اللؤلؤ المكنون

جلد أول



سیرت انسائیکلوپیڈیا



- جزیرہ نمائے عرب کا جغرافیہ اور اقوام و مذاہب
- سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت
- بعثت نبوی سے پہلے عرب کی ہمسایہ اقوام کے احوال
- سلطنتوں کے تاریخی، مذہبی اور سماجی حالات

دار السلام
DARUSSALAM

دار السلام
ریسرچ سنٹر

وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ

اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے



اللؤلؤ المکنون

سیرت انسائیکلوپیڈیا

علی صاحبہا الصلاۃ والسلام

1

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ

اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے

اللؤلؤ المکنون

سیرت انسائیکلوپیڈیا

علی صاحبہا الصلاۃ والسلام

- جزیرہ نمائے عرب کا جغرافیہ اور اقوام و مذاہب
- بعثت نبوی سے پہلے عرب کی ہمسایہ اقوام کے احوال
- سابقہ انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت
- سلطنتوں کے تاریخی، مذہبی اور سماجی حالات

1

نگران اعلیٰ: عبدالمالک مجاہد

تصنیف و تالیف

جناب محسن فارانی — حافظ محمد ابراہیم طاہر کیلانی — مولانا تنویر احمد

حافظ عبداللہ ناصر مدنی — حافظ اقبال صدیق — حافظ ابوبکر احمد خواجہ

تصحیح و تنقیح و نظرثانی

مولانا ارشاد الحق اثری — پروفیسر محمد یحییٰ — مولانا محمد خالد سیف

دارالسلام
DARUSSALAM

اللؤلؤ المکنون

سیرت انسائیکلوپیڈیا

علی صاحبہا الصلاۃ والسلام

جزیرہ نمائے عرب، قبل از بعثت عالمی حالات

جلد 1

نگرانِ اعلیٰ: عبدالمالک مُجاہد

تصنیف وتالیف

جناب محسن فارانی
(ایم اے اردو، ماہر تاریخ، جغرافیہ ولسانیات)

حافظ محمد ابراہیم طاہر کیلانی
(ایم اے اسلامیات، فاضل مدینہ یونیورسٹی)

مولانا تنویر احمد
(فاضل علوم اسلامیہ)

حافظ اقبال صدیق
(فاضل مدینہ یونیورسٹی)

حافظ عبداللہ ناصر مدنی
(فاضل علوم اسلامیہ)

مولانا ابوبکر احمد خواجہ
(فاضل مدینہ یونیورسٹی)

تصحیح وتنقیح/نظر ثانی

مولانا ارشاد الحق اثری
(فاضل علوم اسلامیہ، معروف مؤلف ومحقق)

پروفیسر محمد یحییٰ
(بی اے آنرز، ایم اے عربی، سینئر ریسرچ سکالر دارالسلام)

مولانا محمد خالد سیف
(ر) ریسرچ سکالر اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد

معاونت

مولانا عبدالوہاب شہاب
(فاضل مدینہ یونیورسٹی)

مولانا عبدالبصیر خالد
(فاضل علوم اسلامیہ)

جناب احمد کامران
(سینئر صحافی وماہر اردو زبان وادب)

جناب محمد انور اعوان
(ایم اے انگریزی وسیاسیات)

فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
مكتبة دار السلام
موسوعة السيرة النبوية. / مكتبة دار السلام - الرياض، ١٤٣٣ هـ
ص: ٥٠٨ مقاس: ١٧×٢٤ سم
ردمك: ٦-٨٢-٠٠٠-٥٠٠-٦٠٣-٩٧٨
(النص باللغة الاردية)
١. السيرة النبوية أ. العنوان
ديوي ٢٣٩ ١٤٣٣/١٥٢٦
رقم الإيداع: ١٤٣٣/١٥٢٦
ردمك: ٩٧٨-٦٠٣-٥٠٠-٠٨٢-٦

دارُالسّلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

پرنس عبدالعزیز بن جلاوی سٹریٹ پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب

فون: 4033962-4043432 1 00966 فیکس: 4021659 www.darussalamksa.com

Email: darussalam@awalnet.net.sa info@darussalamksa.com

الریاض • العلیا فون: 4614483 1 00966 فیکس: 4644945 • الملز فون: 4735220 1 00966 فیکس: 4735221
• سویدی فون: 4286641 1 00966 • سویلم فون/فیکس: 2860422 1 00966

جدہ فون: 6879254 2 00966 فیکس: 6336270 مدینہ منورہ فون: 8234446,8230038 4 00966 فیکس: 8151121 04

الخبر فون: 8692900 3 00966 فیکس: 8691551 3 00966 خمیس مشیط فون/فیکس: 2207055 7 00966

ینبع البحر فون: 0500887341 فیکس: 8691551 قصیم (بریدہ) فون: 0503417156 فیکس: 3696124 6 00966

امریکہ • نیویارک فون: 5925 625 718 001 • ہیوسٹن: 0419 722 713 001 کینیڈا • نصیر الدین الخطاب فون: 4186619 416 001

لندن • دارالسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز لمیٹڈ فون: 77252246 20 0044-85394885 20 0044 • مارک انٹرنیشنل: 7739309 0121 0044

متحدہ عرب امارات • شارجہ فون: 5632623 6 00971 فیکس: 5632624 فرانس فون: 52928 480 01 0033 فیکس: 52997 480 01 0033

انڈیا • دارالسلام انڈیا فون: 45566249 44 0091 موبائل: 12041 98841 0091 • اسلامک بکس انٹرنیشنل فون: 4180 2373 22 0091

• ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرز فون: 4892 2451 40 0091 موبائل: 30850 98493 0091 • اکرم الدین پبلی کیشنز فون: 42157847 44 0091

سری لنکا • دارالکتاب فون: 358712 115 0094 • دارالایمان ٹرسٹ فون: 2669197 114 0094

پاکستان ہیڈ آفس و مرکزی شوروم

لاہور 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ لاہور فون: 00 4 32 372,24 400 372,34 240 373 42 0092 فیکس: 72 540 373 042

• غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 54 200 371 42 0092 فیکس: 03 207 373 042

• Y بلاک، گول کمرشل مارکیٹ، دکان: 2 (گراؤنڈ فلور) ڈیفنس، لاہور فون: 10 926 356 42 0092

کراچی مین طارق روڈ، ڈاکمن مال سے (بہادر آباد کی طرف) دوسری گلی کراچی فون: 36 939 343 21 0092 فیکس: 37 939 343 21 0092

اسلام آباد F-8 مرکز، اسلام آباد فون/فیکس: 13 815 22 51 0092

info@darussalampk.com | www.darussalapk.com

بسم الله الرحمن الرحيم

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى

مُحَمَّدٍ

وَعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ

وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ

كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرَاهِيْمَ

اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

صحيح البخاري : 3370 صحيح مسلم : 405-407

مِدحتِ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وَأَحْسَنُ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِي
وَأَجْمَلُ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ
كَأَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

اور آپ کی ذاتِ اَقدس سے زیادہ حسین میری نگاہ نے کبھی کوئی دیکھا ہی نہیں
اور آپ سے زیادہ حسن و جمال والا کبھی کسی ماں نے جنا ہی نہیں
آپ ہر قسم کے عیب سے پاک صاف پیدا کیے گئے ہیں
گویا آپ کی ذاتِ اَقدس کو آپ کے منشا کے عین مطابق بنایا گیا ہے

فہرست

باب: 1

جزیرہ نمائے عرب کا جغرافیائی و تاریخی پس منظر

باب:2

جزیرہ نمائے عرب کی اقوام وقبائل

باب: 3

جزیرہ نمائے عرب کی حکومتیں اور سلطنتیں

باب: 4

جزیرہ نمائے عرب کے مذاہب اور مشرکانہ رسوم

باب: 5

جزیرہ نمائے عرب کی معاشرت، تجارت اور ثقافت

باب: 6

عرب کی ہمسایہ اقوام، سلطنتیں اور مذاہب



طلوعِ آفتابِ نبوّت

ساتویں صدی عیسوی میں سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا گیا۔ یہ تاریخ کا بدترین دور تھا اور انسانیت کے مستقبل اور اس کی بقا و ترقی کے لحاظ سے انتہائی تاریک اور مایوس کن ...... پوری انسانیت خودکشی کے راستے پر چل رہی تھی۔ انسان اپنے خالق اور مالک کو بھول چکا تھا اور خود اپنے آپ کو اور اپنے انجام کو فراموش کر چکا تھا۔ اس کے اندر بھلائی اور بُرائی میں تمیز کرنے کی بھی صلاحیت باقی نہ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کے دل و دماغ کسی چیز میں کھو چکے ہیں۔ ان کو دین و آخرت کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں۔ روح و قلب کی غذا، اخروی فلاح، انسانیت کی خدمت اور اصلاحِ حال کے لیے ان کے پاس ایک لمحہ بھی نہیں تھا۔ بسا اوقات پورے کے پورے ملک میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہ آتا جسے اپنے دین کی فکر ہو، جو ایک ربِّ ذوالجلال کی پرستش کرتا ہو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراتا ہو، جس کے جگر میں انسانیت کا درد ہو اور اس کے ہولناک انجام پر کچھ بے چینی ہو۔ یہ صورتِ حال

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی ہو بہو تصویر تھی:

﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۞ ﴾ (الروم 41:30)

''خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا، تاکہ اللہ ان کو ان کے بعض عملوں کا مزہ چکھائے، عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں۔''

اس عالم گیر فساد کی اصلاح کرنے اور بنی نوع انسان کو گمراہی کی دلدل سے نکال کر ہدایت کی راہ پر ڈالنے کے لیے ساتویں صدی عیسوی کے دسویں سال فخرِ موجودات سید الکونین حضرت محمد ﷺ کو منصبِ نبوت پر مامور فرمانا اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی، چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۞ ﴾

(آل عمرٰن 164:3)

''بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا، جب ان میں انھی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔''

اس عظیم حکمتِ الٰہی کے تحت خاتم النبیین ﷺ چھٹی صدی عیسوی کی آٹھویں دہائی (571ء) میں قریشِ مکہ کے ایک معزز خاندان میں تولد ہوئے جن کی تاباں و درخشاں سیرتِ طیبہ بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ.

عرض ناشر

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِينُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُولُهٗ.

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝﴾
﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝﴾
﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو، جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمھیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔'' [1]

''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کر کے ان دونوں سے مرد اور عورتیں کثرت سے پھیلا دیے، اور اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم آپس میں سوال کرتے ہو، اور رشتے توڑنے سے ڈرو۔ بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے۔'' [2]

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی سچی بات کہا کرو۔ وہ (اللہ) تمھارے عمل درست کر دے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے تو یقیناً اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی۔'' [3]

---

[1] آل عمرٰن 3:102. [2] النسآء 4:1. [3] الأحزاب 33:70،71.

أَمَّا بَعْدُ:

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے اس کائنات کے باسیوں پر بے حد انعامات واحسانات ہیں جن کا کوئی شمار نہیں مگر ان میں سب سے افضل اور اعلیٰ انعام یہ ہے کہ اس نے ہمیں ایمان کی دولت سے مالامال کیا اور ہمیں اپنے آخری رسول ﷺ کا امتی بنایا۔ ہماری تمام تر کمزوریوں اور لغزشوں کے باوجود ہم پر اللہ کا بے پناہ کرم ہے کہ ہمیں سیدِ وَلدِ آدم، سرورِ کائنات حضرت محمد ﷺ سے بے حد محبت ہے۔ ایک مومن کو آپ ﷺ اپنے والدین، اپنی بیوی بچوں اپنی جان حتی کہ ساری کائنات سے بڑھ کر محبوب ہوتے ہیں۔ اس کے بغیر کوئی انسان مسلمان نہیں ہوسکتا۔ اس شدید محبت کے باوجود جس کسی نے بھی آپ کی عظمت و رفعت، آپ کے محاسن وکمالات اور آپ کی سیرت کی بوقلموں خوبیوں کو بیان کرنے کی کوشش کی، اسی کو اعترافِ عجز کرنا پڑا ؎

زندگیاں بیت گئیں اور قلم ٹوٹ گئے
تیرے اوصاف کا اِک باب بھی پورا نہ ہوا

یہی بات ہر پڑھنے اور سننے والے پر بھی صادق آتی ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت پاک کو جتنی بار بھی پڑھا جائے اور بیان کرنے والوں سے سنا جائے، پیاس نہیں بجھتی۔ ہر مرتبہ نئی لذت اور نئی روشنی ملتی ہے۔ یہی آبِ حیات ہے جو ایک مشتِ خاک کو دائمی زندگی اور ابدی نعمتوں سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

آج کے آتش گیر دور میں امت مسلمہ کو بے شمار چیلنج درپیش ہیں۔ کفر پوری چالاکی، بے باکی اور سفاکی کے ساتھ اسلام کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے دلوں سے اللہ تعالیٰ کا ابدی پیغام لانے والے رسول ﷺ کی محبت کا نقش مٹا دے، دنیا کی زیب وزینت، مادی زندگی کا عیش وتنعم اور بلامؤاخذہ جسمانی لذتوں کے مواقع فراہم کر کے وہ ہماری نوجوان نسل کو روحانی لذتوں سے بے بہرہ کر دے اور کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو محمد رسول اللہ ﷺ کے دامن رحمت سے دور کر دے اور آپ ﷺ کے ارشادات وتعلیمات کی اصل روح کو مسخ کر ڈالے۔ ہمارے نزدیک اس طاغوتی حربے کا مداوا یہی ہے کہ محبت واطاعت کے اس رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے، ہر دل میں نورِ حق کی محبت کو بڑھایا جائے اور ہر ذہن کو سیرت پاک کے نور سے منور کر دیا جائے۔

ان سطور کے راقم کو بھی اپنی تمام تر کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود اسی بات پر فخر ہے کہ اسے اللہ نے اپنے رسول ﷺ کی ذات گرامی کے ساتھ گہری محبت اور عقیدت سے نوازا ہے۔ میں بچپن ہی سے اللہ کے رسول ﷺ کی

سیرت کا قاری ہوں۔ طلبِ علم کے ایام میں قاضی محمد سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ کی رحمۃ للعالمین میری پسندیدہ کتاب تھی۔ وقت کروٹیں بدلتا رہا، زندگی نشیب و فراز سے گزرتی رہی۔ الحمدللہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ رسالت مآب ﷺ سے محبت وعقیدت کی گرم جوشیاں بھی بڑھتی گئیں اور زندگی کے اندھیروں میں رہبری کی روشنی مہیا کرتی رہیں۔ سعودی عرب آیا تو یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ اور نفیس سے نفیس تر کتابوں سے اس طرح بھی واسطہ پڑا کہ میں خود ناشر بن گیا۔ اس بات پر اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے کہ دارالسلام نے سیرت طیبہ پر بہت سی عمدہ کتابیں شائع کیں۔

یہ خالصتاً اللہ کا کرم ہے کہ میں سیرت طیبہ پر کتابوں کا ناشر ہی نہیں، ہر ادارے کی کتبِ سیرت کا مطالعہ کرتا ہوں اور ایمان ویقین کی حلاوت سے سرشار ہوتا ہوں۔ میں نے سیرت پر اردو اور عربی میں بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ مطالعے کے اس سفر میں مجھے الرحیق المختوم نے بڑا متاثر کیا، پھر ایک دن خوش بختی سے اس خوبصورت کتاب کے مؤلف مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ سے ملاقات ہوگئی۔ میں تو انھیں خوب جانتا تھا مگر یہ میرے لیے سعادت کے لمحات تھے جب انھوں نے بتایا کہ وہ بھی مجھے جانتے ہیں۔ یوں فاصلے گھٹتے اور قربتیں بڑھتی چلی گئیں۔ وہ اس وقت جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ کے مرکز خدمة السنة والسيرة النبوية میں کام کرتے تھے۔ ملاقاتیں جاری رہیں اور ایک وقت ایسا آیا کہ میری محبوب کتاب کے مؤلف مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ دارالسلام میں علمی کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے ان سے کماحقہ استفادہ نہ کرسکا مگر پھر بھی جب کبھی وقت ملتا، میں ان کی کرسی کے قریب جا بیٹھتا' ان سے لمبی گفتگو ہوتی اور اُن کی مہیا کردہ رہنمائی کی روشنی میرے خیالوں کو مجلّا کرتی چلی جاتی۔

سیرت کے مطالعے کے دوران میں میرے دماغ میں ایک کوندا سا لپکا۔ وہ یہ کہ محدثین، محققین اور مؤرخین نے سیرت طیبہ کے قریب قریب سارے واقعات بیان کردیے ہیں' لیکن ان واقعات کے اسالیب بیان کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ایک مؤرخ نے کوئی واقعہ لکھا تو اس نے اسے بڑا مختصر سا لکھ دیا۔ دوسرے سیرت نگار نے اسی واقعے کو بڑی تفصیل سے لکھا۔ تیسرے مؤلف نے اپنے انداز میں وہی واقعہ لکھا مگر اس واقعے کے حوالے سے چند احادیث اور چند مزید نکات کا اضافہ کردیا۔ میرے دل میں بے ساختہ یہ آرزو انگڑائی لیتی رہی کہ کاش سیرت کی کوئی ایسی جامع کتاب ہو جس میں ان تمام صحیح واقعات کو حُسنِ ترتیب سے ایک جگہ جمع کردیا جائے۔

ایک دن میں مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ موقع کی مناسبت سے میں نے موصوف سے اظہار تمنا کرتے ہوئے تمام واقعات و حالات پر مبنی جامع سیرت کی ضرورت، اہمیت اور اشاعت کا خیال ظاہر کیا۔

مولانا اپنے وقت کی یگانۂ روزگار شخصیت تھے۔ نہایت معاملہ فہم تھے۔ فوراً بات کی تہ تک پہنچ جاتے تھے۔ فرمانے لگے: اگر یہ کام ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا......

تو گویا آپ بھی میری اس بات سے اتفاق کرتے ہیں، میں گویا ہوا۔ فرمانے لگے: کیوں نہیں، میں تو اس پر کچھ کام مدینہ طیبہ میں جامعہ اسلامیہ کے مرکز خدمة السنة والسيرة النبوية میں کرتا بھی رہا مگر وہ بوجوہ مکمل ہوا نہ شائع ہو سکا۔

مولانا! اگر یہ کام دارالسلام کر دے...... میری زبان سے یہ الفاظ پھسلتے پھسلتے رہ گئے۔ مجھے اپنی کم مائگی کا احساس تھا۔ یہ معمولی کام نہ تھا کہ سیرت کے صحیح واقعات کو مختلف مصادر سے اکٹھا کر کے ایک جگہ اس طرح شائع کر دیا جائے کہ اس کا انداز بھی آسان اور دلکش ہو اور نوجوان نسل کو سیرت کے بارے میں تمام معلومات بھی یکجا مل جائیں۔

محترم قارئین کرام! مجھے یہ عرض کرتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ اس دن جب میں مولانا کے پاس سے اٹھا تو طبیعت میں بڑی شادابی، آسودگی اور بے پناہ مسرت محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اس خیال سے بڑی طمانیت نصیب ہوئی کہ میرے افکار سے مولانا بھی متفق ہیں۔ دراصل میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا کہ میں اس قسم کی سوچ سوچوں۔ رہ رہ کر خیال گزرتا تھا کہ کہاں اللہ کے رسول ﷺ کی حیات طیبہ...... اور کہاں میں عاجز! بھلا میں اتنے وقیع ورفیع عنوان پر کیسے کام کروں۔ آپ ﷺ کی سیرت پاک کا مقام اور مرتبہ تو میرے تصور اور افکار سے کہیں ماورا ہے۔

کبھی کبھار علیحدگی میں بیٹھتا تو اپنی قسمت پر نازاں بھی ہوتا اور خودکلامی کے انداز میں اپنے آپ سے کہتا کہ یقیناً تمھاری سوچ مثبت ہے اور مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری جیسے ممتاز سیرت نگار نے اس سوچ اور فکر پر اپنی پسندیدگی کی مہر بھی لگا دی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام نہایت ہی عالی قدر ہے اور ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے تم یہ کام کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔

اس دوران میں واقعات کا تسلسل جاری رہا۔ دارالسلام میں کام بڑھتا چلا گیا، ذمہ داریوں میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ کئی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ ہمارے سامنے پہلے سے جو اشاعتی منصوبے تھے، ہم ان میں مصروف ہوتے چلے گئے۔ میرے ذہن میں یہ منصوبہ تو بدستور درخشاں رہا مگر اس کے لیے بے پناہ مالی اور علمی وسائل کی ضرورت تھی اور سچ پوچھیے تو میں اپنے اندر یہ ہمت ہی نہ پا رہا تھا کہ اتنے بڑے کام کا آغاز کر دوں۔

پھر مولانا بیمار ہو گئے، علاج کے لیے ان کا بھارت آنا جانا لگا رہا۔ ہم ایک منصوبہ شروع کرتے تو اتنے میں دوسرا

سامنے آجاتا۔ پھر اچانک ایک انتہائی دلفگار واقعہ رونما ہوگیا۔ اس سے پوری دنیا میں ہنگامہ برپا ہوگیا۔2006ء میں ڈنمارک کے ایک ادنیٰ سے اخبار نے اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں ہرزہ سرائی کی اور ناپاک خاکے شائع کیے۔ ان خاکوں کے خلاف پوری دنیا کے مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا۔ ہنگامے، جلسے اور جلوس شروع ہوئے۔ ہر ملت اور ہر خطے کے مہذب لوگوں نے اس گھناؤنی حرکت پر شدید نفرت کا اظہار کیا۔ دنیا بھر میں سیرت پاک پر سیمینار، کانفرنسیں اور پروگرام ہوئے۔ ارباب فکر و دانش نے اللہ کے رسول ﷺ کے روشن ترین کردار، آپ کے عظیم اعمال اور آپ کی زندگی کے پاکیزہ معاملات کو دنیا کے سامنے اجاگر کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

دنیا بھر میں سیرت نبوی ﷺ کا ایک نئے انداز سے چرچا شروع ہوگیا۔ میری خوش قسمتی کہ میں نے بھی اسی حوالے سے اپنا چھوٹا سا کردار ادا کیا۔ جدہ کے روزنامہ اردو نیوز کے ایڈیٹر کو خط لکھا کہ آپ روزانہ اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت پاک پر کالم شائع کیا کریں۔ چند دنوں بعد اردو میگزین کے ایڈیٹر جناب رؤف طاہر کا فون آگیا کہ سیرت کے حوالے سے آپ کی تجویز اچھی ہے مگر عملاً ہر روز سیرت پر کالم لکھنا آسان بات نہیں، البتہ ہم اسے ہفتہ وار میگزین میں ضرور شائع کریں گے۔ ان کی تجویز تھی کہ یہ کالم میں خود لکھوں، چنانچہ میں نے اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوش قسمتی سمجھتے ہوئے یہ پیش کش قبول کر لی اور الحمدللہ 174 کالم لکھے۔اس دوران میں ابلاغ کے نقطۂ نظر سے سیرت پاک پر مطالعے کا نادر موقع میسر آیا جس سے زندگی فعال ہوگئی۔

دوران مطالعہ مجھے ''مقالات پروفیسر عبدالقیوم'' دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بلا شبہ وہ اپنے وقت کی بہت بڑی شخصیت تھے۔ میری حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے ایک مقالے میں سیرت مقدسہ کے سلسلے میں پروفیسر صاحب کا مرتب کردہ ایک خاکہ دیکھا۔ یہ خاکہ ٹھیک ٹھیک میرے خیالوں کا عکس تھا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ سیرت پاک پر جس اسلوب کا کام میرے پیش نظر ہے، اسی انداز سے دوسرے اصحاب علم وفضل کا فکری سفر بھی جاری ہے۔ میرے دل سے پروفیسر عبدالقیوم رحمہ اللہ کے لیے خلوص بھری دعا نکلی اور جامع سیرت انسائیکلو پیڈیا کی تیاری کے لیے میرا ارادہ پہلے سے زیادہ پختہ ہوگیا۔

مگر اس کے فوری آغاز کی راہ میں مالی مشکلات حائل تھیں۔ میں اس سیرت انسائیکلو پیڈیا کو دس جلدوں میں لانا چاہتا تھا، پھر اس کے انگلش اور بعد ازاں دیگر زبانوں میں ترجمے کا پروگرام بھی پیش نظر تھا جو خاصی لمبی رقم کا متقاضی تھا۔

2007ء کا زمانہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے توفیق خاص سے نوازا اور میں نے کمرِ ہمت باندھ کر اس مبارک کام کو عملی

شکل دینے کی کوشش شروع کر دی۔ میں شام گیا۔ وہاں کے علمائے کرام سے ملا۔ اپنی کہی، اُن کی سُنی۔ پھر خوب پرکھ کر یہ کام ایک بڑی علمی شخصیت کے سپرد کیا کہ وہ علماء سے مشورہ کر کے اس منصوبے کا آغاز کر دیں۔ اس دوران میں ان سے رابطہ رہا۔ انھوں نے اس کام کے خطوط متعین کیے۔ کچھ کام آگے بڑھایا۔ کچھ مدت کے بعد شامی علمائے کرام کے کام کا جائزہ لیا تو مجھے اعتراف ہے کہ خاصا مایوس ہوا۔ یہ کام کسی بھی اعتبار سے مطلوبہ معیار کا نہ تھا۔ اس وقتی مایوسی کے باوجود میری ہمت نے ساتھ نہ چھوڑا، نہ میرے پائے شوق نے جواب دیا۔ میں نے مصر کے علماء سے رابطہ کیا۔ یہاں کے اجل علمائے کرام کی ایک کمیٹی تشکیل دی اور اس مقدس موضوع کے مختلف پہلو اُجاگر کر کے کام شروع کرایا۔ کچھ عرصے بعد اس کام پر نظر ڈالی تو یہاں بھی گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ میری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ یہ کام بھی مطلوبہ معیار کے مطابق نہ نکلا۔

ناکامیوں نے ہمیشہ کامیابیوں کی راہ ہموار کی ہے۔ اب توفیق ربانی سے خیالوں کا رخ دارالسلام لاہور کی طرف ہونے لگا۔ جلد ہی دارالسلام لاہور میں سیرت انسائیکلو پیڈیا کا خصوصی سیکشن قائم کر دیا گیا۔ جب میں نے اس سیکشن کے فاضل سکالرز کے ابتدائی کام کا تنقیدی جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے کرم سے یہ کام بڑی حد تک میرے منشا کے مطابق ہے۔ چنانچہ اس کام کے باقاعدہ آغاز کے لیے میں خود لاہور پہنچا۔

ابتدائی طور پر مولانا محمد ذوالفقار ﷾ نے اس اہم کام کی ذمہ داری نبھائی۔ بعدازاں اس مقدس کام کے لیے دارالسلام ریسرچ سنٹر، لاہور کے جید علمائے کرام میں سے ایک فعال ٹیم کا انتخاب کیا گیا۔ اس میں بھی علمی اور انتظامی طور پر کئی بار تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ حافظ ابوبکر احمد خواجہ (فاضل مدینہ یونیورسٹی)، مولانا عبدالوہاب شہاب (فاضل مدینہ یونیورسٹی)، مولانا عبدالبصیر خالد (فاضل عربی و فارسی) بھی تحقیق و تالیف میں شامل رہے۔ موجودہ ٹیم کے ارکان یہ ہیں: مولانا محمد ابراہیم طاہر بن عبدالسلام کیلانی (فاضل مدینہ یونیورسٹی)، حافظ اقبال صدیق (فاضل مدینہ یونیورسٹی)، مولانا تنویر احمد (فاضل علوم اسلامیہ)، مولانا محمد عبداللہ ناصر (فاضل علوم اسلامیہ)۔

میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے جب محدثین ﷭ کے منہج کے مطابق اس مبارک کام کی علمی و تحقیقی تحریروں پر معروف محقق، مؤلف کتب کثیرہ اور استاد مولانا ارشاد الحق اثری ﷾ سے کتاب کے مندرجات کی تحقیق، تنقیح اور تصحیح کی خواہش کی اور اسلامی نظریاتی کونسل کے سینئر ریسرچ سکالر (ر) اور معروف مترجم مولانا محمد خالد سیف ﷾ سے نظر ثانی کے کام میں شمولیت کی درخواست کی تو انھوں نے نہ صرف اسے قبول کیا بلکہ علمی تعاون اور نظر ثانی کا خوب حق ادا کیا۔ جزاهم الله أحسن الجزاء. ان جید علمائے کرام نے صحیح اور ضعیف احادیث و آثار

کے فرق و امتیاز، تاریخی احوال اور دیگر اہم تقاضوں کی طرف ایک سے زائد بار اتنی وقیع رہنمائی فرمائی جس کے شکر و سپاس سے میں کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا۔ ان کے علاوہ دارالسلام کے دیگر رفقائے کار خصوصاً بزرگ عالم اور مفسرِ قرآن حافظ صلاح الدین یوسف اور علوم عالیہ کے محرم اور دارالسلام کے سینئر ریسرچ سکالر پروفیسر محمد یحیٰی کے وقیع مشورے بھی اس تاریخی کام میں شامل ہیں۔ زبان و بیان میں یکسانی کے لیے اردو زبان کے ماہر سینئر صحافی جناب احمد کامران دہلوی بھی ہمہ وقتی فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔

پہلی جلد میں سرِ آغاز قارئینِ کرام کی سہولت کے لیے ''اسلوبِ تحقیق و نگارش'' کے زیرِ عنوان ایک اہم مضمون پیش خدمت ہے۔ ان شاء اللہ یہ مضمون اس انسائیکلو پیڈیا کے نتیجہ خیز مطالعے میں بڑی مدد دے گا۔ اس کے معاً بعد محترم پروفیسر محمد یحیٰی حفظہ اللہ کے قلم سے ایک نہایت وقیع علمی اور جامع مقدمہ نظر نواز ہوگا۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عہد مبارک سے لے کر آج تک علمائے امت نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ کے بیان، تحفظ، تدوین، ترتیب اور تنوع کے حوالے سے جو عظیم الشان خدمات انجام دیں، ان کا عہد بعہد جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس خدمت کے لیے محدثین اور دوسرے سیرت نگاروں نے جو اصول وضوابط پیشِ نظر رکھے اور جو اسالیب اختیار کیے، ان کا علمی تعارف ہے۔ عہد جدید میں اس حوالے سے جو مباحث اہل علم کے سامنے آئے، ان پر سیر حاصل تبصرہ ہے اور عصر حاضر کے علمی تقاضوں کی تکمیل کے لیے محدثینِ کرام کا اسلوب اور ان کے معیارِ صحت کو اپنانے کی ضرورت اُجاگر کی گئی ہے۔

رسالت مآب ﷺ کی سیرت مقدسہ کے مطالعے کے لیے اس زمانے کے عام حالات، قبائل عرب اور ہمسایہ قوموں کے احوال، جغرافیائی و تاریخی پس منظر، خصوصاً ان کی سماجی حالت اور ان کی سیاسی اور ذہنی تاریخ سے آگہی ضروری ہے۔ ان سب موضوعات کا بھرپور جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ محسن فارانی صاحب نے نادر نقشوں اور شجروں سے اہم مقامات اُجاگر کرنے کا خاص اہتمام کیا ہے۔ نقشوں کی تیاری میں ان کے ساتھ ادارے کے مخلص ساتھی جناب محمد انور اعوان (ایم۔اے انگلش، اسلامیات وسیاسیات) نے خصوصی تعاون کیا ہے۔

الحمدللہ! ان مراحل ومنازل سے گزرنے کے بعد اب سیرت انسائیکلو پیڈیا جلوہ گر ہو رہا ہے جس کے لیے میری جبینِ سپاس بارگاہِ رب العزت میں سجدہ ریز ہے۔ فی الجملہ رسالت مآب ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا کوئی واقعہ ایسا نہیں جس کی تحقیق وجستجو میں سیرت انسائیکلو پیڈیا کے فاضل قلم کاروں نے کوئی کوتاہی کی ہو اور اسے آسان سے آسان تر زبان اور بہترین اسلوب میں پیش کرنے کی سعی نہ کی ہو۔ بارك الله في جهودهم و جزاهم الله أحسن الجزاء.

یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ اس عظیم کام کے دوران خیال آیا کہ سیرت انسائیکلوپیڈیا کے ہر باب کا سر آغاز متعلقہ موضوع کی مناسبت سے سیرت پر قرآن کریم کی آیات سے سجایا جائے۔ آیاتِ سیرت کی خطاطی کا یہ شاہکار فریضہ ممتاز خطاط جناب عبدالرحمٰن، جو ''عبدہٗ'' کے نام سے معروف ہیں، نے ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ اس ندرتِ خیال کو قبول فرما کر ہمیں اس کی برکات سے نوازے۔

میں اس سلسلے میں مدیر دارالسلام لاہور عزیزی حافظ عبدالعظیم اسد ﷾ کی خصوصی دلچسپی، نگرانی اور انتظامی مساعی جمیلہ کا معترف ہوں، نیز مولانا محمد ابراہیم طاہر کی سربراہی میں ریسرچ ٹیم کے علمائے کرام اور معاونین نے جس محنت اور باریک بینی سے اپنے اپنے عنوان اور اپنے اپنے ابواب پر کام کیا ہے، اس پر انھیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ الحمدللہ! آرٹ ڈائریکٹرز جناب زاہد سلیم چوہدری، جناب محمد صفت الٰہی اور اُن کی ٹیم کے ارکان سینئر ڈیزائنرز محمد نعیم، عبدالواسع، ہارون الرشید اور زاہد محمود نے باتصویر ڈیزائننگ سے کتاب کے حسن میں قابل قدر اضافہ کیا اور کمپوزنگ کے لیے جناب عبدالخالق کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس عظیم منصوبے میں کسی بھی قسم کا تعاون کرنے والوں کو قیامت کے روز اللہ کے رسول ﷺ کی شفاعت نصیب ہو۔ ہم قیامت کے دن خدام قرآن و حدیث کی حیثیت سے اٹھائے جائیں اور سیرت مقدسہ کی یہ دستاویز دنیا بھر میں اسوۂ حسنہ کی نور افشانی کا باعث بنے۔ ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم. آمین یا رب العٰلمین!

خادم کتاب و سنت

عبدالمالک مجاہد

(مینجنگ ڈائریکٹر: دارالسلام، الریاض، لاہور)

صفر 1433ھ / جنوری 2012ء

اسلوبِ تحقیق و نگارش

''اللؤلؤالمکنون'' سیرت انسائیکلو پیڈیا میں سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی پیدائش سے لے کر آپ کی وفات تک کے احوال و آثار پوری جزئیات سمیت نہایت جامعیت سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دعوتِ اسلام سے پہلے جزیرہ نمائے عرب کے باشندوں، ان کی بود و باش، سماجی رویوں اور جملہ خصائل کے علاوہ ارد گرد کی اقوام کے حالات بھی بیان کیے گئے ہیں تا کہ تاریخ انسانی کے سب سے عظیم اور سب سے روشن عہد کے آغاز کا پس منظر قارئین کے سامنے آجائے اور یہ حکمتِ الٰہی عیاں ہوجائے کہ نبی کریم ﷺ کی ولادت باسعادت اور بعثت کے لیے جزیرہ نمائے عرب ہی کو خاص طور پر کیوں منتخب کیا گیا۔

''اللؤلؤالمکنون'' سیرت انسائیکلو پیڈیا میں علمی، منہجی اور فنی لحاظ سے بحد امکان بھرپور صلاحیتوں اور مہارت کو بروئے کار لایا گیا ہے تا کہ ہم سب فدایانِ رسول اپنی علمی، فکری اور عملی برکات سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوسکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم اپنے محبوب رسول اور رہبرِ اعظم ﷺ کی ہر ادا کو اس طرح پڑھیں، دیکھیں اور سمجھیں گویا ہم رسالت مآب ﷺ ہی کے عہدِ مبارک میں سانس لے رہے ہیں۔

اللہ کرے سیرت انسائیکلو پیڈیا اپنے قاری کو ذہنی اور روحانی طور پر اُسی مقدس فضا میں پہنچا دے جب سید البشر فخرِ رسل ﷺ تاریخ انسانی کی کامیاب ترین جماعت، یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ کی بندگی اور آدابِ زندگی سکھا رہے تھے۔ اس غرض و غایت سے سیرت انسائیکلو پیڈیا میں نبیِ اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ ترتیبِ زمانی کے مطابق مدون کی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ یہ کتاب اسلوب اور تأثر کے اعتبار سے نبیِ اکرم ﷺ کی مبارک زندگی کے مختلف مراحل اور حالات و واقعات کو ایک خاص معنویت کے ساتھ اُجاگر کرے۔ اس کا اسلوبِ بیان انتہائی سادہ، آسان، دلنشیں اور مدلل ہو۔ ترتیب و تدوین میں جو مختلف اسالیب پیشِ نظر رکھے گئے ہیں ان کا تعارف یوں ہے:

اسلوب نگارش

1. کتاب کے شروع میں ایک جامع مقدمہ رقم کیا گیا ہے جس میں سیرت کے موضوع اور اس کے خصوصی مطالعے

کی اہمیت وضرورت کے اسباب بتائے گئے ہیں۔ مختلف ادوار میں متداول کتبِ سیرت اور سیرت نگاروں کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے، نیز مستشرقین اور ان کے گرویدہ قلمی طائفے کا علمی محاسبہ کیا گیا ہے۔

2 سیرت کے مآخذ ومراجع میں تین چیزوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے:

1- قرآنِ کریم 2- کتبِ احادیث 3- کتبِ سیرت ومغازی

وضاحت اور تفصیلات کے لیے ہم نے مندرجہ ذیل مصادر کو بھی استعمال کیا ہے:

1- قرآنِ کریم کی تفاسیر 2- شروحِ احادیث 3- دوسرے ادیان کی مقدس کتابیں 4- کتبِ تاریخ وجغرافیہ 5- کتبِ شمائل 6- کتبِ دلائل ومعجزات

3 ایک واقعے کی تمام روایات کو جمع کرنے کے بجائے مستند اور جامع روایت کا ذکر کیا گیا ہے، البتہ جہاں روایت مختصر ہو، وہاں متعدد روایات کو حوالوں سمیت یکجا کر دیا گیا ہے لیکن جہاں ایک واقعے میں متعدد روایات ہوں اور ہر روایت کا نتیجہ الگ ہو، وہاں جملہ روایات ذکر کرکے اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ ترجیح کس کو حاصل ہے۔

4 ہم نے روایات کی اسناد ومتون کی صحت اور راویوں کے معتبر ہونے کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ وہی روایات لی جائیں جنھیں محدثینِ کرام نے سیرتِ طیبہ کے ضمن میں قابلِ اعتنا سمجھا ہے اور جہاں خلا پُر کرنے کے پیشِ نظر ضعیف روایات کا تذکرہ ضروری سمجھا گیا ہے، وہاں ان کا ضعف واضح کر دیا گیا ہے۔

5 سیرت کے مختلف عنوانات کو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر باب کے عنوان کے بعد چند سطروں میں اس کے مندرجات کا تعارف ہے۔ بعض ابواب میں ذیلی عنوان شامل کیے گئے ہیں۔

6 تمام جلدوں میں ہر باب سے پہلے اس باب کے موضوع کی مطابقت میں ایک آیت نہایت خوبصورت خطاطی کی شکل میں سجا دی گئی ہے جو اس باب کے کلیدی خیال کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

7 ہر باب نئے صفحے سے شروع کیا گیا ہے۔ اس کے تحت ذیلی سرخیاں ہیں۔

8 ابواب کے تحت ہر جلی عنوان کا ہیڈر بنایا گیا ہے۔

9 متن میں جہاں اقتباسات آئے ہیں، انھیں واوین (Inverted Commas) میں درج کیا گیا ہے اور قرآنی آیات، احادیثِ نبویہ کے تراجم اور کتابِ مقدس (بائبل) کے اقتباسات کو انڈینٹ (Indent) دے کر نمایاں کیا گیا ہے۔

10 بائبل کے اقتباسات میں جہاں نبیِ اکرم ﷺ کی صفات کا تذکرہ ہے اور ظہورِ قدسی کی بشارتیں دی گئی ہیں،

اس عبارت کو خاکی رنگ دے کر اُجاگر کیا گیا ہے، نیز ترتیب سے بشارات کا نتیجہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

11 قرآنی آیات اور عربی متون کو سرخ رنگ دے کر امتیازی حیثیت دی گئی ہے۔

12 متنِ کتاب میں مذکور مشکل الفاظ کی شرح، غیر معروف مقامات کی وضاحت و تعیین اور مختلف اعلام و قبائل کی تعریف مختصر حواشی میں کر دی گئی ہے۔ یہ حواشی ہر جلد کے آخر میں حروف تہجی کے اعتبار سے مذکور ہیں۔ حواشی میں وضاحت کردہ الفاظ کو متن میں براؤن رنگ دے کر واضح کر دیا گیا ہے۔

13 متن میں جہاں موازنے کی ضرورت ہے، وہاں کالم بنا دیے گئے ہیں۔

14 قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ کو الگ الگ بریکٹوں میں رکھا گیا ہے۔

15 عدنانی اور قحطانی قبائل اور اوس وخزرج کے جداگانہ شجرے دیے گئے ہیں۔

16 اماکن کی تفہیم کے لیے نقشوں کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ بعض مقامات کی تعیین کے لیے خاکوں سے کام لیا گیا ہے۔

17 اہم مقامات کی جابجا تصاویر بھی دی گئی ہیں۔

اسلوبِ تحقیق و تخریج

1 قرآنی آیات، احادیثِ نبویہ اور واقعاتِ سیرت و مغازی کی تخریج کا اہتمام اس طرح کیا گیا ہے:

(ا) قرآن کریم: سورت کا نام، نمبر اور آیت کا نمبر۔

(ب) تفاسیر: تفسیر کی کتاب، سورت کا نام، نمبر اور آیت کا نمبر۔

(ج) احادیث: صحیحین اور سننِ اربعہ کا حوالہ دیتے ہوئے کتاب کا نام اور حدیث نمبر درج کیا گیا ہے۔ دیگر کتبِ احادیث کی تخریج میں کتاب کی جلد یا جز، صفحہ نمبر اور بعض اوقات حدیث کا نمبر بھی دیا گیا ہے۔

(د) شروحاتِ احادیث، کتبِ سیرت، کتبِ مغازی، کتبِ شمائل اور کتبِ دلائل و معجزات میں سے جو کتاب ایک جلد میں ہے، وہاں کتاب کا نام اور صفحہ نمبر درج کر دیا گیا ہے اور متعدد جلدوں والی کتاب میں اس کا نام، جلد نمبر اور صفحہ نمبر لکھ دیا گیا ہے۔

(ہ) بائبل کا حوالہ بائبل کی کتاب کے نام، باب نمبر اور آیت نمبر کے ذریعے سے دیا گیا ہے۔

2 مصادر و مراجع میں کتابوں کے علاوہ الیکٹرانک مکتبات اور انٹرنیٹ سے بھی مدد لی گئی ہے اور اس کی ویب سائٹ کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے۔ الیکٹرانک ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کے تمام مندرجات مستند نہیں مانے جاتے، اس لیے ہم نے ان سے صرف وہ معلومات لی ہیں جو سہولت اور وضاحت کے لیے ضروری تھیں اور

جن کی دیگر مستند ذرائع سے تصدیق وتوثیق ہوتی ہے۔

3 تخریج میں عربی مصادر کے حوالے نسخ میں اور اردو مصادر کے حوالے نستعلیق میں دیے گئے ہیں۔ جہاں کہیں انگریزی حوالے کا تذکرہ ہوا ہے، اسے نئی لائن سے شروع کیا گیا ہے۔

اسلوب فہارس

1 ہر جلد کے شروع میں مندرجہ ذیل تین قسموں کی فہرستیں دی گئی ہیں:

(ا) کتاب کی اصل موضوعاتی فہرست: اس میں عناوین کتاب کے ساتھ ساتھ نقشوں، خاکوں اور شجروں کو بھی کتابی ترتیب کے لحاظ سے شامل کیا گیا ہے۔

(ب) نقشوں، خاکوں اور شجروں کی الگ فہرست بھی مرتب کر دی گئی ہے۔

2 سیرت انسائیکلوپیڈیا کی آخری جلد اشاریے پر مشتمل ہوگی جس میں قرآنی آیات، احادیثِ نبویہ، اقوالِ صحابہ، اشعار اور مضامین کی مکمل فہرستوں کے ساتھ اعلام، اماکن، قبائل اور مذاہب وفرق وغیرہ کی فہرستیں بھی بہ اعتبارِ حروفِ تہجی شامل ہوں گی، ان شاء اللہ۔ اشاریے ہی کی جلد میں سیرت انسائیکلوپیڈیا کے مصادر ومراجع کی تفصیلی فہرست بھی ہوگی۔

وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيقِ وَعَلَيْهِ التُّكْلَانُ وَبِهِ نَسْتَعِينُ وَنَسْتَغْفِرُهُ

وَالْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

وَصَلَّى اللّٰهُ وَسَلَّمَ وَبَارَكَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ

وَأَتْبَاعِهٖ أَجْمَعِينَ .

مقدمہ

سیدالانبیاء محمد ﷺ سرزمینِ عرب کی معزز ترین قوم قریش مکہ میں مبعوث ہوئے تاکہ انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے کر توحید ربانی کی لذتوں سے آشنا کر دیں اور پھر ان کے ذریعے بنی نوع انسان دین اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾

"بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا، جب ان میں انھی میں سے ایک رسول (محمد ﷺ کو) بھیجا، وہ انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔" [1]

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَۨا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ ﴾

"وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں برے کاموں سے روکتا ہے۔ اور وہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر تھے، چنانچہ جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انھوں نے اس کی تعظیم کی اور اس کی مدد

[1] آل عمرٰن 3:164.

کی اور اس نور (ہدایت) کی پیروی کی جو اس پر نازل کیا گیا، وہی فلاح پانے والے ہیں۔ کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، جس کے پاس آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود (برحق) نہیں، وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے، لہٰذا تم اللہ پر اور اس کے رسول اُمی نبی پر ایمان لاؤ، جو (خود بھی) اللہ اور اس کے (تمام) کلمات پر ایمان لاتا ہے اور تم اس کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔''[1]

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے انسانی تاریخ کا ایک بالکل نیا اور انوکھا دور شروع ہوا جس کی انسانیت نے کبھی کوئی مثال نہیں دیکھی۔ اس دور کا آغاز ریگستانوں اور بنجر پہاڑوں سے گھرے ہوئے عرب کے ایک چھوٹے سے شہر مکہ سے ہوا۔ مکہ مکرمہ میں اللہ کی عبادت کے لیے اللہ کا ایک گھر بنایا گیا تھا جو اب بتوں، تصویروں اور مقدس پتھروں سے بھرا ہوا تھا۔ اہلِ عرب نے اللہ کے ساتھ ان سب کی بھی عبادت شروع کر دی تھی۔ ان کے پاس، رہنمائی کے لیے کوئی آسمانی صحیفہ موجود نہ تھا۔ ہر خاص و عام فرد کے لیے مال و دولت کی فراوانی سے حاصل ہونے والی سہولتوں کا حصول ہی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ جوا، شراب، شہوانی لذتیں اور ان کے حصول کے لیے دوسروں کا استحصال، ناانصافی، فریب، جھوٹ اور کمزوروں پر ظلم وستم روزمرہ کا معمول تھا۔ فطرت اس قدر مسخ ہو چکی تھی کہ احساسِ تفاخر یا رزق کی تنگی کے ڈر سے سگی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ پورے جزیرہ نمائے عرب میں، ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک، ہر وقت آپس میں لڑنے والے قبائل پھیلے ہوئے تھے۔ انسانی جان، مال اور عزت کچھ محفوظ نہ تھا۔ نہ کوئی نظام تھا، نہ مملکت اور نہ ادارے۔ نہ کہیں فریاد ہو سکتی تھی اور نہ دادرسی۔

مکہ میں چند ہی نفوس ایسے تھے جو اپنی فطرتِ سلیمہ کے باعث عام لوگوں کی طرح برائیوں میں غرق نہ تھے۔ وہ نیکیوں اور اچھائیوں کے قدرشناس بھی تھے۔ ان کے درمیان ایک فرد البتہ ایسا موجود تھا جو اردگرد کے سارے معاشرے سے یکسر مختلف تھا۔ وہ لاقانونیت، ظلم و ہوس، مکروفریب اور جھوٹ کے سمندر میں ضبطِ نفس، بے غرضی، انصاف، رحم، دیانت، امانت اور سچائی کا ایک پیکر جمیل تھا۔ اس کی عادات وصفات اور اعمال و اقوال کے جمال نے ہر انسان کے دل میں اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑ رکھے تھے۔ اس محبوب اور معزز ہستی کو پورے معاشرے میں بے پناہ احترام حاصل تھا۔ لیکن اس تفوق کی بنا پر وہ محبوب ومحترم انسان اپنے لیے نہ کسی قسم کے مالی فائدے کا خواہش مند تھا نہ کسی منصب کا طلب گار۔ اس کی ذات، اس کے مال اور اس کی پاکیزہ عادات سے پورے معاشرے کو فائدہ پہنچتا تھا۔ اس عظیم ہستی، اس فردِ فرید کا نام محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ...... صلی اللہ علیہ وسلم

[1] الأعراف 7:157،158.

ایک مکمل انقلاب کی دعوت

حضرت محمد ﷺ نے عمرِ عزیز کے چالیس سال، انتہائی عزت و احترام سے، اس شہر کے باسیوں کے درمیان گزارے۔ اس کے بعد وہ ایک ایسے انوکھے اور عظیم الشان تجربے سے گزرے جس کے بارے میں پہلے سے ان کے ذہن میں کوئی تصور تک موجود نہ تھا۔ یہ تجربہ وحی لے کر آنے والے ناموسِ اعظم، یعنی جبریلِ امین سے ملاقات اور منصبِ نبوت پر فائز کیے جانے کا تھا۔ اس کے نتیجے میں انھوں نے اپنے عزیزوں، پھر شہر والوں، پھر تمام انسانوں کو یہ دعوت دینی شروع کر دی کہ وہ اپنے افکار، عقائد، عادات و عبادات، اطوار و خصائل، رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے برتنے، لینے دینے، خرید و فروخت، رشتے نبھانے اور بدلہ لینے، غرض پوری زندگی کو ازسرِنو اپنے پیدا کرنے والے رب کے ودیعت کردہ طریقوں کے مطابق درست بنیادوں پر استوار کریں۔ یہ بنی نوع انسان کے ایک ایک فرد کے لیے مکمل انقلاب کی دعوت تھی۔

اتنی بڑی تبدیلی لانے کے لیے داعیِ اسلام کے پاس اللہ کے پیغام حق اور اپنی ذات کے مثالی نمونے کے سوا اور کوئی سروسامان نہ تھا۔ نہ اتھارٹی، نہ اعوان و مددگار، نہ اقتدار، نہ فوج اور نہ اپنی ضرورتوں اور ذاتی اغراض کی تکمیل کی امید پر ساتھ دینے والوں کا کوئی ہجوم۔ چند کمزور نفوس تھے جنھوں نے ان کے پیغام کو اس کی سچائی کی بنا پر قبول کیا تھا اور ساتھ دے رہے تھے۔

مکہ میں مال و دولت، تجارتی مفادات اور قدیم مذہبی تفوق کی بنیاد پر ایک بندوبست قائم تھا۔ اس سے وابستہ چھوٹے بڑے لوگوں کو تبدیلی کے ایسے چیلنج کا سامنا کرنے کی توقع تک نہ تھی۔ وہ اس نئی دعوت کو اپنی جمی جمائی زندگی کے لیے شدید خطرہ سمجھ کر اس کو ہر صورت میں ختم کر دینے پر تُل گئے۔ انھیں اپنا چلتا ہوا بندوبست بچانے کے لیے کسی بھی ظلم و ستم سے دریغ نہ تھا، چنانچہ اس نئے داعی، اس عظیم رسول ﷺ کے تیرہ سال مخلص ساتھیوں کی تلاش اور ان کی تربیت کرتے، انتہائی بے چارگی کے عالم میں ساتھیوں سمیت مکہ کے متکبروں کے ظلم و ستم سہتے اور دنیا میں اپنے لیے عافیت کا کوئی ٹھکانا ڈھونڈتے ہوئے گزر گئے۔

پھر جب مدینہ میں ایک ٹھکانا مل گیا تو وہ بھی مکمل طور پر گوشۂ عافیت ثابت نہ ہوا۔ مدینہ آجانے کے بعد اگلے دس برسوں میں سے ایک لمبا عرصہ آپ ﷺ کو اہلِ مکہ بلکہ پورے عرب کے لشکروں سے اپنا دفاع کرتے ہوئے گزارنا پڑا۔ دفاع کے ساتھ ساتھ انھی دس برسوں میں آپ کو ایک آئیڈیل معاشرہ قائم کرنا اور پیغامِ حق قبول کرنے والوں کو ایک سچے عقیدے پر استوار کرنا تھا۔ آپس میں لڑنے والوں کو ایک طاقتور امت کے سانچے میں

ڈھالنا تھا۔ رجالِ کار تیار کرنے تھے، ادارے بنانے تھے اور ایک ایسا نظام قائم کرنا تھا کہ انسان کا اللہ سے جو خوبصورت تعلق قائم ہوا تھا اور ایک انسان کا دوسرے انسان سے خیر خواہی کا جو تعلق وجود میں آیا تھا، وہ ختم ہو کر نہ رہ جائے، نسل در نسل آگے بڑھتا چلا جائے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بے پروائی، فکری غفلت اور عملی کج روی کے سبب سے یہ تعلق زوال کا شکار ہو جائے تو بھی اس میں پھر سے تازہ ہو کر سرگرمِ عمل ہونے کی مکمل صلاحیت موجود اور محفوظ رہے۔

دنیا کی کامیاب ترین ہستی

اس مقصد کی تکمیل کے لیے جو چیزیں بہم ہوئیں، وہ یہ تھیں: ابدی اور مطلق سچائیوں کو واشگاف کرنے والی ایک جامع کتاب، محمد رسول اللہ ﷺ کی صورت میں ایک ایسی ہستی جس نے اس کتاب کے ہر لفظ پر پوری طرح عمل کر کے مکمل نمونہ عمل پیش کیا، اس کے علاوہ براہِ راست آپ سے تربیت حاصل کرنے والی ایک مختصر سی جماعت تھی جس کے زیادہ تر افراد چرواہے، پھیری لگانے والے، راستوں اور بازاروں میں سامان رکھ کر بیچنے والے چھوٹے تاجر، لکڑہارے، چھوٹے باغبان، کاشت کار، مزدور، گلہ بان، غلام اور آزاد کردہ غلام تھے۔

یہی لوگ مختصر ترین عرصے میں محمد رسول اللہ ﷺ کی تربیت پا کر کامیاب ترین حکمرانوں، دنیا کی عظیم ترین فوجوں کو شکست دینے والے سپہ سالاروں، عدالت شعار منصفوں، نئی روایات رقم کرنے والے سفارت کاروں، مستعد ترین کار پردازوں، دنیا کی تجارت پر چھا جانے والے تاجروں، عظیم سکالروں اور کامیاب ترین استادوں کی حیثیت سے فرائض سرانجام دینے کے لیے پوری طرح تیار ہو گئے۔ ان سب کے سامنے ہر میدان میں یقینی کامیابی کے حصول کے لیے نمونہ ایک ہی تھا۔ پوری کتابِ ہدایت پر ایک ہی عظیم ہستی کے عمل کا کامل ترین نمونہ جس میں کہیں جھول تھا نہ ابہام اور نہ کوئی پیچیدگی۔ ہر عمل کا طریق کار انتہائی اجلا اور غرض و غایت واضح تھی۔

ان دس برسوں کی جدوجہد کے نتیجے میں پورے جزیرہ نمائے عرب کے رہنے والے سرپھرے بدو، تندخو لڑاکے اور خودسر قبائل دیکھتے ہی دیکھتے فوج درفوج نئے دین میں شامل ہو گئے۔ اسلام کی عظیم کامیابیوں کے سامنے ان میں سے کسی کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہ بچا تھا کہ وہ اپنے سابقہ عقیدے اور طرزِ حیات کو چھوڑ کر اللہ کے دین میں داخل ہو اور ایک امت کے نظم میں منسلک ہو جائے۔ اس امت کو انتہائی کٹھن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن آپ ﷺ کے کامل نمونے پر من وعن عمل کرنے والے قائدین کی قیادت میں اس امت نے ارتداد جیسی خطرناک اندرونی مشکلات پر قابو پاتے ہوئے بیس برس سے کم عرصے میں دنیا کی انتہائی طاقتور اور متمدن سلطنتوں پر غلبہ حاصل

کرلیا۔ یہ امت آیندہ کئی صدیوں تک دنیا کی ممتاز ترین قوت رہی جو خیر کی داعی، انصاف کی علمبردار اور بے مثال انسانی فلاح و بہبود کی ضامن تھی۔

مرکزِ نگاہِ عالم

مکہ میں تیرہ سال کی ستم رسیدگی کا زمانہ ہو، اس کے بعد محض دس سال میں پورے عرب کے باشندوں کی مسلم امت میں شمولیت ہو، پھر اگلے پندرہ بیس برسوں میں دنیا کی دوسب سے بڑی طاقتوں کا خاتمہ اور ان کی رعایا کی رضا کارانہ بلکہ والہانہ انداز میں نئے دین میں شمولیت ہو، یہ سب ایسے حیرت انگیز واقعات ہیں جن کے سامنے انسانی عقل آج بھی حیرت زدہ ہے۔ یہ ایک فطری بات تھی کہ ان تمام مراحل کے دوران میں، لکیر کے دونوں طرف رہنے والے انسانوں نے، پورے تجسس کے ساتھ، ہر لمحے کا مشاہدہ کیا۔ اس کے ہر پہلو کا انتہائی گہری نظر سے جائزہ لیا اور مسلسل اس پر غور وفکر کیا۔ اس جائزے، مشاہدے اور غور وفکر کا اصل موضوع محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہی تھی۔ اس کا سبب واضح تھا۔ جو کچھ ہو رہا تھا، آپ کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ باطل کے جس جس ستون کو جو بھی غصہ تھا، آپ ہی کے کام پر اور آپ ہی کی کوششوں کے خلاف تھا۔ جن جن کے دل میں پسندیدگی بلکہ اس سے بہت آگے بڑھ کر شدید محبت اور والہانہ ارادت تھی، وہ بھی آپ ہی کے اخلاق وعمل کی خوبصورتی کی بنا پر تھی۔

اب اس کے بارے میں بھی کسی کو اختلاف نہیں رہا کہ پوری انسانی تاریخ میں وہ ہستی صرف ایک ہی ہے جس کی زندگی ہی میں نہیں، رحلت کے بعد بھی، ہر زاویے سے، اس کی زندگی کے ہر پہلو کا مطالعہ کیا گیا۔ زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور سوانح، آپ ﷺ کے افعال و اعمال اور ان افعال و اعمال کی تمام صورتوں، حتی کہ اپنے اقوال کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کے اعمال واقوال پر آپ کی رضا مندی اور ناراضی کا بھی پوری باریک بینی سے مشاہدہ کیا گیا، ان کو یاد رکھا گیا، ان کو حافظے میں اور لکھ کر محفوظ کیا گیا۔ مختلف مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مختلف زاویوں سے ان پر غور وخوض کیا گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انسانی زندگی کے ہر پہلو کے لیے ان سے رہنمائی لی گئی اور قیامت تک لی جاتی رہے گی۔ وہ ہستی سلسلۂ نبوت کی آخری اور کامل ترین کڑی محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ آپ ﷺ ہی تاریخِ انسانی کے ایسے فردِ فرید اور گوہر یکتا ہیں جن کی خلوت وجلوت کے ہر پہلو کو انتہائی باریک بینی سے مشاہدے اور مطالعے کا موضوع بنایا گیا۔ صرف آپ ہی ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کے ہر پہلو کے مشاہدے اور مطالعے اور امت کے لیے اسے عام کرنے کی اجازت دی۔ کوئی دوسرا اس کی ہمت بھی نہیں کرسکتا۔

بعثت کے بعد جب آپ کی زندگی وسیع مشاہدے اور مطالعے کا موضوع بنی تو آپ کے شہر مکہ میں ایسے لوگوں کی

تعداد بہت کم تھی جن کا مشاہدہ محبت اور احترام پر مبنی تھا۔ یہ کم تعداد کے لوگ وہی تھے جن کا آپ سے انتہائی قریبی تعلق تھا، مثلاً: گھر میں پلنے والا چچیرا بھائی، مختلف دوست، بیوی اور گھر کے دیگر افراد جیسے بیٹیاں، خادم اور قریب سے جاننے والے چند ایسے افراد جن کا تعلق امیر و غریب، آقا اور غلام، مختلف طبقات اور مختلف خاندانوں سے تھا۔ مکہ شہر کی باقی آبادی بعثت کے بعد سخت ترین مخالفوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اب اس ساری آبادی کا مشاہدہ اور مطالعہ ناقدانہ بلکہ سخت مخاصمانہ تھا۔

قریب ترین لوگوں کی فریفتگی

بیوی، گھر کے افراد، خدام اور دوست انسان کی خوبیوں کو دیکھتے تو ہیں لیکن اس میں زیادہ تحسین اور اعجاب کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ زندگی کے معمولات کا حصہ اور روز کی بات ہوتی ہے۔ خامیوں اور کمزوریوں کا بھی مکمل علم ہوتا ہے، اس لیے یہ لوگ خوبیوں سے زیادہ مرعوب نہیں ہوتے۔ اگر کوئی ایسا شخص ہو جسے انتہائی قریب سے اچھی طرح جاننے والے اس سے والہانہ محبت کریں، ہر لمحے دل کی گہرائیوں سے اس کا بے انتہا احترام کریں تو اس کے کردار کی عظمت و رفعت میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا۔

خامیوں پر سب سے کڑی تنقیدی نظر بیوی ڈالتی ہے۔ اسے خامیوں کا بھی پتہ ہوتا ہے اور اچھے کاموں کے اصل مقاصد کا بھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازدواجی زندگی کے پہلے پچیس برس حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بسر کیے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کی شخصیت کی عظمت اور دلآویزی سے اس طرح متاثر ہوئیں کہ انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک آپ ﷺ کو اپنی والہانہ محبت اور خدمت کا مرکز بنائے رکھا۔ عین اس لمحے میں جب آپ زندگی کے اہم ترین موڑ پر کھڑے تھے اور طرح طرح کے خدشات کا شکار تھے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے آپ کی عظیم اخلاقی صفات اور ہمہ گیر خوبیوں کی شہادت دی اور ان کی بنا پر، مستقبل میں مزید رفعتوں اور عظمتوں کے حصول کا یقین دلایا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قریب ترین مشاہدے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو اخلاق و کردار کی بے مثال خوبیوں پر فائز دیکھا۔ انھیں آپ کے روشن اور منور کردار پر کبھی کسی گہن کا شائبہ تک نظر نہ آیا تھا۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بعد نو دس ازواجِ مطہرات نے آپ کی زندگی میں شامل ہو کر ہر اعتبار سے آپ ﷺ کو پرکھا۔ اللہ کی مشیت یہ تھی کہ ان ازواج میں شدید دشمنوں کی بیٹیوں، مختلف خاندانوں کی ذہین ترین خواتین اور پکے مشرک گھرانوں سے تعلق رکھنے والی بیبیوں کے ساتھ ساتھ بلند مرتبہ یہودی گھرانے کی صفیہ رضی اللہ عنہا اور مصر کے اعلیٰ

عیسائی طبقے سے تعلق رکھنے والی سیدہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں۔ الگ الگ معاشرتی اور مذہبی پس منظر، مختلف طرزِ فکر اور اپنی اپنی طرزِ زندگی کے سارے اختلافات کے باوجود وہ سب جس ایک نقطے پر پوری طرح متفق تھیں، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فکر و عمل اور کردار و گفتار کی دل نشینی تھی جس کی بدولت ان سب نے اپنی اپنی زندگی کو بعینہٖ آپ ہی کی زندگی کے سانچے میں ڈھال لیا۔ روز مرہ جس طرح آپ کو دیکھا تھا، اس کی خوشبو پوری دنیا میں پھیلانا انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ٹھہرالیا۔ سب دل و جان سے آپ ہی کے نمونۂ عمل کی اشاعت میں لگ گئیں۔

دنیا بھر میں کوئی اور ایسا خاندان نہیں ہوا جو اپنے سربراہ کے ساتھ اس طرح محبت کرتا ہو، اتنی شدت سے اس کی خوبیوں کا معترف اور شاہد ہو اور اس طرح اس طرزِ زندگی کو پوری دنیا میں عام کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ خانہ اور خدام نے کیا۔

یہی حال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کا تھا۔ ان میں مکہ اور بعدازاں مدینہ کے سلیم الفطرت انسانوں کے شانہ بشانہ فارس کے مجوسی خاندان کے سلمان، روم کے عیسائی صہیب، مدینے کے یہودی عبداللہ بن سلام، حبشہ کے غریب الدیار غلام بلال، تہامہ کے سردار طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہم غرض مختلف معاشروں، مذہبوں اور نسلوں سے تعلق رکھنے والے شامل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کا واضح نتیجہ یہ نکلا کہ یہ سب لوگ ایک ہی انداز میں آپ کے اسوۂ حسنہ کے جلال و جمال کے اسیر ہو گئے، اسی کو دل و جان سے اپنانے کی کوشش کی، خود کو اسی کے رنگ میں رنگ لیا اور اسی خوبصورت نمونۂ عمل کے داعی اور مبلغ بن گئے۔

دشمنوں کی تسخیر

وہ مذہبی مخالف جنھوں نے بعثت کے بعد شدید ترین عداوت و مخاصمت کا مظاہرہ کیا تھا، عرب کی تمام قوتوں کو اپنا حلیف بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو، آپ کے دین کو اور آپ کے پیروکاروں کو نیست و نابود کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، انھوں نے بھی دشمنی، مخاصمت اور جنگ و جدل کے مختلف مرحلوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کی عظمت اور انسانیت کے لیے آپ کی غیر مشروط اور غیر محدود خیر خواہی کے طلسم میں خود کو گرفتار پایا۔ ان کی بڑی اکثریت نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرح صرف اور صرف اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر یکے بعد دیگرے شفقت و رحمت اور خیر و برکت کے اسی دروازے کی چوکھٹ سے وابستگی اختیار کر لی۔

ابوجہل اپنی دشمنی کے عروج میں مارا گیا۔ اس کا بیٹا عکرمہ (رضی اللہ عنہ)، اسی کی طرح کا دشمن، فتحِ مکہ کے دن سخت شرارت پر آمادہ ہوا۔ مخاصمت اور نفرت کی شدت میں عرب کی سرزمین چھوڑ کر یمن کی طرف بھاگ گیا۔ اسے گرفتار

کرنے کے لیے کوئی دستہ نہ بھیجا گیا۔ وہ خود ہی آپ کے عفو وحلم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا کشاں کشاں حاضر ہوا، حلقہ بگوش اسلام ہوا اور آپ کے لائے ہوئے دین کی سربلندی کے لیے جان قربان کر دی۔[1]

یہ کیفیت صرف عکرمہ رضی اللہ عنہ کی نہ تھی بلکہ ہر اس شخص کی ہوئی جو پہلے سخت دشمنی میں مبتلا تھا، پھر گرویدۂ فضل و کمال ہو کر، یا بے بس ہو کر، جس صورت سے بھی آپ کے قریب آیا، وہ آپ کی خوبیوں کا اسیر ہو گیا۔

بیرونِ عرب کے مفتوحینِ نبوت

عرب سے باہر کے مفتوحین کا بھی یہی حال ہوا۔ سابقہ متمدن سلطنتوں کے باشندے اسلام سے پہلے اپنی اپنی سلطنتوں کی عظمت وحشمت کے قائل تھے۔ خوبی اور خرابی کے اپنے اپنے نمونے ان کے سامنے تھے۔ ان کی سلطنت کی ہر فتح انھیں فخر وانبساط کی کیفیت سے سرشار کرتی تھی اور ہر ناکامی کے بعد وہ اس ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کا عزم لے کر ازسرنو کمربستہ ہو جاتے تھے۔ وہ جن عربوں کو غیر متمدن، پسماندہ اور کمزور سمجھتے تھے، ان کی پیش قدمی کو پہلے انھوں نے جسارت سمجھا۔ انھیں عبرت ناک سزا دینی چاہی۔ پھر اپنی ناکامیوں اور ان کی پے در پے کامیابیوں سے وہ سب حیرت زدہ ہوئے، پھر ان پر بے بسی اور مرعوبیت طاری ہوئی، پھر جب اسلامی فتوحات سے مغلوب ہو گئے تو ان کے دل خوف کے ساتھ کینے اور مخاصمت سے بھی بھر گئے۔

انسانی تاریخ میں ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے کہ غالب مغلوبوں کو نشانِ عبرت بنا دیتے ہیں، لوٹ کر کنگال کر دیتے ہیں، عزت و ناموس کو پامال کر دیتے ہیں۔ لیکن تاریخِ اسلامی میں اس کے برعکس ہو رہا تھا۔ فاتحوں نے صدیوں کی لوٹ مار کے ذریعے سے بھرے ہوئے شاہی خزانوں کو رعایا میں تقسیم کر دیا۔ ان اموالِ طائلہ کے فوائد مفتوحین تک پہنچنے لگے۔ سابقہ بھاری ٹیکسوں کے بالمقابل بہت معمولی سا جزیہ تھا جو دفاعی فرائض سے چھوٹ کے عوض دینا پڑتا تھا۔ مفتوحین کو وہ تمام بنیادی انسانی حقوق حاصل ہو گئے جو خود فاتحوں کو حاصل تھے۔ انصاف کے پلڑے میں بھی سب یکساں اور برابر تھے۔ یہ زندگی کا نیا چلن اور حکومت کا نیا اسلوب تھا جس نے مفتوحوں کے دلوں میں ایک تجسس پیدا کر دیا۔

ان کو اپنے تجسس بھرے تمام سوالوں کا جواب یہ ملتا تھا کہ یہ سارا سبق اسی ایک ہستی کا سکھایا ہوا ہے جو پوری خلقت کے لیے رحیم وشفیق تھی۔ رنگ ونسل کی تمیز کے بغیر ہر انسان کی فلاح و بہبود اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اس نے اپنے لیے کچھ نہ چاہا۔ سب کو جسم اور روح کی آسودگیاں اور دنیا اور آخرت کی سچی خوشیاں بخشیں۔

[1] سنن النسائي :4072، البداية والنهاية :297/4.

ہر کسی کا ہاتھ پکڑ کر اسے یقینی کامیابیوں کی راہ پر چلانا اس کا مشن تھا۔ مفتوحوں نے یہ ساری باتیں اپنی آنکھوں کے سامنے پوری ہوتی دیکھیں۔ اسلام کا دامنِ رحمت سب کے لیے کھلا دیکھا۔ نیکی، عمل کی خوبی اور سچائی کو فاتح اور مفتوح دونوں کے لیے یکساں معیارِ عزت پایا۔ ہر اچھی جدوجہد کے مواقع سب کے لیے یکساں دیکھے تو وہ بھی تاریخ کے سب سے بڑے دیالو، سب سے بڑھ کر سچے اور سب سے زیادہ شفیق انسان کی محبت میں مبتلا اور اس کی عظمتوں، رفعتوں اور بے مثال خوبیوں کے اسیر ہو کر رہ گئے۔

مرقعِ جمال کے گرویدہ وفریفتہ

مخاصمت وعناد کے بعد جس طرح تجسس، استعجاب اور تحسین سے بھری لاکھوں نگاہوں نے آپ ﷺ کے کردار و عمل کے ہر پہلو کو پرکھا، اس کی بھی دنیا میں اور کوئی نظیر نہیں۔ آپ کی زندگی کا کوئی پہلو دیکھنے والوں کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھا۔ جلوت میں اگر دیکھنے اور پرکھنے والے دوست اور دشمن ہمہ وقت موجود رہتے تھے تو خلوتوں پر نظر رکھنے والی بیویوں نے بھی آپ کی حیاتِ مبارکہ کے ہر پہلو کو اچھی طرح کھنگالا۔ آپ نے خود اپنی زندگی کا کوئی پہلو چھپایا نہ دوستوں اور بیویوں سمیت کسی کو کوئی بات چھپانے کا حکم دیا۔ جس نے جو کچھ جس طرح دیکھا، اسے اسی طرح بیان کیا، کسی پر کوئی قدغن نہ تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ جس طرح خود دیکھ کر بیان کرنے والے اس مرقعِ جمال کے گرویدہ تھے، اسی طرح ان کے بیان کو سننے والوں نے بھی خود کو آپ کا والہ وشیفتہ پایا۔ حسن وخوبی کا ذوق رکھنے والے دنیا کے ہر انسان کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو غالب نے بیان کی ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازدان اپنا

جمال کا ہر گرویدہ دوسرے گرویدہ کو رقیب خیال کرتا ہے۔ خود کو محبت کرنے کا استحقاق دیتا ہے۔ دوسروں کے اس استحقاق کی نفی کرتا ہے۔ یہاں معاملہ ایسا ہے کہ عقل حیرت واستعجاب میں گم ہے۔ ان سب کی کیفیت یہ ہوگئی کہ ؎

الگ ہے وضع مرے عشق کی زمانے سے
سبھی کو محوِ رخِ یار چاہتا ہوں میں

یہاں صدیوں پر صدیاں گزر رہی ہیں۔ ہر دور میں ایک خلقت ہے جو دل وجان سے اس پیکرِ عظمت وخوبی پر فریفتہ ہے اور زندگی میں یہی مقصد رکھتی ہے کہ دنیا کا ہر انسان اسی کا والہ وشیفتہ بن جائے۔

شانِ رسالت کی لذتِ بیان

ایسے پیکرِ خوبی و جمال کی رعنائیوں کے بیان سے کون پیچھے رہنا چاہے گا۔ آپ ﷺ کے ہزاروں ساتھیوں نے آپ کی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی خوبی اور حسن کو بیان کیا۔ ان سے سننے والوں کی کوشش یہ رہی کہ وہ زیادہ سے زیادہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ دل پذیر بیان سنیں۔ بہت سوں نے اس بیان اور اس کی طلب کے لیے خود کو وقف کر دیا۔ ہر نسل میں لاکھوں انسانوں نے اس بیان کو حرزِ جان بنایا، اسے آگے پہنچایا اور اسے لکھ لکھ کر محفوظ کیا۔ دنیا کی ایک بھی ہستی ایسی نہیں جس کے اعمال واقوال، خصائل و شمائل اور عادات وفضائل کی تفصیلات کو ہر دور میں اتنے زیادہ لوگوں نے بیان کیا ہو، تحریر و کتابت، تالیف و تدوین اور تعلیم و تدریس کا موضوع بنایا ہو۔

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کا مشاہدہ کسی بھی دوسرے انسان کی زندگی کے مشاہدے کی طرح نہ تھا۔ آپ مجسمۂ فضائل تو تھے ہی لیکن سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے ظروف و احوال کے مطابق اللہ کا کلام نازل ہوتا تھا اور آپ کا عمل انتہائی خوبصورتی سے اس کے مطابق ڈھل جاتا تھا۔ وہی عمل تھا جو تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کا ضامن تھا۔ مطالعہ کرنے والوں کی نگاہیں قرآنِ مجید کی رہنمائی اور محمد رسول اللہ ﷺ کے عمل و کردار میں کوئی مغایرت تلاش نہ کر سکتی تھیں۔ قرآن اور رسول اللہ ﷺ کا عمل، ایک ہی سچائی اور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو تھے۔ دونوں کا تعلق اصول اور عمل، تھیوری (نظریے) اور پریکٹیکل (عمل) کا تھا۔ آپ کے ساتھی آپ کی زبانِ مبارک سے اللہ کا کلام سنتے تھے اور آپ کے اسوۂ حسنہ میں اس کا عملی نمونہ اپنی آنکھوں کے سامنے پاتے تھے۔ یہ کردار کے ایسے جمال اور صفات کی ایسی خوبصورتی کا مشاہدہ تھا جس کی کوئی نظیر نہ کبھی پائی گئی تھی نہ پائی جا سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں جیسی وارفتگی، محبت، وفاداری اور فریفتگی کی مثال دنیا کی تاریخ میں کوئی فرد یا کوئی گروہ پیش کر سکا نہ ان جیسے واضح، مکمل، خوبصورت اور دلنشیں بیان ہی پر کوئی دوسرا قادر ہو سکا۔

ام معبد اور حسان رضی اللہ عنہما کی مداحی

صحابہ کے بیان میں تطویل اور اطناب کہیں نظر نہیں آتے۔ انھوں نے جو دیکھا، بعینہٖ اسی طرح بیان کر دیا۔ ان کے بیان میں اوروں کی طرح لفظوں کی بھرمار خوبصورتی کا حجاب نہیں بنتی۔ خوبی اپنی جگہ اتنی کامل ہے کہ مبالغہ آرائی بجائے خود تنقیص وتوہین کے زمرے میں آجاتی ہے۔ بیان میں تکلف کی ضرورت نہیں کیونکہ جمال دل

میں جاگزیں ہو کر خود بخود لفظوں میں ڈھلتا اور خود بخود زبان سے ادا ہوتا ہے۔ ام معبد نے بغیر کسی تکلف کے آپ ﷺ کی شخصیت اور کردار کی خوبصورتی کو بیان کیا۔ یہ اسی خوبصورتی کا کمال تھا کہ اس بدو خاتون کے سیدھے سادے لفظ موتیوں سے زیادہ آب دار ہو گئے۔ صدیاں گزر گئیں، ام معبد کے بیان کی دل کشی آج بھی پہلے دن کی طرح دلوں کی دنیا الٹ پلٹ دیتی ہے۔ بڑے سے بڑا عالم اور ادیب خود کو اس کے سحر کے آگے دم بخود پاتا ہے اور ایک سادہ دل دیہی باشندہ بھی اس کی رعنائیوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ راز سب سے پہلے خوش نصیب حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کھولا جنھوں نے آپ ﷺ کی زندگی ہی میں اپنے آپ کو آپ کی مدح کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کا ایک شعر مدح کے بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے:

مَا إِنْ مَدَحْتُ مُحَمَّدًا بِمَقَالَتِي لٰكِنْ مَدَحْتُ مَقَالَتِي بِمُحَمَّدٍ

''میں نے اپنے کلام سے محمد ﷺ کی مدح نہیں کی بلکہ محمد ﷺ کے ذکر سے میں نے اپنا کلام قابلِ مدح بنایا ہے۔''

جمالِ عبدیت

اخلاق و خصائل نبوی کا جمال دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتا ہے لیکن اس سے بھی بہت اونچا ''جمالِ عبدیت'' ہے۔ اخلاق و فضائل کا تعلق اس رشتے سے ہے جو نبی اکرم ﷺ اور باقی انسانوں کے درمیان تھا جبکہ عبدیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ رشتے کا نام ہے۔ جمالِ عبدیت کا عالم یہ تھا کہ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا جیسی فصیح اللسان سے سوال ہوتا ہے:

كَيْفَ كَانَتْ صَلَاةُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فِي رَمَضَانَ؟

''رمضان میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کیسی ہوتی تھی؟''

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا گیارہ رکعتوں کی تعداد بتاتے ہوئے کہتی ہیں:

فَلَا تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ

''ان کی خوبصورتی اور طوالت کے بارے میں کچھ مت پوچھو۔''[1]

اس لیے کہ وہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔

[1] صحيح البخاري: 1147، صحيح مسلم: 738.

یہ جمالِ عبادت تھا جس کا مشاہدہ کرنے اور اسے اپنا لینے کا باقاعدہ حکم صادر ہوا:

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»

''اسی طرح نماز ادا کرو جس طرح تم نے مجھے نماز ادا کرتے دیکھا ہے۔'' [1]

اور «خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ»

''اپنے حج کے طریقے مجھ سے سیکھ لو۔'' [2]

اس جمال کا مشاہدہ کرنے والوں کی اپنی حالت دیدنی تھی:

﴿وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا ۝﴾

''اور یہ کہ جب کھڑا ہوا اللہ کا بندہ (محمد ﷺ) اس کو پکارتا ہوا تو قریب تھا کہ وہ اس پر انبوہ در انبوہ (جمع) ہو جائیں۔'' [3]

غزوات اور جہاد و قتال

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سب سے زیادہ باریک بینی سے حیاتِ طیبہ کے جس عملی پہلو کا مطالعہ کیا، وہ عبادات تھیں۔ اس کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اس جدوجہد کی تھی جو آپ ﷺ کو دعوتِ دین کے تحفظ اور غلبۂ اسلام کے لیے جنگوں کے میدان میں کرنی پڑی، پھر معاملات، پھر اخلاق و آداب، پھر فضائلِ اعمال تھے۔ اسلامی تربیت کے لیے ترجیحات کی ترتیب بھی یہی بنتی ہے۔ انھی موضوعات کی ہر مسلمان مرد، عورت، بچے، جوان اور بوڑھے کے لیے ضرورت تھی اور ہے۔ تقریباً یہی وہ ترتیب ہے جسے ابتدائی جمع و تدوین کے بعد محدثین اور فقہاء نے اپنایا۔ ان میں سے غزوات کا معاملہ باقی موضوعات سے کسی حد تک مختلف ہے۔

غزوات میں بھی مرکزی کردار رسول اللہ ﷺ ہی کا تھا۔ قائد و سالار ہی نہیں شجاعت و ثبات کا قابلِ اتباع نمونہ بھی آپ ہی تھے۔ معرکوں کی شدت میں بڑے بڑے بہادر آپ ﷺ ہی کے پیچھے پناہ لیتے تھے۔ جیسے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما نے اعتراف کیا ہے:

كُنَّا وَاللَّهِ! إِذَا احْمَرَّ الْبَأْسُ نَتَّقِي بِهِ، وَإِنَّ الشُّجَاعَ مِنَّا لَلَّذِي يُحَاذِي بِهِ، يَعْنِي النَّبِيَّ ﷺ.

''ہم، اللہ کی قسم! جب معرکہ گرم ہوتا تو آپ ﷺ کے پیچھے پناہ لیتے، اور ہم میں سے بہادر وہی ہوتا جو

[1] صحيح البخاري: 631. [2] صحيح مسلم: 1297، السنن الكبرى للبيهقي: 125/5 واللفظ له. [3] الجنّ 19:72.

آپ ﷺ کا ساتھ دے سکتا۔" [1]

جہاد اور لڑائی کے تمام معاملات میں نمونۂ عمل رسول اللہ ﷺ تھے۔ تمام بڑے فیصلے بھی آپ ہی کرتے تھے۔ جہاں مشورے کی ضرورت ہوتی، وہاں آپ مشورہ بھی طلب کرتے تھے۔

جہاد و قتال کے حوالے سے یہ سارے فیصلے آئندہ امت کے لیے اجتہاد و استنباط کی بنیاد ہیں۔ وہ ساری روایات جن سے احکام کا استنباط ہوسکتا ہے، ان کی سب سے زیادہ ضرورت محدثین اور فقہاء اور ان کے بعد مفسرین کو تھی اور انھی کی کتابوں میں ان کو جگہ ملی۔

لیکن رسول اللہ ﷺ کی معیت میں میدانِ قتال میں بہادری کے جوہر دکھانے والے جاں نثاروں نے بھی آپ کے اتباع میں آپ کے ساتھ مل کر شجاعت وتہور اور عزیمت و جاں نثاری کی غیر معمولی داستانیں رقم کی تھیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے یہ کارنامے اللہ، اس کے رسول ﷺ اور پوری امت کے سامنے سرمایۂ افتخار تھے۔ آپ کے ساتھ جہاد میں شرکت کرنے والوں نے جو کیا، وہ بھی عظیم تھا۔ جاں نثاری کا جو طریقہ اپنایا، وہ بھی بے مثل تھا۔ اسی طرح اپنے احساسات کو جس طرح اشعار کے قالب میں ڈھالا، وہ بھی دنیا کی رزمیہ شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔

دنیا بھر کا رزمیہ ادب مبالغے، شیخی، سخن آرائی حتی کہ جھوٹ سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے برعکس جہاد و غزوات کے دوران میں کی گئی شاعری مبالغے سے پاک، دل کے سچے جذبات کی ترجمان، پیش آنے والے واقعات کے سچے بیان پر مبنی اور جنگ کی حقیقی کیفیتوں کی صحیح آئینہ دار ہے۔ غزوات و جہاد میں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے کارناموں کا بیان، رزمیہ شاعری سمیت، تاریخ کا سرمایہ تھا جس کی نئی نسل کے مُربیوں کو ضرورت تھی۔ جس طرح غزوات و جہاد کے حوالے سے صحابہ کی ان روایات کو، جن سے احکامِ جہاد اخذ کیے جا سکتے ہیں، محدثین، فقہاء اور مفسرین نے اپنی ضرورتوں کے لیے استعمال کیا، اسی طرح صحابہ کے عظیم الشان کارناموں اور ان سے متعلقہ اشعار کو مؤرخوں اور سیرت نگاروں نے زیادہ سے زیادہ تفصیلات سمیت اپنی ضرورت اور اپنے نقطۂ نظر سے اکٹھا کیا۔ فقہ اور سیرت و تاریخ دونوں محاذوں پر کام کرنے والے بنیادی طور پر محدثین ہی تھے۔ محدثین ہی نے ہر ضرورت کے لیے اور ہر عنوان سے احادیث و روایات جمع کیں، پھر حسبِ ضرورت الگ الگ انداز میں الگ الگ عناوین کے تحت ان کو مرتب کیا۔

علمِ حدیث کی تدوین و ترتیب اپنے طور پر ارتقائی مراحل سے گزرتی رہی اور غزوات اور متعلقہ امور کی جمع و تدوین

[1] صحیح مسلم: (79)-1776.

کا سلسلہ مستقل طور پر بھی جاری رہا۔ جنگیں زیادہ تر مدینے سے باہر نکل کر کی گئیں۔ طویل اور پُر صعوبت سفر جہاد ہی کا حصہ تھے، اس لیے غزوات کے دوران میں میدانِ جنگ میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات واحوال کے علاوہ جہاد کی غرض سے کیے جانے والے سفر اور ان کے دوران میں پیش آنے والے واقعات بھی پوری روئیداد کا لازمی حصہ تھے۔ جہاد کا بیان سفر سے شروع ہوتا اور سفر ہی پر ختم ہوتا تھا۔

سیرت کا مفہوم

''سیرۃ'' کا مادہ ''س ی ر'' (سیر) ہے جس کے معنی چلنے اور فاصلہ طے کرنے کے ہیں۔ سیرۃ کی جمع سِیَر ہے۔ اوائلِ اسلام میں لفظ سِیَر کا اطلاق رسول اللہ ﷺ کے ان سفروں پر ہوا جو زیادہ تر غزوات کے لیے کیے جاتے تھے۔ چونکہ سفر اور غزوات ان دونوں کے احوال اکٹھے مدون کیے جاتے، اس لیے انھیں ملا کر ان پر ''مغازی و سِیَر'' کا اطلاق کیا جاتا تھا اور اس عنوان کے تحت آپ ﷺ کے غزوات اور ان کے لیے اختیار کردہ سفروں کا حال بیان کیا جاتا تھا۔

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ وہ روایات بھی جن کا تعلق نبی ﷺ کے مغازی اور سیر سے تھا، اپنی جگہ بہت سے اہم امور کے لیے اجتہاد و استنباط کی بنیاد تھیں۔ مؤرخین کے علاوہ فقہاء نے ''سِیَر'' کے نام سے جو کتابیں لکھیں، ان کا موضوع جہاد، غزوات اور ان کے متعلقہ امور کے احکام و مسائل تھے۔ ان کی مثالیں السير للأوزاعي (م 157ھ) اور كتاب السير الصغير اور كتاب السير الكبير لمحمد بن حسن الشيباني (م189ھ) ہیں۔ ان کتابوں کو ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے بجا طور پر بین الاقوامی قانون کی کتابیں بھی قرار دیا ہے۔[1]

مؤرخین نے غزوات و سیر کے نام سے جو کتابیں لکھیں، ان کے محتویات میں بتدریج توسیع ہوتی گئی۔ مغازی کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہے گئے اشعار، آپ ﷺ کے تمام شخصی اور خاندانی حالات، رشتے، بعثت سے پہلے پیش آمدہ واقعات اور بعدازاں آپ کے فضائل و خصائل اور عادات و شمائل سب سیرت کے موضوع میں شامل ہوتے گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ لفظِ سیرت کے مفہوم میں بجائے خود اتنی وسعت موجود ہے کہ مذکورہ بالا سب امور بلکہ ان سے مستنبط احکام اور ان کے تجزیے سے حاصل ہونے والے اسباق سب اس کے محتویات میں شامل ہو سکتے ہیں۔

[1] خطبات بہاول پور، خطبہ: 5، ص: 164-166، نیز دیکھیے: صحيح البخاري، كتاب الجهاد والسير، وصحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير. امام بخاری نے جنگوں کے حالات اور ان کے دوران میں پیش آنے والے واقعات كتاب المغازي میں پیش کیے ہیں۔

لفظ سیرۃ، سَارَ یَسِیرُ سے اسم ہے۔ اس کا اردو مترادف ''چال ڈھال'' ہے۔ ''چال ڈھال'' کے لفظوں سے ذہن میں ہیئت اور حالت کا تصور ابھرتا ہے۔ قرآن کریم میں ''سیرۃ'' کا لفظ بالکل انھی معانی میں استعمال ہوا ہے۔ کوہِ طور پر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے سانپ کی شکل اختیار کر لی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا:

﴿ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ ﴾

''اسے پکڑ لو اور ڈرو نہیں، عنقریب ہم اسے اس کی پہلی ہیئت پر لوٹا دیں گے۔''[1]

چونکہ ''سیرۃ'' کی جمع ''سِیَر'' ہے، اس لیے سِیَر کے معنی ''احوال'' ہی کے ہیں۔

سِیَر و مغازی کی تدوین اور ارتقا

رسول اللہ ﷺ کے احوالِ سفر کے بیان سے لے کر وسیع ترین معنی میں آپ کی سیرت کی تدوین و تالیف اور اس کے ارتقا کا جائزہ اپنی جگہ بہت دلچسپ اور علمی اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔ اسلامی تاریخ کے اولین دور سے لے کر عہد بعہد جن خوش قسمت انسانوں نے خود کو رسول اللہ ﷺ کے احوال و اقوال اور شمائل و خصائل کے بیان کے لیے وقف کیا، مطالعۂ سیرت سے پہلے ان کے کارناموں پر ایک سرسری نگاہ بھی قاری کے لیے بے شمار علمی فوائد اور معنوی اعتبار سے ایک انوکھے لطف کا باعث ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں امت کے لیے رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور حدیث کی اہمیت کتنی تھی اور یہ بھی کہ علمائے اسلام نے صحیح سیرت کی ترتیب و تدوین کے لیے کس قدر اہتمام کیا۔

سِیَر و مغازی کے عینی شاہد

بحیثیتِ نبی و رسول محمد ﷺ کی شخصیت کے بنیادی خد و خال خود قرآنِ مجید کے مطالعے سے واضح ہو جاتے ہیں۔ لیکن آپ کے مغازی اور سیر کی تفصیلات کا اہم ماخذ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بیانات ہیں جو بذاتِ خود رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ان مغازی میں شریک رہے۔ کتبِ صحاح و سنن میں نبی ﷺ کے غزوات کے زیادہ تر احوال حضرت علی، حضرت عباس، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوموسیٰ اشعری، حضرت ابوقتادہ، حضرت سلمہ بن اکوع وغیرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے غزوۂ حنین کے بہت سے واقعات روایت کیے گئے ہیں۔ صحیح مسلم اور سنن ابی داود میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ

[1] طٰہٰ 21:20.

سے حدیبیہ کے سفر اور باقی احوال کے بارے میں مفصل معلومات مروی ہیں۔ اسی طرح غزوۂ ذی قرد اور خیبر کے بارے میں ان کی روایات بیانیہ انداز کی اور بہت مفصل ہیں۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے جنگِ احد کے واقعات بیان فرمائے۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے جنگِ خندق کے واقعات مروی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی غزوات کے مفصل احوال روایت کیے گئے۔ بعض غزوات کی وہ ایک طرح سے خود شاہد تھیں، مثلاً: غزوۂ احد کی جس میں انھوں نے ابتدائی طبی امداد اور پانی پلانے کی خدمات سرانجام دیتے ہوئے شرکت کی۔[1] صحیح بخاری میں ان سے جنگِ احد کی تفصیلات روایت ہوئیں۔[2]

ان کے بعد نوجوان صحابہ آتے ہیں۔ ان میں عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن عاص، انس بن مالک، براء بن عازب، عبداللہ بن زبیر اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی بہت سی تفصیلات مروی ہیں۔ وہ خیبر کے موقع پر مسلمان ہوئے اور بعد کی مہمات میں شامل رہے۔ بہت سی جنگوں کے احوال انھوں نے ساتھی صحابہ سے حاصل کیے۔ دوسرے نوجوان صحابہ نے بھی بعض جنگوں کی تفصیلات براہ راست ان صحابہ سے سن کر روایت کیں جو ان میں شریک تھے۔ بعض کے اپنے بزرگ غزوات میں شریک تھے۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کے علاوہ دیگر شرکاء سے بھی تفصیلات سنیں۔ ان میں سے بعض نوجوان صحابہ آخری دور کے غزوات میں خود شریک ہوئے۔ انس بن مالک، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم غزوات کے احوال روایت کرنے میں دوسرے نوجوان صحابہ کی نسبت زیادہ آگے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم کی حیثیت سے جنگِ بدر میں بھی آپ کے ساتھ تھے لیکن کم عمری کی وجہ سے انھیں قتال میں شریک نہیں کیا گیا۔ غزوۂ اُحد کے بھی وہ عینی شاہد تھے۔ ان کے فرزند موسیٰ بن انس رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے (بعدازاں) آٹھ غزوات میں شرکت کی۔[3] انھوں نے مختلف جنگوں کی بیش از بیش تفصیلات روایت کی ہیں۔ ان میں سے کچھ تفصیلات انھوں نے دوسرے صحابہ سے لی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سب سے پہلے غزوۂ خندق میں شریک ہوئے۔ پھر بیعتِ رضوان سمیت بعد کی جنگوں میں شامل رہے۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں وہ شام، عراق، بصرہ، فارس اور مصر کے جہاد میں شریک ہوئے۔ خندق سے پہلے کے غزوات کی معلومات انھوں نے اپنے والد اور دیگر بزرگوں سے سن کر بیان کیں۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو اس امت کے حبر (بہت بڑے عالم) ہیں، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی

[1] صحیح البخاري :4064. [2] صحیح البخاري :4065 و4077. [3] الإصابة :276/1.

احادیث، آپ کی حیاتِ مبارکہ کے واقعات اور آپ کے غزوات کے حالات بیان کیے ہیں، حالانکہ صحیح ترین روایات کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے وقت ان کی عمر پندرہ برس تھی۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ فتحِ مکہ والے سال تک وہ اپنے خاندان کے ساتھ مکہ ہی میں مقیم رہے، اسی سال مدینہ آئے۔ آیت: ﴿ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ ﴾ ''مگر وہ مرد، عورتیں اور بچے جو بے بس ہوں ......''[1] کی تفسیر کرتے ہوئے وہ خود کہتے ہیں:

كُنْتُ أَنَا وَأُمِّي مِنَ الْمُسْتَضْعَفِينَ: أَنَا مِنَ الْوِلْدَانِ وَأُمِّي مِنَ النِّسَاءِ.

''میں اور میری والدہ ان میں سے تھے جنھیں ضعیف سمجھا جاتا تھا (جو لوگ کمزوری اور بے چارگی کے عالم میں کافروں کے درمیان رہنے پر مجبور تھے)۔ میں بچوں میں سے اور میری والدہ عورتوں میں سے تھیں۔''[2]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے غزوات اور رسول اللہ ﷺ کے سوانحِ حیات کے ضمن میں جو کچھ روایت کیا ہے، وہ انھوں نے، انتہائی رغبت اور شوق سے، بزرگ صحابہ سے اخذ کیا تھا۔ وہ اپنے شغف کے حوالے سے خود فرماتے ہیں:

''جب رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے تو میں نے ایک انصاری سے کہا: آؤ اللہ کے رسول ﷺ کے صحابہ سے (آپ ﷺ کے اقوال و احوال کے بارے میں) پوچھیں، آج ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ وہ کہنے لگے: فرزندِ عباس! تمھارا حال عجیب ہے! تم سمجھتے ہو کہ لوگوں کو تمھاری ضرورت ہے جبکہ لوگوں میں اللہ کے رسول ﷺ کے وہ سب صحابہ موجود ہیں جنھیں تم دیکھ رہے ہو؟ چنانچہ میں نے انھیں نظر انداز کر دیا اور حصولِ علم میں لگ گیا۔ جب مجھے کسی شخص کی روایت کردہ حدیث کا پتہ چلتا تو میں اس کے ہاں حاضری دیتا۔ اگر وہ دوپہر کی نیند میں ہوتا، میں کمر اور گھٹنوں کے گرد چادر باندھ کر اس کے سہارے بیٹھ جاتا اور ہوا مجھ پر گرد پھینکتی رہتی۔ وہ باہر آتا، مجھے دیکھتا اور کہتا: اے رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد! آپ کس غرض سے آئے ہیں؟ آپ مجھے پیغام بھیجتے تو میں آپ کے ہاں چلا آتا۔ میں کہتا: نہیں، میں زیادہ حق رکھتا ہوں کہ میں آپ کے پاس آؤں۔ پس میں ان سے (رسول اللہ ﷺ کی) حدیث کے بارے میں سوال کرتا۔ وہ انصاری (جنھیں میں نے حصولِ علم میں اپنا ساتھ دینے کو کہا تھا) زندہ رہے حتی کہ (ایک وقت آیا جب)

[1] النسآء 4:98. [2] صحيح البخاري: 1357 و 4597، تفسير الطبري، النسآء 4:98.

انھوں نے دیکھا کہ میرے ارد گرد لوگوں (طالبانِ حدیث) کا مجمع لگا ہوا ہے اور وہ مجھ سے سوال کر رہے ہیں۔ اس وقت انھوں نے کہا: یہ جوان مجھ سے زیادہ عقل مند نکلا۔''[1]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کی نوجوان نسل اور پھر ان کے شاگرد جس علم کے طلبگار تھے اور جسے وہ آگے روایت کرتے تھے، وہ رسول اللہ ﷺ کی باتیں اور آپ ہی کے اقوال و احوال تھے۔ سیرت اور اس سے متعلقہ معلومات ابتدا ہی سے علم کا انتہائی اہم حصہ تھیں اور عہد بعہد ان کی اہمیت میں اضافہ ہوتا رہا۔

معروف تابعی، عکرمہ رحمہ اللہ کی روایت ہے کہ ''ابن عباس رضی اللہ عنہما علم کا سمندر تھے، کوئی (علمی) معاملہ ان کے لیے مشقت کا باعث نہ ہوتا تھا۔''[2]

ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ خود رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں دعا کی تھی:

«اَللّٰهُمَّ! عَلِّمْهُ الْكِتَابَ»

''اے اللہ! اسے قرآن مجید کا علم عطا کر دے۔''[3]

اور «اَللّٰهُمَّ! عَلِّمْهُ الْحِكْمَةَ»

''اے اللہ! اسے حکمت سکھا دے۔''[4]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے جن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اخذ کیا، ان میں حضرات عمر، علی، معاذ، عباس بن عبدالمطلب، عبدالرحمن بن عوف، ابوسفیان صخر بن حرب، ابو ذر، ابی بن کعب اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے علاوہ بھی بہت سے صحابۂ کرام شامل ہیں۔ آگے جلیل القدر تابعین کی بہت بڑی جماعت ان کی شاگرد ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی زندگی میں لوگ ان کی مرویات لکھ لیتے تھے اور دوسرے ان سے نقل کرتے تھے۔ یہ بھی ہوتا کہ بعض ناقلین بعد ازاں موقع تلاش کر کے ان لکھی ہوئی احادیث کی توثیق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کروا لیتے۔

جب ابن عباس رضی اللہ عنہما نابینا ہو گئے تو ان کے پاس طائف کے اصحابِ علم حاضر ہوئے۔ وہ ان کی روایات لکھی ہوئی صورت میں اپنے ساتھ لائے اور براہِ راست آپ سے ان احادیث کے سماع کا مطالبہ کیا۔ آپ نے احادیث بیان کرنی شروع کیں تو ان کی ترتیب لکھی ہوئی کتابوں سے مختلف تھی، ان کے لیے آپ کو اپنی سنائی ہوئی احادیث

---

[1] الطبقات لابن سعد: 368,367/2، المستدرك للحاكم: 107,106/1، امام ذہبی نے اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ [2] سیر أعلام النبلاء: 354/3. [3] صحیح البخاري: 75. [4] صحیح البخاري: 3756.

مقدم اور مؤخر کرنا پڑ رہی تھیں۔ آپ نے یہ حال دیکھا تو فرمایا: میں اپنی اس مصیبت سے حیران و پریشان ہو گیا ہوں۔ جس کے پاس میرا علم (میری بیان کردہ احادیث کا ذخیرہ) ہے، وہ خود پڑھے۔ میرا اقرار اس کے لیے اس بات کے مترادف ہو گا کہ میں نے اسے حدیث سنائی ہے۔ حاضر ہونے والوں نے اس کے مطابق آپ کے سامنے قراءت کی۔ [1]

حضرت براء بن عازب انصاری رضی اللہ عنہما بھی ایک نوعمر صحابی تھے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ہمجولی تھے۔ دونوں کو کم سنی کی بنا پر جنگِ بدر میں شمولیت کی اجازت نہ ملی تھی۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں شامل نہ ہو سکے لیکن شرکاء سے ان کی حاصل کردہ تفصیلات اور اس جنگ کے حیران کر دینے والے امور کی طرف ان کی توجہ ان کی علمی جستجو کی دلیل ہے۔ بدر کے حوالے سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کی روایات اپنی صحیح میں شامل کیں۔ غزوۂ احد میں وہ شامل ہوئے اور اس کے متعدد وقائع بیان کیے جو صحیح بخاری میں مروی ہیں۔ اسی طرح عمرۃ القضاء کے سفر اور مناسکِ حج کی تفصیلات بخاری اور مسلم دونوں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما کے حوالے سے روایت کی ہیں۔ ان روایات میں ضمناً معاہدۂ حدیبیہ کی بہت سی تفصیلات بھی آ گئی ہیں۔ اسی طرح بخاری، مسلم، ترمذی اور ابو داود رحمہم اللہ نے ابو اسحاق السبیعی کے واسطے سے غزوۂ حنین کی کئی تفصیلات حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہیں۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے یمن کے مختلف علاقوں میں حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما کی جنگی مہمات کے حوالے سے بھی بعض واقعات براء بن عازب رضی اللہ عنہما کی وساطت سے روایت کیے ہیں۔ [2]

مجموعی طور پر حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما پندرہ غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔ [3] اور ان کی تفصیلات بیان کیں۔ ان کی کل روایات کی تعداد پانچ سو تین ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے خیبر کے موقع پر حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ [4] دوسرے صحابہ کے ساتھ ساتھ انھوں نے بھی خیبر اور بعد کے غزوات کے حالات بیان کیے۔ انھوں نے پہلے کی بعض جنگوں کے واقعات بھی تفصیل سے بیان کیے، مثلاً: انھوں نے جنگِ رجیع کا واقعہ اور اس کے دوران میں عاصم بن عمر بن خطاب کے نانا حضرت عاصم بن ثابت انصاری کی شہادت اور حضرت خبیب اور حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہما کی گرفتاری، پھر حضرت خبیب کی شہادت کے واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ [5] ان کے دل میں علم کی جستجو اور اس کے حصول کی خواہش اس قدر تھی کہ انھوں نے پہلے ایمان لانے والے صحابہ سے ان واقعات کی تفصیلات جمع کیں اور انھیں پوری ذمہ داری سے آگے

---

[1] سیر أعلام النبلاء: 3/355,354. [2] جامع الترمذي: 1704. [3] مسند أبي داود الطیالسي: 2/92، الطبقات لابن سعد: 4/368، اس کی سند صحیح ہے۔ [4] الاستیعاب لابن عبدالبر، ص: 852. [5] صحیح البخاري: 4086، سنن أبي داود: 2660.

روایت کیا۔ ان حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ عہدِ صحابہ بلکہ خود عہدِ نبوی میں نوجوانوں کے ہاں مغازی اور سِیَر کے واقعات کی تفصیلات جاننے، جمع کرنے، حفظ کرنے اور انھیں آگے بیان کرنے کا شوق کتنا فراواں تھا۔

سیرت نبوی پر اولین صحیفے

انتہائی نوعمر صحابہ میں، جنھیں دیگر احادیث کے ساتھ مغازی اور سِیَر کی روایات سے خصوصی شغف تھا، حضرت سہل بن ابی حثمہ (ولادت 3 ہجری) اور حضرت سعید بن سعد بن عبادہ خزرجی رضی اللہ عنہم نمایاں ہیں۔ ان دونوں نے مغازی اور سیر میں لکھے ہوئے صحیفے بھی چھوڑے جن سے بعد کے مصنفین امام احمد، طبری، بلاذری رحمہم اللہ وغیرہ نے استفادہ کیا۔

تابعین اور سِیَر و مغازی کی تعلیم و تالیف

عہدِ نبوی کے بعد کم عمر صحابہ کے ساتھ ساتھ تابعین نے بھی اس جستجو کو آگے بڑھایا۔ انھوں نے حدیث و سنن کے علاوہ مغازی میں بھی صحابہ کرام کی مرویات کو خود قلمبند کیا۔ یہ لوگ حفظ کے ساتھ کتابت سے بھی کام لیتے تھے، اس لیے انتہائی معتبر تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے رسول اللہ ﷺ کے فتحِ مکہ کے سفر کی تفصیلات حضرت عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کی روایت سے پیش کی ہیں۔[1] حضرت عروہ رحمہ اللہ 23 ہجری میں پیدا ہوئے۔[2]

امام مسلم نے فتح مکہ کی بعض تفصیلات عبداللہ بن رباح رحمہ اللہ کی روایت سے بیان کیں جو انھوں نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حاصل کی تھیں۔[3]

- سعید بن مسیّب مخزومی رحمہ اللہ (م 94ھ) معروف تابعی، محدث اور فقیہ تھے۔ انھوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اور فتوحات کے بارے میں تحریری سرمایہ چھوڑا۔ اس کا بیشتر حصہ، بعد ازاں امام طبری نے اپنی تاریخ میں شامل کیا۔
- ابان بن عثمان بن عفان رحمہ اللہ (م 101ھ) سے امام مالک نے غزوات کے حوالے سے روایات لیں۔ ان کی روایات کتب حدیث کے علاوہ طبقات ابن سعد، تاریخ طبری اور تاریخ یعقوبی میں محفوظ ہیں۔
- ابو فضالہ عبداللہ بن کعب بن مالک رحمہ اللہ (م 97ھ) سے اصحابِ مغازی میں سے ابن اسحاق اور طبری نے استفادہ کیا۔
- عامر بن شراحیل شعبی (م 103ھ) سے ابو اسحاق سبیعی، سعید بن مسروق ثوری، اعمش، قتادہ اور مجالد بن سعید رحمہم اللہ کے علاوہ ایک خلقت نے روایات بیان کیں۔

[1] صحيح البخاري: 4280. [2] سير أعلام النبلاء: 422/4. [3] صحيح مسلم: 1780.

- قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیق کی بیان کردہ روایات محدثین کی کتابوں کے علاوہ طبری، بلاذری، واقدی رحمہم اللہ وغیرہ مؤرخین کی تالیفات میں محفوظ ہیں۔
- وہب بن منبہ رحمہ اللہ (م 144ھ) کے صحیفۂ حدیث، جو ڈاکٹر حمید اللہ نے استنبول میں دریافت کیا، کے علاوہ ان کی مغازی کا بھی ایک حصہ جرمنی کے شہر ہائڈل برگ میں محفوظ ہے۔ ان کی روایات ابن اسحاق، ابن قتیبہ، مسعودی، مقدسی اور طبری وغیرہم کی تالیفات میں محفوظ ہیں۔

دوسری صدی ہجری کے آغاز تک فن مغازی و سیر اہلِ علم تابعین کے ہاتھوں نکھر کر اور زیادہ مرتب صورت میں سامنے آیا اور آئندہ نسل کی تعلیم و تربیت کا حصہ بنا۔ وہب بن منبہ رحمہ اللہ کی طرح اس دور میں اور بہت سے تابعین تھے جو عمر میں ان سے کم تھے، انھوں نے احادیث و سنن کے ساتھ مغازی اور سیر میں بھی تخصص حاصل کیا۔ ان تابعین نے اس موضوع پر مختلف صحابہ اور بزرگ تابعین کی روایات جمع کر کے مرتب کیں۔ ان میں سے اکثر نے اس فن میں مستقل کتابیں بھی تالیف کیں۔

- تابعین کے اس طبقے میں عاصم بن عمر بن قتادہ رحمہ اللہ بہت اہم ہیں۔ عاصم معروف صحابی حضرت قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے۔ ان کی دادی حضرت رُمیثہ، جن سے انھوں نے روایات حاصل کیں، صحابیہ تھیں رضی اللہ عنہا۔ اپنی دادی کے علاوہ انھوں نے حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے، جو غزوات میں خصوصی شغف رکھتے تھے، روایات جمع کیں۔ بکر بن اشج، ابن عجلان اور ابن اسحاق رحمہم اللہ جیسے لوگ ان کے شاگرد تھے۔ ابنِ اسحاق نے یہود کے ایمان لانے کا واقعہ اپنی کتاب میں انھی سے نقل کیا ہے۔ غزوات میں ان کی مہارت کی وجہ سے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ان کو جامع مسجد دمشق میں مغازی اور مناقب کے درس کے لیے مامور کیا۔
- اس دور کی ایک اور بڑی شخصیت امام محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن شہاب زہری قرشی رحمہ اللہ ہیں۔ وہ 50ھ میں پیدا ہوئے اور 124ھ میں وفات پائی۔ امام زہری نے حضرات ابن عمر، سہل بن سعد، انس بن مالک، سائب بن یزید، عبد اللہ بن ثعلبہ بن صُعَیر اور محمود بن ربیع رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا۔ انھوں نے بزرگ تابعی سعید بن مسیب رحمہ اللہ کے ساتھ بھی آٹھ سال گزارے۔ بہت سے دوسرے تابعین سے بھی روایات حاصل کیں جن میں زیادہ تر صحابہ کی اولاد ہیں، مثلاً: علی بن حسین، عروہ بن زبیر، سالم بن عبداللہ بن عمر، محمد بن جبیر بن مطعم، محمد بن نعمان بن بشیر، ابوسلمہ بن عبد الرحمٰن بن عوف، عبید اللہ بن عبداللہ بن عتبہ، قاسم بن محمد، عامر بن سعد، خارجہ

بن زید بن ثابت، عبید اللہ بن کعب بن مالک اور ابان بن عثمان رحمہم اللہ۔

امام زہری نے سنن اور مغازی و سیر کی روایات اپنے اجل اساتذہ سے بہت کاوش کے ساتھ جمع کیں اور ان کا خوب اچھی طرح احاطہ کیا۔ مؤرخین کہتے ہیں: وہ مدینہ منورہ کے ایک ایک انصاری کے گھر جاتے۔ جوان، بوڑھے، عورت، مرد ہر ایک سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور احوال دریافت کرتے یہاں تک کہ پردہ نشیں خواتین سے بھی پوچھتے۔[1] یہی سبب ہے کہ ان کے اساتذہ میں صحابہ کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔

امام زہری سے روایت کرنے والوں میں بھی اجل تابعین کے نام آتے ہیں، مثلاً: عطاء بن ابی رباح (وہ عمر میں امام زہری سے بڑے تھے)، عمر بن عبدالعزیز (زہری سے بہت سال پہلے فوت ہوئے)، عمرو بن دینار، عمرو بن شعیب، زید بن اسلم، منصور بن معتمر رحمہم اللہ۔ ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے ائمۂ حدیث، مثلاً: معمر بن راشد، اوزاعی، شعیب بن ابی حمزہ، سفیان بن عیینہ، مالک بن انس، لیث بن سعد رحمہم اللہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

فن مغازی اور سیر کے امام موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق رحمہما اللہ بھی امام زہری کے فیض یافتہ تھے۔ ان کے علاوہ یعقوب بن ابراہیم، محمد بن صالح تمار اور عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز، جو قدیم اہل علم کے ہاں اصحابِ مغازی کہلاتے ہیں، انھی کے شاگرد تھے۔ ان سب نے مغازی میں مفصل اور وقیع تحریری سرمایہ چھوڑا۔

امام زہری کے معاصرین میں ابواسحاق سبیعی (م 127ھ)، یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ مدنی (م 128ھ)، ابوروح یزید بن رومان اسدی مدنی (130ھ) اور ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن مدنی (م 131ھ یا 137ھ) شامل ہیں۔ مؤخرالذکر کی تحریروں سے اصحابِ کتبِ ستہ کے علاوہ ابن سعد، طبری، بلاذری، ابن حجر، ابن کثیر، ابن قیم اور ابن سیدالناس رحمہم اللہ نے خوب استفادہ کیا۔ حافظ ابن حجر نے مغازی اور سیر میں ان کی کتاب سے 48 روایات اپنی کتاب الإصابة میں نقل کیں۔

- مغازی اور سِیَر کے حوالے سے اس دور کی ایک اور بہت بڑی شخصیت موسیٰ بن عقبہ (م 140 یا 141ھ) ہیں۔ وہ خاندانِ زبیر کے غلام تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیکھا تھا۔ حدیث میں حضرت امام مالک کے استاد تھے۔ امام مالک مغازی اور سیر میں ان کی مہارت کے معترف تھے اور لوگوں کو انھی سے یہ فن سیکھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ ان کی روایات کتبِ ستہ کے علاوہ ابنِ کثیر اور ابنِ حجر وغیرہ کی تصنیفات میں محفوظ ہیں۔ ایڈورڈ سخاؤ نے 1904ء میں ان کی مغازی کا ایک حصہ المنتقٰی من مغازي موسٰی بن عقبة کے نام سے طبع کرایا۔ اس کا نسخہ

[1] تهذيب التهذيب: 397/9.

انھیں برلن سے ملا تھا۔

- اسی دور میں مغازی کے بہت بڑے امام اور محدثین اور مؤرخین کے استاد عبد اللہ بن ابوبکر بن حزم (م130 یا 135ھ)، داود بن حصین اموی (م135ھ) اور سلیمان بن طرخان تیمی (م143ھ) ہوئے جن کی روایات کتبِ ستہ کے علاوہ ابنِ معتمر اشبیلی اور ابنِ حجر کی تصنیفات اور سہیلی کی الروض الأنف میں محفوظ ہیں۔

انھوں نے السیرۃ الصحیحۃ کے نام سے کتاب بھی تالیف کی۔ اس کے ستتر (77) صفحات معروف مستشرق وان کریمر کی کاوش سے 1856ء میں واقدی کی کتاب المغازي کے ضمیمے کے طور پر طبع ہوئے۔

فنِ سیرت کا ارتقا

ان اولین اصحابِ مغازی و سیر سے جو مرویات بعد کے مؤلفین نے اپنی کتابوں میں محفوظ کیں، ان پر نظر ڈالتے ہوئے فنِ سیرت کا ایک اہم ارتقائی مرحلہ سامنے آتا ہے۔ پہلی صدی ہجری کے آخر اور دوسری صدی ہجری کی پہلی چوتھائی تک پہنچتے پہنچتے ''سیرت'' کے مفہوم میں خاصی وسعت آ چکی تھی۔ اس وقت تک سیرت محض رسول اللہ ﷺ کے غزوات اور سفروں کے تذکرے تک محدود نہ رہی تھی بلکہ اس میں آپ ﷺ کے نسب، آپ کے زمانۂ ولادت اور اس سے ماقبل کے حالات، آپ کے بچپن، جوانی اور بعثت سے پہلے کے دیگر اہم واقعات کا تذکرہ بھی شامل نظر آتا ہے۔

جب ہمارے ہاتھ میں ابنِ اسحاق (م151ھ) کی مغازی کا پہلا حصہ آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں سیرت کا آغاز نبی کریم ﷺ کے نسبِ مبارک سے کیا گیا ہے جس کی تفصیلات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہیں، پھر اس میں یمن، وہاں کے قبائل اور بادشاہوں کے حالات ہیں۔ اس کے بعد عمرو بن لحی کے ذریعے سے بت پرستی کے رواج، بنوجرہم کے حالات اور ان کے ہاتھوں زم زم کے بند ہونے، پھر جناب عبدالمطلب کے ہاتھوں اس کی بازیافت، آپ ﷺ کی ننھیال کے حالات اور آپ کی ولادت، تبع حمیری کا واقعہ اور پھر اصحابِ فیل کے حملے اور اس کے حوالے سے اشعار کا ذکر ہے۔ اس کے بعد سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اور آپ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی شادی کے واقعے اور احبار و رہبان، خصوصاً یہود کی طرف سے آخری نبی کی بعثت کے انتظار کا بھی تذکرہ ہے۔ اسی ضمن میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد کعبہ کی تعمیرِ جدید، بعثت سے قبل ورقہ بن نوفل کی عیسائیت، غارحراء میں نبی ﷺ کی خلوت، نزولِ وحی کی ابتدا، لیلۃ القدر کی تحدید، انقطاعِ وحی، السابقون الاولون کے ناموں، مشرکین کی طرف سے ایذا، نبی ﷺ کے

اقتصادی بائیکاٹ، ہجرتِ حبشہ، رسول اللہ ﷺ کی دعوت، جناب ابوطالب اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات، آپ ﷺ کی صاحبزادیوں کی شادیوں اور آپ کی اپنی تمام شادیوں کا تذکرہ یکجا ہے۔

اس کے بعد استہزا کرنے والے دشمنوں کا بیان ہے، پھر رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی نشانیاں مذکور ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اہلِ یمن میں سے ام شریک دوسیہ اور ابوہریرہ دوسی، پھر عدی بن حاتم اور جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم کے ایمان لانے کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ واقعات ترتیبِ زمانی کے اعتبار سے بہت بعد کے ہیں لیکن اہلِ یمن کے تذکرے کے ساتھ یکجا کر دیے گئے ہیں۔ ان کے بعد بیت المقدس تک آپ کے اسراء (رات کے ایک حصے میں مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک کے سفر) کا تذکرہ ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ کے غزوات کے حالات شروع ہوجاتے ہیں۔ ابنِ اسحاق کی سیرت کا جو حصہ دستیاب ہوا ہے، وہ جنگِ احد کے واقعات پر ختم ہوجاتا ہے۔

- ابنِ اسحاق کے اساتذہ میں سے ایک اہم استاد مشہور صاحب مغازی عبدالملک بن محمد بن عمرو بن حزم مدنی ہیں۔ وہ ابنِ اسحاق کے بعد 176 یا 177ھ میں فوت ہوئے۔ ابنِ اسحاق کے معاصرین میں سے مشہور اور اہم معاصر معمر بن راشد (م 150 یا 153ھ) ہیں۔ ان کی کتابوں سے معروف ترین محدثین کے علاوہ بلاذری، ابن سعد اور طبری جیسے مؤرخین نے خوب استفادہ کیا۔ ان کی مغازی کا مکمل نسخہ شکاگو میں موجود ہے جسے نبیہہ عبود نے اضافہ کر کے شائع کیا ہے۔ ان کی کتاب کے ایک حصے کے نسخے استنبول، رباط اور دمشق میں بھی موجود ہیں۔
- ابنِ اسحاق کے دیگر معاصرین میں ابومحمد عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز حنیفی (م 162ھ)، محمد بن صالح بن دینار (م 168ھ)، عبداللہ بن جعفر مخرمی (م 170ھ) اور ابومعشر سندی (م 170ھ) ہیں۔ یہ سب اپنی اپنی جگہ بلند مرتبہ ماہرینِ سیرت سمجھے جاتے ہیں۔
- ابنِ اسحاق کے شاگردوں میں زیاد بن عبداللہ بکائی (م 183ھ)، سلمہ بن فضل ابرش انصاری (م 191ھ)، یونس بن بکیر شیبانی (م 199ھ) اور ابوالعباس وہب بن جریر بن حازم ازدی (م 206ھ) زیادہ معروف ہیں۔ انھی چاروں نے ابنِ اسحاق کی سیرت کو روایت کیا۔ بکائی سے استفادہ کرنے والوں میں امام احمد، احمد بن عَبْدَہ ضَبّی، ابوغسان نہدی، اسماعیل بن توبہ اور عمر بن زُرارہ جیسے محدثین اور ابنِ ہشام جیسے امامِ مغازی و سیر شامل ہیں۔ دوسری صدی ہجری سیرت نویسی کے عروج کی صدی ہے۔
- اس صدی کے دیگر ممتاز سیرت نگار، ابواسحاق ابراہیم بن محمد فزاری (م 186ھ)، یحییٰ بن سعید اموی (م 194ھ) اور ولید بن مسلم دمشقی (م 195 یا 196ھ) ہیں۔ ان تینوں نے سیرت پر مستقل کتابیں تصنیف کیں جو بعد کے مؤرخین اور اصحابِ سیر کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

مجروح سیرت نگار

اس دور میں بہت سے ایسے لوگوں نے بھی سیرت پر کتابیں لکھیں جو علمائے جرح وتعدیل کے نزدیک انتہائی ضعیف ہیں، مثلاً:

- علی بن مجاہد بن مسلم قاضی کابلی (م 182ھ)۔ یہ متروک ہیں، البتہ امام ترمذی نے ان کی صرف وہ روایات قابلِ اعتماد شمار کی ہیں جو انھوں نے ثعلبہ کے حوالے سے بیان کی ہیں۔
- انھی میں معروف مؤرخ اور سیرت نگار محمد بن عمر واقدی (م 207ھ) ہیں۔ وہ بھی محدثین کے نزدیک متروک ہیں۔ بعض ائمۂ جرح وتعدیل نے تو انھیں واضع اور کذّاب قرار دیا ہے۔
- واقدی کے ہم عصر ہیثم بن عدی بن عبد الرحمٰن ثعلبی (م 207ھ) کا شمار بھی انھی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی مرویات طبری، بلاذری، ابنِ قتیبہ اور مسعودی کی مؤلفات میں ملتی ہیں لیکن ائمۂ جرح وتعدیل نے انھیں بھی کذّاب اور متروک قرار دیا ہے۔

سِیَر ومغازی کی تہذیب وترتیب

- دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے آغاز سے فنِ سیرت کا ایک اور اہم مرحلہ شروع ہوا جسے تنقیح، تہذیب اور ترتیب کا مرحلہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کا آغاز معروف سیرت نگار عبد الملک بن ہشام بن ایوب حمیری (م 213 یا 218ھ) کے کام سے ہوتا ہے۔ انھوں نے ابنِ اسحاق کی سیرت کی عمدہ تہذیب و ترتیب کی اور اس میں وقیع اضافے کیے۔ اس کام کی وجہ سے ان کی کتاب السیرۃ النبویۃ لابن هشام کے مستقل نام سے مشہور ہوئی۔
- محمد بن سعد کاتبِ واقدی (م 230ھ) نے آٹھ جلدوں میں الطبقات مرتب کی۔ اس کی پہلی دو جلدیں سیرتِ رسول اللہ ﷺ پر ہیں۔ ان کا شمار محدثین میں ہوتا ہے۔ ائمۂ جرح وتعدیل کے نزدیک ان کے استاد واقدی اگرچہ ناقابلِ اعتبار ہیں لیکن ابنِ سعد خود قابلِ اعتماد ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں واقدی کی روایات نقل کی ہیں لیکن چونکہ وہ ہر روایت کی سند ذکر کرتے ہیں، اس لیے نہ صرف واقدی کی روایات الگ ہوسکتی ہیں بلکہ ہر روایت کی صحت وضعف کا بھی فیصلہ ہوسکتا ہے۔ اسناد ذکر کرنے کے علاوہ ابنِ سعد روایات کے انتخاب میں محتاط بھی ہیں۔

اس دور کی بعض کتبِ تاریخ وسیرت ایسی بھی ہیں جن کے مصنفین نے اسانید سرے سے ذکر ہی نہیں کیں۔ ان

میں ابن حبیب بغدادی (م245ھ) کی کتاب المحبّر ہے۔ اس میں سیرت کے حوالے سے ایسی معلومات موجود ہیں جو دوسری کتب میں نہیں ملتیں۔ لیکن ان معلومات کی توثیق ایک مشکل کام ہے۔

- احمد بن جعفر بن وہب (م292ھ) کی تاریخ الیعقوبي اور اگلی صدی کے وسط میں وفات پانے والے ابوالحسن علی بن حسین مسعودی کی کتاب مروج الذهب و معادن الجوهر بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔

فنِ سیرت اور محدثین

اس دور میں عام مؤرخین کے علاوہ بہت سے معروف محدثین نے بھی سیرت پر مستقل کتابیں تالیف کیں۔ یہ کتابیں خود تو ناپید ہیں لیکن ان کی معلومات بعد میں آنے والے مصنفین کی کتابوں میں محفوظ ہوگئی ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل نمایاں ہیں:

- سعید بن مغیرہ مصیصی (م220ھ)۔ ان کی مرویات سنن نسائی میں مذکور ہیں۔
- احمد بن محمد ورّاق (م228ھ)۔ ان کی روایات سنن ابی داود، مسند ابی یعلیٰ اور مصنف ابن ابی شیبہ میں نقل کی گئی ہیں۔
- محمد بن عائذ قرشی (م234ھ)۔ ابوداود اور نسائی نے ان کی روایات نقل کیں۔
- عبد اللہ بن محمد بن علی بن نفیل حرانی (م234ھ) نے بھی مغازی پر کتاب لکھی۔ ابوداود نے ان سے بہت سی روایات لیں۔ امام مسلم کے علاوہ دیگر محدثین نے ذُہلی کے واسطے سے ان کی روایات اپنی کتابوں میں شامل کیں۔
- امام حدیث ابوبکر ابن ابی شیبہ (م235ھ)۔ ان کی مرویات صحیحین کے علاوہ سنن ابی داود اور سنن نسائی میں بھی محفوظ ہیں۔ اپنے معروف مجموعۂ حدیث المصنف کے علاوہ انھوں نے أوائل الإسلام کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی جس کا نسخہ برلن میں موجود ہے۔ ان کی کتاب المغازي بھی مطبوع ہے۔
- اس دور کی اہم کتابوں میں خلیفہ بن خیاط عصفری (م240ھ تقریباً) کی التاریخ ہے جس کی پہلی جلد سیرت پر مشتمل ہے۔ وہ شائع ہوچکی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے سنین کی ترتیب سے تالیف کی۔ ابتدا ہجری تاریخ کے آغاز سے کی گئی ہے، پھر سیرت پر ایک مختصر فصل ہے۔ انھوں نے بکر بن سلمان اور وہب بن جریر کی روایت کردہ سیرت ابنِ اسحاق پر اعتماد کیا ہے اور اسانید کا اہتمام کرتے ہوئے مختصر انداز میں صحیح اور قابلِ اعتماد روایات کی بنیاد پر سیرت کا خاکہ پیش کیا ہے۔ خلیفہ بن خیاط امام بخاری کے اساتذہ میں سے ہیں۔
- ہشام بن عمار (م245ھ)۔ امام بخاری اور امام نسائی نے ان سے روایات لیں۔

- سعید بن یحییٰ بن سعید اموی (م 249ھ) ثقہ اور محدث تھے۔ انھوں نے بھی مغازی پر ایک وقیع تصنیف چھوڑی تھی۔ [1]
- زبیر بن بکار (م 256ھ) نے سیرت کے علاوہ ازواج النبی کے احوال پر بھی کتاب لکھی جو سیرت کا ایک اہم باب ہے۔
- احمد بن حارث خزّاز (م 258ھ) انتہائی ثقہ محدث تھے۔ انھوں نے ایک وقیع کتاب مغازي النبيّ و سراياه وأزواجه چھوڑی۔
- عبدالملک بن محمد رقاشی بصری (م 276ھ) نے مغازی پر مستقل کتاب تالیف کی۔ ابنِ ماجہ اور ابنِ خزیمہ وغیرہ نے ان سے روایات لیں۔
- ابوبکر احمد بن ابی خیثمہ زہیر بن حرب (م 279ھ) نے التاريخ الكبير کے نام سے ایک اہم کتاب تالیف کی۔ [2] اس میں انھوں نے سنین کی ترتیب سے مختصر سیرت بھی شامل کی۔ یہ طبری، ذہبی اور خطیب بغدادی کے مراجع میں سے ہے۔
- ابراہیم بن اسماعیل عنبری طوسی (م 290ھ) نے بھی المغازي کے نام سے کتاب تالیف کی۔
- امام ابوزرعہ عبدالرحمٰن بن عمرو بن عبداللہ بن صفوان نصری دمشقی (م 281ھ)۔ حدیث میں المصنَّف کے علاوہ تاریخ میں بھی انھوں نے ایک اہم کتاب تالیف کی جس میں سیرتِ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ سیرۃ الخلفاء بھی شامل تھی۔ یہ کتاب تاريخ أبي زرعة الدمشقي کے نام سے مطبوع اور متداول ہے۔
- اسی دور میں سیرتِ طیبہ پر ایک اہم کتاب امام ابواسحاق ابراہیم بن اسحاق حربی (م 285ھ) نے تالیف کی۔ انھیں علم، زہد اور ورع میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مثل قرار دیا جاتا تھا۔
- تیسری صدی کے ایک اور معروف مصنف ابومحمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ دینوری (م 276ھ) نے محدثین ہی کے انداز میں کئی کتابیں تالیف کیں۔ ان میں سے دو کتابوں المعارف اور عيون الأخبار کا ذکر سیرت کے مآخذ میں کیا جاتا ہے۔ كتاب الإمامة والسياسة کے بارے میں اختلاف ہے کہ ان کی تصنیف ہے یا کسی اور کی۔ خطیب بغدادی نے ان کے بارے میں لکھا ہے: كَانَ ثِقَةً دَيِّنًا فَاضِلًا [3] ان کے برعکس بیہقی اور حاکم نے ان پر جرح کی ہے۔ حافظ ذہبی نے بعض حضرات کی جرح سے ان کا دفاع بھی کیا ہے۔

---

[1] سير أعلام النبلاء: 139/9، تهذيب التهذيب: 86/4. [2] تاريخ بغداد: 162/4-164، غاية النهاية في طبقات القراء، ص: 23، لسان الميزان: 277/1. [3] تاريخ بغداد: 170/10.

امام یعقوب بن سفیان فارسی فسوی (م 277ھ) کی کتاب "المعرفة والتاریخ" کا حصہ السیرۃ النبویۃ پر تھا۔ یہ حصہ اب مفقود ہے، البتہ کتاب کی تیسری جلد میں مختلف کتب سے اس کے مقتبسات اکٹھے کر کے جمع کر دیے گئے ہیں۔

فنِ سیرت اور مؤرخین

- اس دور کے ایک اور مؤلف جن کی کتابوں کو سیرت کے مآخذ میں شمار کیا جاتا ہے، احمد بن یحییٰ بلاذری (م 279ھ) ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب أنساب الأشراف میں نسب کے حوالے سے تاریخ بیان کی ہے۔ ان کی دوسری کتاب فتوح البلدان کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے معاہدات اور امان نامے نقل کیے ہیں۔ انھوں نے محدثین کے طریق کے مطابق اسانید کا اہتمام کیا ہے جن میں سے بڑی تعداد صحیح اسانید کی ہے۔ لیکن خود ان کو علمائے جرح و تعدیل نے ضعفاء میں شمار کیا ہے۔
- تیسری صدی کے آخر میں سیرت کے حوالے سے ایک اہم اور مفصل کتاب سامنے آئی ہے۔ وہ معروف محدث، مفسر اور مؤرخ محمد بن جریر طبری (م 310ھ) کی تاریخ الأمم والملوك ہے۔ اس کتاب کا ایک حصہ سیرتِ رسول اللہ ﷺ پر مشتمل ہے۔ انھوں نے محدثین کے اسلوب کے مطابق اسانید کا پورا اہتمام کیا ہے۔ ان کا اصل مقصود تمام روایات کو جمع کرنا تھا، وہ صحیح ہوں یا ضعیف۔ انھوں نے ان کی چھان پھٹک کا کام ان اہلِ علم پر چھوڑ دیا جو ان کی کتاب سے استفادہ کرنا چاہیں۔

محدثین نے سیرتِ رسول ﷺ پر جو کتابیں تالیف کیں، ان کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ وہ دوسری کتبِ سیرت سے اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ انھوں نے اسانید کا اہتمام کیا ہے اور اس میں نقدِ روایت کے اصولوں سے کام لیتے ہوئے صحیح، حسن اور ان کے قریب المرتبہ روایات قبول کی ہیں جبکہ موضوع اور ناقابلِ قبول روایات سے احتراز کیا ہے۔

المغرب اور اندلس کے سیرت نگار

چوتھی صدی ہجری سے علم سیرت کے میدان میں محدثین ہی کے اسلوب کے مطابق المغرب اور اندلس کی بھرپور شرکت نمایاں ہوئی۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ انھوں نے اس دور میں سیرت نگاری میں عالمِ اسلام کی نمائندگی کی۔ ان کے ہاں جمع اور تلخیص و تجزیہ دونوں رجحانات نمایاں نظر آتے ہیں۔

- المغرب میں ابو محمد عبداللہ بن ابی زید قیروانی (م 386ھ) نے کتاب الجامع في السنن والآداب والمغازي والتاريخ تصنیف کی۔
- اندلس میں امام ابن حزم اندلسی (م 456ھ) نے تلخیص و تجرید کا اسلوب اختیار کرتے ہوئے اپنے خصوصی مصادر سے جوامع السيرة النبوية مرتب کی۔

اسی زمانے میں حافظ ابن عبدالبر نمری قرطبی (م463ھ) کی الدرر في اختصار المغازي والسير سامنے آئی اور بعد کے دور میں ابوربیع سلیمان بن موسیٰ کلاعی اندلسی (م 634ھ) نے الاكتفاء بما تضمنه من مغازي رسول اللّٰه والثلاثة الخلفاء تالیف کی۔

چھٹی ساتویں صدی میں سیرت نگاری

- مشرق میں اس دور میں جو نمایاں کتابیں سامنے آئیں، ان میں عبدالرحمٰن بن علی بن محمد بن جعفر جوزی (م 597ھ) کی المنتظم في تاريخ الملوك و الأمم معروف ہے۔ اس کا آغاز انھوں نے زمین کی تخلیق سے کیا ہے۔ اس کے ضمن میں انھوں نے ملکوں، پہاڑوں، سمندروں، دریاؤں، زمین میں پائے جانے والے عجائبات اور جنات سمیت مختلف ادوار میں زمین پر آباد ہونے والوں کا تذکرہ کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے اسی موقع پر جہنم کے حالات بھی بیان کیے ہیں۔ انسانوں کی تاریخ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کی ہے اور اس سارے پس منظر کو بیان کرنے کے بعد سنین کی ترتیب سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر تفصیل سے لکھا ہے۔
- بعدازاں مشہور محدث ابن اثیر الجزری (م 632ھ) کی الكامل في التاريخ سامنے آئی جس کا ایک حصہ سیرت کے لیے خاص ہے۔
- یحییٰ بن حُمیدہ (م 630ھ) نے سیرت پر تین جلدوں میں کتاب تالیف کی جو سیرت ابن ابی طے کے نام سے مشہور ہے۔
- یہاں اس دور کے ایک بہت بڑے محدث اور مؤرخ امام ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی دمشقی (م 676ھ) کی کتاب تهذيب الأسماء واللغات کا ذکر بھی ضروری ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے اس کتاب کا آغاز سرورِ کونین نبی رحمت محمد رسول اللہ ﷺ کے نامِ نامی سے کیا ہے۔ یہ حصہ مختصر لیکن انتہائی وقیع ہے اور اس میں صحت کے التزام کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور شمائل جمع کیے گئے ہیں۔ اب یہ حصہ تهذيب السيرة النبويه کے نام سے الگ طبع ہو چکا ہے۔

- ساتویں صدی ہجری کے مشہور شافعی مؤرخ علی بن محمد بن محمود کازرونی (فارسی نام ''گازرونی'' م697ھ) نے سترہ جلدوں میں ایک ضخیم تاریخ روضة الأريب کے نام سے لکھی۔ اس میں سیرت کا حصہ انتہائی مفصل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے السيرة النبوية کے نام سے سیرت پر مستقل کتاب تالیف کی جو سیرتِ کازرونی کے نام سے مشہور ہے۔[1]

آٹھویں صدی میں سیرت نگاری

- حافظ عبدالمؤمن دمیاطی (م705ھ) نے المختصر في سيرة سيد البشر کے نام سے کتاب تالیف کی۔ اسے سیرت دمیاطی کے نام سے شہرت ملی۔ بعد کے مصنفین نے اس سے بہت استفادہ کیا۔
- علامہ علاء الدین علی بن محمد بن حسن خلاطی قادوس (م708ھ) کی کتاب جو سیرتِ خلاطی کے نام سے معروف ہے، اسی دور میں لکھی گئی۔[2]
- اس صدی کے مشہور ترین محدث اور مؤرخ حافظ شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان ذہبی (م748ھ) نے اپنی ضخیم کتاب تاريخ الإسلام کا ایک حصہ سیرت کے مفصل تذکرے کے لیے خاص کیا۔
- اسی قبیل کی اہم ترین کتابوں میں سے حافظ ابن کثیر (م774ھ) کی انتہائی معتبر کتاب البداية والنهاية ہے جس کے ابتدائی چھ اجزاء سیرت پر مشتمل ہیں جو بعد میں علیحدہ طور پر السيرة النبوية کے نام سے بھی شائع ہوئی ہے۔

سیرت نگاری میں تنوع

محدثینِ کرام رحمہم اللہ کی تمام تر کاوشوں کا محور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہی ہے۔ انھوں نے آپ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ مختلف جہات اور مختلف زاویوں سے کیا۔ آپ ﷺ کے پیغام، آپ کی عبادات، آپ کے معاملات، آپ کے اخلاق اور آپ کے غزوات و سیر کے علاوہ آپ کے خصائل و عادات، فضائل و مناقب، آپ کے خانگی معاملات، کھانا پینا، پہننا، دینا، لینا اور دیگر شخصی امور محدثینِ کرام رحمہم اللہ کی خصوصی توجہ کا مرکز رہے۔

مؤرخین اور سیرت نگاروں کی توجہ بھی انھی امور کی طرف ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ محدثین نے سنن کے نام سے جو کتابیں مرتب کیں، ان میں آغاز رسول اللہ ﷺ کے پیغام، عبادات اور معاملات سے ہوتا ہے۔ مختلف وجوہات کی بنا

[1] الدرر الكامنة في أعيان المائة الثامنة: 119/3، معجم المؤلفين: 232/7. [2] الدرر الكامنة في أعيان المائة الثامنة: 101/3.

پر ان کی تفصیلات بھی زیادہ بیان کی جاتی ہیں جبکہ سیر و مغازی اور شخصی احوال کا تذکرہ بعد میں آتا ہے۔ کتبِ سیرت نام ونسب، ولادت، پرورش، جوانی، شادی اور دوسرے شخصی امور کو پہلے بیان کرتی ہیں۔ ان امور کے ساتھ آپ کی جنگوں کے حالات کو بالخصوص زیادہ تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ کتبِ سنن میں رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کا مطالعہ، بنیادی طور پر، بحیثیتِ رسول کیا جاتا ہے، اس لیے ترتیب میں امورِ رسالت پہلے آتے ہیں اور شخصی امور بعد میں۔ اس کے برعکس کتبِ سیرت میں مطالعے کا موضوع آپ کی شخصیت ہوتی ہے، اس لیے شخصی امور پہلے آتے ہیں۔ شخصیت ایک ہے۔ حیاتِ مبارکہ ایک ہے۔ بیان کرنے والوں کی طرف سے پیش کردہ حقائق بھی وہی ہیں۔ ترتیب الگ الگ ہے اور تفصیلات کی ترجیح بھی الگ الگ ہے۔

صحیح البخاری میں سیرت نبوی

- محدثین کے سرخیل حضرت امام بخاری رحمہ اللہ (م 256ھ) کی صحیح کا جائزہ لیں تو پہلی کتاب بدء الوحي پر ہے۔ اس کے بعد کتاب الإیمان اور کتاب العلم ہیں، پھر عبادات ہیں۔ ان سب کا تعلق رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ والا صفات کی عظیم ترین خصوصیت وفضیلت، یعنی رسالت سے ہے۔ کتاب الجهاد والسیر، کتاب المغازي سے الگ ہے۔ کتاب المناقب میں آپ کے شخصی فضائل، آپ کی عادات، اخلاق، احوال، مرض ووفات بیان ہوئے۔ امام بخاری نے نسب کے حوالے سے کنانہ، قریش اور بنوہاشم کی فضیلت اور عدنان تک نسابوں کا بیان کردہ نسب درست ہونے کی روایتیں پیش کی ہیں۔ جناب عبداللہ سے عدنان تک کے نام، نسابوں اور اربابِ سیرت کی کتابوں سے دستیاب ہیں۔ امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب المناقب میں علامات النبوة پر مستقل باب قائم کیا۔ دوسرے مصنفین نے علاماتِ نبوت پر مستقل تالیفات سپردِ قلم کیں۔ کتاب فضائل أصحاب النبي ﷺ اور کتاب مناقب الأنصار میں آپ ﷺ کے دوستوں، ساتھیوں اور آپ کے خاندان کے حالات کا تذکرہ ہے۔ کتاب الأطعمة، کتاب الذبائح والصید، کتاب الأضاحي اور کتاب الأشربة وغیرہ میں بیان کردہ تفصیلات بھی آپ ہی کی شخصیت کے گرد گھومتی ہیں۔ کتاب الدعوات اور کتاب الرقاق اپنے رب سے آپ ﷺ کی مناجاتوں اور آپ کے زہد و ورع کی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔

امام بخاری نے اپنی کتاب میں رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کے ہر پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی کتاب کا نام بھی ایسا تجویز کیا جو اس وقت کے مروج ناموں سے بالکل مختلف اور اچھوتا ہے۔ اس نام سے واضح ہوجاتا ہے کہ ان کی کتاب میں رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا عکسِ جمیل ہر جہت اور ہر زاویے سے پیش کیا

گیا ہے۔ امام بخاری نے اس کا نام الجامع الصحيح المسند من حديث رسول اللهﷺ و سننه و أيامه رکھا۔ ایک اور روایت کے مطابق انھوں نے کتاب کا نام الجامع المسند الصحيح المختصر من أمور رسول اللهﷺ و سننه وأيامه رکھا۔ نام کے ذریعے سے انھوں نے واضح کیا کہ اس صحیح میں ہر حدیث سند کے ساتھ بیان ہوئی اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے جملہ امور، آپ کا طریقِ زندگی اور آپ کی جنگوں کے احوال کا احاطہ کیا گیا ہے۔

امام مسلم اور سیرتِ رسول

- امام مسلم بن حجاج قُشَیری رحمہ اللہ (م261ھ) نے اپنی کتاب میں دیگر شخصی امور کے علاوہ آپ ﷺ کے نسب مبارک، اخلاق و عادات، فضائل، معجزات، مکہ اور مدینہ میں آپ کے قیام، جہاد و سیر اور وفات کے بارے میں صحیح روایات جمع کی ہیں۔ صحیحین کے ابواب کے تحت وہی روایات لائی گئی ہیں جو امام بخاری اور امام مسلم کے اختیار کردہ معیار کے مطابق ہیں۔ ان کے ذریعے سے تمام تر تفصیلات سامنے نہیں آتیں، البتہ ہر موضوع کے بنیادی خدوخال واضح ہو جاتے ہیں۔ باقی ماندہ تفصیلات دیگر کتبِ حدیث، سِیَر اور تاریخ سے مہیا ہوتی ہیں۔

شمائلِ رسول اللہ ﷺ

بہت سے محدثین نے اپنی جامع کتبِ حدیث کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے شخصی احوال اور فضائل کو مستقل کتابوں میں پیش کیا ہے۔

- امام بخاری رحمہ اللہ کے تلمیذِ خاص حضرت امام ترمذی رحمہ اللہ (م275ھ) نے اپنی سنن میں مذکورہ تمام امور کے حوالے سے احادیث پیش کیں اور اس کے ساتھ الشمائل النبوية و الخصائص المصطفويّة کے نام سے ایک نفیس ترین کتاب الگ تالیف کی۔ اس میں شمائل، خصائل اور فضائل مفصل بیان ہوئے۔ اس کتاب کو امت میں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ تقریباً ہر زمانے میں علمائے اعیان، خصوصاً اربابِ سیر نے اس سے استفادہ کیا۔ بار بار اس کی مفصل شرحیں لکھی گئیں اور وہ بھی اپنی اپنی جگہ مقبولیت کے عروج تک پہنچیں۔

رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و صفات پر امام ترمذی سے پہلے یا ان کے عہد کے دوسرے محدثین کی مختصر کتابوں کا بھی سراغ ملتا ہے، مثلاً: ابوالبختری وہب بن وہب اسدی (م200ھ) کی صفة النبي، ابوالحسن علی بن محمد مدائنی (م234ھ) کی صفة النبي اور ترمذی کے ہم عصر محدث داود بن علی اصفہانی کی صفة أخلاق النبي۔[1] یہ

[1] الفهرست لابن النديم، ص: 272,271.

کتابیں خود محفوظ نہ رہ سکیں لیکن ان کی معلومات بعد کی جامع کتابوں کا حصہ بن گئیں۔

امام ترمذی کے بعد اور کئی محدثین نے شمائل پر کتابیں لکھیں۔ ان میں سے نمایاں مندرجہ ذیل ہیں:

- حافظ ابو محمد عبداللہ بن محمد بن جعفر بن حیان اصفہانی (م369ھ)، وہ ''ابوالشیخ'' کی کنیت سے معروف ہیں۔ ان کی کتاب کا نام أخلاق النبيﷺ و آدابہ ہے۔
- ابو سعید عبدالملک بن محمد نیشاپوری (م406ھ) نے شرف المصطفٰی کے نام سے، ابو العباس جعفر بن محمد مستغفری (م433ھ) نے شمائل النبي کے نام سے اور ان کے بعد محدث کبیر، محی السنہ حسین بن مسعود بغوی (م510ھ) نے الأنوار في شمائل النبي المختار کے نام سے شمائل پر کتابیں تالیف کیں۔
- اس موضوع پر انتہائی مقبول اور اہم کتاب مشہور محدث، شارحِ صحیح مسلم قاضی عیاض یحصبی (م544ھ) کی الشّفاء بتعریف حقوق المصطفٰی ہے۔ اس کتاب کو بھی امت میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہر دور میں اس کی شروح لکھی گئیں۔ اس میں رسولِ اکرمﷺ کے شمائل، حقوق اور آپ کی حیاتِ طیبہ کے گوناگوں پہلو بیان کیے گئے ہیں۔ تقی الدین احمد بن محمد شمنی حنفی (م832ھ)، ملا علی القاری (م1014ھ) اور شہاب خفاجی (م1096ھ) جیسے لوگ اس کتاب کے شارحین میں شامل ہیں۔[1]
- چھٹی صدی ہجری میں ہی اندلس کے ابن مقری غرناطی (م552ھ) نے الشمائل بالنور الساطع الکامل قلم بند کی۔
- اس حوالے سے اندلس ہی سے تعلق رکھنے والا ایک بہت بڑا نام الحافظ الامام ابوالفتح محمد بن سید الناس الیعمری (م734ھ) کا ہے۔ ان کی کتاب عیون الأثر في فنون المغازي والشمائل والسیر ایک جامع اور مقبول کتاب ہے۔ علمائے امت، سیرت نگاروں اور مؤرخوں نے اس سے خوب استفادہ کیا۔ حافظ محمد بن سید الناس علمِ حدیث کے ائمہ میں سے ہیں۔ وہ اپنی کتاب میں محدثین کے منہج کے عین مطابق واقعاتِ سیرت کے حوالے سے تمام معروف روایات ذکر کرتے ہوئے ان کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ دلائل کی روشنی میں جو روایات راجح ہیں، ان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے عیون الأثر سیرت کی انتہائی وقیع کتاب ہے۔ چونکہ یہ عرصہ تک نسبتاً کمیاب رہی، اس لیے متاخرین میں سے بہت سے لوگوں نے ان کی کتاب میں ذکر کی گئی مرجوح روایات کو مفید مطلب پاتے ہوئے ان کے حوالے دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات، عام قارئین میں یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ اس کتاب میں بھی ہر قسم کی روایات جمع کی گئی ہیں، حالانکہ حافظ ابن سید الناس نے صحیح روایات

[1] شرح الشفا للملاعلي القاري: 3/1.

کو ترجیح دینے ہی کی غرض سے دونوں قسم کی روایات کا احاطہ کیا ہے۔

- ان کے بعد شمائل کی کتابوں میں ابن کثیر (م 774ھ) کی شمائل الرسول امتیازی مقام رکھتی ہے۔
- مجد الدین فیروز آبادی (م 817ھ) کی سفر السعادۃ کا شمار بھی شمائل کی بہت مقبول کتابوں میں ہوتا ہے لیکن افسوس اس میں روایات کی صحت کا التزام نہیں کیا گیا۔

دلائل النبوۃ اور اعلام النبوۃ

شمائل کی طرح سیرت کے حوالے سے ایک اور اہم موضوع رسول اللہ ﷺ کے معجزات اور آپ کی نبوت کے دلائل کا ہے۔ محدثین کبار نے اپنی کتابوں میں اس موضوع پر مختلف عنوانات کے تحت روایات پیش کی ہیں۔

- دستیاب معلومات کے مطابق جس نے سب سے پہلے دلائل کو مستقل کتاب کا موضوع بنایا، وہ اپنے عہد کے ایک بہت بڑے محدث محمد بن یوسف فریابی (م 212ھ) ہیں۔ اس موضوع پر سب سے پہلے مستقل کتاب تالیف کرنے کی فضیلت انھی کے نام منسوب کی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب کا نام دلائل النبوۃ تجویز کیا۔
- ان کے بعد اس موضوع پر علی بن محمد مدائنی (م 234ھ) کی کتاب آیات النبي کے نام سے اور داود بن علی الاصفہانی (م 280ھ) کی کتاب أعلام النبوۃ کے نام سے سامنے آئیں۔ ان دونوں حضرات نے شمائل پر بھی کتابیں لکھیں، مدائنی نے صفۃ النبي کے نام سے اور اصفہانی نے صفۃ أخلاق النبي کے نام سے۔ ان دونوں کتابوں کا تذکرہ شمائل کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔
- ابن قتیبہ (م 276ھ) نے أعلام رسول اللّٰہ کے نام سے کتاب لکھی۔ ان کے بعد امام ابوبکر ابن ابی دنیا (م 281ھ)، پھر امام ابوبکر جعفر بن محمد مستفاض فریابی (م 301ھ) نے اس موضوع پر دلائل النبوۃ کے نام سے کتابیں تصنیف کیں۔ پھر ان کے بعد محدثِ شہیر ابن ابی حاتم (م 327ھ) نے أعلام النبوۃ کے نام سے، حافظ ابوعبداللہ محمد بن اسحاق بن یحییٰ ابن مندہ (م 395ھ) نے دلائل النبوۃ کے نام سے اور قاضی عبدالجبار معتزلی (م 415ھ) نے تثبیت دلائل النبوۃ کے نام سے کتابیں لکھیں۔
- پانچویں صدی ہجری میں، ان کے بعد، ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی (م 430ھ) نے دلائل النبوۃ تالیف کی اور ابوالحسن علی بن فہد ماوردی (م 450ھ) نے أعلام النبوۃ کے نام سے نہایت عمدہ کتاب لکھی۔
- اسی صدی میں امام ابوبکر احمد بن حسین بن علی بیہقی (م 458ھ) کی معروف ترین کتاب دلائل النبوۃ سامنے آئی اور ایک دنیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔

- اندلس میں ابوعمر یوسف بن عبدالبر قرطبی (م535ھ) نے اس پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے سیرت پر ایک کتاب لکھی، پھر آٹھویں صدی میں عمر بن علی ابن ملقن (م804ھ) نے خصائص أفضل المخلوقین اور غایة السؤل في خصائص الرسول تالیف کیں۔
- ان کے بعد شارحِ بخاری شہاب الدین ابوالعباس احمد بن محمد بن ابی بکر بن عبدالملک قسطلانی (م923ھ) کی المواهب اللدنية بِالمِنَح المحمدية نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ یہ کتاب بہت عرصے تک متأخرین کے لیے سب سے بڑے علمی مصدر کے طور پر استعمال ہوئی۔ قسطلانی خود محدث ہیں لیکن اس کتاب میں انھوں نے ہر طرح کی روایات جمع کر دی ہیں۔
- اسی دور میں امام جلال الدین سیوطی (م911ھ) نے دلائل وشمائل میں الخصائص الكبرٰى کے نام سے مفصل کتاب قلم بند کی۔ یہ دلائل النبوة کے سلسلے کی چند اہم کتابیں ہیں۔

کتبِ سیرت کی شروح

ایک اور اہم سلسلہ سیرت کی بنیادی اور مقبول کتابوں کی شروح کا ہے۔ ان میں جہاں اصل روایات کے متون اوراشعار وغیرہ کی شرح کی گئی ہے، وہاں اصل کتابوں کے عنوانات کے تحت مزید معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں۔

- ان شرحوں میں اہم ترین امام عبدالرحمٰن سہیلی کی الروض الأنف ہے جو سیرة ابن هشام کی جامع شرح ہے۔
- بعد ازاں ساتویں صدی ہجری میں یمن کے زیدیوں کے مشہور امام یحیٰی بن حمزہ بن علی طالبی (م745ھ) نے الأنوار المضيئة في شرح الأخبار النبوية کے نام سے سیرة ابن هشام کی شرح لکھی۔ انھوں نے سیرة ابن هشام کی تلخیص بھی خلاصة السيرة کے نام سے سپرد قلم کی۔
- اسی طرح ابن سید الناس کی کتاب عیون الأثر کی شرح نور النبراس في سيرة ابن سيد الناس بہت معروف اور اہم کتاب ہے۔ یہ ابوالوفا ابراہیم بن محمد بن خلیل طرابلسی حلبی (م841ھ) کی تصنیف ہے۔
- امام قسطلانی کی تالیف المواهب اللدنية کی شرح محمد بن عبدالباقی زرقانی (م1122ھ) نے آٹھ جلدوں میں لکھی۔ یہ ایک مبسوط شرح ہے جو شرح الزرقاني على المواهب کے نام سے زیادہ معروف ہے۔ یہ کتاب ہر قسم کی روایات کا مجموعہ ہے۔

کتبِ سیرت میں جامعیت کا اہم مرحلہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ سب سے پہلے امام بخاری اور امام مسلم نے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے حوالے

سے صحیحین کے ذریعے سے جامعیت کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے اپنے انداز میں رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ہر پہلو کا احاطہ کیا۔

- سیرت کا فن بھی مختلف ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد آٹھویں صدی ہجری میں جامعیت کی منزل تک آ پہنچا۔ اس کی عمدہ ترین مثال امام بخاری اور امام مسلم کے خوشہ چین شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے قابل ترین شاگرد امام ابن قیم رحمہ اللہ (م751ھ) کی زادالمعاد ہے۔ اپنے استادِ گرامی کی طرح ان کا مشن بھی یہی تھا کہ انسانیت مقامِ مصطفیٰ کو پہچانے، سعادتِ دارین کے حصول کے لیے آپ ﷺ کے راستے کو اپنائے اور اس سے ذرہ برابر روگردانی نہ کرے۔ سیرت پر اپنی ممتاز ترین کتاب زادالمعاد میں وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہتے ہیں:

فَهَدَى (اللّٰهُ) بِهِ إِلٰى أَقْوَمِ الطُّرُقِ وَ أَوْضَحِ السُّبُلِ، وَافْتَرَضَ عَلَى الْعِبَادِ طَاعَتَهُ وَ تَعْزِيرَهُ وَتَوْقِيرَهُ وَمَحَبَّتَهُ، وَالْقِيَامَ بِحُقُوقِهِ، وَسَدَّ دُونَ جَنَّتِهِ الطُّرُقَ، فَلَنْ تُفْتَحَ لِأَحَدٍ إِلَّا مِنْ طَرِيقِهِ.

''اللہ نے رسول ﷺ کے ذریعے سے سب سے مضبوط طریقے اور سب سے واضح راستے کی طرف رہنمائی کی۔ بندوں پر آپ ﷺ کی اطاعت، نصرت، توقیر، محبت اور آپ کے حقوق کی ادائیگی فرض کی۔ اپنی جنت میں داخلے کے راستے بند کر دیے کہ آپ کا راستہ اختیار کیے بغیر یہ کسی کے لیے نہیں کھلیں گے۔'' [1]

سیرت کے بارے میں ابن قیم رحمہ اللہ کا تصور یہ نہیں کہ وہ محض رسول اللہ ﷺ کے شخصی احوال اور آپ کی جنگوں اور آپ کی حیاتِ مبارکہ میں پیش آنے والے بڑے بڑے واقعات پر مشتمل ہونی چاہیے۔ ان کے مطابق سیرت نجات اور سعادت کا مکمل راستہ واضح کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

وَإِذَا كَانَتْ سَعَادَةُ الْعَبْدِ فِي الدَّارَيْنِ مُعَلَّقَةً بِهَدْيِ النَّبِيِّ ﷺ، فَيَجِبُ عَلَى كُلِّ مَنْ نَصَحَ نَفْسَهُ، وَأَحَبَّ نَجَاتَهَا وَسَعَادَتَهَا أَنْ يَعْرِفَ مِنْ هَدْيِهِ وَ سِيرَتِهِ وَ شَأْنِهِ مَا يَخْرُجُ بِهِ عَنِ الْجَاهِلِينَ بِهِ، وَ يَدْخُلُ بِهِ فِي عِدَادِ أَتْبَاعِهِ وَ شِيعَتِهِ وَ حِزْبِهِ.

''جب ایک انسان کے لیے دونوں جہانوں کی سعادت نبی ﷺ کی سیرت اور طریقے سے وابستہ ہے تو ہر اس شخص کے لیے جو اپنا خیر خواہ اور نجات اور سعادت کا طلبگار ہے، ضروری ہے کہ آپ ﷺ کے طریقے، آپ کی سیرت اور آپ کے احوال اس قدر ضرور جانے جن کے ذریعے سے وہ جاہلوں سے خارج ہو جائے اور آپ ﷺ کے متبعین، آپ کے حمایتیوں اور آپ کی جماعت میں اس کا شمار ہو۔'' [2]

---

[1] زاد المعاد، مقدمة :1/35,34. [2] زاد المعاد، مقدمة :1/70,69.

امام ابن قیم ﷫ کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے بارے میں لکھی گئی کتاب ان تینوں چیزوں پر مشتمل ہونی چاہیے۔ اس لیے انھوں نے اپنی کتاب کا نام زادالمعاد في هدي خير العباد رکھا۔ اس کتاب میں جہاں نبی ﷺ کا نسب مبارک، آپ کے بچپن اور جوانی سمیت آپ کی حیاتِ مبارکہ کے واقعات، آپ کی ازواج، اولاد، خدام، آپ کے لباس، نعلین، مسواک، سلاح و اثاث اور سواریوں وغیرہ کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں، وہیں آپ کے اٹھنے بیٹھنے، سوار ہونے، بولنے اور سکوت فرمانے، وضو اور عبادت میں آپ کے اسلوب و طریق کو کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ انھوں نے ان تفصیلات سے مختلف فقہی مسائل بھی اخذ کیے ہیں۔ جس طرح صحیح بخاری رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، اسی طرح زادالمعاد بھی سیرت کی جامع کتاب ہے۔ فرق یہ ہے کہ ابن قیم ﷫ اصحابِ سنن کی طرح روایات جمع کرنے اور ان کی تبویب اور ترتیب سے اسوۂ حسنہ کو واضح کرنے کے بجائے بیانیہ انداز میں اسوۂ مبارکہ کو واضح کرتے ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے متون کو سمجھنے کے لیے شروح کی ضرورت ہے جبکہ زادالمعاد میں ابن قیم نے استنباط و استنتاج اور شرح و بسط سے بات واضح کی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ صحت کے معیار میں زادالمعاد صحیحین کے برابر نہیں۔ صحیحین کا معیارِ صحت انتہائی بلند اور ارفع ہے۔ امام بخاری کا استنباط و استنتاج بھی انتہائی دقیق اور لطیف ہے، البتہ زادالمعاد میں صحیحین سے خوب استفادہ کیا گیا ہے۔

- امام ابن قیم ﷫ کے بعد کوئی اور ان کے راستے پر نہ چلا، البتہ نویں اور دسویں صدی کے سیرت نگاروں میں سیرت کے حوالے سے زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنے کا رجحان سامنے آیا۔
- ان میں سب سے اہم نام محمد بن یوسف دمشقی شامی (م942ھ) کا ہے۔ انھوں نے سیرت کی تمام میسر کتابوں کی معلومات جمع کر کے ایک ضخیم موسوعہ مرتب کرنے کی ایک سنجیدہ علمی کوشش کی۔ انھوں نے اپنی کتاب سبل الهدٰى والرشاد في سيرة خير العباد میں سیرت کی 300 سے زیادہ کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ یہ چودہ جلدوں میں طبع ہو چکی ہے۔ یہ سب کتابوں کی جامع ہے۔ اس میں موضوع روایتوں سے اجتناب کیا گیا ہے لیکن صحت کا التزام پیشِ نظر نہیں رکھا گیا۔

ان کے بعد سب سے مشہور نام علی بن برہان الدین (ابراہیم) حلبی کا ہے۔ انھوں نے ”إنسان العيون في سيرة الأمين المأمون“ تالیف کی جو السيرة الحلبية کے نام سے معروف ہے۔ لیکن اس میں ضعیف روایات اور اسرائیلی قصے بھرے ہوئے ہیں۔

اسلام کے پہلے ہزار سال میں سیرت نگاری اور اس کے ارتقا کا جائزہ لینے کے لیے ہم نے معروف، اہم اور ایسی

متداول کتبِ سیرت کے ناموں پر اکتفا کیا ہے جو مختلف زمانوں میں اہل علم کے ہاں بنیادی مراجع کے طور پر استعمال ہوئیں یا ہو رہی ہیں۔ ان صفحات میں نہ تمام کتب سیرت کا احاطہ مقصود تھا نہ اس تقدیم میں اس کی گنجائش ہے۔ اب ہم سیرت نگاری کے ایک نئے مرحلے کی طرف آتے ہیں۔ ہماری مراد مخالفین کی طرف سے رسول اللہ ﷺ پر کتابیں لکھنے اور سیرت نگاری پر ان کتابوں کے اثرات سے ہے۔

سیرت اور مستشرقین

تیرھویں صدی ہجری (انیسویں صدی عیسوی) میں مطالعۂ سیرت کے ایک نئے سلسلے کا آغاز ہوا، یعنی ان لوگوں کی طرف سے سیرت کا مطالعہ جو رسول اللہ ﷺ کے مخالف تھے۔ ہماری مراد یورپ کے عیسائی مستشرقین ہیں جنھوں نے عربی اور بعض دوسری مشرقی زبانیں سیکھ کر اپنی مصلحتوں اور مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے مسلمانوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہا۔ جب یورپ میں علمی نشأۃِ ثانیہ کے بعد ان کا استعماری دور شروع ہوا تو انھوں نے استعماری مقاصد کے لیے اور مختلف فوجی، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور مذہبی وجوہ سے مسلمانوں کو قریب سے جاننے کی ضرورت شدت سے محسوس کی۔ انھیں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے فکر وعمل، ان کی معاشرت، ان کی کمزوریوں اور خوبیوں سے آگاہی کے لیے سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں جاننا ضروری ہے جو مسلمانوں کے یقین، فکر اور عمل کا محور ہیں۔

اہلِ یورپ اگرچہ معروضیت اور غیر جانبداری کے دعویدار ہیں لیکن حقیقت میں اسلام کے ساتھ ان کے عناد اور مخاصمت کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ان کے لیے اپنی تاریخی سوچ، اپنی اقدار اور اپنے مفادات سے غیر متعلق ہو کر پوری غیر جانب داری اختیار کرنا ممکن ہی نہیں، اس لیے سیرت کا مطالعہ کرتے وقت وہ تاریخی مخاصمت اور مخالفت کی عینک اپنی آنکھوں سے اتار نہ سکے۔

مسلمانوں کو اپنی تہذیب سے مغلوب کرنے کی غرض سے ان کے مفادات میں یہ بھی شامل تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت، عقیدت اور اطاعت کا جو تعلق مسلمانوں کو ہے، اسے کمزور کیا جائے۔ مسلمانوں کے اندر اپنے ذہنی غلاموں کی آبیاری ان کی ضرورت تھی، اس لیے انھوں نے مطالعۂ سیرت کے نام پر اپنی مرضی کی خود ساختہ باتیں پھیلانے کے لیے اپنے ایجاد کردہ طریقوں کا استعمال کیا۔

اپنی مرضی کی باتیں پھیلانے کے لیے پہلے تو ان کے تمہیدی کلمات یہ ہوتے تھے کہ (نعوذ باللہ!) رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے بارے میں مستند معلومات سرے سے موجود ہی نہیں۔

- وہ یہ لکھتے رہے کہ اسلامی عقائد یہودیوں اور عیسائیوں سے اخذ کردہ ہیں۔
- قرآن (معاذ اللہ) نبی ﷺ کی تصنیف ہے۔
- اسلامی عبادات بھی دوسرے مذاہب کی عبادات کا چربہ ہیں۔
- حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ کی شادی دولت کی حرص کی وجہ سے ہوئی۔
- آپ ﷺ نے دوسرے آسمانی مذاہب کو ماننے والوں کی مخالفت اس لیے کی کہ آپ خود کو منوانا چاہتے تھے۔
- آپ نے شروع میں بنی اسرائیل کے انبیاء کو مانا تاکہ لوگ متوجہ ہوں، پھر ان انبیاء کا سردار ہونے کا دعویٰ کردیا۔
- سلسلۂ نسب حضرت اسماعیل علیہ السلام سے جوڑا۔
- مکی دور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہیرو بنایا، پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہیرو بنالیا۔
- مدنی زندگی میں رسالت بادشاہت میں تبدیل ہوگئی۔
- اسلام بزورِ شمشیر پھیلا۔
- کثرتِ ازدواج کا مقصد نفس پرستی تھا۔
- اسلامی سزائیں وحشت و بہیمیت کا مظہر ہیں۔
- مسلمان بنیادی طور پر قاتل اور لٹیرے ہیں۔
- کتبِ سیرت صدیوں بعد لکھی گئیں، اس لیے ناقابل اعتبار ہیں۔
- معجزات من گھڑت ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ تِلْكَ الْهَفَوَاتِ كُلِّهَا.

ان سب دعووں کا جھوٹ اس قدر نمایاں تھا کہ ان کی کتابیں مسلمان تو ایک طرف خود انصاف پسند عیسائیوں کے سامنے بھی، جو کسی طرح مسلمانوں کے ساتھ کچھ رابطہ رکھتے تھے، لکھنے والوں کو بددیانت اور فریب کار ثابت کرنے کے لیے کافی تھیں۔ پھر بتدریج ایسے مستشرقین سامنے آتے گئے جنھوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے زیادہ لطیف طریقے اختیار کرنے کی ضرورت محسوس کی۔

- مارگولیتھ کی نسبت ولیم میور نے مختلف انداز اختیار کیا اور نرے جھوٹ کے بجائے سچ اور جھوٹ کی آمیزش کا طریق کار اپنایا۔
- جوزف شاخت نے عربی زبان و ادب کی زیادہ مہارت بہم پہنچائی اور براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی ذات پر حملہ آور ہونے کے بجائے حدیث و سنت، فقہ، اصولِ فقہ اور مسلمانوں کے اجتہادی کارناموں کو ہدفِ تنقید بنایا۔
- منٹگمری واٹ نے کارل مارکس کی جدلیاتی مادیت کو بنیاد بنا کر سیرت کا حلیہ تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ یہ نمائندہ

مستشرقین ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھی شاگرد اور پیروکار ہیں جو اپنے اپنے میدان میں سرگرمِ عمل ہیں۔ ان سب کو سب سے زیادہ پرخاش حدیث اور علومِ حدیث، خصوصاً علم الاسناد سے ہے۔ یہ علوم مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہیں، اس لیے سب سے زیادہ حسد انھی سے محسوس کیا جاتا ہے۔ زیادہ تر اعتراضات کا رخ بھی انھی کی طرف ہے۔ علم الاسناد کا مقام و مرتبہ گھٹانے کے لیے یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ مسلمان اہلِ علم اسانید کے سلسلے میں اس طرح مشغول ہوئے کہ انھوں نے متون کی تنقید، یعنی جانچ پڑتال کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اس پہلو پر تفصیلی بحث آئندہ صفحات میں آئے گی۔

مستشرقین تو محقق اور سکالر کہلاتے ہیں جبکہ اہلِ یورپ اپنے ان اوباشوں کا بھی دل و جان سے تحفظ کرتے ہیں جو محض گندگی اچھالتے ہیں۔ ان تمام کوششوں کے باوجود قرآنِ مجید، جس کے متعدد تراجم یورپی زبانوں میں طبع ہوئے ہیں، اور رسول اللہ ﷺ کی سنت و سیرت، جس پر مسلمانوں کی لکھی ہوئی کئی کتابیں یورپی زبانوں میں شائع ہوئی ہیں، کی اثر انگیزی حیران کن ہے۔ مستشرقین کی ساری مخالفانہ مہم اور خود مسلمانوں کی طرف سے برے عملی نمونے کے باوجود کتاب اللہ اور سنت و سیرتِ رسول اللہ ﷺ کے مطالعے سے یورپ کے لاکھوں انسان حلقہ بگوش اسلام ہو رہے ہیں۔

متاثرینِ استشراق اور سیرت نگاری کا جدید دور

ابتدائی مراحل میں بہت سے ذہین مسلمان بھی مستشرقین کے افکار سے متاثر ہوئے، سب سے پہلے ان کے اثرات برصغیر میں نمودار ہوئے۔ عرب دنیا پر استعمار کا قبضہ برصغیر کے بعد ہوا، اس لیے وہاں مستشرقین سے متاثر ہونے والوں کا دور نسبتاً بعد میں شروع ہوا۔ برصغیر میں اس کی نمایاں مثال سر سید احمد خاں تھے۔ سر سید احمد خاں ایک طرف تو مستشرقین کے اعتراضات سے پریشان ہوئے اور رسول اللہ ﷺ پر لگائے گئے الزامات کا ردّ کرنے کی ٹھانی۔ دوسری طرف وہ مستشرقین کے عقلی اور مادی طرزِ استدلال سے سخت مرعوب بھی ہوئے۔ اس مرعوبیت نے ان کے جملہ افکار کو متاثر کیا۔ مسلمانوں، خصوصاً محدثین کرام نے علم الحدیث کے علاوہ سیرت اور تاریخ میں صحت کا جو انتہائی بلند معیار قائم کیا تھا، اس پر مستشرقین کے سطحی اعتراضات کا ردّ کرنے کے بجائے سر سید نے ان کا شدید اثر قبول کیا۔ انھوں نے اپنے مخصوص نظریات کے مطابق کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں سے بھی بعض لوگ متاثر ہوئے لیکن اکثریت نے انھیں مسترد کر دیا۔

ان اعتراضات کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اہلِ علم کے ہاں سنت کے گہرے مطالعے اور سیرت کے حقیقی

خدوخال واضح کرنے کی ضرورت کا احساس زیادہ ہوا اور سیرت پر بہتر سے بہتر تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہم بطورِ مثال برصغیر میں لکھی جانے والی اس دور کی ایک نمایاں کتاب ''رحمۃ للعالمین'' کا نام لیتے ہیں۔ اس کے مصنف قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری تھے۔ ان کا مقصود سیرتِ پاک کے حقیقی خدوخال واضح کرنا، عقلیت پرستوں کے پھیلائے ہوئے وساوس کو ذہنوں سے صاف کرنا اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سچی محبت کے رشتوں کو ٹھیک طور پر استوار کرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے مغازی و سیر، دلائل، خصائل اور شمائل سب اصنافِ سیرت سے استفادہ کرتے ہوئے ایک عمدہ کتاب تالیف کی۔ اس کتاب کا ایک ایک لفظ سیرتِ پاک کے جمال و کمال کو دل میں اتارتا ہے۔

محترم مصنف نے اب تک استعمال ہونے والے تمام مصادر کے علاوہ بہت سے نئے مصادر سے بھی استفادہ کیا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے نقوش اجاگر کرنے کے لیے اسلامی مصادر کے علاوہ تورات اور انجیل سمیت دوسرے مذاہب کی مذہبی کتابوں کو سیرت کے مصادر میں شامل کیا۔ یہ سیرت نگاری میں توسیع کا ایک اہم مرحلہ تھا جس کا آغاز قاضی صاحب کے ذریعے سے ہوا۔ علاوہ ازیں انھوں نے جدید علوم، مثلاً: ریاضی، طبعیات اور ہیئت سے سنین اور اوقات کے تعین کے لیے مدد لی۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے فضائل و شمائل، آپ پر نازل کردہ کتاب قرآن اور آپ کے لائے ہوئے دین اسلام کی اکملیت کو واضح کرنے کے لیے علم تقابلِ ادیان سے استفادہ کیا۔ دنیا کی دیگر تہذیبوں کے مطالعے اور علم الآثار وغیرہ سے بھی انھی مقاصد کے لیے فائدہ اٹھایا۔ ان خصوصیات کے ساتھ قاضی صاحب کی کتاب بنیادی طور پر صحیح اور مستند مصادر پر مبنی ہے اور ہر طرح کے غلو سے پاک ہے۔ اس میں احوال و واقعات کا صحیح علمی تجزیہ کیا گیا ہے۔ ''رحمۃ للعالمین'' نے سیرت نویسوں، خصوصاً برصغیر کے لکھنے والوں کو ایک نئی راہ دکھائی۔

ان کے بعد فرانسیسی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ ؒ کی لکھی ہوئی کتاب Le Prophete de l' Islam (پیغمبرِ اسلام) اہم ترین ہے۔ اس کے مطالعے سے ہزارہا کی تعداد میں پڑھے لکھے عیسائی نوجوان مسلمان ہوئے۔ ایسی کاوشوں کے نتیجے میں مستشرقین اور ان کے افکار سے متأثر ہونے والے مسلمان مؤرخوں، سیرت نگاروں اور مصنفوں کا جادو ٹوٹ چکا ہے۔

مولانا شبلی اور سیرۃ النبی

رحمۃ للعالمین کی پہلی جلد 1912ء (بمطابق 1330ھ) میں شائع ہوئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی ؒ کے بقول

اسی سال (1330ھ) میں مولانا شبلی نے بھی سیرت پر ایک کتاب لکھنے کی ذمہ داری اٹھائی جس کا ارادہ وہ کئی سال پہلے باندھ چکے تھے۔[1] نومبر 1914ء میں علامہ شبلی کا انتقال ہوا تو پہلی جلد کا مسودہ مع مقدمہ مکمل ہو چکا تھا۔ اسے ان کے بعد سید سلیمان ندوی نے شائع کیا اور باقی کتاب مکمل کی۔ مولانا شبلی کا مقصود بھی یہی تھا کہ مستشرقین نے جو گرد اڑائی ہے، اسے صاف کیا جائے اور مستند مآخذ سے سیرت پر ایک تفصیلی کتاب مرتب کی جائے۔ مولانا نے اپنی تالیف میں مستشرقین کے اعتراضات کا رد کیا، ان کی غلط تعبیرات کی وضاحت کی اور زیادہ تر واقعاتِ سیرت صحیح مآخذ سے اخذ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جس طرح ان کے اکثر تذکرہ نویس کہتے ہیں کہ وہ اثر پذیر مزاج رکھتے تھے اور بہت سے معاملات میں سرسید سے متاثر اور ان کے مداح تھے، انھوں نے سرسید کے مذہبی نظریات کو تو قبول نہیں کیا لیکن سرسید کی طرح اسلامی مآخذ پر مستشرقین کی عقلی تنقید سے مرعوب ضرور ہوئے۔

مستشرقین نے کتبِ حدیث اور مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتبِ سیرت پر نقدِ متون کے حوالے سے جو اعتراضات کیے، شبلی نے سرسید کی طرح ان کا جواب دینے کے لیے یہ طریقہ اپنایا کہ درایت کو مستشرقین کے نقدِ متون کے طریقوں کے مترادف قرار دیتے ہوئے، ویسے ہی طریقوں کے اثبات کے لیے دلائل تلاش کرنے کی کوشش کی جو مغربی محققین تاریخ نویسی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مولانا شبلی کو اپنی آراء کے حق میں جو دلائل ملے، سیرت پر اپنی کتاب کے مقدمے میں انھوں نے ان کو خوب پھیلا کر پیش کیا۔ بعد ازاں ان کے نقطۂ نظر سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جن کا مشن اپنی اپنی عقل کو معیار بنا کر صحیح ترین مرویات کو رد کرنا اور رسول اللہ ﷺ کے لائے اور سمجھائے ہوئے اسلام کے بجائے اپنی خواہشات کے مطابق تیار کردہ خود ساختہ دین کو اسلام کا نام دینا تھا۔

مولانا شبلی کے تصورِ درایت کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہوگا کہ قارئینِ کرام محدثینِ کرام کے معیارِ صحت پر ایک نظر ڈال لیں۔ اس کے بعد مستشرقین کے اپنے طریقِ کار اور مولانا شبلی کے افکار کا جائزہ لینا موزوں رہے گا۔

سیرت کے حوالے سے محدثین کا معیارِ صحت

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا ہر پہلو ہر مسلمان کے لیے ذریعۂ ہدایت اور نمونۂ عمل ہے۔ اس حوالے سے بنیادی ضرورت اس بات کی تھی کہ آپ ﷺ کے بارے میں دی گئی ہر خبر درست اور مکمل طور پر قابلِ اعتماد ہو۔ احادیث بیان کرنے والوں نے اسی مقصد کے حصول کے لیے اسانید کا اہتمام کیا۔ محدثین نے اسی غرض سے نقدِ حدیث اور

[1] سیرۃ النبی ﷺ، دیباچہ طبع اول: 15/1.

رواۃ کی جرح وتعدیل دونوں کے لیے بے مثال قواعد وضوابط وضع کیے جوفن اسماء الرجال اور اصولِ جرح وتعدیل کہلاتے ہیں۔ نقد وتحقیق کے ان اصولوں کے ذریعے سے امت کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ وہ صحیح احادیث سے اپنے لیے دین کے احکام معلوم کریں اور بوقتِ ضرورت نئے پیش آنے والے مسائل کے لیے اجتہاد کی بنیاد بنائیں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور کبار تابعین رحمہم اللہ نے سیرت کے معاملے میں بھی روزِ اول سے یہی طریق کار اپنایا۔ لیکن جب سیرت کو مستقل حیثیت ملی اور اس کی مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا تو محتاط محدثین کے علاوہ نسبتاً کم محتاط لوگ بھی اس میدان میں داخل ہو گئے۔ ایسے مؤلفین سیرت کی روایات کا وہ معیار برقرار نہ رکھ سکے جو صحابہ اور تابعین کے ابتدائی زمانے تک ملحوظ رکھا گیا تھا۔

امام زہری رحمہ اللہ کے شاگردوں ہی کے دور میں تساہل اور تسامح کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اس کا اندازہ محدثین کی ان اخبار و آراء سے ہوسکتا ہے جو انھوں نے مرویاتِ سیرت کے حوالے سے امام زہری کے شاگرد اور مغازی کے امام ابنِ اسحاق کا مرتبہ متعین کرتے ہوئے بیان کیں۔ یحییٰ بن سعید اموی نے جو حدیث اور سیرت دونوں کے امام ہیں، ان کے بارے میں کہا: ''ابن اسحاق ناموں میں تصحیف (تلفظ اور املا کی غلطی) کرتے ہیں کیونکہ انھوں نے یہ نام (سرکاری) رجسٹر سے لیے۔'' [1]

اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جن شخصیات کے انھوں نے نام لیے، ان کو وہ جانتے تک نہ تھے۔ رجسٹر سے نام لے کر روایت بیان کر دی۔

ابن اسحاق پر یہ بھی الزام لگا کہ انھوں نے ہشام بن عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کی اہلیہ فاطمہ سے سیرت کی جو روایات بیان کیں، وہ انھوں نے ان سے نہیں سنی تھیں۔ لیکن تحقیق سے چونکہ ان پر غلط بیانی کا یہ الزام ثابت نہ ہوا، اس لیے امام احمد سمیت متعدد ائمۂ فن نے اس معاملے میں ان کا دفاع کیا۔

امام ذہبی نے ان کے بارے میں سب سے زیادہ مثبت رائے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن وہ بھی ان کی مکمل توثیق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں:

فَلَهُ ارْتِفَاعٌ بِحَسَبِهِ، وَلَا سِيَّمَا فِي السِّيَرِ، وَ أَمَّا فِي أَحَادِيثِ الْأَحْكَامِ فَيَنْحَطُّ حَدِيثُهُ فِيهَا عَنْ رُتْبَةِ الصِّحَّةِ إِلٰى رُتْبَةِ الْحَسَنِ إِلَّا فِيمَا شَذَّ فِيهِ، فَإِنَّهُ يُعَدُّ مُنْكَرًا. [2]

وہ یہ بھی کہتے ہیں:

---

[1] تصحيفات المحدثين: 26/1، السيرة النبوية للعمري، مقدمة: 57/1. [2] سير أعلام النبلاء: 41/7.

فَكِتَابُهُ مُحْتَاجٌ إِلَى تَنْقِيحٍ وَّ تَصْحِيحٍ وَّ رِوَايَةِ مَا فَاتَهُ.[1]

وہ مانتے ہیں کہ ابن اسحاق:

كَانَ أَحَدَ أَوْعِيَةِ الْعِلْمِ حِبْرًا فِي مَعْرِفَةِ الْمَغَازِي وَالسِّيَرِ وَلَيْسَ بِذَاكَ الْمُتْقِنِ فَانْحَطَّ حَدِيثُهُ عَنْ رُتْبَةِ الصِّحَّةِ، وَهُوَ صَدُوقٌ فِي نَفْسِهِ مَرْضِيٌّ.[2]

لیکن میزان الاعتدال میں ان کی سیرت کے حوالے سے یہ بھی کہتے ہیں:

صَالِحُ الْحَدِيثِ مَالَهُ عِنْدِي ذَنْبٌ إِلَّا مَا قَدْ حَشَا فِي السِّيرَةِ مِنَ الْأَشْيَاءِ الْمُنْكَرَةِ الْمُنْقَطِعَةِ.[3]

جب ایسے ماہرِ سیرت نے، جو فی نفسہ ''صَدُوق'' اور ''مَرْضِي'' ہے، سیرت پر مرتب کردہ اپنی کتاب میں منکر اور منقطع چیزیں بھردی ہیں تو اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سیرت کے معاملے میں دوسرے لوگوں کا حال کیا ہوگا؟

محتاط محدثین نے مغازی میں ابن اسحاق کی روایات خوب چھان پھٹک کے قبول کیں۔ صرف وہی روایات لیں جو قابلِ قبول ہوسکتی تھیں۔ کم درجے کی روایات مسترد کردیں۔ سیرت عام تاریخ سے مختلف ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے احوال ہیں جن کی اتباع واجب ہے۔ آپ کی طرف کوئی بھی ایسی بات منسوب کرنا جو صحت کے اعتبار سے مشکوک ہو، انتہائی معیوب بات، بلکہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اس لیے سیرت میں بھی محدثینِ کرام ہی کا معیار اپنانا ناگزیر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ادب کا تقاضا بھی یہی ہے۔ تصدیقِ اخبار میں، محدثین کا معیار انسانی تاریخ کا محتاط ترین معیار ہے۔

محدثین کے معیار کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا کوئی فرمان یا آپ کے بارے میں کوئی خبر اس صحابی سے لی جاتی ہے جو خود سامع یا عینی شاہد ہو۔ صحابہ کے بیان کرنے کا طریق کار یہ تھا کہ وہ حدیث کو مختلف مجالس میں لوگوں کے سامنے بار بار بیان کرتے تھے۔ ان سے سننے والے شاگرد (تابعین) عموماً اس بات کو بعینہٖ صحابی کے لفظوں ہی میں، حفظ و کتابت دونوں طریقوں سے، محفوظ کرتے تھے۔ اس کے ساتھ وہ اصل موقع پر موجود دیگر صحابہ سے بھی اس حدیث کے بارے میں دریافت کرتے تاکہ تمام حالات وظروف اور تمام تر تفصیلات سامنے آجائیں۔ اگر کہیں اختلاف کا شائبہ ہوتا تو دوبارہ اسی صحابی سے رجوع کرتے جس سے پہلے سنا تھا اور وضاحت چاہتے۔ اس طرح

[1] سير أعلام النبلاء: 116/6. [2] تذكرة الحفاظ: 130/1. [3] ميزان الاعتدال: 469/3.

زیادہ سے زیادہ تفصیلات سامنے آنے سے پوری بات واضح ہوجاتی۔ کئی بار خود صحابہ بھی اپنے شاگردوں کو بیان کردہ واقعے کے دوران میں موجود دوسرے صحابہ کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کرتے۔ اگر ایک صحابی خود موقع پر موجود نہ تھے تو جس سے انھوں نے حدیث سنی، اس کی طرف یا موقع پر موجود کسی دوسرے صحابی کی طرف رجوع کرنے کا کہتے۔ مقصد یہ تھا کہ ان کا بیان کردہ واقعہ یا حدیث واضح اور یقینی صورت میں آگے پہنچے۔

صحابہ کے شاگردوں سے سننے والے تابعین اور اتباعِ تابعین بھی اسی طریقے سے احادیث حاصل کرتے تھے۔ اگر بیان کرنے والے صحابی زندہ ہوتے تو کوشش کی جاتی کہ بالواسطہ سننے کے بعد براہِ راست ان سے بھی وہی حدیث سنی جائے۔ اتباعِ تابعین نے یہ بھی اہتمام کیا کہ اپنے اساتذہ، یعنی تابعین کے مختلف زمانوں کے زیادہ سے زیادہ شاگردوں سے وہی حدیث سن کر اس بات کی توثیق کریں کہ بیان کرنے والے استاد نے زندگی کے ہر دور میں وہ حدیث ایک ہی طرح بیان کی، کبھی بیان میں اختلاط تو نہیں ہوا۔

صحابہ کے بعد ہر راوی کی عدالت (گواہی میں سچا ہونا)، ان کے حفظ، ضبط، ذاتی کردار اور خیالات و افکار حتی کہ مذہبی اور سیاسی میلانات تک کا جائزہ لیا گیا۔

محدثین نے ہزاروں راویوں کے بارے میں یہ سب تفصیلات جمع کیں اور اپنی کتابوں میں محفوظ کیں۔ اس بات تک کا ریکارڈ رکھا گیا کہ ایک بیان کرنے والا جس سے بیان کر رہا ہے، اس سے زندگی میں کبھی ملا بھی تھا یا نہیں؟ بعض محدثین اتنے زیادہ محتاط ہیں کہ صرف ملاقات کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ حدیث سننے کی وضاحت تلاش کرتے ہیں۔ اس بات کا ریکارڈ بھی محفوظ کیا گیا کہ کون سا راوی کس استاد سے کس دور میں ملا۔ یہ بھی محفوظ ہے کہ فلاں فلاں شاگرد اپنے استاد سے بڑھاپے میں ملے اور یہ بھی کہ بڑھاپے میں شیخ کے حافظے کا کیا عالم تھا؟ اس بات کا بھی ریکارڈ رکھا گیا اور صحت و ضعف کا فیصلہ کرنے کے لیے اس کا جائزہ لیا گیا کہ کس راوی سے، تنقیدی نظر رکھنے والے کتنے ثقہ محدثین نے روایت کی اور کون ہے جس کی روایات کو محتاط لوگوں نے قابلِ توجہ نہ سمجھا۔

مسلمانوں کا سرمایۂ افتخار

رسول اللہ ﷺ کی اخبار و احادیث کے بارے میں یہ سب ریکارڈ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور کے محدثین کی مجموعی کاوشوں سے حاصل ہوا اور محفوظ رکھا گیا۔ مسلمانوں کے علاوہ کسی قوم نے اپنے دین، اپنے رسول کے فرامین و احوال اور اپنی تاریخ کو محفوظ رکھنے کے لیے ایسے کسی انتظام کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ دوسری امتوں نے اپنے اپنے انبیاء کی جو تاریخ مرتب کی، وہ اصل واقعات سے کٹے ہوئے نامعلوم لوگوں کی تحریروں، سنی سنائی مبالغہ آمیز

باتوں اور عوامی داستان طرازوں کی کہانیوں سے عبارت ہے۔ اس میں جگہ جگہ داخلی تضادات نمایاں ہیں۔ اس قسم کے مواد کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک مغربی مؤرخ یا تذکرہ نویس مختلف قرائن کے ذریعے سے جن کی تفصیل آگے آرہی ہے، اس کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے اور اس میں سے کچھ مواد کو قابلِ اعتماد اور کچھ کو ناقابلِ اعتماد قرار دیتا ہے۔ اس رد وقبول میں عموماً مؤرخ کے عقائد ونظریات، مختلف دینی، قومی اور معاشرتی مصلحتیں اور ذاتی میلانات جو ہر مؤرخ کے پیشِ نظر ہوتے ہیں، بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

ایک مغربی مؤرخ جب ازمنہ وسطیٰ یا ان سے پہلے کی تاریخ لکھنے بیٹھتا ہے تو اس دور کے تمدن، اس کی معاشرت، سیاسی اور اقتصادی حالت بلکہ اس دور کی اہم شخصیتوں کے افکار واحوال کا ایک خیالی نقشہ، جو زیادہ تر پرانے زمانے کے کھنڈروں سے ملنے والی اشیاء، کتبوں اور سکوں وغیرہ کے ذریعے سے بنایا گیا ہوتا ہے، اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے، پھر اس زمانے کے بارے میں معروف روایات یا بہت بعد کے مؤرخوں کے بیانات اور قصے کہانیوں کے ایسے حصے جو اس کے بنیادی تصور سے ٹکرانے والے نہیں ہوتے، ان کو الگ کر لیتا ہے، پھر جن باتوں کو ملا کر ایک مسلسل کہانی بن سکتی ہے، ان کو لے کر ایک کہانی تیار کر لیتا ہے۔ مغرب میں اسے نقدِ متون کا طریقِ تحقیق کہا جاتا ہے۔ اس طریقے سے تیار کردہ تاریخ میں مختلف لوگوں کی کاوشوں کے نتائج ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے درمیان تضادات ناگزیر ہوتے ہیں۔ ہر نیا لکھنے والا پہلے لکھنے والوں کی پرزور تردید کرتا اور نئی ''تھیوری'' پیش کرتا ہے۔ ایسی تاریخ سمجھ دار قارئین کے ہاں کسی طور قابلِ اعتماد نہیں ٹھہر سکتی۔

نقدِ متون کے ان طریقوں کو اپنانے کے جو نتائج سامنے آئے ہیں، وہ خاصے عبرت ناک ہیں۔ مغرب کے بڑے بڑے سکالرز حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام جیسی شخصیتوں کے وجود اور عدمِ وجود تک کے بارے میں بے یقینی کا شکار ہیں۔ جو لوگ ان پیغمبروں کے وجود کے قائل ہیں، وہ نقدِ متون کے مغربی طریق کو استعمال کرتے ہوئے جن نتائج تک پہنچے ہیں، ان کی رو سے حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ علیہما السلام جیسی شخصیتوں کے نقوشِ حیات پیغمبروں کی شخصیتوں سے بہت کم مرتبہ نظر آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ماننے والے انھیں اور سب کچھ مان سکتے ہیں لیکن ایسی شخصیتیں نہیں مانتے جن کی غیر مشروط اطاعت کی جا سکے۔

دوسری طرف محدثین نے نقدِ سند کے ذریعے سے صحتِ نقل کا ایسا اہتمام کیا جس میں ذاتی رجحانات اور میلانات کا کوئی دخل نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ کی جلیل القدر شخصیتوں کے صحیح اور سچی باتوں پر مشتمل ایسے خدوخال سامنے آتے ہیں جن کی وجہ سے فطری طور پر انسانوں کے دلوں میں ان کے بارے میں انتہائی محبت اور حد درجہ

احترام کے جذبات ابھرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے نقوش اتنے فطری، اتنے تابناک اور اتنے واضح ہیں کہ غور سے ان کا مطالعہ کرنے والا ہر سلیم الطبع انسان آپ ﷺ پر ایمان لانے کو ناگزیر سمجھتا ہے۔

محدثین اور نقدِ متون

جس طرح پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے نقدِ متون سے پہلے حفظِ متون کا انتظام کیا۔ اس کے لیے روایت کو زبانی اور لکھ کر دونوں طریقوں سے محفوظ کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ اس کے بعد نقدِ متون کے اصول لاگو ہوئے۔ ہر لفظ کی متعدد بیان کرنے والوں سے توثیق کی گئی۔ جس روایت میں لفظی شذوذ نظر آیا، مسترد کر دی گئی۔ جس متن میں علت پائی گئی، مسترد ہوا۔ جس روایت کی زبان کمزور اور معنی کم مرتبہ ہو یا فصاحت اس درجے کی نہ ہو جو درجہ رسول اللہ ﷺ کی فصاحت کا تھا، اسے بھی اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔ متن کے اضطراب، مُدرج عبارات (اصل کے علاوہ دوسری عبارات کی شمولیت) حتی کہ تصحیف (نقطوں یا زیر زبر کی تبدیلی) تک کا خیال رکھا گیا۔ یہ سب نقدِ متون کی معقول ترین صورتیں ہیں۔ نقدِ متون میں محدثین کی احتیاط کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب کوئی محدث یہ کہتا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے تو وہ اشارہ کر رہا ہوتا ہے کہ اس نے سند کی صحت کی جانچ کر لی، اس کے متن میں کوئی بات ہوسکتی ہے جس کی تحقیق الگ سے ضروری ہوگی۔

مسلمانوں کے ہاں نقدِ متون کے اہتمام کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ محدث سب سے پہلے بیان کیے گئے قابلِ اعتماد متون کو جمع کرتا ہے اور ان کو مرتب کرتا ہے، پھر تفصیلات کی کمی کے سبب سے اگر کوئی تضاد سامنے آئے تو پھر وہ تمام ایسی روایات سے واقعے اور بیانات کی پوری تفصیلات جمع کرتا ہے جو انتہائی ضعیف، شاذ، منکر اور وضعی نہ ہوں۔ اگر ایک سے زیادہ بیان کرنے والوں سے ایسی تفصیلات مل جائیں جن سے تضاد یا اختلاف رفع ہوسکتا ہو تو ان پر غور کرتا ہے۔ کبھی اسے مختلف بیانات میں تطبیق کی ضرورت ہو تو اس کے لیے اس کے پاس تطبیقِ روایات کے انتہائی منطقی طریقے بھی موجود ہیں۔ صدیوں سے محدثین کے اصولوں کے مطابق نقدِ اسناد اور نقدِ متون کا سلسلہ جاری ہے۔ اس طریق کار پر عمل کرنے والوں کو آج تک کبھی ایسی روایات کو یکسر رد کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی جو صحیح سند سے مروی ہوں۔

بعض اوقات جب مختلف درجے کی روایات کی بنا پر، واقعات کی تاریخوں (ماہ و سال) یا مختلف مقامات و حوادث کی ترتیب میں اختلاف سامنے آتا ہے تو ترجیح کی ضرورت پیش آتی ہے، مثلاً: اکثر اصحابِ مغازی نے غزوۂ بنی مصطلق کو چھ ہجری کا واقعہ بتایا ہے جبکہ محدث و مؤرخ موسیٰ بن عقبہ اور ان کے بعد ابن قیم اور ذہبی نے اس کا سن وقوع

چار ہجری قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس کی دلیل یہ دی ہے کہ صحیح روایات کے مطابق، اس میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی شرکت ثابت ہے اور وہ غزوۂ بنو قریظہ کے بعد جلد ہی شہادت پا گئے تھے۔ یہ ترجیح کی مضبوط بنیاد ہے۔

اسی طرح امام بخاری نے ابن اسحاق اور واقدی جیسے اصحابِ مغازی کے برعکس اس بات کو ترجیح دی ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع خیبر کے بعد ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ صحیح تر روایات کے مطابق اس میں ابو موسیٰ اشعری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی شرکت ثابت ہے اور وہ فتح خیبر کے فوراً بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ترجیح کا اصول یہی ہے کہ صحیح روایت کو ضعیف پر اور صحیح تر کو صحیح پر تفوق حاصل ہے۔

ایک مسلمان محدث، مؤرخ اور سیرت نویس کے سامنے ایسا مواد موجود ہوتا ہے جو صحتِ سند اور صحتِ متن دونوں کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے۔ اسے محض اٹکل پچو سے، ملے جلے اور زیادہ تر ناقابلِ اعتماد مواد میں سے نسبتاً بہتر اور قابلِ استعمال جزئیات منتخب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ وہ نقدِ متون کے حوالے سے اہلِ مغرب کے تخمینی طریقوں کا محتاج نہیں۔ وہ صحتِ نقل کے بہترین اہتمام کے ساتھ میسر انتہائی قابلِ اعتماد بیانات کو استعمال کرتا ہے۔ اسے جس قسم کے نقدِ متن کی ضرورت ہے، وہ یقیناً اہلِ مغرب کے نقدِ متن سے مختلف ہے۔

اہلِ مغرب کے اصول غیر متعلق ہیں

اہلِ مغرب کے سے عقلی معیاروں کو اپنانے کے نتائج خاصے مضحکہ خیز ہو سکتے ہیں، مثلاً: جو کچھ غزوۂ بدر میں پیش آیا، اسے اہلِ مغرب کی مادی عقلیت تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں۔ ان کے مطابق عقلی طور پر یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ تین سو سے کچھ زائد لوگ جن کے پاس اس دور کا رائج اسلحہ بھی بہت کم مقدار میں موجود تھا، ایک ہزار کی پوری طرح مسلح فوج کو شکست دیں، ان میں سے ستر کو مار ڈالیں اور ستر کو قید کر لیں، چنانچہ وہ اس واقعے کے مادی اسباب کے بارے میں بہت دور کی کوڑیاں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مشرکین کی شکست کا سبب کبھی تو اس امکان کو ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی فوج پیاس سے جاں بہ لب ہو گئی ہوگی جبکہ وہ لوگ بھی جو اس وقت مشرکین کی فوج میں شامل تھے، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جنگ سے ایک رات قبل خوب بارش ہوئی تھی۔ کافروں کو تو رسد کے اعلیٰ انتظامات کی بنا پر پہلے بھی پانی کا مسئلہ درپیش نہ تھا۔ وہ مسلمان تھے جنھیں پانی کی قلت کا مسئلہ درپیش تھا اور انھوں نے اس بارش سے اچھی طرح فائدہ اٹھایا۔

مقتولوں اور قیدیوں کی تعداد بھی ناقابلِ یقین ہے۔ لیکن اپنے مقتولین پر اہلِ مکہ کے مرثیے شہادت دیتے ہیں کہ مکہ کا کوئی گھرانہ ایسا نہ بچا تھا جس کا کوئی فرد قتل نہ ہوا ہو۔ دوسری طرف مسلمانوں نے اپنے مقتولین کی تعداد

کبھی گھٹا کر پیش نہ کی۔ بدر کے بعد اُحد میں جب قریشِ مکہ نے ستر مسلمان شہید کیے اور ابوسفیان نے پکار کر کہا: ''یہ دن بدر کے دن کا بدلہ ہے'' [1] تو مسلمانوں نے یہ نہ کہا کہ ہمارے مقتولوں کی تعداد تمھارے مقتولوں کی نسبت کم ہے۔ صحابہ نے خود بھی ہمیشہ یہی تعداد بتائی اور اُحد میں اپنے شدید نقصان کا اعتراف کیا اور اس کے حقیقی اسباب بھی بتائے۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایک غیر معمولی سالار تھے، جنگ احد میں ان کی چال سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچا تھا۔ بعد کی تمام جنگوں کے نتائج دیکھتے ہوئے خالد خود ہی دل سے اس بات کے قائل ہو گئے کہ مسلمانوں کو، عام انسانی سوچ سے ماورا، جو کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں، ان کا سبب صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ حق کے پیروکار ہیں۔ ان کا فلسفۂ زندگی (عقیدہ) اعلیٰ اور ارفع ہے اور انھیں اس پر پورا یقین ہے۔ اسی وجہ سے وہ بے دھڑک اللہ کی راہ میں جان کی بازی لگا دیتے ہیں، پھر انھیں اللہ کی مدد بھی حاصل ہوتی ہے۔ اسی یقین کی بنا پر خالد رضی اللہ عنہ بغیر کسی لالچ یا اکراہ کے خود حاضر ہو کر مسلمان ہوئے۔ اسلام کو اپنانے کے بعد ان کی صلاحیتوں کو چار چاند لگ گئے۔ بعد میں انھوں نے خود مسلمان فوج کی بہت کم تعداد کے ساتھ بہت بڑی، زیادہ مسلح اور انتہائی تجربہ کار افواج کو بار بار شکست دی اور دنیا کی عسکری تاریخ کا چمکتا ہوا ستارہ بن گئے۔ اسلام لانے کے بعد سچے نظریۂ زندگی کے غلبے کا معجزہ خود ان کے ہاتھوں سے ظہور پذیر ہونے لگا۔

کئی مسلمان سیرت نگار اور مؤرخ بھی نقدِ متن کے اس طریقے سے از حد مرعوب ہوئے جو اہلِ مغرب نے اپنی ضرورتوں اور خاص تعصب کے تحت اختیار کیا۔ عرب میں ''احمد امین'' اور ہندوستان میں ''علامہ شبلی نعمانی'' اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ دونوں حضرات اور ان کے مؤیدین یہ ثابت کرنے میں لگ گئے کہ مسلمانوں کے ہاں بھی عقلی بنیادوں پر نقدِ متن کا طریقہ موجود ہے۔

مولانا شبلی اور درایت

مولانا شبلی نے اس غرض سے محدثین کی اصطلاح ''درایت'' کو بنیاد بنایا۔ اس بات کی پوری تحقیق کرنے کے بجائے کہ محدثین اور ائمۂ فن کے نزدیک درایت کی اصطلاح کن معنوں میں استعمال ہوتی ہے، انھوں نے اپنے خیال کے مطابق یہ سمجھ لیا کہ ''علم الروایہ'' جرح و تعدیل کے اصولوں کے مطابق اسانید کو پرکھنے اور ''علم الدرایہ'' عقل و قیاس سے صحیح روایات کو مسترد کرنے کا نام ہے، حالانکہ فقہائے محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ

[1] صحيح البخاري: 3039.

درایت نام ہی جرح و تعدیل کے اصولوں کے ذریعے سے سند اور راویوں کو پرکھنے اور ان کی بیان کردہ شرائط کی روشنی میں صحیح وضعیف روایات کا تعین کرنے کا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں علم الروایہ نام ہے رسول اللہ ﷺ کے اپنے اقوال و افعال اور ان کو روایت کرنے، یاد رکھنے اور سیکھ لینے کا۔

علامہ شبلی نے اس بحث میں سب سے زیادہ حوالے اصولِ حدیث میں امام سیوطی کی معروف کتاب تدریب الراوی سے دیے ہیں۔ اسی میں ابن الاکفانی (م794ھ) کے حوالے سے واضح طور پر لکھا ہوا ہے:

عِلْمُ الْحَدِيثِ الْخَاصُّ بِالرِّوَايَةِ: عِلْمٌ يَشْتَمِلُ عَلٰى أَقْوَالِ النَّبِيِّ ﷺ وَ أَفْعَالِهِ وَرِوَايَتِهَا وَضَبْطِهَا وَ تَحْرِيرِ أَلْفَاظِهَا.

”علم الروایہ مشتمل ہے نبی کریم ﷺ کے اقوال و اعمال پر اور ان کو روایت کرنے، یاد رکھنے اور اس کے الفاظ کو لکھنے پر۔“

پھر علم الدرایہ کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

وَ عِلْمُ الْحَدِيثِ الْخَاصُّ بِالدِّرَايَةِ : عِلْمٌ يُعْرَفُ مِنْهُ حَقِيقَةُ الرِّوَايَةِ وَ شُرُوطُهَا وَ أَنْوَاعُهَا وَأَحْكَامُهَا وَ حَالُ الرُّوَاةِ وَ شُرُوطُهُمْ، وَ أَصْنَافُ الْمَرْوِيَّاتِ، وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهَا.

”علم الدرایہ وہ علم ہے جس کے ذریعے سے روایت کی حقیقت، اس کی شروط، انواع، اس کے بارے میں احکام، راویوں کے حالات، ان کی شروط، مرویات کی اصناف اور متعلقہ امور کو جانا جاتا ہے۔“

امام سیوطی رحمہ اللہ نے درایت کی اس تعریف کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ حقیقت سے مراد سنت کو نقل کرنے کا طریقہ اور حَدَّثَنَا یا أَخْبَرَنَا جیسے الفاظ سے اس کی اسناد کو بیان کرنا ہے۔ درایت کی شروط سے مراد اس امر کی وضاحت ہے کہ کس طرح روایت حاصل کی گئی: سماع، عرض یا اجازت وغیرہ۔ انواع کے تحت یہ آتا ہے کہ روایت متصل ہے، منقطع ہے یا کیا ہے؟ روایت کے بارے میں احکام یہ ہوتے ہیں کہ وہ روایت قبول کی جا سکتی (صحیح) ہے یا مسترد (ضعیف)۔ راویوں کے حال سے مراد ان کے عادل یا مجروح ہونے کا بیان ہے۔ شروط سے مراد راوی کے حدیث حاصل کرنے اور آگے پہنچانے کی شروط ہیں۔ مرویات کی اصناف سے مراد کتبِ حدیث کا مُسْنَد یا مُعجم یا جزء وغیرہ کی صورت میں ہونا اور یہ کہ مرویات احادیثِ رسول اللہ ﷺ ہیں یا آثارِ صحابہ۔ متعلقہ امور سے مراد، فنِ مصطلح الحدیث ہے۔[1]

[1] تدریب الراوي: 22,21/1.

مختصر لفظوں میں علم درایت وہ علم ہے جس کے ذریعے سے راوی اور روایت کردہ حدیث کے بارے میں معلوم کیا جاتا ہے کہ وہ قابلِ قبول (صحیح) ہے یا مسترد کر دینے کے قابل (ضعیف) ہے۔[1]

مولانا شبلی کے دلائل کا تجزیہ

مولانا شبلی نے درایت کی اصطلاح بالکل الٹ مفہوم میں پیش کرتے ہوئے عقل و قیاس کی بنیاد پر صحیح روایت کو مسترد کرنے کے حق میں دلائل دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے اختیار کیے گئے مفہوم کے مطابق درایت کی ابتدا پر بات کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عقل و قیاس کی بنا پر حدیث کو رد کرنے کا یہ اصول قرآن مجید نے قائم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اس طرح اس خبر کو مشہور کیا کہ بعض صحابہ تک مغالطے میں آ گئے۔ چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ سیدنا حسان رضی اللہ عنہ بھی قاذفین میں شریک تھے اور اسی وجہ سے ان پر حد قذف جاری کی گئی۔ قرآن مجید میں بھی اس کی تصریح ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ﴾ ''جن لوگوں نے تہمت لگائی، وہ تمھارے گروہ میں سے ہیں۔''[2]

تفسیر جلالین میں ﴿ مِّنْكُمْ ﴾ کی تفسیر حسبِ ذیل کی ہے: جَمَاعَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ یعنی یہ تہمت لگانے والے مسلمانوں کا ایک گروہ ہے۔[3]

قرآن مجید کی آیتیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت اور طہارت کے متعلق جو نازل ہوئیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

﴿ وَلَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ○ ﴾

''اور جب تم نے سنا تو یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہم کو ایسی بات بولنا مناسب نہیں، سبحان اللہ! یہ بڑا بہتان ہے۔''[4]

عام اصول کی بنا پر اس خبر کی تحقیق کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے راویوں کے نام دریافت کیے جاتے، پھر دیکھا جاتا کہ وہ ثقہ اور صحیح الروایہ ہیں یا نہیں؟ پھر ان کی شہادت لی جاتی لیکن اللہ نے اس آیت میں فرمایا کہ سننے کے ساتھ تم نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ بہتان ہے۔ اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا خلافِ قیاس جو واقعہ بیان کیا جائے، قطعاً سمجھ لینا چاہیے کہ غلط ہے۔ اس طرزِ تحقیق، یعنی درایت کی ابتدا خود صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں ہو چکی تھی۔''[5]

---

[1] توجیه النظر إلٰی أصول الأثر :792/1. [2] النّور 11:24. [3] تفسیر الجلالین، النّور 11:24. [4] النّور 16:24. [5] سیرة النبی ﷺ، مقدمہ :39/1.

علامہ شبلی نے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ﴾ کا ترجمہ ''جن لوگوں نے تہمت لگائی'' کیا ہے۔ اس سے اگلی آیتوں کا ترجمہ بھی انھوں نے اسی کے مطابق کیا ہے۔ جبکہ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کا ترجمہ اس طرح ہے: ''جو لوگ لائے ہیں یہ طوفان۔'' ان الفاظ سے اور اس کے بعد قرآن کے پورے بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو تہمت لگانے والے نہیں، لانے والے ہیں۔ یہ تہمت کہیں اور گھڑی گئی۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ ایک بری تہمت مسلمانوں میں پھیلائی جائے۔ اسے مسلمانوں میں پھیلانے کے لیے کچھ سادہ مسلمانوں کو استعمال کیا گیا۔ قرآن مجید کی متعلقہ آیات اور ان کا ترجمہ یہ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ۚ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ۗ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ۝ لَوْلَا جَآءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ ۚ فَاِذْ لَمْ يَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْ مَآ اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۝ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

''جو لوگ لائے ہیں یہ طوفان تمھی میں ایک جماعت ہیں، تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو بلکہ تمھارے حق میں یہ بہتر ہے، ان میں سے ہر آدمی کو پہنچنا ہے جتنا گناہ اس نے کمایا اور ان میں سے جس نے اس کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے، اس کے لیے بڑا عذاب ہے۔ کیوں نہ (ہوا کہ) جب تم نے اس کو سنا تھا تو مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے لوگوں کے بارے میں اچھا خیال کیا ہوتا اور کہا ہوتا: یہ صریح طوفان ہے۔ وہ لوگ اس بات پر چار گواہ کیوں نہ لائے؟ پھر جب وہ گواہ نہ لائے تو وہی لوگ اللہ کے ہاں جھوٹے ہیں۔ اور اگر تم پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو جو چرچا تم نے کیا، اس میں تم پر کوئی بہت بڑا عذاب پڑتا۔ جب تم اس کو اپنی زبانوں پر لینے لگے اور اپنے منہ سے بولنے لگے (وہ بات) جس کا تمھیں علم نہ تھا اور تم اسے ہلکی بات سمجھتے تھے جبکہ اللہ کے ہاں وہ بہت بڑی بات تھی۔ اور کیوں نہ (ہوا

کہ) جب تم نے اس کو سنا تھا تو کہا ہوتا: ہم کو لائق نہیں کہ ہم یہ بات بولیں، اللہ تو پاک ہے! یہ ایک بڑا بہتان ہے۔ اللہ تم کو سمجھاتا ہے کہ تم اگر مومن ہو تو ایسا کام کبھی نہ کرو اور اللہ بیان کرتا ہے تمھارے لیے آیتیں، اور اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی (بری تہمت) کا چرچا ہو، ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ (ہر بات کو) جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی اور یہ کہ اللہ نرمی کرنے والا مہربان ہے (تو تہمت لگانے والوں کو فوری عذاب ہو جاتا)۔" [1]

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ 1 یہ خبر نہ تھی، ایک بہت بڑا بہتان تھا۔ 2 بہتان تراشی کا مقصد اگرچہ فساد پھیلانا ہوتا ہے مگر اللہ نے اس کوشش کو بھی خیر میں بدل دیا۔ 3 جن لوگوں نے پیچھے رہ کر بہتان تراشا، وہ سب سے بڑے مجرم ہیں۔ 4 جب کسی مومن مرد یا عورت پر بہتان باندھا جائے تو اس کو سنتے ہی حسنِ ظن ختم نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے قائم رکھنا چاہیے۔ 5 جو لوگ بہتان باندھیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو وہی جھوٹے قرار پائیں گے۔ 6 لوگوں نے اس بہتان کا چرچا کیا، اس بہتان کو اپنی زبانوں سے دہرانے لگے۔ اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو ان پر بڑا عذاب آسکتا تھا کیونکہ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، بہت بڑی بات تھی۔ 7 جب اس کو سنا گیا تو کہہ دینا چاہیے تھا کہ یہ ایک بہتان ہے، ہم اس کو اپنی زبانوں سے آگے نہیں پھیلائیں گے۔

بہتان اور خبر میں فرق

معلوم نہیں یہ کیسے ہوا کہ اللہ نے قرآن میں جس بات کو بار بار بہتان قرار دیا، مولانا شبلی نے اس بہتان کو ایک خبر قرار دے دیا۔ اللہ نے فرمایا: "بہتان پر چار گواہ کیوں نہ لائے!" مولانا نے اس میں بھی ترمیم کر لی اور بہتان تراشنے والوں کو راوی قرار دیتے ہوئے بہتان پر پہلے خبر کے احکام منطبق کرنے کی شرط لگا دی۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس خبر کی تحقیق کا اصل طریقہ یہ تھا کہ پہلے راویوں کے نام دریافت کیے جاتے، پھر دیکھا جاتا کہ وہ ثقہ اور صحیح الروایہ ہیں یا نہیں، پھر ان کی شہادت لی جاتی۔

مولانا بھول گئے کہ خبر اور چیز ہے، بہتان اور چیز ہے۔ اس کی مثال اس طرح ہے: کوئی شخص کہتا ہے کہ فلاں شخص کی بیٹی فلاں سکول میں پڑھتی ہے، تو یہ خبر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ فلاں شخص کی بیٹی فلاں سکول جاتی ہے اس لیے (خدانخواستہ) وہ بدکردار ہے تو یہ بہتان ہے۔ قرآن نے آیت: ﴿ إِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓا ﴾

[1] النور 24:11-20.

''اگر کوئی فاسق تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو۔'' [1] کے تحت خبر پر تحقیق کرنے اور سورہ نور کی پہلے بیان کردہ آیات کے تحت بہتان پر گواہ مانگنے کا حکم دیا ہے۔ لیکن مولانا کا خیال ہے کہ بہتان پر گواہ مانگنے کے بجائے پہلے اس پر خبر کے احکام جاری کیے جاتے، بہتان کے حکم کے مطابق شہادت کا مرحلہ اس کے بعد آنا چاہیے تھا۔ قرآن مجید سے اپنی درایت کے حق میں استدلال کرنے کے لیے مولانا کو یہ انداز اختیار کرنا پڑا۔

آگ پر پکی چیز کھانے کا مسئلہ

علامہ شبلی نے اپنے تصورِ درایت کے حق میں استدلال کرنے کے لیے آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹنے کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے درمیان ہونے والی گفتگو کا بھی حوالہ دیا ہے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان یہ تھا کہ اگر آگ پر پکی چیز کی وجہ سے وضو ضروری ہو تو کیا ہم گھی کھا کر وضو کریں؟ گرم پانی کی وجہ سے وضو کریں؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''بھتیجے! جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کردہ حدیث سنو تو (اس پر عمل کرو) اس پر مثالیں مت دو۔'' [2] علامہ شبلی نے دو صحابہ کے درمیان ہونے والی اس عملی گفتگو کو یہ رنگ دے دیا ہے کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت رد کر دی تھی۔ [3]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے یہ روایت بیان کرتے ہوئے وہیں پر یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے علاوہ ام حبیبہ، ام سلمہ، زید بن ثابت، ابو طلحہ، ابو ایوب اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہم سے بھی اس مسئلے میں اسی کے مطابق احادیث مروی ہیں، گویا نہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تنہا راوی ہیں کہ سمجھنے میں غلطی لگی ہو، نہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس روایت اور اس کے ساتھ مذکورہ بالا چھ صحابہ کی روایت کو رد کیا ہے۔ انھوں نے اپنے سینئر ساتھی کے سامنے ایک علمی مشکل رکھی ہے۔ یہی مناقشۂ علمی کا طریقہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنے موقف میں تنہا نہ تھے، متعدد اجل صحابہ، مثلاً: حضرت ابن عمر، ابو طلحہ، انس بن مالک، ابو موسیٰ، عائشہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کرنے کے قائل تھے۔ [4]

دوسری طرف بھی کچھ صحابہ تھے۔ فریقین کے اپنے اپنے دلائل تھے جو دونوں طرف سے پیش کیے گئے۔ کسی نے کسی کی پیش کی گئی حدیث رد نہیں کی۔ فہم کے حوالے سے سب نے اپنے اپنے دلائل دیے۔ اس علمی مناقشے کے دوران میں کسی کی حدیث رد کرنے کا سوال تک نہ اٹھا۔

---

[1] الحجرٰت 6:49. [2] جامع الترمذي: 79، سنن ابن ماجه: 485. [3] سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، مقدمہ: 40,39/1 و 54. [4] تحفة الأحوذي: 229/1.

علامہ شبلی کے استدلال کو درست مانا جائے تو مسائل کے حوالے سے صحابہ کے درمیان جتنے اختلافات ہوئے، سب میں ایک دوسرے کی روایت کردہ احادیث کو رد کرنا لازم ٹھہرے گا۔ یہ بات سراسر خلافِ حقیقت ہے۔ محدثین نے تحقیق کے بعد وضو کے بارے میں اختلاف کے حوالے سے یہ کہا ہے کہ وضو کرنے اور نہ کرنے میں آخری عمل جو رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے، وہ وضو نہ کرنا ہے۔ [1]

روایات کی صحت وضعف کا فیصلہ

اسی طرح علامہ شبلی نے ابن جوزی اور ملا علی قاری (م 1014ھ) کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک جن روایات کو مشاہدے، محسوسات اور مسلماتِ عقلیہ کے خلاف دیکھو تو سمجھ لو کہ یہ احادیث ضعیف ہیں۔ [2]

ان محدثین میں سے کسی کا بھی یہ موقف ہرگز نہیں کہ ہر انسان اپنی اپنی سوچ، اپنے اپنے محسوسات، مشاہدات اور خودساختہ عقلی اصولوں کو سامنے رکھ کر روایات کی صحت وضعف کا فیصلہ کرتا جائے۔

اصل صورت یہ ہے کہ محدثین نے اسانید کے حوالے سے تمام احادیث کا مجموعی جائزہ لیا اور ضعفِ سند کے علاوہ پائی جانے والی ضعفِ حدیث کی دوسری نشانیاں بھی اکٹھی کر دیں۔ انھوں نے بتایا کہ فلاں فلاں قسم کے مزید نقائص ان احادیث میں پائے جاتے ہیں جو سنداً ضعیف ہیں۔ ملا علی قاری نے اپنی کتاب میں علم الاسانید کے معیار کے مطابق موضوع روایتیں جمع کی ہیں اور آخر میں ان کے عمومی جائزے کے نتائج کے طور پر ان موضوع روایات کی کچھ مزید نشانیوں کو گنوایا ہے۔ ایک نشانی یہ ہے کہ ان میں ایسی باتیں کہی گئی ہوتی ہیں جو انسانی مشاہدے اور مجموعی طور پر انسانوں کے عقلی مسلمات کے خلاف ہوتی ہیں۔ [3] گویا اس میں موضوع روایات میں پائی جانے والی ایک حقیقت کا بیان ہے، نہ یہ کہ اس میں احادیث کے پرکھنے کا اصول بتایا گیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ نشانیاں کسی ایسی حدیث میں کبھی نہیں پائی جاتیں جو معتبر راویوں نے بیان کی ہو اور وہ حدیث شذوذ وعلل سے پاک ہو۔

محض عقل معیار نہیں

حقیقت یہ ہے کہ احادیثِ معراج سے لے کر باقی معجزات تک کے بارے میں مروی تمام صحیح احادیث مستشرقین سمیت بہت سے لوگوں کو خلافِ عقل معلوم ہوتی ہیں لیکن اہلِ ایمان کی عقلیں اس بات کی گواہی دیتی

[1] تحفة الأحوذي: 229/1. [2] سیرۃ النبی ﷺ، مقدمہ: 41,40/1. [3] الموضوعات الكبير للملا علي القاري، ص: 155.

ہیں کہ جو اللہ انسان کو ماں کے پیٹ سے پیدا کرتا ہے، ہڈیوں سمیت اس کے جسم کو بڑھاتا ہے، اسے زمین پر زندہ رکھتا ہے، اسے بیماری سے شفا بخشتا ہے، وہ اللہ ان میں سے جسے چاہے آسمانوں پر بھی بلا سکتا ہے۔ صحابہ سے لے کر آج تک کے تمام محدثین، فقہاء و علماء، بشمول ابن جوزی اور ملا علی قاری، سبھی نے معراج، آپ کے دیگر معجزات اور پہلے انبیاء کے معجزات کو بالکل صحیح تسلیم کیا ہے۔

عقل کی حدود سے ماورا معجزاتی کوائف بیان کرنے والی کسی صحیح حدیث کو مستشرقین اور ان سے مرعوب متجددین کے علاوہ کسی اور نے خلاف عقل ہونے کے سبب نہ ضعیف کہا ہے، نہ رد کیا ہے۔ سائنس اور تحقیق جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے، اس کے ذریعے سے انھی باتوں کی صحت کی زیادہ سے زیادہ شہادتیں سامنے آ رہی ہیں جو پہلے بعض لوگوں کو خلافِ عقل لگتی تھیں۔ اگر محض عقل کو معیار قرار دے دیا جائے تو نہ وحی کا اقرار ممکن ہوگا، نہ فرشتوں کا، نہ موت کے بعد کی زندگی کا، نہ قیامت کا، نہ جنت اور دوزخ کا۔ جو لوگ عقل ہی کو معیار مانتے ہیں، وہ تو اللہ تعالیٰ کے وجود کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ ہر کسی کی عقل الگ الگ سوچتی اور فیصلہ کرتی ہے۔

ائمۂ فقہاء اور محدثین کے نزدیک یہ بات مسلّم ہے کہ جو احادیث سنداً صحیح ہیں، وہ ساری ایک ایمان دار انسان کی عقلِ سلیم کے مطابق ہیں۔ ساری خرابیاں ضعیف اور موضوع احادیث ہی میں پائی جاتی ہیں۔ ایک صاحبِ ایمان کو اس بات کا یقین مطلوب ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے جو خبر اس تک پہنچے، وہ سچی ہو، اس میں کسی جھوٹ کی آمیزش نہ ہو۔ اس کے بعد وہ کسی خاص فرد کی عقل میں آئے یا نہ آئے، اس پر ایمان اور اس کے مطابق عمل لازمی ہوتا ہے۔ محدثین نے جو معیار اپنایا، وہ اسی مقصود کو حاصل کرنے کے لیے ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا جو فرمان اور آپ کا جو عمل روایت کیا گیا ہے، اس کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف صحیح ہو، کسی نے اس کے بیان میں کوئی ملاوٹ کی ہو نہ تبدیلی۔ محدثین کا معیار اپنانے سے یہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔

عقلِ انسانی صحیح حدیث کے فہم اور اس کے مطابق راہِ عمل ڈھونڈنے کا ایک ذریعہ ہے، وہ اس پر جج نہیں۔ وہ استفادہ کرتی ہے، حدیثِ صحیح کے ذریعے سے اپنے فہم کی حدود میں وسعت لاتی ہے، اس کی خوبیوں کو سراہتی ہے اور اس کے لطائف کو ڈھونڈتی اور بیان کرتی ہے۔ اس پر عمل کرنے سے صاحبِ عقلِ سلیم کو سچی لذت حاصل ہوتی ہے جبکہ انکار، تشکیک وغیرہ سے عقل مزید درماندہ اور مضطرب ہوتی ہے، سکون حاصل نہیں کر پاتی۔

علامہ شبلی اپنے مقدمے میں آگے چل کر قیاس و درایت کے زیرِ عنوان اپنے ہی موقف کے بارے میں خود لکھتے ہیں: ''حقیقت یہ ہے کہ اس بحث کا قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ جس روایت کے راوی ثقہ اور

مستند ہوں اور سلسلۂ روایت کہیں سے منقطع نہ ہو، وہ باوجود خلافِ عقل ہونے کے انکار کے قابل نہیں۔'' بطورِ مثال علامہ شبلی نے حافظ ابنِ حجر اور دوسرے معروف شارحِ بخاری علامہ قسطلانی کے اقوال پیش کیے ہیں جن کا مطلب یہی ہے کہ خلافِ عقل نظر آنے کی بنا پر صحیح حدیث کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ [1]

مولانا شبلی نے اتنے بڑے محدثین کے مدلل موقف کو ''عام خیال'' قرار دے دیا ہے جو کسی لحاظ سے مناسب نہیں، کیونکہ یہ ''عام خیال'' نہیں بلکہ اُن محدثین کے مسلمہ اصول ہیں جنھوں نے حفظ و تدوینِ حدیث اور شرحِ حدیث کا مہتم بالشان اور عدیم النظیر کام کیا اور احادیث و رجالِ حدیث کی نقد و تحقیق کے ایسے اصول وضوابط مقرر کیے جن کی نظیر انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس لیے عقل سلیم کا تقاضا ہے کہ قبولِ حدیث اور عدمِ قبول میں محدثین ہی کی بات مانی جائے۔ مسئلہ زیرِ بحث میں ان کا فیصلہ یہی ہے جو خود مولانا شبلی نے مذکورہ اقتباس سے پہلے تحریر کیا ہے: ''عقل کا لفظ ایک غیر مشخص لفظ ہے، حامیانِ روایت لکھتے ہیں کہ اگر اس لفظ کو وسعت دے دی گئی تو ہر شخص جس روایت سے چاہے گا، انکار کر دے گا کہ یہ میرے نزدیک عقل کے خلاف ہے۔''

صحابہ اور عقلی معیار

اس کے بعد مولانا شبلی نے صحابہ کے دو گروہ بناتے ہوئے ایک گروہ کے بارے میں خود اپنی طرف سے یہ فیصلہ دے دیا ہے کہ وہ ''دلائلِ عقلی اور قرائنِ حالی کی بنا پر بعض حدیث کے تسلیم کرنے میں تأمل کرتا ہے۔'' انھوں نے اس کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ ایک مثال حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مذکورہ بالا مناقشے کی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور مثالیں بھی دی ہیں، مثلاً:

- حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے لکھے ہوئے کچھ فیصلے پیش کیے گئے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب تھے۔ حضرت ابنِ عباس ان کی نقل لیتے جاتے تھے اور بعض فیصلے یہ کہہ کر چھوڑتے جاتے تھے: ''اللہ کی قسم! حضرت علی نے یہ فیصلہ نہیں کیا، سوائے یہ کہ (خدانخواستہ) وہ راہ سے ہٹ گئے ہوں۔'' یہ بھی کہ علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب فیصلوں کی ایک کتاب لائی گئی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک گز کے بقدر چھوڑ کر باقی سب کچھ مٹا دیا۔ [2] مولانا شبلی فرماتے ہیں: ''ظاہر ہے کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے صرف اُن فیصلوں کے مضمون سے یہ قیاس کر لیا کہ وہ صحیح نہیں ہو سکتے، اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ رُواۃ اور سند کا پتہ لگائیں۔'' [3]

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے سند کا پتہ لگانے کی ضرورت اس لیے نہ سمجھی کہ خود روایت کے الفاظ سے ثابت ہے

[1] سیرۃ النبی ﷺ، مقدمہ: 54,53/1. [2] صحیح مسلم، مقدمۃ: 23,22. [3] سیرۃ النبی ﷺ، مقدمہ: 55,54/1.

کہ وہ فیصلے غیر متعین ذرائع کی طرف سے لائے گئے تھے اور وہ لکھے ہوئے تھے، ان کا کوئی راوی یا گواہ نہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے زندگی کا بہت بڑا حصہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ گزارا تھا۔ حضرت علی کے فیصلوں سے ان کی نسبت زیادہ آگاہ اور کوئی نہ تھا۔ ایسی بے سند تحریر جب ان کے سامنے لائی گئی تو انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وہ فیصلے رہنے دیے جو انھیں معلوم تھا کہ صحیح ہیں، باقی سب قلم زد کر دیے۔ وہاں راویوں کا ذکر تک نہ تھا، وہ تحقیق کن کے بارے میں کرتے۔

- حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول پیش فرمایا کہ ''جو شخص لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کہے گا (اصل روایت میں ساتھ یہ الفاظ ہیں: يَبْتَغِي بِذَالِكَ وَجْهَ اللّٰهِ ''وہ اس کے ساتھ اللہ کی رضا تلاش کرے'') تو اللہ تعالیٰ اس پر آگ حرام کر دے گا۔'' اس پر ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم! میں کبھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ جو تم کہتے ہو، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہوگا۔'' [1]

علامہ شبلی رحمہ اللہ اس پر فرماتے ہیں: ''اگرچہ صحیح بخاری میں ہے کہ محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ نے مدینہ آکر اس حدیث کی تصدیق اپنے راوی (عتبان رضی اللہ عنہ) سے کر لی لیکن اس سے اصل مسئلے پر اثر نہیں پڑتا۔ حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ کو جن اسباب کی بنا پر محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ کی روایت میں شبہ پیدا ہوا، عتبان رضی اللہ عنہ پر بھی وہی شبہ پیدا ہو سکتا تھا۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ خدانخواستہ محمود رضی اللہ عنہ کو غلط گو نہیں سمجھتے تھے، بلکہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے روایت کا مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہوگی۔'' [2]

محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ نے بچپن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت محمود رضی اللہ عنہ پانچ سال کے تھے۔ انھوں نے حضرت عتبان رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث سنی تھی۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کو پہلے سے یہ حدیث معلوم نہ تھی۔ انھوں نے ایسی بات پہلے نہ سننے اور حضرت محمود رضی اللہ عنہ کی صغر سنی کی بنا پر ایک خاص تبصرہ فرمایا۔ یہ مولانا شبلی کا محض اپنا مفروضہ ہے کہ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ اگر یہ روایت براہ راست عتبان رضی اللہ عنہ سے سنتے تو بھی یہی تبصرہ کرتے یا انھوں نے یہ تبصرہ حدیث کے درایتاً، عقل و قیاس کے خلاف ہونے کی بنا پر کیا تھا۔ یہ روایت کسی صورت عقل و قیاس کے خلاف ہے ہی نہیں۔ کیا اللہ شرک کے علاوہ دوسرے گناہ نہیں بخش سکتا؟

جو کچھ محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ نے روایت کیا، وہ تو مسلّمات دینیہ میں سے ہے۔ قرآن مجید میں اس بات کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے:

---

[1] صحيح البخاري: 1186، صحيح مسلم: (264)-657. [2] سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، مقدمہ: 55/1.

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ﴾

”بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشتا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے اور بخشتا ہے جو کچھ اس سے نیچے ہے، جس کے لیے چاہے۔“ [1]

قرآن مجید کی اس آیت کو حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ خلاف عقل کیونکر سمجھ سکتے تھے؟ اس معنی کی احادیث حضرت عتبان رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر کئی صحابہ نے بھی روایت کی ہیں۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی بات کی نسبت کے بارے میں حد درجہ احتیاط کی تلقین کرنا تھا، اسی لیے حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ نے صحتِ نقل کے حوالے سے دوبارہ یقین حاصل کیا۔ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک صحت نقل کے بجائے عقل و قیاس پر انحصار کی گنجائش ہوتی تو حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ کو دوبارہ جا کر حضرت عتبان رضی اللہ عنہ سے روایت کی تصدیق کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ عقلی دلیل کے ذریعے سے حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کو مطمئن کر دیتے۔

روایتِ تیمّم، عمار اور عمر رضی اللہ عنہما

- تیمّم کے بارے میں عمار رضی اللہ عنہ کی روایت سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تبصرہ: ”اِتَّقِ اللّٰهَ يَا عَمَّارُ!“ عقل و قیاس کی بنا پر صحیح احادیث کو رد کرنے کے لیے ہرگز نہ تھا۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی بات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تسلی نہ ہونے کا تأثر بھی یکسر غلط ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حافظے میں تیمّم کی پوری جزئیات محفوظ نہ رہی تھیں، حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے ان کو یاد دلایا کہ سفر میں پانی نہ ملنے کے باعث تیمّم کی ضرورت خود انھیں، یعنی حضرت عمر اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما دونوں کو ایک ساتھ پیش آئی تھی۔ دونوں کے لیے غسل واجب ہوگیا تھا لیکن پانی موجود نہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طہارت نہ ہونے کی وجہ سے نماز نہ پڑھی جبکہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے مٹی میں لوٹ لگائی اور واپس آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب ماجرا سنا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وضو کے بدلے سکھائے گئے تیمّم کی تعلیم دے کر فرمایا: ”تمھارے لیے یہی کافی تھا۔“ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے یاد دلانے کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یاد نہ آیا۔ [2] ان کی عدمِ تسلی کی حقیقت یہ تھی کہ انھیں سرے سے اپنے اور عمار رضی اللہ عنہ کے ساتھ گزرا واقعہ ہی یاد نہ رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کیفیت میں فرمایا: اِتَّقِ اللّٰهَ يَا عَمَّارُ! ”عمار! اللہ سے ڈرو۔“ مقصود یہ تھا کہ مجھے تو سرے سے واقعہ یاد ہی نہیں آ رہا۔ تم اس کے بیان کرنے میں پوری احتیاط ملحوظ رکھو۔ چونکہ یہ سارا معاملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یاد تک نہ تھا، اس لیے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما نے اس موقع پر یہ بھی

[1] النسآء 4:48. [2] صحيح البخاري: 338 و 347.

فرمایا: إِنْ شِئْتَ لَمْ أُحَدِّثْ بِهِ ''اگر آپ چاہیں تو میں یہ حدیث بیان نہ کروں گا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (سن کر یہ نہیں کہا: ہاں ٹھیک ہے بلکہ اس کے برعکس یہ) کہا: نُوَلِّيكَ مَا تَوَلَّيْتَ ''ہم اس ذمہ داری کو تمھارے ہی سپرد کرتے ہیں جو تم نے اٹھائی ہے۔'' [1] یعنی بشرطِ احتیاط ان سے روایت بیان کرنے کو کہا۔ اس صورت میں اس واقعے سے مولانا شبلی کا عقل و قیاس کی بنا پر حدیث رد کرنے کا استدلال کیسے درست ہو سکتا ہے!

نوحہ کرنے پر مُردے کو عذاب اور سماعِ میت

- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نوحہ کرنے سے مردے کو عذاب دینے والی روایت پر یہ اعتراض ضرور کیا کہ یہ قرآن کی آیت: ''کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا'' [2] کے خلاف ہے۔ [3] انھوں نے اسے عقل و قیاس کے خلاف قرار دیا نہ رد کیا۔ اس مسئلے پر صحابہ کا اختلاف ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اعتراض قرآن اور صحیح حدیث میں تطبیق سے رفع ہوسکتا ہے، چنانچہ محدثین نے بجا طور پر دونوں باتوں میں اس طرح تطبیق دی کہ اگر عرب کے پرانے جاہلی دستور کے مطابق مرنے والا اپنے پیچھے نوحہ کرنے کی تلقین کر جائے تو اس بات پر اسے عذاب ہوگا۔
- بدر کے کافر مقتولین کے بارے میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس وقت میں جو کہہ رہا ہوں، یہ سن رہے ہیں۔'' اس پر بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہی اعتراض کیا کہ یہ قرآن کی اس آیت کے خلاف ہے کہ آپ ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں ہیں۔ [4] انھوں نے اسے خلافِ عقل قرار دے کر مسترد نہیں کیا۔ ان کا یہ تبصرہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری بات نہ پہنچنے کے سبب سے تھا۔ پوری بات یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ''اللہ نے اس موقع کے لیے ان کی روحیں لوٹا دی ہیں اور اس گھڑی وہ میری بات تم سے بھی زیادہ سن رہے ہیں۔'' روایت کے اس حصے کے سامنے آنے کے بعد یہ اعتراض رفع ہو جاتا ہے کہ یہ روایت قرآن کے خلاف ہے۔
- طلاق یافتہ عورت کی عدت کے دوران میں اس کے نان ونفقہ کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی روایت پر عمل نہ کیا۔ اس کا سبب عمر رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں بتایا کہ یہ عقل و قیاس کے خلاف ہے، اس لیے اس پر عمل نہیں کریں گے۔ بلکہ واضح طور پر فرمایا: لَا نَدْرِي لَعَلَّهَا حَفِظَتْ أَوْ نَسِيَتْ ''ہمیں معلوم

[1] صحيح مسلم :368. [2] الأنعام164:6. [3] صحيح البخاري :1288. [4] صحيح البخاري :3979-3981.

نہیں شاید انھوں (فاطمہ) نے بات ٹھیک طرح سے یاد رکھی یا بھول گئیں۔" پھر عمر رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی آیت:
﴿لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ﴾ (الطلاق 65:1)
"تم انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں مگر یہ کہ وہ کوئی کھلی بے حیائی کریں" کے عموم سے استدلال کیا کہ مطلقہ کو خرچ ملنا چاہیے۔[1] گویا حضرت عمر کو اس کے بارے میں تردد اس لیے تھا کہ ممکن ہے فاطمہ بنت قیس کو نسیان ہوا ہو۔

محدثین نے وضاحت کی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث صحیح ہے جس سے مطلقہ ثلاثہ بائنہ کی بابت یہ حکم ثابت ہوتا ہے کہ وہ نان و نفقہ اور سکنیٰ کی مستحق نہیں اور قرآن کا جو حکم ہے، اس کا تعلق ان عورتوں سے ہے جو مطلقہ رجعیہ ہیں۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا موقف وہی ہے جو فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کا تھا اور وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں اس عورت کے لیے رہائش اور خرچ کا اثبات کہاں ہے جسے تین طلاقیں ہو چکی ہوں؟ اس حدیث سے چونکہ متعدد مسائل کا استنباط ہوتا ہے، اس لیے تمام ائمہ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔

صحابہ نے، بعض اوقات پہلے سے معلوم نہ ہونے کی بنا پر، کسی صحیح خبر پر تعجب کا اظہار کیا یا تاکید چاہی یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح کسی کے حافظے کے بارے میں تردد کا اظہار کیا تو اس وجہ سے ان کی طرف یہ بات کسی صورت منسوب نہیں کی جاسکتی کہ انھوں نے عقل و قیاس کی بنیاد پر صحیح خبر کو رد کیا۔

بعض مشکل احادیث کے حوالے سے کچھ محدثین نے اگر یہ کہا ہے کہ ان کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا یا یہ کہا ہے کہ اس حوالے سے فلاں مشکل پیش آتی ہے تو یہ بھی صحیح حدیث کا رد نہیں، بلکہ اس کے برعکس یہ حدیث کی قبولیت اور اس کے مکمل فہم میں اپنی تقصیر کا اعتراف ہے۔ یہی درست طرزِ عمل بھی ہے۔

کم عمر صحابہ کی روایت

علامہ شبلی نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدمے میں ایک عنوان یہ قائم کیا ہے: "نوعیتِ واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار نہیں قائم کیا گیا۔" اس میں وہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ثقہ راوی کوئی ایسا معمولی واقعہ بیان کرتا ہے جو عموماً پیش آتا ہے تو بلا تکلف روایت تسلیم کر لی جائے گی لیکن کوئی اگر غیر معمولی، تجربۂ عام کے خلاف، گرد و پیش کے واقعات سے مناسبت نہ رکھنے والا واقعہ بیان کرتا ہے تو "معمولی درجۂ وثوق" کافی نہیں ہوسکتا۔ ساتھ ہی فرماتے ہیں، مثلاً: "ایک بحث یہ ہے کہ روایت کرنے کے لیے کسی عمر کی قید ہے یا نہیں؟ اکثر محدثین کا مذہب ہے کہ 5 برس

[1] صحيح مسلم: 1480، فتح الباري: 595,594/9.

کا لڑکا حدیث روایت کرسکتا ہے یا مثلاً: اگر کسی صحابی نے 5 برس کی عمر میں آنحضرت ﷺ کے کسی قول یا فعل کی روایت کی تو قابلِ اعتبار ہوگی؟" [1]

یہاں مشکل یہ ہے کہ علامہ شبلی کے ہاں متعدد الگ الگ معاملات ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہوگئے ہیں۔ انھوں نے عام کم عمر راوی اور کم سن صحابی دونوں کی روایت کی قبولیت کو مختلف فیہ قرار دیا ہے، حالانکہ قبولیتِ روایت کے لیے عمر کی بحث غیر صحابہ کے لیے ہے، صحابہ کے لیے نہیں۔ بلکہ جو محدثین کم عمر راوی کی قبولیت کے حق میں ہیں، انھوں نے اپنے موقف کے حق میں اسی بات سے استدلال کیا ہے کہ جب کم عمر صحابہ کی روایات سب کے نزدیک قابل قبول ہیں تو دوسرے کم عمر ثقہ راویوں کی روایت قبول کرنے میں کیا حرج ہے؟! نیز انھوں نے یہ استدلال صرف حضرت محمود بن ربیع رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نہیں کیا بلکہ کم سن صحابہ کی ایک پوری جماعت ہے۔ ان سب صحابہ کرام کی روایات قبول کرنے پر تمام ائمہ امت کا اجماع ہے۔ علامہ شبلی نے اپنے مقدمے میں جس کتاب (فتح المغیث) کے بار بار حوالے دیے ہیں، اسی میں پوری بات کی وضاحت ان الفاظ میں موجود ہے:

وَرُدَّ عَلَى الْقَائِلِينَ بِعَدَمِ قَبُولِ الصَّبِيِّ بِإِجْمَاعِ الْأَئِمَّةِ عَلَى قَبُولِ حَدِيثِ جَمَاعَةٍ مِّنْ صِغَارِ الصَّحَابَةِ مِمَّا تَحَمَّلُوهُ فِي حَالِ الصِّغَرِ كَالسِّبْطَيْنِ وَهُمَا الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ ابْنَا ابْنَتِهِ فَاطِمَةَ الزَّهْرَاءِ، وَالْعَبَادِلَةِ ابْنِ جَعْفَرِ بْنِ أَبِي طَالِبٍ، وَابْنِ الزُّبَيْرِ، وَابْنِ عَبَّاسٍ، وَالنُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ، وَالسَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ، وَالْمِسْوَرِبْنِ مَخْرَمَةَ، وَأَنَسٍ، وَمَسْلَمَةَ بْنِ مُخَلَّدٍ، وَعُمَرَ بْنِ أَبِي سَلَمَةَ، وَيُوسُفَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ، وَأَبِي الطُّفَيْلِ وَعَائِشَةَ وَنَحْوِهِمْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ مِّنْ غَيْرِ فَرْقٍ بَيْنَ مَا تَحَمَّلُوهُ قَبْلَ الْبُلُوغِ وَبَعْدَهُ.

"جن لوگوں نے بچے کی روایت قبول نہ کرنے کی بات کی ہے، ان کی تردید اس بات سے کی گئی ہے کہ تمام ائمہ کا کم عمر صحابہ کی پوری جماعت کی احادیث قبول کرنے پر اجماع ہے جو انھوں نے کم سنی کے عالم میں حاصل کیں (یا بیان کیں)، جیسے رسول اللہ ﷺ کے دونوں نواسے حسن اور حسین ہیں، جو آپ کی دختر سیدہ فاطمہ زہراء کے فرزند ہیں اور تینوں عبد اللہ (یعنی) عبد اللہ بن جعفر بن ابی طالب، عبد اللہ بن زبیر اور عبد اللہ بن عباس، نعمان بن بشیر، سائب بن یزید، مسور بن مخرمہ، انس، مسلمہ بن مخلد، عمر بن ابی سلمہ (ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے فرزند)، یوسف بن عبد اللہ بن سلام، ابوطفیل، حضرت عائشہ اور دیگر (کم عمر صحابہ) ہیں رضی اللہ عنہم۔ اس بات

[1] سیرۃ النبی ﷺ، مقدمہ: 48/1.

سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ انھوں نے حدیث بلوغت سے قبل لی (اور بیان کی) یا بعد میں۔" [1]

ہجرت کے حوالے سے روایتِ عائشہ پر انحصار

علامہ شبلی نے پانچ برس کے صحابی اور دوسرے کم عمر راویوں کو ایک ساتھ ملا کر کم عمر صحابہ کی روایات کو بھی نہ صرف ایک اختلافی مسئلہ بنا دیا ہے بلکہ اہم نوعیت کے واقعات کے لیے اسے کم معیار کی شہادت قرار دیا ہے۔ اب چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنے موقف کے مطابق اپنی تالیف کردہ سیرت النبی میں کم سن صحابہ کی روایت پر انحصار نہ کرتے لیکن انھوں نے اکثر مقامات پر کم سن صحابہ کی روایات ہی کو بنیاد بنایا۔ اس کی ایک مثال رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کا واقعہ ہے، لکھتے ہیں: "(ہجرت کی) یہ داستان نہایت پُر اثر ہے اور اسی وجہ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی لکھا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گو اس وقت سات آٹھ برس کی تھیں لیکن ان کا بیان درحقیقت خود رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ انھی سے سن کر کہا ہوگا اور ابتدائے واقعہ میں وہ خود بھی موجود تھیں۔" [2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت چھ سال کی ہوئی تھیں، ساتویں کا آغاز ہی ہوا تھا۔ [3] سات آٹھ برس کہنا درست نہیں۔ نیز ان کے ایک ایک لفظ سے واضح ہوتا ہے کہ ابتدائے واقعہ کو وہ اپنے مشاہدے کے مطابق بیان کر رہی ہیں۔ مولانا شبلی نے ہجرت کے حوالے سے کم سن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اسی پورے بیان پر انحصار کیا ہے۔

کم سن صحابہ کی سب روایات صحیح ہیں

محدثین کے ہاں یہ بات مسلّم ہے کہ جن کم سن صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا یا آپ سے سنا، اس وقت کے حالات وظروف کے عین مطابق، ان کی پوری توجہ مکمل طور پر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے قول وعمل پر مرکوز تھی اور بعد میں بھی ساری زندگی رہی۔ انھوں نے اپنے خاندان کے افراد اور دوسرے صحابہ سے بھی انتہائی توجہ اور اہتمام سے روایات سنیں۔ بعد ازاں اپنی معلومات کی توثیق بھی کی اور ان میں توسیع بھی کی۔ انھوں نے جو بھی روایات بیان کیں، وہ سب کی سب صحیح ہیں۔

اس صورتِ حال میں ان کے مقدمے کا ایک قاری یہ سمجھ لینے میں حق بجانب ہے کہ کم سن صحابہ کی روایات کی قبولیت کو دیگر راویوں کے ساتھ خلط کرنے یا کسی راوی کی طرف سے اپنی روایات میں قیاس آرائی کی شمولیت کی

[1] فتح المغیث: 151,150/2. [2] سیرۃ النبی ﷺ: 161/1. [3] الإصابة: 232,231/8.

بحث اور قیاس و درایت کی بنا پر احادیث کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں صحابہ کے دو گروہ بنانے کی کھکھیڑ انھوں نے اپنی کتاب سیرت النبی میں قبولِ روایات کا معیار واضح کرنے کے لیے نہیں اٹھائی بلکہ ان کا اصل مقصد اس مقدمے کے مباحث کے ذریعے سے بعض ایسے فقہی قیاسات کا دفاع کرنا تھا جن کے بارے میں یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ صحیح اور صریح احادیث کے خلاف ہیں۔

پہلے تو علامہ شبلی نے ''معمولی درجۂ وثوق'' رکھنے والے راوی سے ایسے واقعے کو قبول کرنے پر اعتراض کیا جو ''گردوپیش کے واقعات سے مناسبت نہیں رکھتا۔''[1] لیکن آگے چل کر وہ کہتے ہیں: ''یورپ کے اصولِ تنقیحِ شہادت اور ہمارے اصولِ تنقیح میں سخت اختلاف ہے۔ یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب؟ اس کے اخلاق و عادات کیا ہیں؟ حافظہ کیسا ہے؟ اس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ ممکن ہے نہ ضروری ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ فرض کرو ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائنِ موجودہ اور گردوپیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صحت تسلیم کرلی جائے گی۔

بخلاف اس کے مسلمان مؤرخ اور خصوصاً محدثین اس کی پروا نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے بلکہ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ ''اسمائے رجال'' کے دفترِ تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں؟[2] اگر نہیں ہے تو ان کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابلِ اعتنا ہے۔[3] بخلاف اس کے کہ اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا تو گو قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو[4] اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو لیکن اس کی روایت قبول کرلی جائے گی۔''[5]

صحیح روایات خلافِ عقل نہیں، محدثین کا موقف

مولانا شبلی نے اپنے اس بیان میں بھی محدثین کے بارے میں جو کچھ فرمایا، وہ کلی طور پر درست نہیں، بلکہ محدثین

[1] سیرۃ النبی ﷺ، مقدمہ: 48/1. [2] یہ نام بہت زیادہ تحقیق کے بعد درج ہوتا ہے اور اسی کا درج ہوتا ہے جس نے حقائق ثابتہ کے خلاف روایتیں بیان نہ کی ہوں۔ [3] ثقہ سے نیچے صدوق اور مقبول راویوں کی روایات کو بھی قابلِ قبول سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اگر کم درجے کا ضعف ہے، جھوٹ یا روایات وضع کرنے کا الزام نہیں اور مضبوط شواہد موجود ہیں تو ان کی روایت بھی متن پر تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد، قابلِ قبول سمجھی جاتی ہے۔ [4] اگر کسی راوی کی بیان کردہ روایات مضبوط قرائن اور مسلمات کے خلاف ہوں تو یہ بات خود اس کی ثقاہت پر اثر انداز ہوتی ہے۔
[5] سیرۃ النبی ﷺ، مقدمہ: 70,69/1.

کے بارے میں ان کے اپنے ہی بیانات کے خلاف ہے۔ انھوں نے درایت کی اصطلاح کو اپنا مفہوم عطا کرتے ہوئے جو کچھ تحریر فرمایا، اس میں خود تسلیم کرتے ہیں کہ محدثین ہر وہ حدیث جو عقولِ انسانی کے خلاف ہو یا مسلمہ اصولوں کے خلاف، اس کے بارے میں یقین رکھتے ہیں کہ وہ موضوع ہے۔ انھوں نے اس حوالے سے امام ابن جوزی کی عبارت بھی نقل کی ہے۔[1]

امام ابن جوزی نے اپنی عبارت میں عقل کی مخالفت کے حوالے سے بہت محتاط الفاظ استعمال کیے ہیں۔ انھوں نے مخالفِ عقل حدیث نہیں کہا، مخالفِ عقول کہا ہے، یعنی جو سب لوگوں کی عقل کے خلاف ہو کیونکہ اس معاملے میں محض چند انسانوں یا کسی ایک انسان کی عقل معیار نہیں۔ وہ راوی جنھوں نے عقول، اصولِ کتاب و سنت اور اجماعِ قطعی کے خلاف روایات بیان کیں، وہی غیر معتبر راوی ہیں۔ معتبر راوی کوئی ایسی روایت بیان ہی نہیں کرتے جس میں مذکورہ بالا خامیاں پائی جاتی ہوں۔

جس طرح پہلے وضاحت ہو چکی، محدثین نے اصل معیار ثقاہت کو قرار دیا ہے اور ثقاہت کی انتہائی اہم شرط ہے کہ راوی مناکیر روایت نہ کرے۔ جن لوگوں نے عقول، اصول اور حس و مشاہدے کے خلاف روایات بیان کی ہیں، محدثین نے ان میں سے کسی کو ثقہ قرار نہیں دیا۔ اگر کوئی ایسے راویوں کے خلاف جرح ڈھونڈنے کا تکلف نہ بھی کرے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ استقرا سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسی روایات صرف مجروح لوگ ہی بیان کرتے ہیں۔

علامہ شبلی کی ان عبارتوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ انھوں نے درایت و قیاس کے حوالے سے جو کچھ لکھا، اس کے ہر پہلو پر کماحقہ غور نہیں فرمایا۔ اس میں وہ ایک جگہ جو بات کہتے ہیں، دوسری جگہ خود اس کے خلاف موقف اختیار کر لیتے ہیں۔

انھوں نے قیاس و درایت کا جو مفہوم خود متعین کیا ہے، اس کی کئی مثالیں دی ہیں جن میں سے بعض کی حقیقت ہم واضح کر آئے ہیں۔ جو دوسری مثالیں ہیں، ان کا تعلق بھی اختلافِ فہم سے ہے جو بعض مسائل میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان تھا، یا اس کا تعلق پوری حدیث کے علم یا اس کی جزئیات سے بے خبری پر ہے کیونکہ ان میں سے کسی بھی واقعے کا تعلق اس بات سے نہیں تھا کہ صحابہ نے اس حدیث کو عقل و قیاس کے خلاف سمجھا، اس لیے ردّ کر دیا۔

محدثین پر ناروا اعتراض

مولانا شبلی نے محدثین کے بارے میں بھی کئی اور باتیں خلافِ واقعہ کہہ دی ہیں، مثلاً: وہ لکھتے ہیں: ''اس لیے

[1] سیرۃ النبی ﷺ، مقدمہ: 40/1.

ضروری ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کیے ہیں اور جن کو بعض جگہ وہ بھول جاتے ہیں، ان کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔"[1]

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ روایات کی چھان پھٹک کے بارے میں محدثین کرام سے بڑھ کر احتیاط کرنے اور معیار کے بارے میں لچک نہ دکھانے والا طبقہ تاریخِ انسانی میں اور کوئی نہیں۔ وہ کبھی اپنے اصولوں کو نہیں بھولے۔ کاش! مولانا اصول کو فراموش کرنے کی کوئی ادنیٰ سی مثال تو پیش فرما دیتے۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ درایت سے محدثین کی مراد کچھ اور ہے، وہ اسی کے اصولوں کے ہمیشہ پابند رہے جبکہ مولانا درایت کو محدثین کے برعکس اپنی مرضی کا مفہوم دینے کے لیے کوشاں ہیں، حالانکہ محدثین اس مفہوم کو مانتے ہیں نہ اس کے پابند ہو سکتے ہیں۔

اصل مسئلہ یہ نہیں کہ محدثین نے کبھی اللہ پر ایمان رکھنے والے دانا اور سلیم الفطرت انسانوں کی عقول یا اصول یا حس و مشاہدے کے خلاف کوئی روایت قبول کی ہے۔ اصل مسئلہ محض اتنا ہے کہ بعض حضرات نے بعض معاملات میں صحیح احادیث کے خلاف اپنی آراء اور قیاسات کو ترجیح دی ہے۔ یہ ایسی آراء ہیں جن کی بنا پر محدثین صحیح احادیث کو مسترد کرنے کے روادار نہیں۔ مسئلہ عقولِ انسانی کا نہیں، بعض حضرات کی آراء کا ہے جو کبھی اتنی بڑی نہیں ہو سکتیں کہ ان کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ کے ثابت شدہ فرامین کو ترک کر دیا جائے۔

غزوات اور دیگر واقعات میں بھی محدثین کے اصولوں کی پابندی ضروری ہے

ان مباحث کے بعد علامہ شبلی نے اپنی کتاب میں ملحوظ رکھے جانے والے اصولِ تصنیف و ترتیب بیان فرمائے ہیں۔ انھوں نے سیرت کے حوالے سے سب سے مقدم قرآن مجید کو رکھا ہے، پھر احادیثِ صحیحہ کو، اور فرمایا کہ سیرت سے متعلقہ صحیح احادیث انھوں نے کتبِ حدیث سے جمع کی ہیں اور اس کام پر خوب محنت کی ہے۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ احادیثِ صحیحہ کے مقابلے میں انھوں نے اربابِ سِیَر کی روایات کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے روز مرہ اور عام واقعات میں سے "جو واقعات کچھ بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں، ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے۔"[2] ان کے بیان کردہ یہ اصول متفق علیہ ہیں لیکن آگے "استناد اور حوالے" کے زیرِ عنوان یہ بھی فرماتے ہیں: "جو واقعات کسی قدر اہم ہیں ان کے متعلق صرف صحیح حدیثوں یا مستند تاریخی روایتوں کا حوالہ دیا ہے۔ لیکن عام واقعات یا غزوات کے متعلق جزئیات کی تفصیل میں محدثانہ کدّ و کاوش نہیں کی ہے۔"[3]

ہم اس آخری بات سے متفق نہیں ہو سکتے کیونکہ ہماری نظر میں غزوات اور سیرت سے متعلق ہر واقعہ خاص اہمیت

[1] سیرۃ النبی ﷺ، مقدمہ: 70/1. [2] سیرۃ النبی ﷺ، مقدمہ: 71/1. [3] سیرۃ النبی ﷺ، مقدمہ: 72/1.

رکھتا ہے۔ آپ کی ہر بات قابلِ عمل اور ہر ادا قابلِ اتباع ہے۔ اس کے علاوہ یہ معاملہ کسی بھی بات کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنے کا ہے جس میں ذرہ برابر عدمِ احتیاط قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔

استشراق اور عرب مصنفین

جب مغربی استعمار نے مسلم ممالک تک اپنے پنجے پھیلا دیے اور ان میں اپنا نظام تعلیم رائج کر دیا تو عربی زبان میں بھی ایسی تصنیفات سامنے آنے لگیں جن پر مستشرقین کے اسلوب اور ان کے افکار کی چھاپ نمایاں تھی۔ اس سلسلے کی نمایاں کتابوں میں مصر کے معروف ادیب محمد حسین ہیکل کی کتاب ''حیات محمد'' ہے۔ اپنی اس کتاب کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں:

إِنِّي لَمْ آخُذْ بِمَا سَجَّلَتْهُ كُتُبُ السِّيرَةِ وَالْحَدِيثِ، لِأَنَّنِي فَضَّلْتُ أَنْ أَجْرِيَ فِي هٰذَا الْبَحْثِ عَلَى الطَّرِيقَةِ الْعِلْمِيَّةِ .

''جو کچھ سیرت اور حدیث کی کتابوں میں ریکارڈ کیا گیا ہے، میں نے اسے نہیں لیا کیونکہ میں اس تحقیق میں علمی اور سائنسی طریقے پر چلنا چاہتا تھا۔''

کیا علمی اور سائنسی طریقہ یہ ہے کہ جہاں حقائق موجود ہوں، ادھر کا رخ نہ کیا جائے بلکہ ظن وتخمین کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے خود تاریخ سازی کر کے دکھائی جائے؟

ایک اور معروف عرب قلمکار محمد فرید وجدی ہیں۔ انھوں نے السيرة المحمدية تحت ضوء العلم والفلسفة (سیرتِ محمدیہ سائنس اور فلسفے کی روشنی میں) کے عنوان سے مقالات کا ایک سلسلہ سپردِ قلم کیا۔ ان کا مطمحِ نظر ان کے ان الفاظ سے واضح ہو جاتا ہے:

وَقَدْ لَاحَظَ قُرَّاؤُنَا أَنَّنَا نَحْرِصُ كُلَّ الْحِرْصِ فِيمَا نَكْتُبُهُ فِي هٰذِهِ السِّيرَةِ عَلٰى أَلَّا نُسْرِفَ فِي كُلِّ نَاحِيَةٍ إِلٰى نَاحِيَةِ الْإِعْجَازِ، مَا دَامَ يُمْكِنُ تَعْلِيلُهَا بِالْأَسْبَابِ الْعَادِيَةِ، حَتّٰى وَلَوْ بِشَيْءٍ مِّنَ التَّكَلُّفِ .

''ہمارے قارئین نے ملاحظہ کر لیا ہوگا کہ اس سیرت میں ہم نے جو لکھا، اس میں ہم اس بات کے شدید خواہش مند ہیں کہ جب تک عام اور معمول کے اسباب کے ذریعے سے اس کی تعلیل اور وضاحت ممکن ہو، اس کے ہر پہلو کو معجزانہ قرار دینے میں اسراف نہ کریں۔ چاہے ہمیں اس سلسلے میں کسی حد تک تکلف ہی

کیوں نہ کرنا پڑے۔''

یعنی وجدی صاحب کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور آپ کے کارناموں کے غیر معمولی اور معجزانہ پہلوؤں کا انکار ضروری ہے، چاہے اس کے لیے ان کی تاویل کرنے میں کتنا ہی تکلف کیوں نہ کرنا پڑے، چنانچہ وہ ان تمام حقائق کی کوئی نہ کوئی ایسی تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے ذریعے سے اعجاز کی نفی ہو سکے۔

نبوت کی واضح ترین دلیلوں میں سے ایک دلیل اعجاز ہے۔ وجدی صاحب نے سیرت پر ایسے مضامین لکھے ہیں جن کا اصل مقصود یہ ہے کہ سیرت طیبہ کے غیر معمولی اور ارفع و اعلیٰ پہلوؤں کا انکار کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ہر پہلو اور آپ کا ہر کارنامہ اس قدر مکمل، بے مثال اور خوبصورت ہے کہ اس کے سوا اس کی کوئی اور توجیہ ممکن ہی نہیں کہ آپ عام انسان نہیں، نبی ہیں اور سلسلۂ انبیاء میں آپ سب سے افضل، تمام انبیاء کی صفاتِ جمیلہ کا مجموعہ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہیں۔ آپ نے زندگی کے ہر معاملے میں، وہ تمام انسانیت کی مکمل فلاح کے عظیم الشان مشن سے وابستگی ہو، اس کے لیے جان توڑ محنت ہو، اس کے سبب سے آنے والی مشکلات پر صبر ہو، سچائی پر استقامت ہو، مادی اور دنیوی مفادات سے لاتعلقی ہو، بدترین دشمنوں سے صلح جوئی کی کوششیں ہوں، ہر انسان کی بہبود کی مساعی ہوں، مشکل سے مشکل معاملے میں اخلاقِ عالیہ اور صفاتِ فاضلہ کا مظاہرہ ہو، غرض میدان کوئی بھی ہو، آپ نے ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جس سے زیادہ خوبصورت، جس سے زیادہ کامیاب، جس سے زیادہ روشن دوسرا کوئی طرزِ عمل ہو نہیں سکتا۔ یہی تکمیلِ نبوت ہے، یہی سب سے بڑا اعجاز ہے۔

اعجازِ نبوت کا انکار عناد اور کج فکری ہے

دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا معاشرہ اور کوئی ایسی قوم نہیں جس نے اپنے اندر انبیاء کے وجود کا اعتراف نہ کیا ہو۔ کسی نے انھیں اوتار (سنسکرت) کہا، کسی نے وخشور (قدیم فارسی)، کسی نے Apostolos (یونانی) اور کسی نے شلیخ (بمعنی رسول، سخت پیغام لانے والا، عبرانی)[1] کہا۔ قرآن مجید نے کچھ انبیاء کا ذکر کیا، یہود اور نصاریٰ دونوں کے ہاں کچھ مزید انبیاء کے نام بھی آتے ہیں۔ دوسری اقوام کی تاریخ میں بھی کچھ ایسی ہستیوں کے نام موجود ہیں جن کے بارے میں یہی قرینِ قیاس ہے کہ انھوں نے توحید اور مکارمِ اخلاق کا درس دیا۔ ان کے بارے میں گمانِ غالب یہی ہے کہ وہ انبیاء تھے۔ اگرچہ ان کی تعلیمات صحیح طور پر محفوظ نہیں لیکن یہ بات طے ہے کہ دنیا کے ممتاز ترین لوگ جن پر کسی طرح بھی انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی، جن کے نمونۂ عمل سے بہتر نمونۂ عمل کوئی اور پیش نہ کر سکا، جن کے

[1] قاموس الکتاب، ص: 435.

جن کے اخلاقِ عالیہ کی رفعتوں کے سامنے سب کا سر جھکتا ہے، جن کی صفاتِ حسنہ کی تحسین ہر سلیم الفطرت انسان دل کی گہرائیوں سے کرتا ہے اور جن کی مثال پیش کرنے سے انھی جیسے دوسرے انبیاء کے علاوہ کوئی بھی دوسرا شخص قاصر ہے، وہ انبیائے کرام ہی ہیں جن کی صفاتِ عالیہ کی بنا پر دنیا میں ان کے اعمال و افعال کے نتائج غیر معمولی اور حیران کن ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اعجاز کا ایک نمایاں پہلو آپ کی غیر معمولی کامیابیاں بھی ہیں جن کے حصول سے دوسرے عاجز ہیں۔ یہ انصاف نہیں، محض عناد اور کج فکری ہے کہ جان بوجھ کر، تکلف کر کے بھی، اس فضل و کمال سے جس کا دوسرا نام اعجازِ نبوت ہے، انکار کر دیا جائے۔

انکارِ فضل و کمال کی ان کوششوں کے بعد برصغیر (پاک و ہند) کی طرح عرب دنیا میں بھی ان مصنفین کا دور آیا جو اگرچہ کسی حد تک مغربی اسلوب سے متاثر تھے لیکن ان کے ذہنی غلام نہ تھے۔ ان کی اکثریت نئی عرب یونیورسٹیوں کے ساتھ وابستہ تھی۔ ان میں نمایاں محمد خضری بک ہیں۔ چار جلدوں میں ان کی محاضرات في تاريخ الأمم الإسلامية معروف کتابوں میں سے ہے۔ اس کی پہلی نصف جلد سیرت کے بارے میں ہے۔ ان کی دوسری کتاب نور اليقين في سيرة سيد المرسلين خالص سیرت کی کتاب ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ہیں۔ ان کی تاريخ الاسلام کا ایک حصہ سیرت کے لیے خاص ہے۔ ان حضرات کو کسی حد تک علامہ شبلی نعمانی کا مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔

نئے دور کی اہم عربی کتب سیرت

ان کے بعد مستشرقین کے اسلوب کے جواب میں مختلف زبانوں میں لکھنے والے نئے سیرت نگاروں کی ایک کھیپ سامنے آئی۔ انھوں نے اسلامی اصولِ بحث و تحقیق کو اپنایا۔ عرب مصنفین میں سے بعض نے امام ابن قیم کے اسلوب کو اپناتے ہوئے یہ اہتمام کیا ہے کہ سیرت کی بنیاد مقبول روایت پر رکھنے کے ساتھ ساتھ احکام و مسائل کا استنباط بھی کیا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں فقہ السیرۃ کے نام کی دو کتابیں ہیں۔ ایک شیخ محمد غزالی کی تصنیف ہے اور دوسری شیخ محمد سعید رمضان بوطی کی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کی کتاب السيرة النبوية، دروس وعبر میں احکام نہیں بلکہ سیرت سے حاصل ہونے والے اسباق اور حکمتوں کا تذکرہ ہے۔

مستشرقین اور ان سے متاثر ہونے والوں کی کوششوں کے علی الرغم موجودہ دور میں علم حدیث کی کتابوں کی تحقیق اور محدثین کی بہت سی کتابیں شائع ہونے کے نتیجے میں یہ احساس پیدا ہوا کہ سیرت میں قرآن مجید اور اس کے بعد صرف احادیثِ صحیحہ اور تاریخ و سیرت کی سنداً صحیح روایات پر اعتماد کرنا چاہیے۔ شیخ غزالی نے جب اپنی مشہور کتاب

فقہ السیرۃ لکھی اور وہ مقبول ہوئی تو شیخ ناصر الدین البانی نے انھیں قائل کیا کہ ان کی کتاب میں بیان کی گئی روایات کی محدثین کے معیار کے مطابق تخریج ہونی چاہیے۔ ان کی رضا مندی سے جب شیخ البانی نے تحقیق کی تو شیخ غزالی اس پر خاصے اضطراب کا شکار ہوئے، انھوں نے اپنی کتاب کے نئے ایڈیشن میں شیخ البانی کی تحقیقات چھاپنے کی اجازت تو دی اور یہ ان کی علمی عظمت کی نشانی ہے لیکن ساتھ ہی یہ کوشش کی کہ جابجا شیخ البانی کی تحقیقات کے حوالے سے کسی طور پر اپنا دفاع کیا جائے۔ شیخ البانی نے اپنا کام جاری رکھا اور امام ترمذی کی الشمائل المحمدیة کی تحقیق کے بعد اپنے دور کے عظیم محدث، مفسر اور مؤرخ امام ابن کثیر کی السیرۃ النبویة کی روایات پر بھی تحقیق شروع کر دی۔ وہ اسراء اور معراج کے واقعے تک پہنچ پائے تھے کہ اللہ کی طرف سے بلاوا آگیا۔ ان کی تحقیق صحیح السیرۃ النبویة کے نام سے واقعہ معراج تک شائع ہوئی۔

برصغیر میں اس سے پہلے سیرت نویسی کے ارتقاء کے یہ مراحل گزر چکے تھے۔ علامہ شبلی رحمہ اللہ کی سیرت کے بعد مولانا عبدالرؤف دانا پوری نے 1932ء میں اردو میں اصح السیر کے نام سے کتاب لکھی۔ انھوں نے زیادہ انحصار سیرت کی بنیادی کتابوں ہی پر کیا لیکن، حتی المقدور، ان کی روایات کو محدثین کے معیار پر پرکھ کر مقبول روایات کو لیا۔ اگرچہ طریق محدثین پر ہر روایت کے صحیح یا حسن ہونے کا حکم ساتھ ساتھ نہیں لگایا اور مراجع کے حوالے بھی نہیں دیے لیکن عمومی طور پر صحتِ مراجع کا اہتمام کرنے کی کوشش کی۔

عربی زبان میں اس نوع کی کتابوں میں محمد ابوزہرہ کی خاتم النبیین، شیخ محمد عیسیٰ دروزہ کی سیرۃ رسول اللہ ﷺ صور مقتبسة من القرآن الکریم و تحلیلات و دراسات قرآنیة اور شیخ ابوالحسن علی ندوی کی السیرۃ النبویة نمایاں ہیں۔ اس دوران میں صحیح روایات سے مرتب کردہ سیرت کی متعدد کتب منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان میں شیخ صفی الرحمٰن مبارکپوری کی الرحیق المختوم، ڈاکٹر علی الصلابی کی السیرۃ النبویة، محمد صویانی کی السیرۃ النبویة کما جاءت في الأحادیث الصحیحة، ڈاکٹر مہدی رزق اللہ کی السیرۃ النبویة في ضوء المصادر الأصلية اور ڈاکٹر اکرم ضیاء العمری کی السیرۃ النبویة الصحیحة زیادہ اہم اور مقبول کتب ہیں۔ صحیح روایات پر مبنی ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں سامنے آ رہی ہیں۔ سیرت کے مختلف موضوعات پر ڈاکٹر مہدی رزق اللہ اور غالباً ان سے بھی بڑھ کر ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری کی کتابیں، مثلاً: المجتمع المدني بھی سامنے آئی ہیں۔

صحیح حدیث اور صحیح تاریخی روایات

ڈاکٹر عمری نے السیرۃ النبویة الصحیحة کے مقدمے میں لکھا ہے:

وَقَدْ ظَهَرَ جَلِيًّا أَنَّ الْاعْتِمَادَ عَلٰى صَحِيحِ الرِّوَايَاتِ وَ حَسَنِهَا يَكْفُلُ تَوْضِيحَ الْأَبْعَادِ التَّارِيخِيَّةِ لِلسِّيرَةِ النَّبَوِيَّةِ دُونَ حَاجَةٍ إِلَى الضَّعِيفِ مِنَ الرِّوَايَاتِ.[1]

ڈاکٹر عمری نے الصحیح من الحدیث اور الروایة التاریخیة الصحیحة میں فرق کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

شَرْطُ الصَّحِيحِ مِنَ الْحَدِيثِ هُوَ أَنْ يَرْوِيَهُ الْعَدْلُ الضَّابِطُ عَنِ الْعَدْلِ الضَّابِطِ إِلٰى مُنْتَهَاهُ مِنْ غَيْرِ شُذُوذٍ وَّلَا عِلَّةٍ فَشَرْطُ الرِّوَايَةِ التَّارِيخِيَّةِ الصَّحِيحَةِ أَنَّ كُلَّ رُوَاتِهَا الْمُتَعَاقِبِينَ ــ إِلٰى شَاهِدِ الْعِيَانِ ــ مُتَدَيِّنُونَ تَدَيُّنًا صَحِيحًا وَّعِنْدَهُمْ مَلَكَةُ الْحِفْظِ الَّتِي تَمْنَعُ وُقُوعَهُمْ فِي الْأَوْهَامِ وَالتَّخْلِيطِ ......[2]

ڈاکٹر عمری نے تاریخی روایت کے لیے راویوں کے عدل و ضبط کی جگہ ''تدیُّن'' کی جو صفت بیان کی ہے، اس کے بارے میں محدثین کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ تدین کے ہوتے ہوئے بھی لوگوں کی زبان پر جھوٹ جاری رہتا ہے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح کے مقدمے میں اس بات کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔ انھوں نے بیان کیا کہ عبداللہ بن مبارک نے اپنے استاد امام سفیان ثوری سے اس زمانے کے مشہور نیک اور متدین بزرگ عبّاد بن کثیر کے بارے میں پوچھا کہ نیکی کے باوجود وہ جب روایت کرتے ہیں تو غیر معمولی باتیں بیان کر دیتے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جب ان کا ذکر آئے تو میں لوگوں (طالبانِ حدیث) سے کہہ دیا کروں کہ لَا تَأْخُذُوا عَنْهُ ''اس سے روایت نہ لو۔'' انھوں نے فرمایا: کیوں نہیں! ابنِ مبارک فرماتے ہیں: پھر جب کسی مجلس میں میرے سامنے عباد کا ذکر ہوتا تو میں ان کی دین داری کے بارے میں تعریف کرتا لیکن (ساتھ ہی) کہتا: ان سے روایت نہ لو۔''

امام عبداللہ بن مبارک ہی نے بیان کیا کہ وہ امام شعبہ کی خدمت میں پہنچے تو انھوں نے (بھی) فرمایا: یہ عباد بن کثیر ہیں، ان سے دور رہو۔

اسی طرح امام مسلم یحییٰ بن سعید قطان کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں:

لَمْ تَرَ أَهْلَ الْخَيْرِ فِي شَيْءٍ أَكْذَبَ مِنْهُمْ فِي الْحَدِيثِ.

''نیک لوگوں کو تم حدیث سے زیادہ کسی اور چیز میں غلط بیانی کرتے نہ دیکھو گے۔''

وہ کہا کرتے تھے: يَجْرِي الْكَذِبُ عَلٰى لِسَانِهِمْ وَلَا يَتَعَمَّدُونَ الْكَذِبَ.

[1] السيرة النبوية للعمري: 19/1. [2] السيرة النبوية للعمري: 39/1.

''جھوٹ ان کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے، وہ عمداً ایسا نہیں کرتے۔'' [1]

اس کے اسباب میں نقد روایات میں مہارت کی کمی، لوگوں کا دل نرم کرنے کے لیے اپنے خیال کے مطابق غرائب کی طرف رغبت، مزاج کی سادگی بلکہ تحقیق علمی کے بجائے زہد و عبادات کی طرف زیادہ توجہ، ہو سکتے ہیں۔

سیرت کے معاملے میں تساہل کیوں؟

کسی بھی روایت کو قبول کرنے کے بارے میں محدثین نے جو اصول قائم کیے، عقل سلیم، دانائی اور معروضیت کے تقاضوں کے مطابق ان کی نسبت بہتر اصول قائم نہیں کیے جاسکتے۔ راویوں کے درجات قائم کرتے ہوئے انھوں نے ثقہ راویوں کے دو درجے قائم کیے ہیں۔ ان کے بعد صدوق کے دو درجے ہیں۔ ایک صَدُوق یالَا بَأْسَ بِهٖ اور دوسرا صَدُوقٌ يَهِمُ ''سچا ہے کبھی وہم بھی لاحق ہو جاتا ہے۔'' اس کے بعد اس راوی کا درجہ ہے جس سے زیادہ احادیث مروی نہیں (کہ بہت سے لوگوں نے اس کے احوال کھنگالے ہوں) لیکن اس کے بارے میں ایسی کوئی بات ثابت نہیں جس کی وجہ سے اس کی حدیث ترک کرنا ضروری ہو۔ ایسے راوی کا کوئی متابع (مؤید) موجود ہو تو اسے ''مقبول'' کہا جاتا ہے اور اگر متابع نہ ہو تو اسے لَيِّنُ الْحَدِيث قرار دیا جاتا ہے۔ کسی بھی خبر یا گواہی کے حوالے سے اعتماد کا یہ آخری درجہ ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد مستور، ضعیف، مجہول، متروک الحدیث، کذّاب اور وضّاع کے درجات آتے ہیں۔ یہ سب ایسے ہیں کہ ان کی بیان کردہ کسی بات یا چیز کو رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت دینے کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ محدثین جن روایات کو قبول کرتے ہیں، احتیاطاً ان کے راویوں کا درجہ اور روایت کا مرتبہ بھی واضح کر دیتے ہیں۔ [2]

موجودہ دور میں ہمارے بہت سے محتاط سیرت نویس بھی یہ بات کہتے ہیں کہ سیرت پر لکھتے ہوئے وہ روایات جن سے مسائل اور احکام کا استنباط ہو سکتا ہے، ان کے بارے میں سخت احتیاط ضروری ہے لیکن جن روایات سے مسائل و احکام کا استنباط نہیں ہوتا، مثلاً: عمرانی امور، شہروں اور عمارتوں کی نقشہ بندی، نہروں کی کھدائی، یا جنگ کے میدانوں اور ان میں جہاد کرنے والے مجاہدین کی شجاعت اور جاں نثاری کے قصے تو ان میں تساہل برتا جاسکتا ہے۔ [3]

ہم اس معاملے میں ان حضرات سے متفق نہیں۔ عام تاریخ کی بات الگ ہے لیکن جب رسول اللہ ﷺ کی سیرت بیان کی جارہی ہو تو آپ کی طرف کسی بھی بات، کام یا چیز کو منسوب کرنے میں کسی طرح کا تساہل نہیں برتا

---

[1] صحيح مسلم، مقدمة: 38 و 40. [2] مدارج رواۃ کے لیے دیکھیے: تقريب التهذيب، مقدمة المؤلف، ص: 25،24.

[3] السيرة النبوية للعمري: 40/1.

جا سکتا۔ نیز صحیح تر بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ہر بات سے استنباط ہو سکتا ہے۔ آج نہیں ہو سکتا تو کل ایسا ممکن ہے۔ مثال کے طور پر چیزوں یا عمارتوں کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی وغیرہ کے تناسب کا مسئلہ لیجیے کہ پہلے اس پر غور وخوض نہیں کیا جاتا تھا۔ اب ہندسہ اور ریاضی کی ترقی کے بعد ''سنہرے تناسب'' کا تصور سامنے آیا ہے۔ اگر کسی غیر صحیح روایت سے جسم وغیرہ میں بھی ''سنہرے تناسب'' کی نفی ہوتی ہو تو اس کی نسبت آپ ﷺ کی طرف کرنا غلط ہوگا۔ اس طرح جدید دور میں جسم اور سائز وغیرہ کے معاملات بھی انتہائی حزم واحتیاط کا تقاضا کرتے ہیں۔

سیرت کی تدوین میں احتیاط وتوازن

محدثین کے حوالے سے یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ انھوں نے احادیث کی نقل و روایت میں مکمل توازن قائم کیا ہے۔ ایک طرف تو وہ کسی بھی غلط چیز کی نسبت رسولِ اکرم ﷺ کی طرف کرنے کے معاملے میں انتہائی سخت ہیں، دوسری طرف وہ اس بات کا بھی پورا اہتمام کرتے ہیں کہ قابلِ اعتماد اطلاع (Information) کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے۔ وضاحت کے لیے ہم حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی کتاب العجاب في بيان الأسباب کے مخطوطے کی اس عبارت کا حوالہ دینا مناسب سمجھتے ہیں جو ڈاکٹر اکرم ضیاء عمری نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی لائبریری میں موجود نسخے سے نقل کی ہے۔ حافظ صاحب کی عبارت ہے:

فِي طُرُقِ هٰذِهِ الْقِصَّةِ الْقَوِيُّ وَالضَّعِيفُ، وَلَا سَبِيلَ إِلٰى رَدِّ الْجَمِيعِ فَإِنَّهُ يُنَادِي عَلٰى مَنْ أَطْلَقَهُ بِقِلَّةِ الْاِطِّلَاعِ وَالْإِقْدَامِ عَلٰى رَدِّ مَا لَا يَعْلَمُهُ، لٰكِنِ الْأَوْلٰى أَنْ يُّنْظَرَ إِلٰى مَا اخْتَلَفَتْ فِيهِ بِالزِّيَادَةِ وَالنَّقْصِ، فَيُؤْخَذَ بِمَا اجْتَمَعَتْ عَلَيْهِ، وَيُؤْخَذَ مِنَ الْمُخْتَلَفِ مَا قَوِيَ، وَيُطْرَحَ مَا ضَعُفَ وَمَا اضْطَرَبَ، فَإِنَّ الْاِضْطِرَابَ إِذَا بَعُدَ بِهِ الْجَمْعُ بَيْنَ الْمُخْتَلَفِ، وَلَمْ يَتَرَجَّحْ شَيْءٌ مِّنْهُ، اِلْتَحَقَ بِالضَّعِيفِ الْمَرْدُودِ.

''اس قصے کے بارے میں مضبوط روایتیں بھی ہیں اور کمزور بھی، سبھی کو رد کر دینے کا کوئی طریقہ نہیں کیونکہ جو بھی علی الاطلاق ایسا کرے گا، اس کے بارے میں کم علمی کی اور جس چیز کا علم نہیں، اسے رد کر دینے کی بات پورے زور سے کہی جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ مختلف روایات میں جو زیادتی اور کمی ہے، اس پر غور کر کے اس حصے کو قبول کر لیا جائے جس پر اتفاق پایا جاتا ہے، اور جس پر اختلاف ہے، اس میں سے (سنداً) قوی کو لے لیا جائے اور ضعیف اور مضطرب کو رد کر دیا جائے کیونکہ اضطراب کی صورت میں جب ان

روایات کو جن میں اختلاف ہے جمع کرنا ممکن نہ ہو اور کسی کو ترجیح نہ دی جاسکتی ہو تو اسے (بھی) مسترد شدہ ضعیف کے ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔" [1]

ہم سیرت انسائیکلو پیڈیا میں ان شاء اللہ اسی اصول پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ضعیف احادیث کی مدد سے گمشدہ کڑیوں کی تکمیل

السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ کے مصنف نے سیرت کے بیان میں "خلا پر کرنے" (اکمال الفراغ) کی بات کرتے ہوئے فرمایا ہے:

أَمَّا الرِّوَايَاتُ الضَّعِيفَةُ الَّتِي لَا تَقْوٰى أَوْ تَعْتَضِدُ فَيُمْكِنُ الْإِفَادَةُ مِنْهَا فِي إِكْمَالِ الْفَرَاغِ الَّذِي لَا تَسُدُّهُ الرِّوَايَاتُ الصَّحِيحَةُ وَالْحَسَنَةُ عَلٰى أَلَّا تَتَعَلَّقَ بِجَانِبٍ عَقَدِيٍّ أَوْ شَرْعِيٍّ ......

"ایسی ضعیف روایات جن کو (شواہد وغیرہ کے ذریعے سے) قوی اور مضبوط کرنے کی کوئی صورت نہ ہو، ان سے ایسا خلا پُر کرنے کے لیے استفادہ کیا جاسکتا ہے جو صحیح اور حسن روایتیں پُر نہیں کرسکتیں بشرطیکہ ان کا عقیدے یا شرعی پہلو سے کوئی تعلق نہ ہو۔" [2]

اس سلسلے میں پہلی اہم بات تو یہ ہے کہ "فراغ" سے مراد کیا ہے۔ اس کا درست طریقے سے تعین کرنا ضروری ہے، ورنہ بہت سی ضعیف احادیث، مثلاً: واقدی کی روایات، جو کسی نہ کسی پہلو سے کوئی نہ کوئی مزید تفصیل بیان کرتی ہیں، اکمالِ فراغ کے نام پر سیرت میں راہ پا جائیں گی۔ بلکہ بہت سے مصنفین کے ہاں راہ پا چکی ہیں۔ فراغ کے حوالے سے عدم تعیین اور ابہام، ہر قسم کی رطب و یابس روایات کو، سیرت کا حصہ بنانے کا دروازہ کھول دے گا۔

اگر فراغ سے مراد سیرت کے واقعات کی وہ کڑیاں لی جائیں جو سیرت کے فہم، واقعات کی ترتیب اور اس حوالے سے دیگر مشکلات کے حل، مثلاً: بظاہر ایک دوسری سے مختلف روایات کے مابین تطبیق کے لیے ضروری ہیں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ محدثین، مفسرین اور فقہاء کو سیرت کے علاوہ اسبابِ نزول کے واقعات کے حوالے سے بھی بعض اوقات کچھ کڑیاں ڈھونڈنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ محدثین نے سیرت سے متعلق میسر آنے والی ان روایات پر بھرپور کام کیا ہے جو بظاہر محدثین کے معیار پر پوری اترتی دکھائی نہیں دیتیں لیکن ان کے ذریعے سے واقعات کی گم شدہ کڑیاں مکمل کی جاسکتی ہیں، ان روایات کو محدثین نے بہت فحص و جستجو کے ساتھ جمع کیا ہے۔ ان کے مؤیدات تلاش کیے ہیں۔ ان کے متون یا متون کے ضروری اجزاء کی دیگر عقلی اور نقلی ذرائع سے توثیق کی کوشش

[1] السیرۃ النبویۃ للعمري: 41,40/1. [2] السیرۃ النبویۃ للعمري: 40/1.

کی ہے۔ ان کی مساعیِ جمیلہ سے واقعات کی اکثر کڑیاں مکمل ہو گئیں۔

سیرتِ پاک کو غلط روایات سے محفوظ رکھنے اور ضروری کڑیوں کو مکمل کرنے کے لیے یہ اصول اختیار کیا جا سکتا ہے کہ اصل معیار سے کم درجے کی ایسی روایات جنھیں محدثین نے متفقہ طور پر یا ان کی اکثریت نے بحث و تحقیق کے بعد قابلِ اعتنا سمجھا ہے، انھیں بھی، ان کا مرتبہ واضح کرنے کے بعد، اس غرض سے استعمال کیا جائے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں اس حوالے سے بہت کام کیا، مثلاً: وہ ایسی مرسل روایات کو قابلِ اعتنا سمجھتے ہیں جو کسی صحیح روایت سے نہیں ٹکراتیں اور جن پر تمام اربابِ سیر کا اتفاق ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ ایسی کسی روایت کو بیان کرتے ہوئے جرح و تعدیل کے حوالے سے اس کے راویوں کا درجہ اور روایت کا مرتبہ متعین کر کے بتا دیا جائے۔

سیرتِ مبارکہ کی تدوین کے مآخذ اور معیارِ صحت

رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر جو کام ہوا، اس کے عہد بعہد جائزے اور معیارِ صحت سمیت متعلقہ امور پر ضروری بحث کی روشنی میں ہم موجودہ عہد میں سیرت کی تالیف و ترتیب کے اسلوب اور بنیادی اصولوں کا تعین کر سکتے ہیں۔

سیرتِ پاک کا صحیح ترین اور ابدی ماخذ قرآن مجید ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی اسی کا عملی نمونہ ہے۔ قرآن مجید کے ذریعے سے آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے اہم واقعات کا بنیادی خاکہ سامنے آ جاتا ہے۔

دوسرا ماخذ حدیث ہے۔ روزِ اول سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے صحیح احادیث و اخبارِ رسول اللہ ﷺ کے حفظ و بیان کا ایسا مضبوط، مستحکم اور بے عیب طریقہ اختیار کیا جس میں کسی پہلو سے کوئی کمزوری اور خامی موجود نہ تھی۔ احادیث کی کتابت کا آغاز رسول اللہ ﷺ کے حکم یا اجازت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہی کے ہاتھوں ہوا۔ تابعین اور اتباعِ تابعین نے حفظ و کتابت دونوں کا مکمل اہتمام کیا۔

غیر ذمہ دارانہ بیانات اور غیر محفوظ یا من گھڑت روایات کے استرداد کا باقاعدہ آغاز بھی صحابہ ہی کے ذریعے سے ہوا۔ صحابہ نے صحتِ روایت کا انتہائی سخت معیار اپنایا۔ بعد کے ادوار میں یہ اصول سخت سے سخت تر ہوتے گئے۔

تابعین اور اتباعِ تابعین اولین محدث تھے۔ ان کے شاگردوں نے مشرق و مغرب کے ہر محدث سے احادیث لیں اور ساتھ ہی ان تمام کتابوں، صحیفوں اور احادیث کے مجموعوں سے استفادہ کیا جو ان کے اساتذہ نے مرتب کیے تھے، پھر انھوں نے ہی احادیث مبارکہ کو مختلف ترتیبوں سے المصنف، المسند یا صحیح یا سنن کی صورت میں امت کے سامنے پیش کر دیا۔ یہی کتب آج بھی امت کے پاس ہیں اور اس کا انتہائی قیمتی سرمایہ ہیں۔

سیرت کے حوالے سے احادیث، اخبارِ مغازی، سِیَر، شمائل، خصائل اور دلائل النبوۃ کی کتابوں کی صورت میں

مرتب ہوئیں۔ ان تمام عنوانات سے ترتیب و تالیف کا سلسلہ مدتوں جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔ ان تمام عنوانات کے تحت جو وقیع کتابیں اب تک سامنے آئیں، وہ سب کی سب سیرت کے بنیادی مآخذ میں شامل ہیں۔

مسلمانوں نے تاریخ میں بہت وقیع کام کیا۔ صحتِ اخبار کو مطمحِ نظر بنایا۔ تاریخ کی ایک اہم شاخ تاریخِ رجال کا انھوں نے آغاز کیا۔ شہروں، ان میں آباد ہونے والوں اور وہاں آنے جانے والوں کے حوالے سے تاریخ نویسی کا آغاز بھی مسلمانوں نے کیا۔ ابتدائی ادوار کے تاریخ نویسوں نے رسول اللہ ﷺ سے پہلے کے دور، آپ کے عہدِ مبارک اور آپ کی حیاتِ طیبہ کی تفصیلات کے لیے مفصل جلدیں خاص کیں۔ تاریخِ رجال خصوصاً صحابہ کے احوال میں رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک کی بیش از بیش تفصیلات ذکر ہوئیں۔ یہ سب ذخیرہ کتبِ سیرتِ طیبہ کے اہم مصادر میں شامل ہے۔

قدیم و جدید جغرافیہ دانوں اور موجودہ عہد کی اٹلسیں مرتب کرنے والوں نے جو بیش قیمت کام کیا، آج ان سے بھی استفادہ کیے بغیر چارہ نہیں۔

شعر و ادب کے دواوین میں آپ ﷺ کی بعثت سے قبل، آپ کے زمانے اور آپ سے فوری بعد کے زمانے کی شاعری اور نثر محفوظ ہوئی۔ سیرتِ طیبہ کی تدوین کے لیے ان سے بھی استفادہ ناگزیر ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ سے پہلے کی آسمانی کتابیں، دوسری اقوام کی قدیم کتابیں اور دوسرے ادیان کا لٹریچر جس صورت میں بھی محفوظ ہے، اس میں اب بھی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بکثرت پیش گوئیاں، آپ کے خصائل و صفات اور آپ کے عہدِ مبارک کے بارے میں واضح اشارات موجود ہیں۔ آپ ﷺ کی سیرت مرتب کرنے کے لیے ان سے استفادے کی طرح ڈالی جا چکی ہے۔ اب ان کتابوں کو بطورِ مصدرِ سیرت استعمال کرنا ناگزیر ہے۔

مخالفانہ لٹریچر کا علمی و تحقیقی جائزہ

مخالفانہ لٹریچر میں جو کچھ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مشن کے بارے میں کہا گیا ہے، اس کا علمی اور تحقیقی جائزہ بھی ضروری ہے۔ جو کچھ اس میں کہا گیا ہے، اسی کی بنا پر سیرتِ طیبہ پر نئے نئے پہلوؤں سے غور و خوض کے دروازے کھلے ہیں اور مخالفین کے جواب میں اس تازہ غور و خوض کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات اور آپ کے کردار عالمتاب کے نئے سے نئے پُر جمال پہلو سامنے آ رہے ہیں، آپ کے اقوال و اعمال کی نئی سے نئی حکمتیں جلوہ ریز ہو رہی ہیں، اس لیے یہ لٹریچر بھی سیرت کے ناگزیر مراجع میں شامل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا نمونۂ عمل ہدایت اور کامیابی کا ضامن ہے، اس لیے فقہائے محدثین اور ان تمام لوگوں کی

تالیفات جنھوں نے سیرتِ مبارکہ سے دروس، عبر اور احکام کا استخراج کیا، سیرت کے ہر مرتب کے پیش نظر رہنی چاہئیں۔ ان شاء اللہ سیرت انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب میں یہ تمام مصادر و مراجع ہمارے پیشِ نظر رہیں گے۔

ہم اس بات کی بھی کوشش کریں گے کہ تمام روایات کی صحت کا فیصلہ محدثین کے معیار کے مطابق ہو۔ اکمال فراغ، یعنی نہ ملنے والی کڑیوں کی تکمیل کے لیے بھی حدِ قبول سے نیچے کی صرف وہی روایات لی جائیں جو کبار محدثین کی بے مثال تحقیقی کاوشوں کے بعد ان کے نزدیک قابلِ اعتنا ثابت ہوئیں، اور وہ بھی صحت کے اعتبار سے ان کا مرتبہ پوری طرح واضح کر دینے کی شرط کے ساتھ۔

اس طرح ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہم بے بضاعت اور کمزور انسانوں کو اس بات کی توفیق عطا فرمائے گا کہ ہم سیرت انسائیکلوپیڈیا کی صورت میں ایسی کتاب قارئینِ کرام کی خدمت میں پیش کرسکیں جو ان کی روحوں کو ایمان باللہ اور ایمان بالرسول ﷺ کی دولت سے مالا مال کر دے، جو ان کے دلوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی سچی محبت سے سرشار کر دے، جو ان کے کردار و عمل کو جمالِ نبوت کے نور سے تابناک بنا دے، جو ان کے اخلاق کو رفعتوں سے ہمکنار کر دے، جو ان کی ہمتوں کو فولاد سے بڑھ کر مضبوط کر دے، جو ان کے اعضاء کو پُر خلوص سعی و محنت کی لذت سے آشنا کر دے اور جو ان کے مشامِ جان کو قرب و رضائے الٰہی کی نکہتوں سے معطر کر دے۔

سیرتِ پاک واحد ایسا نمونۂ عمل ہے جس کے ذریعے سے ہر صاحبِ ایمان روحانی رفعتوں کے بلند ترین مدارج تک پہنچ سکتا ہے۔ روحانی منزلیں طے کرنے کے لیے مختلف طریقے اپنانے والے اگر غور کریں تو اللہ تعالیٰ نے اصل منزل تک پہنچنے کے لیے صرف طریقۂ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی نشان دہی کی ہے جو سیرتِ پاک کے ذریعے سے ہر صاحبِ ایمان کے سامنے واضح ہو جاتا ہے۔ اصل منزل وہی ہے جہاں تک رسول اللہ ﷺ کا طریق پہنچاتا ہے۔ جو منزل اس راستے سے نہیں ملتی، وہ منزل، مقصود و مطلوب ہی نہیں۔ وہ سارے کے سارے پڑاؤ بھی انتہائی خطرناک ہیں جو ان دوسرے راستوں پر آتے ہیں۔ ''اَلْمَحَجَّةُ الْبَیْضَاءُ'' یعنی چمکتا ہوا سیدھا راستہ وہی ہے جس پر رسول اللہ ﷺ کے نقشِ قدم ثبت ہیں۔ محدثینِ کرام کی ساری کوششیں امت کو اسی راستے پر چلانے کے لیے ہیں۔

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○﴾

''اور یقیناً یہ میرا راستہ سیدھا ہے، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو اور تم دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، وہ تمھیں اللہ کے راستے سے الگ کر دیں گے۔ اللہ نے تمھیں تاکید کی ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔'' [1]

[1] الأنعام 6:153.

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

قَدْ تَرَكْتُكُمْ عَلَى الْبَيْضَاءِ، لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا، لَا يَزِيغُ عَنْهَا بَعْدِي إِلَّا هَالِكٌ

''یقیناً میں تمھیں روشن (شریعت) پر چھوڑ رہا ہوں۔ اس کی رات بھی دن کی طرح (روشن) ہے۔ میرے بعد اس سے صرف وہی کج روی اختیار کرے گا جو ہلاک ہونے والا ہے۔'' [1]

اَللّٰهُمَّ! وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى وَ اجْعَلْ آخِرَتَنَا خَيْرًا مِّنَ الْأُولٰى. اَللّٰهُمَّ! إِنَّا نَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَ حُبَّ مَنْ يُحِبُّكَ وَ حُبَّ عَمَلٍ صَالِحٍ يُقَرِّبُنَا إِلَيْكَ.

اَللّٰهُمَّ! صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ. اَللّٰهُمَّ! بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ وَعَلٰى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ.

پروفیسر محمد یحییٰ حفظہ اللہ
(سینئر ریسرچ سکالر دارالسلام لاہور)

صفر 1433ھ/ جنوری 2012ء

[1] سنن ابن ماجه: 43.

باب 1

جزیرہ نمائے عرب کا جغرافیائی و تاریخی پس منظر

جزیرہ نمائے عرب کا محل وقوع اور دورِ جاہلیت و عہد نبوی میں عرب کے مختلف خطوں کے طبعی، جغرافیائی اور تاریخی حالات

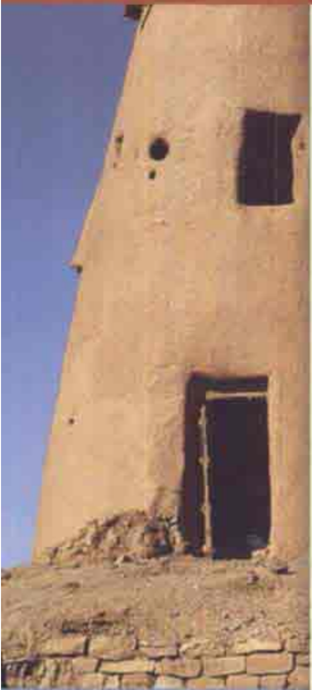
وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ

يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ

أَحْمَدُ

''اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، وہ میرے
بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا۔'' (الصف 6:61)

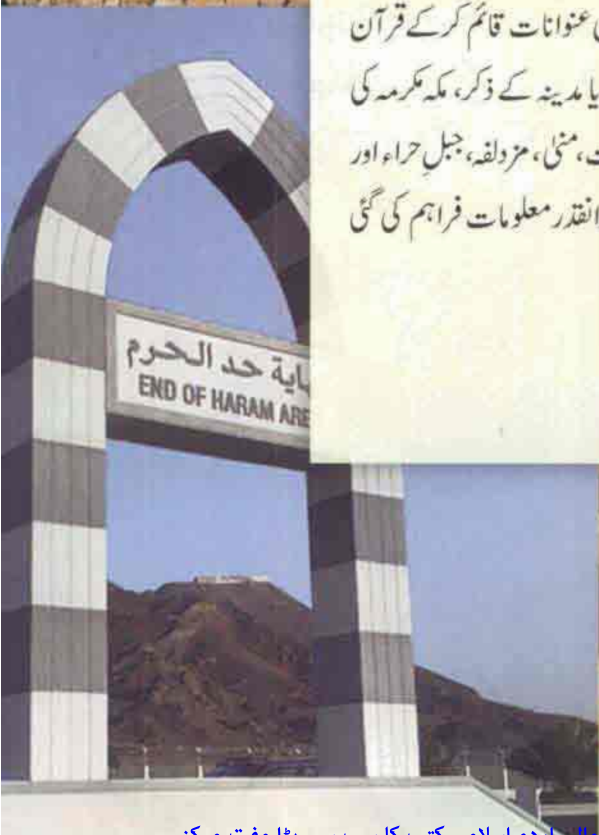
اس باب میں

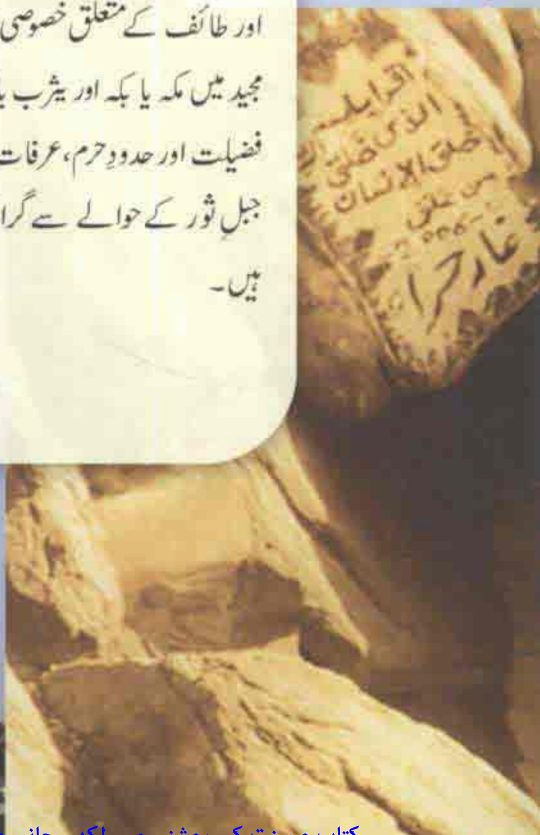




جزیرہ نمائے عرب کے طبعی جغرافیہ، یعنی آب و ہوا، پہاڑوں، صحراؤں، ندیوں، حرات (سنگلاخ چٹانوں سے بھرے ہوئے میدانوں)، نباتات، حیوانات، معدنیات اور عربوں کی بود و باش پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے علاوہ جزیرہ نمائے عرب کی طبعی تقسیم بیان کرتے ہوئے تہامہ، بحرین، عمان، نجد، حجاز اور یمن کا مکمل تعارف کرایا گیا ہے اور ساتھ ساتھ وہاں کے سیاسی و سماجی حالات اور ان پر روشنی ڈالنے والے دلچسپ تاریخی واقعات جو عرب کے مختلف علاقوں میں عہد جاہلیت میں پیش آئے، بیان کیے گئے ہیں، نیز مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور طائف کے متعلق خصوصی عنوانات قائم کر کے قرآن مجید میں مکہ یا بکہ اور یثرب یا مدینہ کے ذکر، مکہ مکرمہ کی فضیلت اور حدودِ حرم، عرفات، منیٰ، مزدلفہ، جبلِ حراء اور جبلِ ثور کے حوالے سے گرانقدر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔





1

عرب کا طبعی جغرافیہ

جزیرہ اور جزیرہ نما

جزیرہ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے پانی اُتر گیا ہو۔ یہ جَزَرَ الْمَاءُ عَنِ الْأَرْضِ ''پانی زمین سے اُتر گیا یا خشک ہوگیا'' سے ماخوذ ہے۔[1]

اصطلاحی طور پر جزیرہ (Island) سے مراد خشکی کا وہ ٹکڑا ہے جس کے چاروں طرف پانی ہو، جیسے جزیرہ قبرص، جزیرہ صقلیہ (سسلی)، جزیرہ کیوبا، جزیرہ جاوا۔ لیکن زمین کا ایسا قطعہ جس کے تین جانب پانی (سمندر) ہو اور چوتھی طرف وہ خشکی کے کسی بڑے قطعے سے ملا ہوا ہو، جزیرہ نما (Peninsula) کہلاتا ہے۔ عرب بھی ایک جزیرہ نما ہے کیونکہ اس کے تین اطراف (مشرق، مغرب اور جنوب) میں پانی ہے اور صرف شمال میں وہ خشکی سے ملا ہوا ہے۔ عربی میں اسے جزیرۃ العرب یا زیادہ صحیح طور پر شبہ الجزیرہ (Peninsula) کہا جاتا ہے۔

[1] المعجم الوسیط، مادۃ: جزر



حدیث میں عرب کے لیے جزیرۃ العرب یا هٰذِهِ الجزیرۃ کے الفاظ آئے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: «أَخْرِجُوا الْمُشْرِكِينَ مِنْ جَزِيرَةِ الْعَرَبِ» ''مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔'' [1] صحیح مسلم کی روایت ہے:

«إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ أَيِسَ أَنْ يَعْبُدَهُ الْمُصَلُّونَ فِي جَزِيرَةِ الْعَرَبِ وَلٰكِنْ فِي التَّحْرِيشِ بَيْنَهُمْ»

''بے شک شیطان اس بات سے مایوس ہوگیا ہے کہ کبھی جزیرۃ العرب میں نمازی اس کی عبادت کریں گے لیکن وہ ان میں لڑائی کرواتا رہے گا۔'' [2]

امام سیوطی نے ایک ضعیف روایت بیان کی ہے:

«لَقَدْ طَهَّرَ اللّٰهُ أَهْلَ هٰذِهِ الْجَزِيرَةِ مِنَ الشِّرْكِ إِنْ لَّمْ تُضِلَّهُمُ النُّجُومُ»

''اللہ نے اس جزیرہ (عرب) کے لوگوں کو شرک سے پاک کر دیا ہے اگر ستاروں (پر عقیدے) نے انھیں گمراہ نہ کر دیا۔'' [3]

علامہ مقدسی اور یاقوت حموی نے اپنی کتبِ جغرافیہ میں اسے جزیرۃ العرب ہی لکھا ہے۔

ہشام کلبی نے اپنی سند سے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول ذکر کیا ہے: ''عربوں نے جزیرہ (جزیرۃ العرب) کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے ...... تہامہ، حجاز، نجد، عروض اور یمن۔'' کلبی مزید کہتے ہیں: ''بلاد العرب کا نام جزیرہ اس لیے رکھا گیا کہ یہ چاروں طرف سے دریاؤں اور سمندروں میں گھرا ہوا ہے۔'' پھر انھوں نے اس کی حدود دریائے فرات، سواد عراق، بصرہ، اُبلّہ، عبادان (ایران)، کاظمہ (کویت)، قطیف (سعودی عرب)، ہجر (بحرین)، قطر، عُمان، شحر (حضرموت)، اَبیَن، عدن، جزائر دہلک، جزائر فرسان (سعودی عرب)، جُدّہ، ساحل مکہ، ساحلِ مدینہ، ساحلِ طُور، خلیج اَیلہ (خلیج عقبہ)، قلزم مصر، دریائے نیل، بحر مصر و شام (بحیرۂ روم)، بلادِ فلسطین، عسقلان، صور (لبنان)، بیروت، ساحلِ حمص اور ساحلِ قنسرین (شام) تک بیان کی ہیں۔ [4]

عرب کی وجہ تسمیہ

اس کے بارے میں قُدماء سے مختلف اقوال منقول ہیں کیونکہ علمائے لغت، ماہرین انساب اور اہلِ جغرافیہ نے

[1] صحیح البخاري :3053. [2] صحیح مسلم :2812. [3] السلسلة الضعیفة :4316. [4] معجم البلدان، مادة: جزیرة العرب.

اپنے اپنے انداز میں عرب کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے:

1 علمائے انساب کہتے ہیں کہ اس ملک کا پہلا باشندہ یعرب بن قحطان تھا جو اہل یمن کا جد امجد تھا۔ اس کے نام کی مناسبت سے اس ملک اور اس میں بسنے والوں کو عرب کہا جانے لگا۔ لیکن یہ قول درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اگر یہ بات درست ہوتی تو پہلے یمن، یعنی جنوبی عرب کو عرب کا نام دیا جاتا جبکہ یہ نام سب سے پہلے شمالی عرب کے لیے استعمال کیا گیا۔

2 بعض علمائے لغت کہتے ہیں کہ عرب ''اعراب'' سے مشتق ہے جس کے معنی فصاحت سے اپنی بات دوسرے تک پہنچانے کے ہیں۔ چونکہ اس جزیرہ نما کے رہنے والے ہمیشہ سے زبان و بیان کے ماہر تھے، اس لیے وہ عرب کہلائے۔ انھوں نے اپنے سوا باقی پوری دنیا کو عجم، یعنی ژولیدہ زباں یا گونگے کے نام سے پکارا۔

3 اہلِ جغرافیہ کے مطابق لفظ عرب اصل میں عَرَبَۃ تھا جس کے معنی بے آب و گیاہ زمین اور صحرا کے ہیں۔ عبرانی زبان میں بھی عَرَبَۃ بیابان اور بنجر میدان کو کہتے ہیں۔[1] خود عرب شعراء نے بھی یہ لفظ اپنے اشعار میں اس معنی میں استعمال کیا ہے۔ نبی ﷺ کے چچا سردار ابوطالب بن عبدالمطلب نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی مدح و توصیف کرتے ہوئے لفظِ عربہ مکہ مکرمہ کے لیے استعمال کیا ہے:

وَعَرَبَۃٌ دَارٌ لَّا يُحِلُّ حَرَامَهَا مِنَ النَّاسِ إِلَّا اللَّوْذَعِيُّ الْحُلَاحِلُ

''عربہ وہ گھر (جگہ) ہے کہ لوگوں میں سے صرف صاحبِ فراست اور خوش بیان سردار ہی اس کی حرمت کو حلال کرسکتا ہے۔''

لگتا ہے قدیم زمانے میں لفظ عربہ کا اطلاق سب سے پہلے مکہ کے حوالے سے ہوا جو بنجر اور بے آب و گیاہ جزیرہ نمائے عرب کا سب سے اہم مقام تھا۔ پھر اس سارے جزیرہ نما کو یہی نام دے دیا گیا۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تہامہ کے مقام عربہ میں آباد ہوئی، لہٰذا بنو اسماعیل اس عربہ سے منسوب ہو کر عرب کہلائے۔[2]

عرب کا محلِ وقوع

جزیرہ نمائے عرب براعظم ایشیا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس کے مشرق میں خلیج عربی (خلیج فارس) اور خلیج عُمان واقع ہیں، مغرب میں بحیرۂ قلزم اور جنوب میں خلیج عدن اور بحیرۂ عرب ہیں۔ بحیرۂ عرب دراصل بحرِ ہند

[1] معجم البلدان، مادة: عربة، المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 1/14-19. [2] معجم البلدان، مادة: عربة.



جزیرہ نمائے عرب کی موجودہ سیاسی تقسیم اور ہمسایہ ممالک

ہی کا پھیلاؤ ہے۔

خلیج عربی (خلیج فارس) کے پار ایران اور آگے افغانستان اور ترکستان کے علاقے ہیں جن کا بڑا حصہ ماضی میں خراسان کہلاتا تھا۔ موجودہ ایران کے مغرب میں ترکی، عراق اور خلیج عربی ہیں، شمال میں ترکمانستان، آذربائیجان، آرمینیا اور بحیرہ کیسپین، مشرق میں افغانستان اور پاکستان اور جنوب میں خلیج عمان ہے۔ ایران کا کل رقبہ 1648000 مربع کلومیٹر ہے۔ آگے ترکستان کے دریائے جیحون (آمو) کے پار واقع علاقوں کو عرب مؤرخین ماوراء النہر کہتے تھے جس میں نہر (دریا) سے مراد دریائے جیحون ہے۔ ترکستان (وسط ایشیا) ان دنوں ازبکستان، تاجکستان، کرغیزستان، قازاقستان اور ترکمانستان میں بٹا ہوا ہے۔ خلیج عمان کے پار ماضی کا مکران (بلوچستان) ہے جو اب پاکستان اور ایران میں منقسم ہے۔ نبی ﷺ کے دور میں مکران سے متصل سندھ اور اس سے آگے ہند یا ہندوستان پھیلا ہوا تھا جس کے مغربی ساحل سے، بحیرۂ عرب اور بحر ہند کے راستے، عربوں کے تجارتی تعلقات قائم تھے۔

خلیج عدن کے جنوب میں قرنِ افریقہ (صومالیہ) ہے جو قرن (سینگ) کی طرح بحر ہند میں نکلا ہوا ہے۔ بحیرۂ قلزم (بحیرۂ احمر) کے مغرب میں مصر، سوڈان، اری ٹیریا، جبوتی اور حبشہ (ایتھوپیا) واقع ہیں۔ اگرچہ حبشہ میں صدیوں سے عیسائیت کا غلبہ رہا ہے لیکن پھر بھی یہ سب شمالی افریقہ کے ساتھ مل کر مسلم اکثریت کا خطہ بناتے ہیں۔

جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں عراق اور اردن واقع ہیں جہاں صحرائے شام ان ملکوں میں پھیلتا چلا گیا ہے۔ اردن کے مغرب میں دریائے اردن، بحیرۂ مردار اور فلسطین، جنوب میں سعودی عرب اور خلیج عقبہ، مشرق میں عراق اور شمال میں سوریہ (شام) ہے۔ بہت سے صحابہ کی قبریں اردن میں ہیں۔ الکرک کے قریب جہاں معرکہ مؤتہ برپا ہوا، وہ مقام بھی اردن میں ہے۔ اس کا رقبہ 90740 مربع کلومیٹر ہے۔ شام اور عراق کے شمال میں ترکی واقع ہے جو عہد نبوی میں سلطنتِ روم کا حصہ تھا جسے عرب "الروم" کا نام دیتے تھے۔ اس بارے میں جغرافیہ دانوں میں بہت اختلاف ہے کہ شمال کی جانب عرب کہاں ختم ہوتا ہے اور شام کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اکثر کا خیال یہ رہا ہے کہ شمال کی طرف عرب کی حد دریائے فرات تک ہے۔ یوں تقریباً چاروں طرف پانی کی موجودگی کی بنا پر یہ ملک جزیرہ کہلانے کا مستحق ہے۔ اس جزیرہ نما کا طول شمال مغرب سے جنوب مشرق کی طرف تقریباً 2200 کلومیٹر اور عرض تقریباً 1200 کلومیٹر ہے اور اس کا کل رقبہ، شمالی حد میں اختلاف کی بنا پر، دس تا تیرہ لاکھ مربع میل بنتا ہے۔[1]

[1] عصر النبوة للكعبي، ص: 8,7، مكة و المدينة في الجاهلية وعهد الرسول ﷺ، ص: 13.

بیرونی حملوں سے محفوظ خطہ

عرب کا زیادہ تر حصہ لق و دق صحرا پر مشتمل ہے۔ اس طرح قدرت نے اوائل ہی سے اس جزیرہ نما کو جغرافیائی لحاظ سے ایسا محفوظ خطہ بنا دیا جہاں بیرونی حملہ آوروں کا خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ کسی بھی بیرونی طاقت کے لیے یہاں کوئی اقتصادی مفاد تھا نہ اس پر قبضہ کر کے اسے برقرار رکھنا ممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اندرونِ عرب کے باشندے زمانۂ قدیم سے مکمل طور پر آزادی اور خودمختاری کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت یہ لوگ دو عظیم قوتوں سلطنتِ روم (بازنطینی سلطنت) اور سلطنتِ فارس (ایران) کے ہمسائے تھے لیکن ان میں سے کوئی قوت بھی، کنارے کے چند علاقوں کو چھوڑ کر، عرب میں رہنے والوں کو کبھی اپنا باجگزار نہ بنا سکی۔



رومی طلائی سکہ

جہاں تک حاشیے کے علاقوں کا تعلق ہے، جنوب مغرب میں باب المندب نامی تنگ آبنائے سے حبشی یمن پر حملہ آور ہوتے رہے۔ عہد نبوی میں یمن پر ایرانی قابض تھے جبکہ عُمان، بحرین اور حیرہ کے عرب حکمرانوں کو انھوں نے باجگزار بنا رکھا تھا۔ اسی طرح بُصری الشام کے غسانی عرب رومیوں کے باجگزار تھے۔ تبوک کی جنگ کا سبب بھی روم کا اپنے مقبوضہ علاقوں کے تحفظ کا معاملہ تھا۔

حَرّاتِ عرب

عرب میں سنگلاخ چٹانی علاقے (حَرّات) آتش فشاں پہاڑوں کے لاوے سے وجود میں آئے۔ آتش فشانی لاوا نکلنے کا سلسلہ عہد نبوی کے بعد بھی جاری رہا۔ حجاز میں 654ھ/1256ء میں اسی قسم کا ایک آتش فشاں پہاڑ پھٹا تھا۔ اس سے کئی ہفتوں تک انگارے برستے رہے اور اس سے خارج ہونے والا آتشیں لاوا کئی میل تک بہتا چلا گیا۔ مدینہ منورہ کے مشرق اور مغرب کے حرات (حرہ واقم اور حرہ وبرہ)، حرۂ خیبر اور مکہ اور مدینہ کے مابین واقع حرۃ الرھط (حرۂ رہاط)، حرۃ الحجاز، حرۂ کشب، حرۂ بنی سُلیم اور حرۃ الکراع مشہور ہیں۔[1]

[1] مكة والمدينة في الجاهلية وعهد الرسول ﷺ، ص: 16,15، أطلس التاريخ العربي الإسلامي، ص: 33.



حرۂ رہاط کا ایک مردہ آتش فشانی دہانہ



حرۂ خیبر میں جبل البیضاء اور جبل العاقر

صحرائے عرب

عرب کا بہت بڑا حصہ صحراؤں پر مشتمل ہے۔ ان میں چار بڑے صحرا ہیں: النفود الکبیر، الدہناء، الجافورہ اور سب سے بڑا الربع الخالی۔

النفود الکبیر: یہ شمال میں الجوف سے شروع ہو کر جنوب میں حائل تک چلا گیا ہے۔ ''الجوف'' منطقہ (صوبہ) کا نام ہے۔ اس کا تاریخی شہر دومۃ الجندل الریاض سے کم و بیش 1200 کلومیٹر کی مسافت پر اور اردن کی سرحد سے تقریباً 250 کلومیٹر دور ہے۔ منطقہ الجوف کا دارالحکومت سکاکا ہے۔ النفود الکبیر کا رقبہ 64630 مربع کلومیٹر ہے۔ مشرق سے مغرب تک اس کی زیادہ سے زیادہ وسعت تقریباً 342 کلومیٹر اور شمال سے جنوب کی طرف تقریباً 572 کلومیٹر ہے۔ مشرق کی طرف اس کی شمالاً جنوباً وسعت کم ہوتے ہوتے 128 کلومیٹر رہ جاتی ہے۔ اس طرح النفود الکبیر ایک مثلث شکل کا صحرا ہے۔ یہاں ہوائیں متحرک ریت کے ٹیلوں کو ایک سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہیں۔ بسا اوقات یہ ٹیلے 450 فٹ تک اونچے ہو جاتے ہیں۔ دومۃ الجندل کا تاریخی شہر النفود الکبیر کے شمال مغرب میں واقع ہے۔



النفود الکبیر کا ایک ٹیلا



الدہناء

الدہناء: یہ النفود الکبیر اور الربع الخالی کے درمیان ایک تنگ قوس کی شکل میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ تخمیناً 40789 مربع کلومیٹر ہے۔ اس کے مغربی جانب جبل طُوَیق اور مشرق میں سطح مرتفع الصُّمان واقع ہے۔ اس کی طوالت 1200 کلومیٹر اور چوڑائی 20 تا 60 کلومیٹر ہے۔ ایسی ہی دوسری صحرائی قوس جبل طُویق کے مغرب میں ہے۔ اسے نفود الدَّحیٰ کہا جاتا ہے۔[1] اس کو معروف صحرائے نجد شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہیں الریاض سے نجران اور ابہا کو جانے والی شاہراہ پر لیلیٰ نامی مقام موجود ہے۔

الجافورہ: یہ صحرا بھی النفود کے نیچے ساحل کے ساتھ ساتھ ایک تنگ پٹی کی شکل میں ہے جو سطح مرتفع الصُّمان کے مشرق کی

[1] أطلس المملكة العربية السعودية، ص: 37.



عرب کے مشہور صحرا
مکمل صحرا
بین الاقوامی سرحد
جزوی صحرا
غیر معین سرحد
صحرائے شام
طریف
عرعر
الجوف
سکاکا
دومۃ الجندل
عراق
کویت
الرقعي
الخفجي
ایران
حائل
بریدة
الجبیل
الدمام
بحرین
قطر
نفود العريق
نفود السر
الریاض
مدینہ منورہ
سلوی
الخرج
متحدہ عرب امارات
نفود السرة
عروق سبیع
نفود الدحي
لیلی
شیطة
مکہ مکرمہ
طائف
سعودی عرب
الربع الخالي
باحہ
اللیث
القنفذة
الخرخیر
عمان
ابہا
نجران
شرورہ
الودیعة
جازان
الطوال
حضرموت
یمن
اریٹیریا
عدن
بحیرۂ عرب
حبشہ



جانب ہے۔ یہ صحرائی پٹی جُبَیل کے شمال سے شروع ہوکر الربع الخالی تک چلی جاتی ہے۔[1]

الربع الخالی: یہ دنیا کے بڑے صحراؤں میں سے ایک ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً 6 لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ اس کا طول شرقاً غرباً تقریباً 1200 کلومیٹر ہے اور زیادہ سے زیادہ عرض 640 کلومیٹر ہے۔ اس میں بعض مقامات پر ریت کھودی جائے تو ٹھنڈے پانی کے چشمے بھی دریافت ہوتے ہیں۔ اسے الربع الخالی اس لیے کہتے ہیں کہ یہ صحرا اس پورے جزیرہ نما کا وہ چوتھا حصہ ہے جو انسانی اور حیوانی زندگی سے تقریباً خالی ہے۔ الربع الخالی کے جنوبی حصے کو الأحقاف کہتے ہیں۔

عرب کے مشہور پہاڑ

جبال السراۃ: جزیرہ نمائے عرب کا طویل ترین پہاڑی سلسلہ جبال السراۃ یا جبال السروات کہلاتا ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ بحیرۂ احمر کے ساحل کے ساتھ ساتھ تہامہ کے نشیبی علاقے کے مشرق میں پھیلا ہوا ہے۔ کوہستان سراۃ کی اوسط بلندی کم و بیش دو ہزار میٹر ہے۔

اس سلسلے کے اہم پہاڑ درج ذیل ہیں:

جبل اُحد: مدینہ منورہ کی شمالی جانب واقع کوہ اُحد مسجد نبوی سے ساڑھے پانچ کلومیٹر دور ہے۔ مدینہ منورہ کی آبادی

[1] مسالك الممالك للإصطَخري، ص: 28,27، عصر النبوة للكعبي، ص: 10,9، أطلس المملكة العربية السعودية والعالم، ص: 16.





اب اس کے اردگرد تک پھیل گئی ہے۔ اُحد پہاڑ حرم میں داخل ہے کیونکہ حرم کی حد اس کے شمال میں ثور پہاڑ تک ہے۔ کوہ احد شرقاً غرباً تقریباً 6 کلومیٹر لمبا ہے۔ اس کے جنوبی جانب غزوۂ احد کے شہداء کی قبریں ہیں۔

جبل ثور: مکہ مکرمہ کے جنوب میں حرم پاک سے تقریباً 3 میل دور جبال السراۃ کی چوٹی ثور واقع ہے جس کے اندر غار میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ کو ہجرت کرتے ہوئے تین راتیں گزاری تھیں۔ کوہ ثور 759 میٹر بلند ہے۔ چوٹی کی سطح تقریبا 30 مربع میٹر ہے۔ غار ثور کا چھوٹا دہانہ اندازاً نصف میٹر اور دوسری طرف کا بڑا دہانہ ایک میٹر کے لگ بھگ چوڑا ہے۔ غار کی لمبائی تقریباً 4 میٹر اور چوڑائی تقریباً اڑھائی میٹر ہے۔[1]

جبل النور (جبل حراء): مکہ مکرمہ کے مشرق میں تقریباً 4 کلومیٹر دور جبل النور (کوہ حرا) واقع ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی 639 میٹر ہے۔ کوہ نور کے اندر غار حرا ہے جس میں نبی ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی تھی۔ غار حرا پہاڑ کے پہلو میں ہے جہاں کم و بیش نصف میٹر موٹے، پونے دو میٹر تک چوڑے اور تین چار میٹر لمبے چٹانی تختے پہاڑ کے ساتھ اس طرح ٹکے ہوئے ہیں کہ متساوی الساقین مثلث کے منہ والا غار بن گیا ہے جس کا ہر ضلع اڑھائی میٹر لمبا اور قاعدہ قریباً ایک میٹر ہے۔ غار کی لمبائی دو سوا دو میٹر ہے۔ پچھلے حصے کی طرح سامنے کا حصہ بھی کھلا ہے۔[2]

جبل رضوی: مدینے کے مغرب میں جبال السراۃ کے رضوی نامی پہاڑ کے پاس ربیع الاول 2 ہجری میں غزوۂ بواط پیش آیا۔ 1814 میٹر بلند جبل رضوی کا ذکر عرب شعراء کے کلام میں بھی ملتا ہے۔ ابوالطیب احمد بن حسین جعفی متنبّی، محمد بن اسحٰق تنوخی کی وفات پر مرثیہ خوانی کرتے ہوئے کہتا ہے:

مَا كُنْتُ آمُلُ قَبْلَ نَعْشِكَ أَنْ أَرٰى رَضْوٰى عَلٰى أَيْدِي الرِّجَالِ تَسِيرُ

"تمھاری نعش (دیکھنے) سے پہلے مجھے امید نہیں تھی کہ میں رضوی (پہاڑ) کو لوگوں کے ہاتھوں پر چلتے ہوئے

[1] في منزل الوحي، محمد حسين هيكل. [2] اٹلس سیرت نبوی، ص: 115.







الجبل الاخضر



جبل اجا



جبل طویق

دیکھوں گا۔'' [1]

مکہ کے جنوب مشرق میں جبال السراۃ کی چند چوٹیاں 2500 میٹر سے زیادہ بلند ہیں۔ اس کے بعد یہ سلسلہ جنوبی عسیر اور یمن میں اپنی انتہائی بلندی کو پہنچ جاتا ہے۔ صنعاء کے مغرب میں ایک چوٹی کی بلندی 3760 میٹر ہے۔ جبال السراۃ کو شمال میں مدین کے پہاڑ، جنوب میں عسیر کے پہاڑ اور درمیان میں حجاز کہا جاتا ہے۔ [2]

الجبل الاخضر: مشرق عمان کا پہاڑی سلسلہ الجبل الاخضر خلیج عمان کے ساحل کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے جس کی بلند ترین چوٹی 3018 میٹر اونچی ہے۔ [3]

جبلِ طُبَیق: اردن اور سعودی عرب کے درمیان سرحدی علاقے میں واقع ہے۔

جبال اَجا و سلمیٰ: صحرائے نفود کے جنوب میں صوبہ حائل کے اندر جبل أجا اور جبل سَلْمیٰ واقع ہیں جو جنوب مغرب میں باہم مل کر جبل شمر کہلاتے ہیں۔ زمخشری کہتے ہیں: اَجا اور سلمیٰ دو پہاڑ ہیں جو تمیراء کے بائیں جانب ہیں۔ اور ابوعبید سکونی نے فید کے مغرب میں واقع ان پہاڑوں کو بنو طے کے پہاڑ (جبال طے) بتایا ہے۔ ان کے نام اَجا نامی شخص اور اس کی محبوبہ سلمیٰ کے نام پر رکھے گئے جنھیں اس علاقے میں سلمیٰ کے بھائیوں نے قتل کر دیا تھا۔ [4]

جبل قطن: یہ مدینہ سے القصیم جانے والی شاہراہ کے شمال میں عقلۃ الصقور کے قریب واقع ہے۔ جبل قطن کے جنوبی دامن میں قصبہ قطن آباد ہے، یہاں بنو اسد کا چشمہ تھا۔ محرم 4 ھ میں یہاں سریۂ ابی سلمہ مخزومی رضی اللہ عنہ پیش آیا تھا کیونکہ طلیحہ بن خویلد اسدی مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاری کر رہا تھا۔ مجاہدین کی آمد پر وہ لوگ فرار ہو گئے۔ [5]

جبل طُوَیق: اسے نجد کی ریڑھ کی ہڈی کہا جا سکتا ہے۔ اس کی لمبائی الریاض کے مشرق میں خشم جزرہ سے الربع الخالی کے قریب خشم خمہ تک ایک ہزار کلومیٹر ہے۔ الدہناء کے مشرق میں الصّمان کی نسبتاً کم بلند سنگلاخ سطح مرتفع واقع ہے۔

[1] ديوان المتنبي، ص: 71. [2] أطلس السيرة النبوية، ص: 17. [3] أطلس المملكة العربية السعودية والعالم، ص: 10. [4] معجم البلدان، مادة: أجأ. [5] اٹلس سیرت نبوی، ص: 253، أطلس المملكة العربية السعودية، ص: 189.

جبل بُحْران: یہ وادی حُجر (قدیم نام السائرہ) اور وادی رابغ یا ''مُرّ'' کے سنگم میں واقع ایک پہاڑ ہے۔ رابغ سے اس کا فاصلہ 90 کلومیٹر بجانب مشرق ہے۔ یہاں جمادی الاولیٰ 3 ھ میں غزوہ بُحران پیش آیا تھا۔ وادی رابغ ماضی میں مَرّ عُنَیب کہلاتی تھی۔[1]

صحرائی عربوں کی بود و باش

صحرائی علاقہ ہونے کی وجہ سے اندرونِ عرب کے باشندے ہمیشہ سے اونٹ اور بھیڑ بکریاں پالتے تھے۔ وہ پانی اور ہریالی کی تلاش میں صحراؤں اور ریتلی وادیوں میں پھرتے رہتے۔ یہ بادیہ نشین مستقل رہائش کے لیے مکان نہیں بناتے تھے بلکہ اونٹوں کے بالوں سے بنے ہوئے خیموں میں رہتے اور جہاں جاتے، اپنے خیمے بھی ساتھ لے جاتے۔ اسی مناسبت سے ان کو اہل الوبر (بالوں سے بنے ہوئے خیموں والے) بھی کہا جاتا تھا۔

عرب کی بعض وادیاں اور مقامات

جزیرہ نمائے عرب کا اندرونی حصہ شدید گرمی کی زد میں رہتا ہے۔ پہاڑ بھی زیادہ تر خشک ہیں، لہٰذا یہاں ایک آدھ دریا ہی سارا سال بہتا ہے، البتہ وادی کے نام سے بہت سے برساتی ندی نالے پائے جاتے ہیں۔ مشہور وادیاں (ندیاں) درج ذیل ہیں:

وادی السرحان: عرب کے شمال میں اردن کی سرحد پر وادی السرحان ہے جو تقریباً 300 کلومیٹر لمبا اور 50 تا 70 کلومیٹر چوڑا ایک نشیب ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے برساتی نالے آ گرتے ہیں۔

فرات کی معاون ندیاں: عرب کے شمال مشرق کی طرف کئی وادیاں بہتی ہیں جن کا پانی دریائے فرات میں جا گرتا ہے۔ ان میں سے زیادہ اہم وادی الأبیض، وادی عرعر اور وادی الخور ہیں۔

[1] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 40.



وادی الابیض



وادی الباطن کا پانی

وادی الباطن: صحرائے دہناء کے شمال میں وادی الباطن ہے۔ اس کا پانی کویت کی سرحد کے ساتھ ساتھ بہتا ہوا خلیج عربی میں جا گرتا ہے۔



وادی الدواسر

وادی الدواسر: پہاڑی سلسلے جبال السراۃ کی مشرقی ڈھلان سے تین بڑی ندیاں نیچے اترتی ہیں جن کے نام: رَنْیة، بِیشة اور تثلیث ہیں۔ ان تینوں کے ملنے سے وادی الدَّواسِر بنتی ہے۔ وادی الدواسر کو عقیق الیمامہ یا عقیق تمرہ بھی کہا جاتا تھا۔ وہاں تمرہ نامی بستی آباد ہے۔ وادی الدَّواسِر میں کبھی کبھار غیر معمولی سیلاب آ جاتا ہے، پھر یہ پانی الربع الخالی کے ریگستان میں پھیل کر ختم ہو جاتا ہے۔



وادی ذات أطلاح کا ایک منظر

ذات أطلاح: یہ ارض شام (موجودہ اردن) کا علاقہ ہے۔ کعب بن عُمیر غِفاری رضی اللہ عنہ ربیع الاول 8 ھ میں ایک سریے کے قائد بن کر یہاں گئے تھے۔ ذات اطلاح ان دنوں "طلاع" یا "ضحل" کہلاتا ہے اور یہ غور الصافی سے 25 کلومیٹر جنوب میں ہے۔ سریّہ ذات اطلاح میں صرف کعب رضی اللہ عنہ زخمی حالت میں بچ نکلے تھے جبکہ ان کے چودہ کے چودہ ساتھی شہید ہو گئے تھے۔ یہ سریہ اگلے ماہ پیش آنے والے غزوہ مؤتہ کا ایک سبب بنا تھا۔[1]



شہر الدیسہ (تبوک)

تبوک: عہدِ نبوی میں تبوک بنو قضاعہ کا علاقہ تھا جو سلطنت روم کے ماتحت تھے۔ یہ مدینہ سے 778 کلومیٹر شمال میں ہے اور تیماء اور خیبر کے راستے مدینہ سے ملا ہوا ہے۔ یہ سعودی عرب کا انتہائی شمالی شہر ہے جہاں بہت بڑی چھاؤنی ہے۔ اس کے شمال میں اردن کا شہر معان 238 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ غزوہ تبوک کے دوران میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس جگہ اپنا خیمہ نصب فرمایا، وہاں بہت خوبصورت مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ تبوک 1312 ھ/1894ء میں تعمیر شدہ حجاز ریلوے کا ایک اہم سٹیشن تھا۔[2]



...دومۃ الجندل کے آثار

دُومۃ الجندل: یہاں بنو قضاعہ کا قبیلہ کلب بن وبرہ آباد تھا۔ یہاں وَدّ نامی بت

[1] معجم المعالم الجغرافیة في السیرة النبویة، ص: 31,30.
naderatieh.maktoobblog.com

[2] معجم المعالم الجغرافیة في السیرة النبویة، ص: 60,59.

کا تھان تھا۔ یہ سعودی منطقہ الجوف کا ایک شہر ہے اور ان دنوں دَومۃ الجندل کہلاتا ہے۔ یہاں اُکَیدر الکندی کے قلعہ حصن مارد کے آثار ہیں۔ الجوف کے دارالحکومت سکاکا سے اس کا فاصلہ 60 کلومیٹر ہے جبکہ تیماء سے دومۃ الجندل کا فاصلہ تقریباً 450 کلومیٹر ہے۔ یہ اسماعیل علیہ السلام کے بیٹے دُوم یا دومان سے منسوب ہے۔[1]

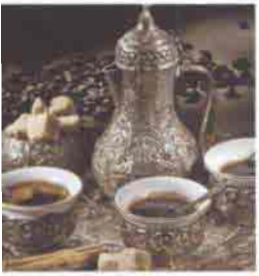
بَرک الغماد (البرک): یہ مکہ سے تقریباً 600 میل جنوب میں ساحل بحر پر ایک بندرگاہ ہے اور ان دنوں اَلبِرْک کے نام سے معروف ہے۔ یہاں اس نام کی وادی بھی ہے۔ قصبہ ذہبان (عسیر) سے البرک 14 کلومیٹر شمال میں ہے۔[2] حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہجرتِ حبشہ کے لیے نکلے تو برک الغماد جا پہنچے تھے جہاں سے ابن دغنہ کی ترغیب پر مکہ واپس آئے تھے۔

عرب کی نباتات

جزیرہ نمائے عرب کا اکثر حصہ پتھریلا اور ریتلا ہے۔ اس جزیرہ نما کے جو علاقے ساحل سمندر کے قریب ہیں، وہاں شاداب وادیاں ہیں۔ جنوب مغربی یمن کا علاقہ قدیم زمانے میں بھی اپنی سرسبزی اور شادابی کے لیے ضرب المثل تھا۔ یمن چونکہ بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ عرب دونوں کے ساحل پر واقع ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ہر قسم کی پیداوار سے نواز رکھا ہے۔

یمن اور عسیر کا قہوہ (کافی) بہت مشہور ہے۔ یمن کی بندرگاہ مخا قدیم زمانے سے قہوے اور بخور (لوبان) کی تجارت کے لیے مشہور رہی ہے۔ لوبان اور دیگر خوشبودار چیزیں دو ہزار سال پہلے بھی شاہراہِ بخورات (Incense Road) کے ذریعے جنوبی عرب سے بحیرۂ روم کے ممالک کو برآمد کی جاتی تھیں۔

ایک یونانی مؤرخ لکھتا ہے: ''بخور سے یونانی لوگ اپنے مکانوں اور معابد میں اور رومی اپنے کاہنوں کی قبروں پر دھونی دیتے تھے۔ مصر کے بطلیموسی اور رومی حکمرانوں کے عہد میں مصری باشندے اسے ان عرب تاجروں سے خریدتے تھے جو بحیرۂ احمر کے راستے سے ان کے ہاں تجارت کے لیے آیا کرتے تھے۔ عرب تاجر اس کے عوض جواہرات اور عمدہ قسم کی معدنیات لیتے تھے جن سے وہ اپنے شہروں اور عبادت گاہوں کو مزین کرتے تھے۔''[3]





لوبان آج کل بھی مہرہ (مشرقی یمن) میں اگتا ہے، تاہم اب زیادہ کارآمد پیداوار نیل کی ہے جس کے درخت کو عِظْلِم اور رنگ کو نیل کہتے ہیں۔ املی، کیکر (Acacia)، عناب

[1] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 127. [2] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 42، أطلس المملكة العربية السعودية. [3] صناجة الطرب في تقدمات العرب لابن نوفل الطرابلسي.

(Ziziphus Spina) اور آملے کی ایک قسم فربیون (Euphourbia) کے درخت بھی ملتے ہیں۔ گیہوں، جو، جوار اور باجرہ اہم اناج ہیں۔ جانوروں کا چارہ الفلفہ (لُوسن) ایک عام فصل ہے جو کھجور کے درختوں کے سائے میں اگائی جاتی ہے۔



جزیرہ نمائے عرب میں انگور بھی پیدا ہوتا تھا لیکن جو اہمیت کھجور کی تھی، وہ کسی اور کی نہ تھی۔ کھجور اور دودھ عربوں کی بنیادی غذا تھی۔ ظفار اور دوسرے مقامات پر ناریل کے درخت بھی اگتے تھے۔ جزیرہ نما کے سرسبز علاقوں میں سیب، انار، کشمش، آڑو، انجیر، کیلا اور تربوز بھی پائے جاتے تھے اور یہ پھل اب بھی وہاں کافی مقدار میں پیدا ہوتے ہیں۔[1] طائف اپنے گلابوں اور اناروں کے لیے مشہور ہے، الخرج تربوزوں کے لیے (تربوز نجد میں حج، حجاز میں جحب اور شمال میں دبشی کہلاتا ہے) اور البریمی (متحدہ عرب امارات) آموں کے لیے۔

حیوانات

جزیرہ نمائے عرب میں متعدد اقسام کے حیوانات پائے جاتے ہیں۔ خشکی کے جانوروں میں اونٹ، گھوڑا، گائے، بکری، بھیڑ، ہرن، گدھا، نیل گائے اور خچر وغیرہ ہیں۔

اونٹ: اونٹ عرب میں نہایت کارآمد جانور سمجھا جاتا تھا۔ اسے ریگستانی جہاز بھی کہا جاتا تھا کیونکہ جدید دور کی شاہراہوں سے پہلے عرب کے لق ودق صحراؤں کو اونٹ کے بغیر عبور کرنا ممکن نہیں تھا۔ اونٹوں میں سب سے قیمتی سرخ اونٹ سمجھا جاتا تھا۔ اونٹ ہی مال تھا، دیت وغیرہ کا تعین اسی کے ذریعے کیا جاتا تھا۔



دودھ کے علاوہ اونٹ کا گوشت، کھال اور اون بھی بہت کارآمد ہے۔ اس کی مینگنیوں (دِمن) کو ایندھن کے طور پر جلایا جاتا تھا۔ اونٹوں کو بعض اوقات ہل چلانے اور کنویں سے پانی نکالنے کے لیے جوتا بھی جاتا۔ عربی میں اونٹوں کا عام نام اِلابِل ہے۔ سواری کے اونٹ کو ذَلول یا الرّکاب کہتے ہیں۔ اوارک

[1] حسن المحاضرة للسيوطي:2/254.

(واحد مونث اُرکہ) وہ اونٹ ہیں جو اراک (پیلو) کے پتے کھاتے ہیں۔ اصیل (جمع اصائل) خالص نسل کے اونٹ ہیں۔ بہت سے عُمان کی نسلوں (عُمانیات) سے ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ کی سواری کی اونٹنیوں میں السمراء، العریس، الحناء اور الشقراء بھی تھیں۔ السمراء پر عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور العریس پر ام سلمہ رضی اللہ عنہا سوار ہوتی تھیں۔ القصواء نامی اونٹنی پر آپ ﷺ نے ہجرت کا سفر کیا اور حجۃ الوداع کا خطبہ الجدعاء پر سے دیا۔ ابوجہل کا سہری نامی اونٹ غنیمت میں نبی ﷺ کو ملا۔[1]

گھوڑا: عربی گھوڑا شکل وصورت اور دیگر خصوصیات کے اعتبار سے بھی امتیازی شان رکھتا تھا۔ گھوڑے کی بعض اقسام کو اہل عرب بہت پسند کرتے تھے۔ ان کا ذکر رسول اللہ ﷺ نے بھی کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«خَيْرُ الْخَيْلِ الْأَدْهَمُ، الْأَقْرَحُ، الْمُحَجَّلُ، الْأَرْثَمُ، طَلْقُ الْيَدِ الْيُمْنٰى، فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ أَدْهَمَ، فَكُمَيْتٌ عَلٰى هٰذِهِ الشِّيَةِ»

''بہترین گھوڑا وہ ہے جو سیاہ ہو، اس کی پیشانی پر تھوڑا سا سفید نشان ہو، چاروں پاؤں میں سفیدی ہو، ناک اور اوپر والا ہونٹ سفید ہو، اگلا دایاں پاؤں سفید نہ ہو۔ اگر سیاہ رنگ نہ ہو تو انھی صفات کا حامل کُمیت (سیاہی مائل سرخ رنگ کا) گھوڑا عمدہ ہے۔''[2]

ایک حدیث میں ہے: ''گھوڑوں میں برکت ان کے سرخ رنگ والوں میں ہے۔''[3]

رسول اللہ ﷺ نے شِکال گھوڑے کو ناپسند فرمایا ہے، یعنی وہ رنگ دار گھوڑا جس کی اگلی دائیں اور پچھلی بائیں ٹانگ یا اگلی بائیں اور پچھلی دائیں ٹانگ سفید ہو۔[4]

بھیڑ بکریاں: خانہ بدوش عرب بھیڑ بکریاں (غنم) بھی پالتے تھے۔ بھیڑوں کی مانگ عربی دعوتوں میں اہم ترین کھانے کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ بھیڑ (نعجہ) یا بکری (عنز) کے دودھ سے سَمن یعنی مصفّٰی مکھن تیار کیا جاتا ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے لڑکپن میں علاقہ بنوسعد میں بکریاں چرائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اتَّخِذُوا الْغَنَمَ فَإِنَّهَا بَرَكَةٌ»

''بھیڑ بکریاں پالو کیونکہ ان میں برکت ہے۔''[5]

کتب سیرت میں رسول اللہ ﷺ کی بکریوں کے نام عَجوہ، بَرَکہ، قَمْرہ، غَونہ اور زمزم ملتے ہیں۔

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 66/13. رسول اللہ ﷺ کے جانوروں کے متعلق مزید معلومات کے لیے دیکھیے: سبل الهدٰى والرشاد: 418/11-422. [2] سنن ابن ماجه: 2789. [3] سنن أبي داود: 2545. [4] صحيح مسلم: 1875. [5] الجامع الصغير: 2806.

جزیرہ نمائے عرب میں لنگور، بندر، خرگوش اور سیہ (خارپشت) بھی پائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں عرب کے حشرات میں بچھو، مکڑی اور ٹڈی بھی شامل ہیں۔ شکاری پرندوں میں عقاب اور شکرا (صقر) ہیں۔ چھوٹے پرندوں میں ہدہد، بلبل، طوطا، ابابیل، ممولا، چنڈول (ایک خوش الحان اور تاجدار پرندہ) اور سرخ ٹانگوں کے لمبے لمبے بگلے بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ حرم مکی کے کبوتر ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ [1]

کچھ عرصے سے شتر مرغ (نَعام) عرب میں ناپید ہوگیا ہے، حالانکہ صحراء میں اس کے انڈوں کے چھلکے پائے جاتے ہیں اور مقامات کے ناموں میں لفظ نَعام ملتا ہے۔ بحرہند سے کبھی کبھی وہیل بھی خلیج فارس میں آجاتی ہے۔ غزوہ سیف البحر میں مجاہدین نے غالباً وہیل ہی کا گوشت اٹھارہ دن کھایا جس کی پسلی گاڑی گئی تو اس کے نیچے سے ایک اونٹ سوار گزر گیا۔ [2]



عرب کی معدنیات

بائبل میں عربوں کے سونے، چاندی اور جواہر کا تذکرہ جابجا موجود ہے۔ خصوصاً وسطی عرب کا مقام ''عُفر'' یا ''اوفیر'' بنی اسرائیل کے عروج کے زمانے میں زرِ خالص کے لیے بہت مشہور تھا۔ سبا کی ملکہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو تحائف بھیجے، ان میں سونا، قیمتی جواہر اور خوشبودار چیزیں شامل تھیں۔ بائبل کی کتابوں تواریخ اور سلاطین میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے:

> ''جب سبا کی ملکہ نے سلیمان (علیہ السلام) کی شہرت سنی تو وہ مشکل سوالوں سے سلیمان (علیہ السلام) کو آزمانے کے لئے بہت بڑی جلو (کاروان) اور اونٹوں کے ساتھ جن پر مصالح (مسالے) اور باافراط سونا اور جواہر تھے یروشلیم میں آئی...... اور اس نے ایک سو بیس قنطار سونا اور مصالح کا بہت بڑا انبار اور جواہر سلیمان کو دیئے اور جو مصالح سبا کی ملکہ نے سلیمان بادشاہ کو دیئے ویسے پھر کبھی میسر نہ آئے۔ اور حورام کے نوکر بھی اور سلیمان کے نوکر جو اوفیر سے سونا لاتے تھے، وہ چندن (صندل) کے درخت (کی لکڑی) اور جواہر بھی لاتے تھے۔'' [3]

بحرین اور عُمان قدیم زمانے سے اپنے نایاب موتیوں (دُرَر) کی وجہ سے مشہور رہے ہیں۔ اسی طرح عقیق یمنی بھی قدیم زمانے سے دُنیا میں بہت مقبول چلا آرہا ہے۔

---

[1] عصر النبوة للكعبي، ص: 19,18، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ:13/65-68. [2] صحيح البخاري :4359. [3] کتاب مقدس (تواریخ-2) 9:1-10، (سلاطین-1) 10:1-11.

2

جزیرہ نمائے عرب کی طبعی و سیاسی تقسیم

علمائے جغرافیہ نے طبعی لحاظ سے جزیرہ نمائے عرب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے:

1 تہامہ 2 عروض 3 نجد 4 یمن 5 حجاز۔

مشہور عرب محقق شوقی ابوخلیل نے اطلس السیرۃ النبویہ میں حجاز کے بجائے جبال السراۃ کو جزیرۃ العرب کا پانچواں حصہ شمار کرتے ہوئے لکھا ہے: یہ خلیج عقبہ سے یمن تک وسیع ہے۔ شمال میں اسے جبال مدین، جنوب میں جبال عسیر اور وسط میں حجاز کہا جاتا ہے جہاں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ واقع ہیں۔[1]

علامہ اصطخری نے جزیرۃ العرب میں درج ذیل تین علاقے مزید شامل کیے ہیں:

1 بادیۃ العراق 2 بادیۃ الجزیرۃ 3 بادیۃ الشام۔[2]

بادیۃ العراق کو بادیۃ السماوہ بھی کہا جاتا ہے، نیز اصطخری نے بادیۃ الجزیرہ سے وسطی الجزیرہ کا وہ صحرائی علاقہ مراد لیا ہے جو دریائے فرات کے شمال میں واقع ہے۔

بادیۃ الشام یا صحرائے شام ایک وسیع ریگزار ہے جو جنوب مشرقی شام، شمال مشرقی اردن اور مغربی عراق میں پھیلا ہوا ہے۔[3] موجودہ شام (سوریہ) کا شہر تدمر تیسری صدی عیسوی میں ایک بڑی عرب سلطنت کا صدر مقام تھا اور اسے عروس الصحراء کہا جاتا تھا۔

1 اٹلس سیرت نبوی، ص: 27. 2 مسالك الممالك للإصطخري، ص: 21,20. 3 أطلس العالم، ص: 12.

سلطنت تدمر (شام) کے آثار



1 تہامہ

یہ نشیبی ساحلی پٹی ہے جو بحیرۂ احمر اور عرب کے جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی ہے۔ بعض جغرافیہ دانوں نے مکہ کو بھی تہامہ ہی میں شامل کیا ہے۔ تہامہ کی مشہور بندرگاہیں ینبع، جدّہ، حدیدہ اور عدن ہیں۔ ساحل کے ساتھ ساتھ سمندر میں مونگے (مرجان) کی چٹانیں ہیں۔ اسی لیے اِس ساحل پر بندرگاہوں کی کمی ہے۔



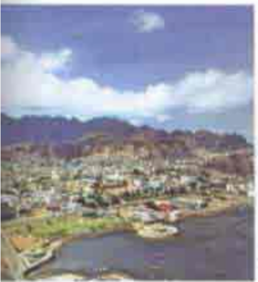
ینبع کا ساحل



جدہ کی بندرگاہ



بندرگاہ حدیدہ (یمن)



عدن (یمن)

تہامہ اَلتَّهَمْ سے مشتق ہے جس کے معنی سخت ترین گرمی اور ہوا رک جانے کے ہیں۔ اسے الغَور بھی کہتے ہیں جس کے معنی نشیب اور پست کے ہیں۔ اس علاقے میں ناقابلِ برداشت گرمی پڑتی ہے۔

تہامہ کی حدود

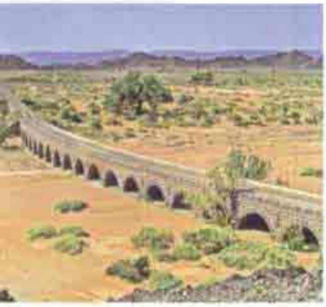
تہامہ کی حد بندی میں مختلف اقوال ہیں: علامہ اصمعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: حجاز کی جانب تہامہ کا کنارہ مدارج العرج ہے۔ مدارج العرج طائف کی ایک وادی میں بلادِ ہُذَیل کا ایک بڑا قصبہ ہے۔ نجد کی طرف تہامہ کا آغاز ذات عِرق سے ہوتا ہے۔ عمارہ بن عقیل یربوعی کہتے ہیں کہ سمندر سے لے کر حرہ بنو سُلَیم اور حرہ لیلیٰ تک پھیلے ہوئے علاقے کو تہامہ اور الغَور کہتے ہیں۔ مدائنی کہتے ہیں کہ جو شخص وَجرہ (مکہ سے بصرہ جانے والی شاہراہ پر ایک مقام)، غمرہ اور طائف سے گزر کر مکہ کی طرف آئے، وہ تہامہ کی سرزمین میں داخل ہو چکا۔[1]

[1] معجم البلدان، مادة: تهامة.

تہامہ کا نام جنوبی عرب کے کتبوں میں بھی ملتا ہے۔ اس کی چوڑائی مختلف مقامات پر ایک جیسی نہیں۔ کہیں بہت تنگ علاقہ ہے جیسا کہ قُنفُذہ اور لُحیّہ کے مقامات پر ہے۔ یمن کے علاقے میں تہامہ سطح سمندر سے دو ہزار (2000) فٹ تک بلند ہے۔ اس کی چوڑائی تیس میل (48 کلومیٹر) سے لے کر پچاس میل (80 کلومیٹر) تک ہے۔ مئی اور ستمبر میں تہامہ کا درجۂ حرارت 35 تا 43 سینٹی گریڈ ہوتا ہے۔ موسم گرما میں کبھی کبھار بارش کی وجہ سے درجۂ حرارت میں کچھ کمی آجاتی ہے۔ موسم سرما میں درجۂ حرارت 25 اور 35 سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا ہے۔ کبھی کبھی 14 سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہے۔ جنوبی تہامہ میں میفعہ اور لحج کے نخلستان بہت زرخیز ہیں۔[1] میفعہ یمن کے صوبہ شبوہ کا ایک شہر ہے۔ یہ صنعاء سے 474 کلومیٹر مشرق میں بحیرۂ عرب کے ساحل پر واقع ہے۔[2]

ذات عرق (نخلہ شامیہ): یہ اہلِ عراق کا میقات ہے جو نجد اور تہامہ کی سرحد پر اوطاس کے قریب واقع ہے۔ مکہ مکرمہ سے اس کا فاصلہ 90 کلومیٹر ہے۔[3]

وادی اِضَم (اَلحَمض): یہ جبال تہامہ (حجاز) کی ایک وادی ہے۔ مدینہ کے پاس اس کا نام القناۃ ہے۔ اس کی بالائی جانب سدّ کے پاس اسے الشظاۃ کہا جاتا ہے اور الشظاۃ سے نیچے سمندر تک اس کا نام اِضَم ہے۔ وادی اضم میں اشجع اور جُہینہ قبائل آباد ہیں۔[4] وادی اضم ان دنوں وادی الحمض کہلاتی ہے۔ یہ حرہ خیبر کے جنوب مشرق سے نکل کر مدینہ کے پاس سے گزرتی ہے اور وادی عقیق اور دیگر وادیوں کو سمیٹ کر وادی القریٰ سے جاملتی ہے۔ یہیں جنوب مغرب سے وادی العیص آکر الحمض سے ملتی ہے جس کے کنارے العیص نامی قصبہ آباد ہے جو ساحلی شہر املج سے 90 کلومیٹر مشرق میں ہے۔ رمضان 1ھ میں سریّہ سیف البحر کے لیے حمزہ رضی اللہ عنہ کا لشکر العیص سے گزرا تھا۔ پھر الحمض مغرب کو بہہ کر الوجہ کے جنوب میں سمندر (بحیرۂ احمر) میں جاگرتی ہے۔ وہیں قدیم یونانی معبد کسر کریم کے آثار ہیں جو یونانی تجارتی جہازوں کے لیے بحری اڈے کا کام دیتا تھا۔ وادی الحمض کی لمبائی تقریباً 900 کلومیٹر ہے۔[5] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان 8ھ میں ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کو بطن اضم کی طرف بھیجا جو مدینہ سے 58 کلومیٹر دور ہے۔[6]



وادی اضم



وادی العیص کی بستی

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 6/851-855. [2] وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا. [3] أطلس الحدیث، ص: 181. [4] معجم البلدان، مادۃ: إضم. [5] مکۃ والمدینۃ فی الجاهلیۃ وعهد الرسول ﷺ، ص: 22. [6] اٹلس سیرت نبوی، ص: 392.

2 عروض

جزیرہ نمائے عرب کا وہ حصہ جو مشرقی نجد اور حدود عراق سے خلیج فارس اور عُمان کے ساحل تک پھیلا ہوا ہے، عروض کہلاتا ہے۔ اسے عروض اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ساحل خلیج کے ساتھ ساتھ مستطیل شکل میں فارس اور یمن و عرب کے درمیان حائل ہے۔[1] اس میں سطح مرتفع بھی ہے اور نشیب بھی، پہاڑ بھی ہیں اور وادیاں بھی۔ عروض میں بحرین اور عمان شامل ہیں۔

بحرین

البکری لکھتے ہیں: بحرین خلیج فارس کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ اس کے مغرب میں یمامہ اور شمال میں بصرہ (عراق) ہے اور جنوبی حصہ عمان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔[2]



قلعہ تاروت

ماضی کی مملکت بحرین میں موجودہ سعودی عرب کا مشرقی علاقہ اور جزیرہ نمائے قطر بھی شامل تھے۔ اس کی بندرگاہ دارین تھا جو سعودی عرب کے شہر القطیف کے مشرق میں جزیرہ نما تاروت پر واقع تھا۔ تاروت سعودی عرب کا ایک چھوٹا سا جزیرہ نما ہے جو خلیج عربی (خلیج فارس) میں واقع ہے۔ جزیرہ نما تاروت کے قصبوں کے نام دارین، سنابس، الربیعہ وغیرہ ہیں۔ قلعہ تاروت اس کے وسط میں واقع ہے۔ یہ قلعہ 921ھ/1515ء میں تعمیر ہوا تھا۔[3]

آج کل مملکت بحرین خلیج عربی کے اندر، سعودی عرب اور قطر کے مابین واقع جزیرہ ''بحرین'' اور چند چھوٹے چھوٹے جزائر کے مجموعے کا نام ہے۔ سب سے بڑا جزیرہ، عربی کے قدیم مآخذ میں، اُوال یا اَوال ملتا ہے۔ وہی آج کل البحرین کہلاتا ہے۔ اس ریاست کا دارالحکومت منامہ ہے۔[4] عدنانی قبائل میں سے بنو عبدالقیس

---

[1] معجم البلدان، مادۃ: عروض. [2] المسالك والممالك لأبي عبيد البكري:1/285. [3] وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا [4] اٹلس سیرت نبوی، ص:30.

کا مسکن قدیم بحرین تھا۔ بنو ربیعہ کی بعض شاخیں بھی یہاں آ کر آباد ہو گئی تھیں۔ [1]

عاتق بن غیث البلادی لکھتے ہیں: قطر سے کویت تک پھیلے ہوئے ساحلِ نجد کا نام البحرین تھا۔ ہَجَر اس کا اہم شہر تھا جسے ان دنوں الهُفوف کہا جاتا ہے۔ اس علاقے کا نام پہلے الحسا تھا، پھر عہد عثمانی کے آخر میں اسے الاحساء کہا جانے لگا اور البحرین کا اطلاق اس بڑے جزیرے پر ہونے لگا جو ساحل کے مشرق میں واقع ہے۔ اس جزیرے کا نام اوال تھا اور آج کل وہ إمارة البحرين کہلاتا ہے۔ جب مملکت سعودی عرب کا قیام عمل میں آیا تو الاحساء کا نام المنطقة الشرقية رکھ دیا گیا۔ دمام اس منطقہ (صوبے) کا دارالحکومت ہے۔ [2]

بحرین میں اسلام، مجوسیت اور یہودیت: چھٹی صدی عیسوی سے بحرین ایرانیوں کے ماتحت تھا۔ سن 6 ھ/628ء میں نبی ﷺ کی طرف سے دعوت اسلام ملنے پر حاکم بحرین منذر بن ساویٰ اور اس کی بیشتر رعایا نے اسلام قبول کر لیا، تاہم خاصی تعداد میں یہاں کے مجوسی (پارسی) اور یہودی اپنے اپنے دین پر کار بند رہے جن سے نبی ﷺ کے حسب فرمان جزیہ وصول کیا گیا۔ [3]


بسم الله الرحمن الرحيم من محمد رسول الله

حاکم بحرین کے نام رسول اللہ ﷺ کا خط

تیسری صدی ہجری میں بحرین کے مجوسیوں میں فرقہ قرامطہ کے بانی حمدان (قرمط) بن اشعث کی دعوت کو فروغ ملا۔ [4] قرامطہ باطنی فرقے کی ایک شاخ ہے۔ مجوسیوں، مزدکیوں، یہود اور ملحد فلاسفہ نے اسلام کی دعوت کمزور کرنے کے لیے اس کی داغ بیل ڈالی۔ قرامطہ کے عقائد فلاسفہ کے نظریات، مزدکیوں کے قواعد اور یہود کے عقائد سے اخذ کیے گئے تھے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو آلِ نبی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قرآن و سنت کے نصوص کے کچھ معانی ظاہر ہوتے ہیں اور کچھ رموز و اسرار باطنی ہیں، لہٰذا ان کے ظاہر پر عمل کے بجائے امام معصوم کا اتباع کیا جائے۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ زمین پر آئیں گے، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی آئیں گے۔ قرامطہ کے نزدیک معبود بھی دو ہیں۔ اسلامی شعائر نماز، روزہ، حج اور زکاۃ وغیرہ معطل ہیں۔ محرمات سے نکاح جائز ہے۔ یہ تحریک 260ھ/873ء میں اپنے گمراہ کن عقائد لے کر ایران کے جنوبی

[1] تاريخ ابن خلدون: 346/2. [2] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 41,40. [3] الطبقات لابن سعد: 263/1، موسوعة السيرة النبوية الشريفة (مرتبة ألفبائيا)، ص: 140. [4] البداية والنهاية: 66,65/11.



قرمطی دینار

علاقوں سے نمودار ہوئی اور رفتہ رفتہ عراق، شام، فلسطین اور بحرین تک پھیل گئی یہاں تک کہ قرامطہ نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ 317ھ/929ء میں قرمطیوں نے مکہ مکرمہ پر حملہ کر کے قتل و غارت کی اور حجر اسود اٹھا کر بحرین لے گئے۔ عباسی خلیفہ مطیع للہ کے دور میں 339ھ/951ء میں حجر اسود کو قرامطہ سے واپس لا کر دوبارہ خانہ کعبہ میں نصب کیا گیا۔ 470ھ/1077ء میں قرامطہ کی حکومت ختم ہوگئی لیکن ان کی تعلیمات کے اثرات ایران، فلسطین اور یمن میں ابھی تک موجود ہیں۔ [1]

عُمان

جزیرہ نمائے عرب کا یہ حصہ بحیرۂ عرب اور خلیج عمان کے ساحل پر واقع ہے۔ اس کے مشرق کی جانب خلیج عمان، مغرب کی طرف الربع الخالی (سعودی عرب)، شمال کی جانب 92100 مربع کلومیٹر پر مشتمل متحدہ عرب امارات اور جنوب میں بحیرۂ عرب اور جنوب مغرب کی طرف حضرموت (یمن) ہے۔ اس کا رقبہ 3 لاکھ 10 ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ [2] زمانۂ قدیم میں عمان کی وجہ شہرت اس کے تیز رفتار گھوڑے اور گدھے تھے۔ عمان کا شہر صُحار تجارت کا بڑا اہم مرکز تھا۔ علامہ مقدسی نے عمان کو بین الاقوامی تجارت کے لحاظ سے مصر اور عدن کا ہم پلہ قرار دیا ہے، نیز عمان اور ایران میں بندر عباس سے 380 کلومیٹر دور 977ء میں زلزلے سے تباہ ہونے والے سیراف کو چین کا دروازہ کہا ہے۔ [3]

عُمان کی بندرگاہ دِبا بھی تجارت کا بڑا مرکز تھی۔ ان دنوں اسے دِبا الحسن کہا جاتا ہے اور یہ آبنائے ہرمز پر واقع عُمان کے علاقے کے جنوب میں متحدہ عرب امارات کی سرحد کے نزدیک آباد ہے۔ یہیں 12ھ/633ء میں عہد صدیق میں حضرت حذیفہ بن محصن رضی اللہ عنہ نے مدعی نبوت ذوالتاج لقیط کو شکست دی تھی۔ [4]

ان دنوں سلطنتِ عمان کا دارالحکومت مسقط ہے جو قدیم دارالحکومت صحار کے جنوب مشرق میں، تقریباً سوا دو سو کلومیٹر دور، خلیج عمان کے ساحل پر واقع ہے۔

[1] موسوعة الأديان، ص:405,404، الموسوعة الميسرة في الأديان و المذاهب: 1/378-382. [2] أطلس العالم، ص: 16و96. [3] أحسن التقاسيم، ص: 35 و 426.

[4] Oman, Sir Donald Hawley, p.35.



دبا



مسقط

3 نجد

نجد کے لغوی معنی بلند اور سخت جگہ کے ہیں۔ اس کو نجد اس لیے کہتے ہیں کہ یہ سخت اور دوسرے علاقوں کی نسبت بلند علاقے پر مشتمل ہے۔ یہ سطح سمندر سے 750 تا 1500 میٹر بلندی پر واقع ہے۔[1] عدنانی قبیلۂ ہُذیل کی بولی میں نجد کو نُجُد کہتے تھے۔[2]

نجد کا حدود اربعہ اور جغرافیائی تقسیم

نجد تین اطراف سے بے آب و گیاہ صحراؤں سے گھرا ہوا ہے، اس لیے یہ علاقہ زیادہ تر بیرونی اثر ورسوخ اور حملہ آوروں سے محفوظ رہا ہے۔ اس کے شمال میں صحرائے شام، عراق اور اردن واقع ہیں۔ مغرب میں حجاز، مشرق میں صحرائے دہناء اور جنوب میں یمامہ کا علاقہ ہے۔ یمامہ کے جنوب میں الربع الخالی واقع ہے۔

اصطخری کے مطابق نجد سے بعض اوقات جزیرہ نمائے عرب کا وہ حصہ بھی مراد لیا جاتا تھا جس کی حدود یمامہ سے لے کر یثرب (مدینہ منورہ) تک، پھر بصرہ سے لے کر بحرین تک پھیلی ہوئی ہیں۔[3] جغرافیہ دان یاقوت حموی لکھتا ہے: نجد خندق کسریٰ (عراق) سے لے کر حرّہ (خیبر) تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک قول کے مطابق نجد سے مراد وہ وسیع سرزمین ہے جس کے بلند علاقے (نجد علیا) تہامہ اور یمن ہیں اور پست علاقے (نجد سفلیٰ) عراق اور شام ہیں۔[4]

یہ بات طے ہے کہ نجد سے سطح مرتفع ہی مراد لی جاتی تھی جیسا کہ ان مقامات سے بھی واضح ہوتا ہے جن کے مرکب ناموں میں نجد کا ذکر آتا ہے۔ علامہ اصمعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نجد کے نام سے کئی مقامات مشہور ہیں، مثلاً: نجد برق (جو یمامہ کی وادی ہے)، نجد الوذ (بلاد ہذیل)، نجد عُقاب، نجد اَجا، نجد شَریٰ، نجد خال (عراق)، نجد عُفر، نجد کبکب (جو عرفات کے قریب ہے)، نجد مَریع۔[5]

نجد کے شمال میں صحرائے نفود پھیلا ہوا ہے۔ اس (کے وسط) میں کوہستان طویق ہے۔ اسے کئی وادیاں (ندیاں)

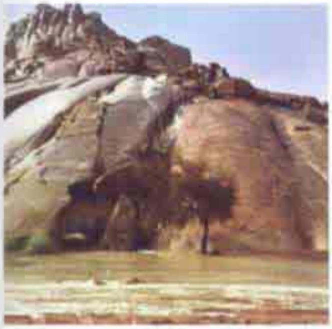
[1] الموسوعة العربية الميسرة: 1824/2، لسان العرب، مادة: نجد. [2] معجم البلدان، مادة: نجد. [3] مسالك الممالك للاصطخري: 14/1. [4] معجم البلدان، مادة: نجد. [5] معجم البلدان، مادة: نجد.



وادی الرمہ



وادی حنیفہ



جبل شمر

قطع کرتی ہیں جن میں سے اہم وادی الرُّمہ اور وادیِ حنیفہ ہیں۔ نجد کے معروف قبائل عنزہ، عتیبہ، حرب اور مطیر ہیں۔ جبل شمر، القصیم، سُدیر (وادی فقی)، وشم، عارض، الخرج، الحریق، الافلاج اور وادی الدواسر، نجد ہی کے علاقے میں ہیں۔ الخرج کا علاقہ بہت زرخیز ہے۔[1]

شعرائے عرب نے نجد کی زرخیزی اور آب و ہوا کی خوبی کی بنا پر اس کو اپنے اشعار میں بڑا ممتاز مقام دیا ہے۔ ایک بدوی شاعر کہتا ہے:

أَلَا حَبَّذَا نَجْدٌ وَّطِيبُ تُرَابِهَا   وَغِلْظَةُ دُنْيَا أَهْلِ نَجْدٍ وَّلِينُهَا

"کیا خوب ہے نجد اور اس کی مٹی کی خوشبو اور اہلِ نجد کی امورِ دنیا میں سختی اور نجد کی شادابی!"[2]

ساعدہ بن جویہ ہذلی نجد شریٰ میں اپنے سفر کی یادوں کو اس طرح تازہ کرتا ہے:

تَحَمَّلْنَ مِنْ ذَاتِ السُّلَيْمِ كَأَنَّهَا   سَفَائِنُ يَمٍّ تَنْتَحِيهَا دَبُورُهَا

مُيَمِّمَةً نَجْدَ الشَّرٰى لَا تَرِيمُهُ   وَكَانَتْ طَرِيقًا لَّا تَزَالُ تَسِيرُهَا

"بنوسُلیم کے علاقے سے سواریاں لدی پھندی آتی ہیں گویا وہ سمندری کشتیاں ہیں جنھیں مغرب سے آنے والی ہوا کے جھونکے آگے لیے جا رہے ہیں۔ وہ نجد شریٰ کا قصد کرنے والی ہیں اور اس سے ہٹنے والی نہیں۔ وہ ایک راستے پر مسلسل چل رہی ہیں۔"[3]

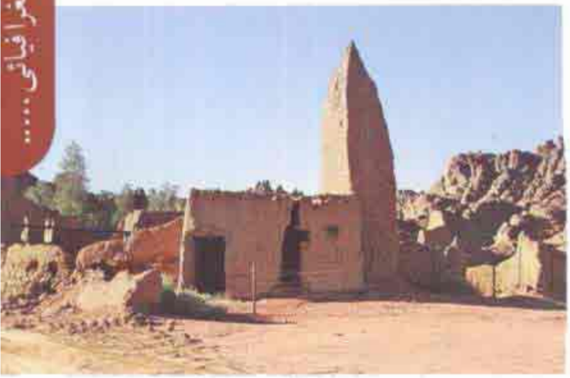
نجد عالیہ اور نجد سافلہ

عرب جغرافیہ دان نجد عالیہ اس علاقے کو کہتے ہیں جو حجاز اور تہامہ کے ساتھ ملا ہوا ہے اور نجد سافلہ وہ علاقہ ہے

[1] الموسوعة العربية المُيَسَّرة: 1824/2. [2] الزهرة لابن داود الأصبهاني :104/1، معجم البلدان، مادة : نجد. [3] معجم البلدان، مادة: نجد.

جو عراق کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں نجد میں جنگلات اور ثمر آور درخت موجود تھے۔ خاص کر وادی الرمہ کے جنوب اور مکہ کے شمال مشرق میں الشَّرَبَّہ اور وجرہ کے علاقے اپنے پھل دار درختوں کی وجہ سے مشہور تھے۔ [1]

نجد کے بعض اہم مقامات



حاتم طائی سے منسوب محل

جبال طے اور حائل: بنو طے کے پہاڑ جبل اَجا اور جبل سلمیٰ پر مشتمل ہیں۔ زمانۂ قدیم میں یہاں مشہور عرب سردار حاتم طائی کا مسکن تھا جس کی سخاوت، فیاضی اور مہمان نوازی ضرب المثل تھی۔ نجد کا خوبصورت شہر حائل یہیں آباد ہے۔ یہاں کی مشہور کھجور حلوۃ الجبل ہے۔ موجودہ سعودی صوبہ حائل کے اہم شہر جبہ، بقعاء، غزالہ، حلیفہ، السُّلیمی، السبعان اور المیاہ ہیں۔ حائل صوبائی دارالحکومت ہے جو جبل اَجا اور جبل سلمیٰ کی طرف سے بہنے والی ندی (وادی حائل) کے کنارے واقع ہے۔ [2]

القصیم: یہ نجد کا وسطی خطہ ہے جو وشم اور جبل طے (جبل شمر) کے درمیان واقع ہے۔ حرۂ خیبر اور جنوبی حائل سے آنے والی ندی (وادی الرمہ) صوبہ القصیم کے وسط میں بہتی ہے۔ بریدہ صوبائی دارالحکومت ہے۔ القصیم کے مغرب میں واقع جبل طامیہ 1286 میٹر بلند ہے۔ کھجور کی پیداوار میں یہ علاقہ ممتاز مقام رکھتا ہے۔ القصیم کے مشہور مقامات مندرجہ ذیل ہیں:

بُرَیْدَہ، عُنَیْزَہ، الرَّسّ، المِذْنَب، البُکَیْرِیَّہ، عُقْلَۃُ الصُّقُورِ، نَقِرَہ، قُبَّہ، الخَبْرَاء۔

اصحاب الرّس کا مسکن: قرآن مجید کی سورۂ فرقان (آیت 38) اور سورۂ ق (آیت 12) میں قوم نوح اور عاد و ثمود کے ساتھ اصحاب الرس (کنویں والوں) کا ذکر ہوا ہے۔ انھوں نے انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا اور تباہی سے دوچار ہوئے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ وہ اصحاب الرس کے نام سے اس لیے مشہور ہوئے کہ انھوں نے اپنے نبی کو کنویں میں پھینک دیا تھا۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اصحاب الرس اور اصحاب الاخدود ایک ہی ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ یمامہ کے علاقے میں ایک بستی تھی جسے فلج (یا فلج الافلاج) کہا جاتا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ یہ قوم ثمود کے ایک قبیلے کا

[1] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 182/1. [2] تاريخ نجد لمحمود شكري، ص: 20,19.


اصحاب الرّس کا ممکنہ علاقہ
(۱) فلج، یمامہ یا الرّس (نجد)
(۲) قوم ثمود کے ایک قبیلے کا علاقہ
(۳) آذربائیجان یا ازّان (داغستان) کی ایک وادی
(۴) حضرموت کی ایک بستی
الرّس
یمامہ
نجد
الریاض (موجودہ)
فلج
حضرموت
یمن
الربع الخالی
بحرِ ہند
خلیج عدن
بحیرۂ عرب
سقوطرہ
حبشہ
سودان
مصر
صحرائے نوبیہ
حجاز
مدینہ منورہ (یثرب)
مکہ مکرمہ
جدہ
صنعاء
عدن
مکلا
صلالہ
عصب
بربرہ
قرن افریقہ (صومالیہ)
عُمان
خلیج عُمان
مسقط
مکران
خلیج عربی (خلیج فارس)
فارس
شیراز
کرمان
یزد
اصفہان
سجستان (سیستان)
اُبلہ
النفود الکبیر
ایلہ
سیناء
صحرائے شام
دمشق
حلب
موصل
دریائے فرات
دریائے دجلہ
رے
تبریز
آذربائیجان
آرمینیا
باکو
دربند
ازّان
تفلس
جارجیا
بحیرۂ اسود
ایشیائے کوچک
کوبان
روس
اتل
دون
یوکرین
ازوف
نجد
سدیر
القصیم
الرس
الریاض
الیمامہ
الافلاج
الدوادمی
عفیف
الخرج
لیلی
البدیع
(فلج)

رہائشی علاقہ ہے۔[1] لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ اصحاب الرس یمامہ میں رہنے والے تھے۔ فلج آج کل صرف الافلاج کہلاتا ہے۔



قدیم قصبہ الرس کے آثار

نجد میں صوبہ القصیم کے شہر بُریدہ سے تقریباً 70 کلومیٹر جنوب مغرب میں الرس نامی شہر آباد ہے۔[2] صاحب معجم البلدان یاقوت حموی نے جہاں یہ ذکر کیا ہے کہ الرس یمامہ کی ایک بستی ہے، وہاں ابن دُرید کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ''الرّس اور الرَّسیس نجد کی دو وادیاں یا دو قصبے ہیں۔''[3] چونکہ یمامہ بھی نجد میں شمار ہوتا ہے، اس لیے یہ قرینِ قیاس ہے کہ آج کے القصیم (نجد) میں واقع الرّس وہی قدیم قصبہ ہے جسے بعض علماء نے یمامہ کی ایک بستی قرار دیا۔

عارض الیمامہ: نجد العارض (عارض الیمامہ) 120 کلومیٹر لمبی وادی حنیفہ (العرض) اور یمامہ پر مشتمل ہے۔ اسی جگہ بعد میں درعیہ آباد ہوا جہاں سعودی مملکت کی بنیاد رکھی گئی۔

یمامہ کا محل وقوع: یمامہ کے مشرق میں عمان اور بحرین، شمال اور مغرب میں اصل نجد اور جنوب میں الربع الخالی ہے۔ بعض اہل علم نے یمامہ کو عروض میں شمار کیا ہے مگر بیشتر اسے نجد میں شامل کرتے ہیں۔ معروف جغرافیہ دان یاقوت حموی نے لکھا ہے: ''اسے نجد میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کا مرکزی مقام حَجْر ہے۔''[4] ان دنوں قصبہ یمامہ الخرج کے شمال مغربی مضافات میں الریاض سے تقریباً 80 کلومیٹر دور ہے۔



یمامہ کی بستی کے کھنڈر (الخرج)

حاکم یمامہ ثمامہ بن اُثال: بعثت نبوی کے وقت ثمامہ بن اُثال رضی اللہ عنہ اسی علاقے میں حاکم تھے۔[5] انھوں نے جس طرح اسلام قبول کیا، اس کی روداد بہت دلچسپ ہے۔ وہ مشرک اور قریش کے حلیف تھے۔ 7 ھ میں عمرے کے لیے نکلے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے انھیں گرفتار کرلیا اور لاکر مسجد نبوی میں باندھ دیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ثمامہ کا ارادہ

---

[1] اطلس القرآن، شوقی ابوخلیل، ص:220. [2] أطلس المملكة العربية السعودية والعالم، ص: 14و 17. [3] معجم البلدان، مادة: الرسّ. [4] معجم البلدان، مادة: يمامة. [5] تاريخ ابن خلدون:2/348.

دریافت فرمایا تو انھوں نے آپ سے کہا:

[إِنْ تَقْتُلْنِي تَقْتُلْ ذَا دَمٍ، وَإِنْ تُنْعِمْ تُنْعِمْ عَلٰى شَاكِرٍ]

''اگر آپ مجھے قتل کریں گے تو میرا خون رائیگاں نہیں جائے گا (میرا بدلہ لینے والے بہت ہیں۔) اور اگر احسان کریں گے تو قدر دان پر احسان کریں گے۔''

دوسرے دن آپ نے پھر پوچھا: ''ثمامہ! اب تیرا کیا خیال ہے؟'' انھوں نے کہا: وہی جو پہلے کہہ چکا ہوں۔ تیسرے دن نبی ﷺ نے پھر کہا: ''ثمامہ! اب تو کیا سمجھتا ہے؟'' انھوں نے جواب دیا: اب بھی وہی ہے جو میں پہلے آپ سے کہہ چکا ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ ثمامہ کو کھول دو۔ رسی کھول دی گئی تو وہ مسجد نبوی کے قریب ایک باغ میں گئے اور غسل کر کے مسجد نبوی میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا:

[أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰهِ]

''میں (اس حقیقت کی) گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔'' پھر کہا:

[يَا مُحَمَّدُ! وَاللّٰهِ! مَاكَانَ عَلَى الْأَرْضِ وَجْهٌ أَبْغَضَ إِلَيَّ مِنْ وَّجْهِكَ، فَقَدْ أَصْبَحَ وَجْهُكَ أَحَبَّ الْوُجُوهِ إِلَيَّ، وَاللّٰهِ! مَاكَانَ مِنْ دِينٍ أَبْغَضَ إِلَيَّ مِنْ دِينِكَ، فَأَصْبَحَ دِينُكَ أَحَبَّ الدِّينِ إِلَيَّ، وَاللّٰهِ! مَاكَانَ مِنْ بَلَدٍ أَبْغَضَ إِلَيَّ مِنْ بَلَدِكَ، فَأَصْبَحَ بَلَدُكَ أَحَبَّ الْبِلَادِ إِلَيَّ]

''اے محمد (ﷺ)! اللہ کی قسم! روئے زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ کسی کے چہرے سے مجھے بغض نہ تھا اور اب آپ کے رخِ انور سے زیادہ کسی کا چہرہ مجھے محبوب نہیں۔ اللہ کی قسم! آپ کے دین سے زیادہ کوئی دین میرے نزدیک قابل نفرت نہ تھا اور اب مجھے آپ کا دین سب دینوں سے زیادہ محبوب ہے۔ اللہ کی قسم! مجھے آپ کے شہر سے بڑھ کر کسی شہر سے نفرت نہ تھی، اب آپ کا شہر تمام شہروں سے زیادہ محبوب ہے۔''

پھر حضرت ثمامہ رضی اللہ عنہ عمرے کے لیے چلے گئے۔ جب آپ مکہ پہنچے تو لوگوں نے کہا: ثمامہ بے دین ہو گیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: نہیں، میں تو محمد ﷺ پر ایمان لایا ہوں۔ اور اب یمامہ سے گندم کا ایک دانہ بھی اس وقت تک مکہ نہیں آئے گا جب تک نبی اکرم ﷺ اجازت نہ دے دیں۔[1] ان دنوں الریاض سے 60 کلو میٹر شمال میں

[1] صحيح البخاري:4372، صحيح مسلم:1764.

ثمامہ نامی بستی اور وادی ثمامہ حضرت ثمامہ رضی اللہ عنہ کی یاد دلاتی ہیں۔

زرقاء الیمامہ اور یمامہ کی وجہ تسمیہ: یاقوت حموی لکھتے ہیں کہ یمامہ پرانی اقوام طسم اور جدیس کا مسکن تھا۔ اسے پہلے ''جَوّ'' کہا جاتا تھا۔ ان کا حاکم عملیق بن ہباش بن ہیلس تھا جس کا تعلق بنوطسم سے تھا۔ وہ نہایت بدطینت، جابر اور ظالم شخص تھا۔ اس نے حکم جاری کر رکھا تھا کہ جب بھی کسی لڑکی کی شادی ہو، خاوند سے پہلے اسے میرے پاس بھیجا جائے۔ قبیلہ جدیس کے سردار اسود بن غِفار کی بہن عفیرہ بنت غفار کی شادی ہوئی اور اسے حسب روایت عملیق کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس ظالم کے وحشیانہ سلوک پر اس نے اپنے بھائی اور اپنی قوم کو عار دلائی تو اس کی باتیں سن کر اسود کی آنکھوں میں غیظ و غضب کے شرارے کوندنے لگے۔ اس نے اپنی قوم کو پکارا تو انھوں نے بنوطسم کے تمام اشراف کو ہلاک کر دیا۔

بنوطسم کا ایک آدمی ریاح بن مرہ بھاگ کر تُبّعِ یمن (حسان بن تبع) کے پاس چلا گیا اور مدد چاہی۔ حسان ایک بڑا لشکر لے کر اس کے ساتھ روانہ ہوا۔ جب وہ مقام ''جَوّ'' کے قریب پہنچے تو ریاح بن مرّہ نے بادشاہ سے کہا: آپ یہیں ٹھہریں۔ میری ایک بہن کی شادی بنوجدیس میں ہوئی ہے۔ اللہ نے اسے عجیب بصارت سے نواز رکھا ہے۔ اسے یمامہ کہا جاتا ہے۔ وہ ایک دن اور ایک رات کی مسافت سے آدمی کو دیکھ لیتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہمیں دیکھ لے اور اپنی قوم کو خبردار کر دے۔ تبع رک گیا، اس نے ایک آدمی سے کہا: پہاڑ پر چڑھ کر حالات کا جائزہ لو۔ وہ اوپر چڑھا تو اس کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ گیا۔ وہ اسے صحیح کرنے کے لیے جھکا تو یمامہ نے اسے دیکھ لیا، اس نے قوم کے لوگوں کو بتایا لیکن انھوں نے اسے مذاق سمجھا۔

بعد ازاں لشکرِ یمن نے دھاوا بول کر بنوجدیس کو شکست فاش دی اور یمامہ کو گرفتار کر لیا۔ جب تبع کے حکم پر اس کی آنکھیں نکالی گئیں تو پتہ چلا کہ اس کی آنکھوں کے حلقے اثمد (سرمہ) سے بھرے ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اثمد سب سے پہلے اسی نے استعمال کیا تھا۔ تبع نے حکم دیا کہ یمامہ کو ''جَوّ'' کے دروازے پر سولی چڑھا دو، پھر اس کے حکم سے اس علاقے کا نام یمامہ رکھ دیا گیا۔[1] بعد کے لوگوں نے اس عورت کو زرقاء الیمامہ (یمامہ کی نیلی آنکھوں والی) کے نام سے یاد رکھا۔ طسم و جدیس کے بعد بنوحنیفہ یمامہ میں برسرِ اقتدار آئے۔ یہ قبیلہ بنوبکر بن وائل سے ہے جو عدنانی ہیں۔ ان کا نسب حنیفہ بن لجیم بن صعب بن علی بن بکر بن وائل ہے۔ یہ یمامہ کے رہائشی تھے۔ انھی میں سے ہوذہ بن علی تھا جسے رسول اللہ ﷺ نے خط لکھا تھا اور اسلام کی دعوت دی تھی۔[2] مسیلمہ کذاب

[1] معجم البلدان، مادة: يمامة. [2] نهاية الأرب، ص: 223.

بن ثمامہ بن کثیر بن حبیب کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا۔ [1]

مسیلمہ نے عہد رسالت کے آخری دنوں میں جھوٹی نبوت کا ڈھونگ رچایا۔ [2] سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کا قلع قمع کرنے کے لیے لشکر بھیجا۔ مسیلمہ کذاب اسی جنگ کے دوران میں وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ [3] جس مقام پر معرکۂ یمامہ برپا ہوا تھا، وہ سعودی دارالحکومت الریاض سے 40 کلومیٹر شمال مغرب میں واقع ہے اور ان دنوں ''الجبیلہ'' کہلاتا ہے۔ الجبیلہ میں ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی قبریں ہیں جو مرتدین کے خلاف جنگ میں شہید ہوئے تھے۔



معرکہ یمامہ میں شہید ہونے والے صحابہ کرام کا قبرستان

ضریة: یہاں سیدنا محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں محرم 5 ھ میں سریۂ قُرطاء پیش آیا تھا۔ قبیلہ قرطاء بنوبکر بن کلاب قیسی کی ایک شاخ تھا۔ ضریہ نجد کے وسط میں ایک چراگاہ ہے۔ ان دنوں ضریہ نامی قصبہ ربذہ سے 165 کلومیٹر اور الحناکیہ سے 247 کلومیٹر مشرق میں، البتراء (الحناکیہ عُنیزہ شاہراہ پر) سے 135 کلومیٹر جنوب میں اور العفیف سے تقریباً 90 کلومیٹر شمال میں ہے۔ [4]



ربذہ یا ضریہ

ذات الرقاع: یہ نجد کا ایک پہاڑ ہے جس میں سرخ، سیاہ اور سفید رنگ کے قطعات (رقاع) ہیں۔ جبل ذات الرقاع مدینہ سے تقریباً 100 کلومیٹر شمال مشرق میں وادی الحناکیہ اور الشقرہ (موجودہ الشقران) کے درمیان واقع ہے۔ یہاں محرم 5 ھ میں غزوہ ذات الرقاع پیش آیا۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے قدم پیدل چلنے سے زخمی ہوگئے تھے، لہٰذا انھوں نے اپنے پیروں پر بوسیدہ کپڑوں کی دھجیاں لپیٹ لیں جنھیں عربی میں رقاع کہتے ہیں، اس لیے اس



وادی النخیل، الحناکیہ

[1] تاريخ ابن خلدون:348/2. [2] فتح الباري:464/7. [3] صحيح البخاري:4072. [4] اٹلس سیرت نبوی، ص:285، أطلس المملكة العربية السعودية، لوحة:9.

غزوے کا نام ذات الرقاع پڑ گیا۔ اس کا مقام وقوع قصبہ الحناکیہ سے دس پندرہ کلومیٹر جنوب میں المریّہ نامی بستی کے پاس ہے۔

غزوہ ذات الرقاع: وادیِ نخل میں پیش آیا تھا۔ نخل وہ وادی ہے جس میں قصبہ الحناکیہ واقع ہے۔ وادی نخل یا وادی الحناکیہ کے پاس ہی وادی النخیل ہے۔ یہیں موجودہ قصبہ النخیل آباد ہے جو الحناکیہ سے تقریباً 30 کلومیٹر شمال میں ہے۔ مدینہ سے قصیم جاتے ہوئے الحناکیہ سے آگے وادی النخیل دائیں طرف آتی ہے۔ [1]

جنگ بسوس کے چالیس برس

زمانۂ قدیم میں نجد عرب بائدہ کا مسکن تھا، پھر جزیرہ نمائے عرب کے جنوب سے قحطانی قبائل اور ان کے بعد حجاز سے عدنانی قبائل یہاں منتقل ہوئے۔ [2]

عدنانی قبائل میں بکر بن وائل بھی نجد میں آباد ہوئے تھے۔ عربی زبان میں جو مہارت بنوبکر کے حصے میں آئی، وہ شاید ہی کسی اور کو نصیب ہوئی ہو۔ بنوبکر کے برادر قبیلہ بنوتغلب کا سردار کلیب بن ربیعہ تغلبی تھا۔ اُسے بنوبکر کے جساس بن مرہ شیبانی نے قتل کر دیا۔ اس پر بنوبکر اور بنوتغلب میں چالیس سال خونریز جنگ ہوتی رہی جسے جنگ بسوس کہتے ہیں۔ [3]

اس علاقے میں عربی زبان کے ایسے ایسے قادر الکلام شعراء پیدا ہوئے جو اپنی مثال آپ تھے۔ کلیب بن ربیعہ تغلبی کا بھائی مہلہل جو عربی شاعری کا باوا آدم کہلاتا ہے، اسی نجد کی خاک سے پیدا ہوا تھا۔ نجد کے قبیلہ کندہ کا مقتول شہزادہ امرؤ القیس بن حُجر بن حارث جاہلی دور کا عظیم ترین شاعر سمجھا جاتا ہے۔ [4]

نجد میں دعوتِ اسلام

عہد نبوی میں مسلمانوں کے ساتھ قبائلِ نجد کے تعلقات آخر تک کشیدہ ہی رہے۔ بعثت کے دسویں سال ہجرت سے پہلے حج کے موقع پر اور عرب کے تجارتی بازاروں میں نبی اکرم ﷺ نے کم و بیش پندرہ قبائل کے لوگوں سے یکے بعد دیگرے یہ خواہش ظاہر فرمائی تھی کہ وہ آپ کی حمایت کریں۔ اس موقع پر نجد کے بنوحنیفہ سب سے زیادہ درشت اور بداخلاق ثابت ہوئے تھے۔ [5] ربیع الاول 4 ھ میں نجد میں بئر معونہ کا دل گداز واقعہ پیش آیا جس میں 70

[1] الطبقات لابن سعد : 61/2، فتح الباري : 521/7، معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية : 318,317، أطلس المملكة العربية السعودية : 189. [2] علماء نجد خلال ثمانية قرون: 9,8/1. [3] الجمهرة لابن حزم، ص: 305. [4] الكامل لابن الأثير: 609,608/1، إمتاع الأسماع للمقريزي: 49/1. [5] المنتظم: 138/2، تاريخ ابن خلدون: 347/2.

قرائے کرام کو بدعہدی اور دھوکے سے شہید کیا گیا۔ [1]

نبی اکرم ﷺ نے 7ھ میں بنو حنیفہ کے شاعر، خطیب اور مذہبًا نصرانی بادشاہ ہوذہ بن علی حنفی کو ایک خط لکھا جس میں اسے اسلام کی دعوت دی تو اس نے جواب میں لکھا: ''......آپ کچھ اختیارات میرے سپرد کردیں تو میں آپ کی اطاعت قبول کرلوں گا۔'' [2]

فتح مکہ کے بعد اگرچہ قبائل نجد نے اسلام قبول کرلیا تھا مگر پھر نبی کریم ﷺ کی زندگی ہی میں نجد میں فتنۂ ارتداد شروع ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس فتنے کی سرکوبی کے لیے ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک سریہ روانہ فرمایا۔ [3]

[1] دیکھیے: صحیح البخاري :4090. [2] الطبقات لابن سعد:262/1. [3] صحیح البخاري :4338، فتح الباري :70/8.

4 یمن

جزیرہ نمائے عرب کے جنوب مغرب میں واقع یمن مختلف ادوار میں ایک خود مختار مملکت رہا ہے۔ یہ جزیرہ نمائے عرب کا متمدن ترین علاقہ اور بنیادی طور پر قحطانی عربوں کا مسکن تھا۔

آثار قدیمہ اور کتبات سے پتا چلتا ہے کہ پورے جزیرہ نمائے عرب میں تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں باشندگانِ یمن کا کوئی ثانی نہیں تھا، اس لیے اسے الیمن السعیدة (خوش و خرم یمن) یا العربیة الغنیة (زرخیز عرب) بھی کہا جاتا تھا۔[1]

یمن کی وجہ تسمیہ

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''عرب اس جزیرہ نما کی مختلف سمتوں میں بکھر گئے، پھر جو دائیں طرف گئے، ان کے رخ کی مناسبت سے اس علاقے کا نام یمن رکھ دیا گیا۔'' (یمین عربی زبان میں دائیں طرف کو کہتے ہیں۔ اسی طرح یُمن کا معنی برکت بھی ہے، لہٰذا دائیں سمت مبارک خیال کی جاتی ہے۔) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب مکہ میں لوگوں کی کثرت ہوگئی اور وہاں مزید گنجائش نہ رہی تو دائیں طرف والے یمن کی طرف اکٹھے ہو گئے اور وہ ارضِ مکہ کے انتہائی دائیں جانب ہے، لہٰذا اس کا یہ نام پڑا۔[2]

[1] قصة و تاریخ الحضارات العربیة: 28/15۔ [2] معجم البلدان، مادة: یمن.



حراز (یمن) کا ایک پہاڑی گاؤں

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی توجیہ خوبصورت ہے۔ وہ کہتے ہیں: مکہ مکرمہ کے پیچھے مغرب میں سمندر (بحیرۂ احمر) ہے لیکن مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے والوں کے سامنے نجد تھا، دائیں طرف یمن اور بائیں طرف شام، لہٰذا یمن کے مکہ مکرمہ سے دائیں طرف ہونے کے باعث اس علاقے کا نام یمن پڑ گیا۔ اسی وجہ سے بیت اللہ کے ایک رکن کا نام بھی رکنِ یمانی ہے۔

قدیم اہلِ عرب اسے العرب السعيدة یا اليمن الخضراء کے نام سے یاد کرتے تھے۔ [1] ابن یعقوب ہمدانی لکھتے ہیں کہ اسے یمن خضراء اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں درختوں، پھلوں اور فصلوں کی بہتات ہے۔ [2]

قدیم سبائی آثار میں یمن کا نام ''یمنات'' یا ''یمنت'' بیان کیا گیا ہے جس کے معنی خیر و برکت کے ہیں، چنانچہ رومی مصنفین نے اسے Arabia Felix لکھا ہے جس کے معنی العربية السعيدة یا العربية الخيرية (بہترین عرب) ہیں۔ [3]

یمن کی وسعت

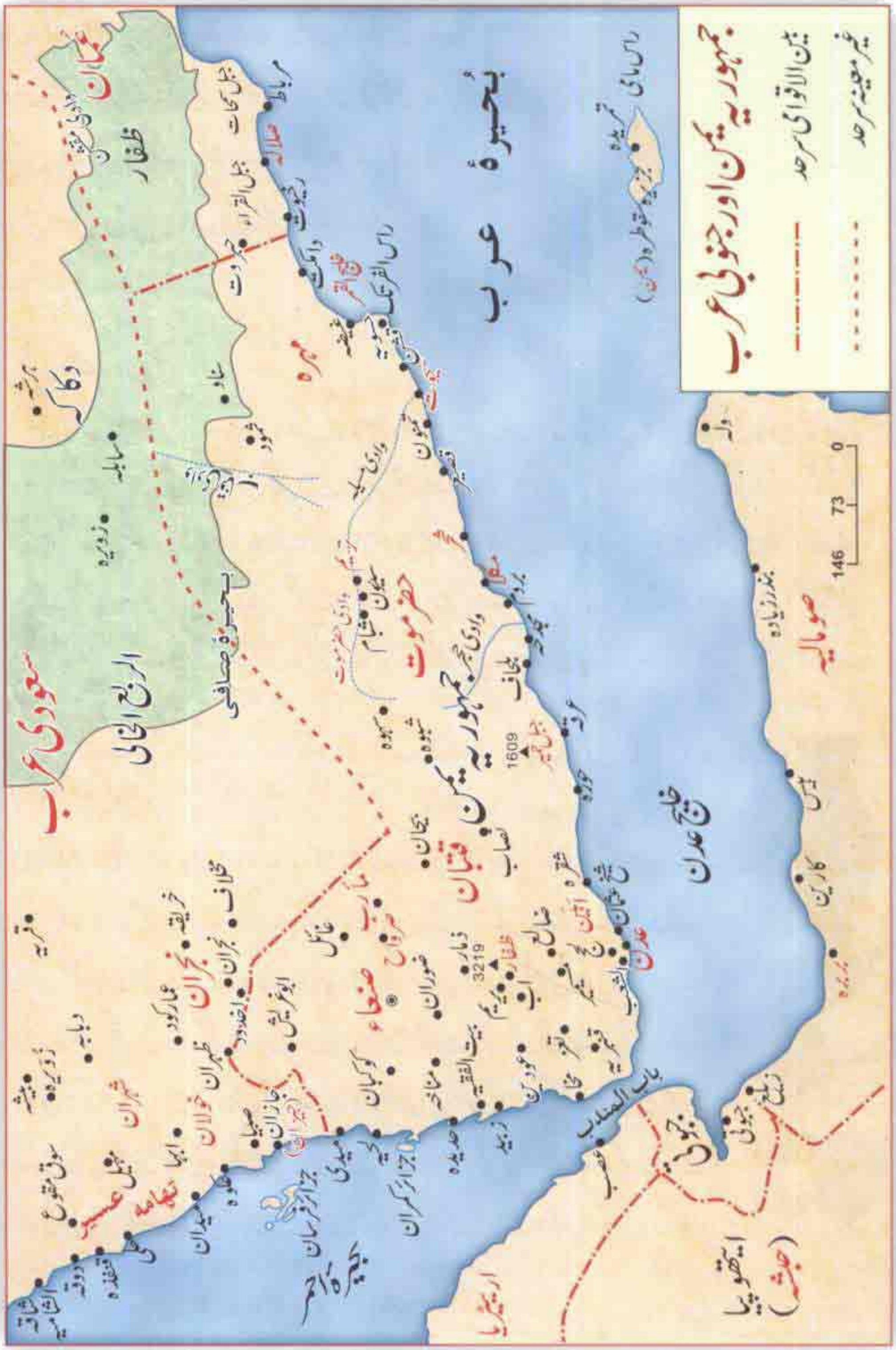
اس سرسبز و شاداب خطے کے جنوب میں خلیج عدن اور بحیرۂ عرب، مغرب میں بحیرۂ احمر (بحیرۂ قلزم)، شمال میں حجاز، نجد اور الربع الخالی اور مشرق میں عُمان واقع ہے۔ موجودہ یمن کا رقبہ 5 لاکھ 27 ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ [4] اس کی حدود شمال میں نجران، یمنی بندرگاہ المکلا سے تقریباً 460 کلومیٹر شمال میں الودیعہ اور عروق الموارد (الربع الخالی) سے جنوب میں بحیرۂ عرب تک اور مغرب میں ساحل بحیرۂ قلزم (احمر) سے لے کر مشرق میں حبروت (سلطنت عُمان) تک ہیں۔ ماضی کا نجرانِ یمن زیادہ تر سعودی عرب میں شامل ہے۔ [5]

یمن کی حدود مختلف ادوار میں مختلف رہی ہیں۔ ابن یعقوب ہمدانی نے یہ حدود عُمان و یبرین سے سرحدِ یمامہ تک، پھر الهُجَيره، تثلیث اور جُرَش سے تہامہ تک، پھر حَمِضَہ کے نزدیک کُدُمُّل نامی پہاڑ تک بیان کی ہیں۔ [6] تثلیث اور حَمِضَہ ان دنوں سعودی عرب کے صوبہ عسیر میں واقع ہیں جبکہ تثلیث موجودہ یمنی سرحد سے تقریباً 200 کلومیٹر شمال میں ہے۔

قدیم عرب جغرافیہ دان ابن حوقل جزیرہ نمائے عرب کا دو تہائی حصہ یمن میں شمار کرتے ہیں۔ وہ تہامہ، نجدِ یمن،

---

[1] عصر النبوة للكعبي، ص: 19. [2] صفة جزيرة العرب، ص: 90. [3] قصة و تاريخ الحضارات العربية: 25/15. [4] أطلس العالم، ص: 16 و 96. [5] أطلس المملكة العربية السعودية والعالم، ص: 31,30. [6] صفة جزيرة العرب، ص: 90.


جمہوریہ یمن اور جنوبی عرب
بین الاقوامی سرحد
غیر متعینہ سرحد
بحیرۂ عرب
خلیج عدن
سعودی عرب
الربع الخالی
عمان
حضرموت
عدن
صنعاء
نجران
باب المندب
صومالیہ
146 73 0



میقات یلملم (السعدیہ)

عُمان، مہرہ، حضر موت، صنعاء، عدن اور یمن کے تمام اضلاع کو اس میں شامل بتاتے ہیں۔ انھوں نے اس کی شمالی حدود سِرّین سے اہل یمن کے میقات یلملم اور طائف تک بیان کی ہیں، پھر وہ ان سرحدوں کو نجدِ یمن سے لے کر خلیج فارس تک لے جاتے ہیں۔[1]

یمن کے اضلاع

عباسی عہد میں یمن جزیرہ نمائے عرب کا وسیع و عریض صوبہ تھا۔ احمد بن اسحٰق یعقوبی (متوفی 292ھ) نے یمن کے 84 اضلاع بیان کیے ہیں جن میں سے اہم یہ تھے:

ذِمَار، جُرَش، صَعْدَہ، الحِجْر، المَعافِر، السَّكُون، مَأرِب، حَضُور، جَيْشان، بَيْش، السّاعِد، زَبِيد، لَحْج، أَبْيَن، حَضْرَمَوْت، عَنْس، بني عامر، مَأذَن، حُمْلان، خَوْلان، السَّرْو، الدَّثِينَہ، كُبَيْبَہ اور تَبالہ۔ اور ساحل کے ساتھ ملے ہوئے اضلاع یہ تھے: عَدَن، المَنْدَب، غَلافِقَہ، الحَمِضَہ اور السَّرَّيْن ۔[2]

یمن کے لعل و جواہر اور تجارت



یونانی مؤرخ سٹرابو بیان کرتا ہے کہ جنوبی عرب (یمن) جزیرہ نمائے عرب کا سب سے مال دار حصہ ہے۔ یہاں کے باشندے عمدہ لباس زیب تن کرتے ہیں۔ سونے چاندی کے برتن ان کے ہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ وہ اپنے گھروں کی زیبائش ہاتھی دانت، سونے، چاندی اور قیمتی پتھروں سے کرتے ہیں۔ ان کی دولت و ثروت کا راز ان کی تجارت میں ہے۔ یمنی تاجر عرب اور ہندوستان کی پیداوار کو قافلوں کی صورت میں مغرب کی طرف یا سمندری راستے سے بابل کی طرف لے جاتے تھے۔ ان کے جہاز بحر ہند میں چلتے تھے اور وہ بڑی بڑی کشتیوں میں دجلہ کے راستے ''اوبیں'' تک جاتے، پھر اس مال کو میڈیا

[1] تقويم البلدان، ص: 80. [2] تاريخ اليعقوبي: 1/173,172.

(شمال مغربی ایران)، آرمینیا اور اس کے نواح میں فروخت کر کے بھاری منافع کماتے تھے۔ [1]

اہلِ یمن کی فضیلت

یمن نہ صرف اپنی معیشت اور مادی اسباب کے اعتبار سے سرسبز وشاداب خطہ ہے بلکہ وہ معنوی خصوصیات اور دینی لحاظ سے بھی بڑا خوش قسمت ہے۔ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ میں اس خطے کا تذکرہ بہت خوبصورت اور تحسین آمیز انداز میں کیا گیا ہے۔

اہلِ یمن کی فضیلت قرآن میں

- ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۫ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىِٕمٍ ﴾

”اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ عنقریب ایسے لوگ لے آئے گا کہ وہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے۔ (وہ) مومنوں پر بہت نرم ہوں گے، کافروں پر بڑے سخت، اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔“ [2]

رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ ان سے مراد کون لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن نے یہ کہا کہ ”اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا:

«هٰؤُلَاءِ قَوْمٌ مِّنَ الْيَمَنِ، ثُمَّ مِنْ كِنْدَةَ، ثُمَّ مِنَ السَّكُونِ، ثُمَّ مِنْ تُجَيْبٍ»

”ان لوگوں کا تعلق یمن سے، پھر بنوکندہ، پھر بنوسکون (بن اَشرس بن ثور)، پھر بنوتُجیب سے ہے۔“ [3]

- سورۂ حج میں فرمانِ الٰہی ہے: ﴿ وَ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ﴾

”اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دیں۔“ [4]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ

---

[1] قصة و تاريخ الحضارات العربية: 35/15. [2] المآئدة5:54. [3] تفسير ابن أبي حاتم، المآئدة5:54، المعجم الأوسط للطبراني: 380/1، حديث: 1392. اس کی سند حسن ہے۔ دیکھیے: مجمع الزوائد: 16/7، حديث: 10977، السلسلة الصحيحة: 1103/7-1106. [4] الحج22:27.

لوگوں میں بیت اللہ کے حج کا اعلان کریں تو وہ (بیت اللہ کے قریب ترین) جبل ابوقبیس پر چڑھ گئے۔ انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈالیں، پھر اعلان کیا: بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے، اس لیے تم اپنے رب کی پکار پر لبیک کہو! اس پکار کو ہر اُس شخص نے قبول کیا جو مردوں کی پشتوں اور عورتوں کے رحموں میں تھا۔ اس پکار پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے اہل یمن تھے۔ [1]

اہلِ یمن کی فضیلت احادیث میں

- ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر نبی ﷺ نے فرمایا:

«اَلْإِيمَانُ هٰهُنَا - وَأَشَارَ بِيَدِهِ إِلَى الْيَمَنِ»

''ایمان اس جگہ ہے۔ (یہ فرما کر) آپ نے اپنے دستِ مبارک سے یمن کی طرف اشارہ کیا۔'' [2]

- نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

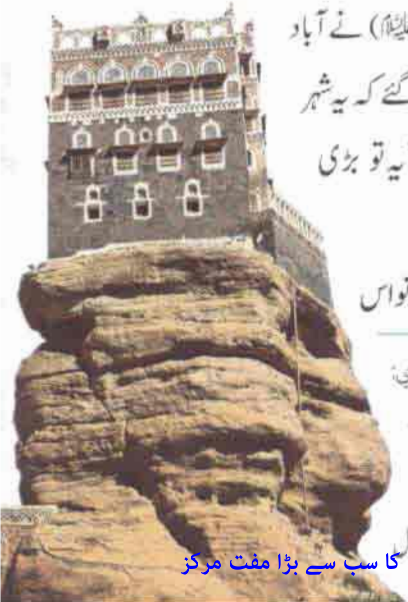
«أَتَاكُمْ أَهْلُ الْيَمَنِ، هُمْ أَرَقُّ أَفْئِدَةً، وَأَلْيَنُ قُلُوبًا، اَلْإِيمَانُ يَمَانٍ، وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَةٌ»

''تمھارے پاس اہل یمن آئے ہیں، وہ گداز دل والے اور رقیق القلب ہیں۔ ایمان یمنی ہے اور حکمت بھی یمنی ہے۔'' [3]

یمن کے مشہور مقامات

صنعاء: یہ یمن کا قلب ہی نہیں بلکہ قدیم ترین تمدن کی آماجگاہ بھی ہے۔ اس کا قدیم نام اُزال تھا۔ یہ روئے زمین کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسے سام بن نوح (علیہ السلام) نے آباد کیا تھا۔ [4] جب اہل حبش نے صنعاء پر قبضہ کیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ شہر پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ وہ بے اختیار بول اٹھے: «هٰذِهِ صَنْعَةٌ» ''یہ تو بڑی کاریگری ہے۔'' اس وجہ سے اس شہر کا نام صنعاء پڑ گیا۔ [5]

525ء میں حبشہ (اکسوم) کے عیسائی بادشاہ نے آخری حمیری حکمران ذونواس



صنعاء میں ایک یمنی رئیس کا قدیم محل

[1] تفسير ابن أبي حاتم، تفسير البغوي، الحج22:26،27. [2] صحيح البخاري: 4387، صحيح مسلم: 51. [3] صحيح البخاري: 4388، صحيح مسلم: 52.
[4] صفة جزيرة العرب، ص: 102،103. [5] معجم البلدان، مادة: صنعاء.

کو شکست دے کر یمن میں اپنا عیسائی گورنر مقرر کیا تو اس نے صنعاء کو اپنا دارالحکومت بنایا۔[1] صنعاء اور اس کے قلعہ غمدان نے 537ء اور 548ء کے درمیان دارالحکومت کا درجہ پایا۔[2] صنعاء آج بھی جمہوریہ یمن کا دارالحکومت ہے۔ یہ سطح سمندر سے 2196 میٹر بلند ہے۔ صوبہ صنعاء میں عمران، الجوف، حوث، محویت، ریحہ، کوکبان اور حراز نامی اضلاع شامل ہیں۔[3]

صنعاء کی آب و ہوا معتدل اور بڑی خوش گوار ہے۔ علامہ زکریا بن محمد قزوینی لکھتے ہیں کہ صنعاء فن تعمیر کا شاہکار ہے۔ یہ خوش گوار ہوا، شیریں پانی، پاکیزہ مٹی اور کم امراض والا شہر ہے۔ یہاں مکھی، مچھر اور دیگر کیڑے مکوڑے بہت کم ہوتے ہیں۔ کہیں کوئی انسان بیمار ہو جائے تو وہ صنعاء آکر بالکل تندرست ہو جاتا ہے۔ کہیں اونٹوں پر بیماری کا حملہ ہوتا ہے تو وہ صنعاء کی چراگاہوں میں لائے جاتے ہیں اور یہاں گھاس چرتے ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ یہاں کی خوشگوار فضا کا یہ عالم ہے کہ اگر گوشت ایک ہفتہ بھی پڑا رہے تو خراب نہیں ہوتا۔ علامہ ہمدانی فرماتے ہیں کہ اہل صنعاء سال میں دو مرتبہ موسم گرما اور دو دفعہ موسم سرما سے مستفید ہوتے ہیں۔[4]

عرب شاعر ابو محمد یزیدی نحوی بصری صنعاء کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے:

قُلْتُ وَنَفْسِي جَمٌّ تَأَوُّهُهَا تَصْبُو إِلَى أَهْلِهَا وَأَنْدُهِهَا

سُقْيًا لِصَنْعَاءَ لَا أَرَى بَلَدًا أَوْطَنَهُ الْمُوطِنُونَ يُشْبِهُهَا

''میرا دل اپنے وطن (صنعاء) کے شوقِ دید میں ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا۔ میں نے دل کو دلاسا دیا اور کہا: صنعاء پر رحمت کی برکھا برسے! میں نے ایسا کوئی شہر نہیں دیکھا جہاں بسنے والے بس گئے ہوں اور وہ صنعاء جیسا ہو۔''[5]

صنعائے یمن کی وادیاں اس قدر سرسبز و شاداب تھیں کہ حد نگاہ تک پھلوں کے باغات لہلہاتے نظر آتے تھے۔ قصر غمدان اس سرزمین پر فن تعمیر کا شاہکار تھا۔ اسے تُبَّع لِیشَرح بن یحصب نے تعمیر کرایا تھا۔ قصر مربع شکل کا تھا۔ یہ محل ایک طرف سے سرخ، دوسری طرف سے سفید، تیسری طرف سے زرد اور چوتھی جانب سے سبز تھا۔ اس کے اندر ایک اور محل تھا۔ اس کی سات منزلیں تھیں۔ ہر منزل چالیس ہاتھ، یعنی تقریباً 60 فٹ بلند تھی۔ جب سورج طلوع ہوتا تھا تو اس محل (غمدان) کا سایہ تین میل تک پھیل جاتا تھا۔ لِیشَرح بن یحصب نے اس محل کی بالائی منزل پر ایک مجلسی دالان (میٹنگ ہال) بنوایا جو رنگین سنگ مرمر کا تھا۔ اس کی چھت سنگ مرمر کے ایک ہی تختے پر مشتمل تھی۔ اس

[1] قصة و تاريخ الحضارات العربية: 32/15 و 34. [2] وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا. [3] المنجد في الأعلام، ص: 348. [4] آثار البلاد وأخبار العباد، ص: 50. [5] معجم البلدان، مادة: صنعاء.

کے ہر ستون پر شیر کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ جب ہوا چلتی تھی تو ان مجسموں سے شیر کے دھاڑنے کی سی آواز سنائی دیتی تھی۔ رات کے وقت جب قصر غمدان میں چراغ روشن کیے جاتے تھے تو سارا محل یوں چمک اٹھتا تھا جیسے بادلوں کی اوٹ سے بجلیاں چمک رہی ہوں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تبابعہ جب اس محل میں بیٹھتے اور شمعیں روشن کرتے تو اس کی روشنی کئی دنوں کی مسافت سے نظر آتی تھی۔ صنعاء کے پاس پھٹکڑی کا پہاڑ ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی سے ہر طرف پانی بہتا ہے جس کے زمین تک پہنچنے سے پہلے اس میں گھلی پھٹکڑی منجمد ہو جاتی ہے۔[1] اعلیٰ قسم کی یہ پھٹکڑی ''شبِّ یمانی'' کہلاتی ہے۔[2]



وادی ضروان (یمن)

قصہ باغ والوں کا: باغ والوں کا واقعہ، جس کا تذکرہ سورۂ قلم (68:17-33) میں آیا ہے، صنعاء کے قریب ضروان کے علاقے میں پیش آیا تھا۔ حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ لوگ ضروان کے رہنے والے تھے جو صنعاء سے چھ میل کے فاصلے پر ایک بستی ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ اہلِ حبشہ تھے اور مذہباً اہل کتاب تھے۔ یہ باغ انھیں اپنے والد کے ورثے میں ملا تھا۔ اُس کا دستور تھا کہ باغ کی پیداوار میں سے باغ کا خرچ نکال کر اپنے اور اپنے بال بچوں کے لیے سال بھر کا خرچ رکھ لیتا تھا اور باقی نفع اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیتا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد بیٹوں نے کہا کہ ہمارا باپ تو بے وقوف تھا جو اتنی بڑی رقم ادھر اُدھر دے دیتا تھا۔ ہم اگر فقیروں کو نہ دیں اور اپنا مال خود ہی سینت کر رکھیں تو بہت جلد دولت مند بن جائیں گے، چنانچہ صدقے سے رُوگردانی کی وجہ سے ان پر اللہ کا عذاب آیا جس کی زد میں

[1] آثار البلاد وأخبار العباد، ص: 52,51. [2] اردو لغت، مادۃ: شبّ۔



صنعاء شہر کا ایک خوبصورت منظر

آ کر ان کا اصل مال، یعنی باغ بھی برباد ہوگیا اور وہ بالکل خالی ہاتھ رہ گئے۔ [1]

حضر موت: یہ بھی یمن کے قدیم ترین علاقوں میں سے ایک ہے۔ اس کے مغرب میں عدن، مشرق میں عُمان، جنوب میں بحیرۂ عرب اور شمال میں الربع الخالی ہے۔ بحیرۂ عرب پر حضر موت کا طویل ساحل واقع ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً 4500 مربع کلومیٹر ہے۔ [2]

مؤرخین نے اس علاقے کو مختلف ناموں سے یاد کیا ہے، مثلاً: بعض اسے ہزرماوت اور بعض حزرماوت (Hazarmaveth) کہتے ہیں لیکن اکثر مؤرخین اسے حضر موت ہی لکھتے ہیں۔ اس کے لغوی معنی ہیں ''موت کا شہر'' چنانچہ یونانیوں میں یہ چرچا عام تھا کہ یہ موت کی وادی ہے۔ جنوبی عرب کے کتبات میں بھی اس کا نام ''حضر موت'' ہی ملتا ہے۔ [3] تورات میں اس کا نام ''حاضر میت'' بتایا گیا ہے۔ [4] اس کے بھی وہی معنی ہیں۔

صلاح البکری کہتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں حضر موت الاحقاف کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بعض مؤرخین لکھتے ہیں کہ عامر بن قحطان پہلا شخص تھا جو احقاف میں داخل ہوا۔ اس کی وجہ شہرت یہ تھی کہ وہ جس جنگ میں شریک ہوتا، کشتوں کے پشتے لگا دیتا تھا، چنانچہ جہاں بھی جاتا، لوگ کہتے: حَضَرَ مَوْت (موت آگئی)۔ یہی اس کا لقب ٹھہرا جو اس قدر مشہور ہوگیا کہ لوگ اس خطۂ زمین کو بھی حضر موت کہنے لگے جہاں اس کا قبیلہ رہتا تھا۔ [5]

پرانے زمانے میں یہاں تاریخ عرب کی عظیم الشان حکومتیں قائم ہوئیں۔ قومِ عاد، اقیالِ تبابعہ، حمیر، کندہ اور معین جیسی نامور قوتوں کا مسکن یہی علاقہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جو بادشاہ حضر موت پر حکومت کرتے تھے، ان کا لقب ''عباہلہ'' تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک خط دے کر وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کو اقیال (ملوک) اور عباہلہ کی طرف بھیجا اور انھیں حضر موت کا گورنر بنایا تھا۔ [6]

حضر موت میں ایک مقام ہے جو قبر ہود کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، تاہم اکثر مؤرخین کی رائے یہی ہے کہ ہود علیہ السلام کو حضر موت ہی میں دفن کیا گیا تھا۔ [7] چوتھی صدی ہجری کے مؤرخ ہمدانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ہود علیہ السلام کو وادی احقاف کے زیریں حصے میں ایک سرخ ٹیلے کے بلند غار میں دفن کیا گیا تھا۔ [8] حضر موت میں کئی کھنڈر ایسے ہیں جو دارِ عاد کہلاتے ہیں۔

حضر موت میں آفتاب اسلام کی کرنیں: حضر موت کے باشندے بت پرست تھے۔ ان کے بت کا نام مرحب

[1] تفسير الطبري، القلم 68:17-33. [2] تاريخ حضرموت السياسي لصلاح البكري، ص: 2،1. [3] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 130/2. [4] تاريخ حضرموت السياسي، ص: 30. [5] تاريخ حضر موت السياسي، ص: 30. [6] تاج العروس، مادة: عبهل. [7] جامع الحديث للسيوطي: 315/29. [8] صفة جزيرة العرب، ص: 170.

تھا۔[1] جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے محمد بن عبداللہ ﷺ کو نبوت سے سرفراز فرمایا تو اہل حضرموت کے دلوں میں دین اسلام کی محبت گھر کر گئی۔ انھوں نے حضرت وائل بن حجر حضرمی قحطانی رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں ایک وفد رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ جب حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کا پرتپاک استقبال کیا اور ان کے لیے دعا فرمائی۔[2]

حضرموت میں آباد قبیلۂ کندہ کا سردار **اشعث بن قیس** بھی دسویں ہجری میں ستر افراد کی سربراہی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ نے اس کی عزت افزائی فرمائی۔ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ جب نبیِ کریم ﷺ وفات پا گئے تو یہ مبتلائے فتنہ ہو کر ارتداد کا شکار ہو گیا، پھر جب اشعث کو گرفتار کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس لایا گیا تو انھوں نے سچے دل سے توبہ کر لی اور دوبارہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ نے کوفے میں وفات پائی اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔[3] ان کی وفات کے دن حسن اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان اتفاق ہوا تھا۔

مأرب اور سبا: مأرب ایک تاریخی شہر ہے جو یمن کے دارالحکومت صنعاء سے تقریباً 70 کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔ یہ مملکت سبا کا دارالحکومت تھا جو 1000 ق م کے لگ بھگ قائم ہوئی تھی۔ قوم سبا کی ملکہ بلقیس مشہور حکمران تھی جس



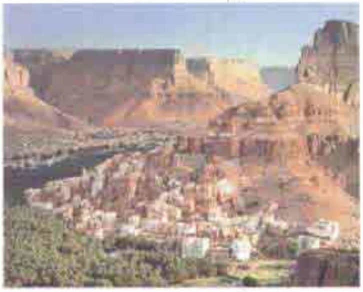
مأرب میں ملکہ سبا کے محل کے کھنڈر

نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی اطاعت کرتے ہوئے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مملکت سبا اپنے عہدِ عروج (650 ق م تا 115 ق م) میں حبشہ (اریٹریا و ایتھوپیا) تک پھیل گئی تھی۔ قوم سبا نے مأرب کے قریب ایک بڑا آبی بند تعمیر کیا تھا جو 542-570ء کے عرصے میں تباہ ہو گیا۔ ان دنوں مأرب محافظہ (صوبہ) البیضاء کا دارالحکومت ہے۔[4]

[1] معجم البلدان، مادة: مرحب، المحبر لابن حبيب، ص: 318. [2] عون المعبود: 413/2، تحت حديث: 723. [3] تاريخ دمشق الكبير: 93/9، التعديل و التجريح: 388/1، معجم البلدان، مادة: حضرموت. [4] المنجد في الأعلام، مادة: مأرب و سبا.



شبام (وادی حضرموت)



تریم (وادی حضرموت)



نجران کا نخلستان

شبام اور تریم: عدن سے تقریباً 500 کلومیٹر شمال مشرق میں المکلا نامی بندرگاہ ہے۔ المکلا سے تقریباً 65 کلومیٹر مشرق میں الشّحر کی بندرگاہ ہے۔ المکلا اور الشحر سے تقریباً 150 کلومیٹر شمال میں وادی حضرموت ہے۔ اس وادی کے کنارے البحر الصافی اور شبام اور تریم کے تاریخی شہر واقع ہیں۔

شبام کا شہر اہل شبوہ نے حضرموت آکر آباد کیا۔ [1] شبام کے مشرق میں تقریباً 40 کلومیٹر دور تریم کا تاریخی شہر ہے۔ یہ شہر صنعاء سے 735 کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔ آج کل اسے مسجدوں کا شہر کہا جاتا ہے۔

نجران: یہ قدیم یمن کا تاریخی شہر ہے جو صنعاء سے تقریباً 250 کلومیٹر شمال میں واقع ہے۔ ان دنوں نجران سعودی سرحد کے اندر واقع ہے۔ یہ انتہائی سرسبز وشاداب خطہ ہے جو پرانے زمانے میں تجارتی قافلوں کی گزرگاہ تھا۔ [2]

یاقوت حموی لکھتے ہیں کہ نجران بن زیدان بن سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان کے نام پر اس علاقے کو نجران کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پہلا شخص تھا جس نے یہ علاقہ آباد کیا۔ [3]

9ھ/630ء میں ساٹھ افراد پر مشتمل نجران کا مسیحی وفد رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ جس میں چوبیس افراد اشرافِ نجران میں سے تھے اور تین سردار بھی وفد میں شامل تھے۔ ایک عاقب (عبدالمسیح) کہلاتا تھا جس کی حیثیت قوم کے حکمران کی سی تھی۔ دوسرا سید کہلاتا تھا، اس کا نام ایہم یا شرحبیل تھا، یہ ان کے تمدنی، ثقافتی اور سیاسی امور کی نگرانی کرتا تھا اور تیسرا اسقف (بشپ ابوحارثہ بن علقمہ) تھا جس سے روحانی اور مذہبی پیشوائی متعلق تھی۔ انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے مناظرہ کرنا چاہا تو سورۂ آل عمران کی آیات 33 تا 36 پر مشتمل ایک خطبہ نازل ہوا۔ اس میں عقیدۂ الوہیتِ مسیح کی تردید اور توحید کی دعوت تھی۔ نہ ماننے کی صورت میں انھیں مباہلے کی دعوت بھی دی گئی، لیکن وہ جزیہ دینے پر آمادہ ہوگئے۔ [4]

[1] معجم البلدان، مادة: شبوة. [2] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 507/2. [3] معجم البلدان، مادة: نجران.
[4] الرحيق المختوم، ص: 454,453، السيرة النبوية لأبي شهبة: 546/2-548.

یمن کی مشہور وادیاں

وادی نجران: یمن کے شمال کی طرف نجران میں وادی نجران بہتی ہے۔ اس کا پانی جبل طُوَیق کے جنوب میں الربع الخالی میں جذب ہوجاتا ہے۔

دریائے حجر: حضرموت کے جنوب میں واقع وادی حجر جزیرہ نمائے عرب کا واحد دریا ہے جو پورا سال بہتا اور بحیرۂ عرب میں گرتا ہے لیکن اس کی لمبائی 100 کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔

وادیِ حضرموت: حضرموت کے شمال مشرق میں وادی حضرموت ہے۔ یہ شمال اور جنوب کی طرف سے آنے والی ندیوں سے مل کر وادی المسیلہ کہلاتی ہے جو سیحوت کے قریب بحیرۂ عرب میں جاگرتی ہے۔ سیحوت یمن کے مشرقی صوبے مہرہ کا ایک شہر ہے۔ یہ بحیرۂ عرب کے ساحل پر مکلا سے 522 کلومیٹر اور صنعاء سے 1318 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں کشتیاں بنانے کا کام بھی ہوتا ہے۔[1]



وادی نجران



دریائے حجر کا ایک منظر (یمن)



وادیٔ حضرموت (یمن)

[1] المعرفة، وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا۔

5 حجاز

حجاز امتِ مسلمہ کے نزدیک سب سے زیادہ روحانی، اقتصادی اور ثقافتی اہمیت کا حامل علاقہ ہے۔ یہیں سے آفتابِ اسلام طلوع ہوا۔ اسی میں رسول اکرم ﷺ کا وطن مالوف اور مہبطِ وحی مکہ مکرمہ اور دارالہجرت اور آپ کا مدفن مدینہ طیبہ واقع ہیں۔

حجاز مسلمانوں کی ارض مقدس ہے۔ اس کے مشرق میں نجد، مغرب میں تہامہ، شمال میں شام اور جنوب میں یمن واقع ہے۔ حجاز درحقیقت وہ پہاڑی سلسلہ ہے جسے جبال سراۃ کہتے ہیں۔ یہ کوہستانی سلسلہ جنوبی شام (دریائے یرموک) سے شروع ہوتا ہے اور یمن میں نجران تک چلا گیا ہے۔ اس میں کئی وادیاں ہیں جو برسات میں ندیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اسے حجاز اس لیے کہتے ہیں کہ یہ نجد اور تہامہ کے درمیان حد فاصل (حاجز) ہے۔[1]

حجاز کا طول شمالاً جنوباً، العلاء سے سرحد یمن تک، تقریباً 700 میل (1120 کلومیٹر) ہے۔ اس کا عرض مشرق سے مغرب تک تقریباً 350 میل (560 کلومیٹر) ہے۔ عرفِ عام میں تہامہ کو ارضِ حجاز میں شامل سمجھا جاتا ہے اور بعض علماء نے تبوک اور فلسطین کو بھی ارضِ حجاز میں شامل کیا ہے۔ جبال سراۃ کو جزیرہ نمائے عرب کی ریڑھ کی ہڈی سمجھا جاتا ہے۔ یمن کی طرف اس کی بعض چوٹیاں خاصی بلند ہیں جہاں سردی کے موسم میں برف باری بھی ہوتی ہے۔

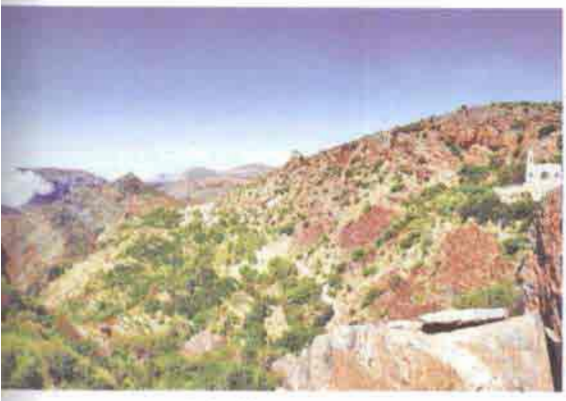


حضور النبی شعیب (یمن)

حجاز کے بلند پہاڑ

صنعاء کے مغرب میں واقع معروف چوٹی "حضور النبی شعیب" 3760 میٹر بلند ہے۔[2] مکہ مکرمہ کے نزدیک یہ پہاڑی سلسلہ نسبتاً کم بلند ہے، پھر طائف کی طرف بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ مکہ اور طائف کے درمیان جبل کرا، 2 ہزار میٹر بلند ہے۔[3] اسی طرح

[1] تاريخ الإسلام لحسن إبراهيم: 10/1. [2] أطلس المملكة العربية السعودية والعالم، ص: 17 و19. [3] مكة والمدينة في الجاهلية و عهد الرسول ﷺ، ص: 21,20.



جبل رضویٰ



جبل کرا

مدینہ اور ینبع کے درمیان جبل رضویٰ کی بلندی 1814 میٹر ہے۔ الباحہ اور طائف کے درمیان اس پہاڑی سلسلے (جبال سراۃ) کی ایک چوٹی کی بلندی 2595 میٹر بلند ہے۔ ابہا کے شمال مغرب میں جبال سراۃ کی ایک چوٹی 2910 میٹر اونچی ہے۔[1]

سیاسی لحاظ سے حجاز ان دنوں سعودی صوبوں تبوک، المدینۃ المنورۃ، مکۃ المکرمۃ، الباحہ، عسیر اور جازان میں بٹا ہوا ہے جبکہ اس کا کچھ حصہ صوبہ نجران میں شامل ہے۔[2] حجاز کا سب سے بڑا ساحلی شہر جدہ ہے جو مکہ کی بندرگاہ ہے۔ اس کے بعد دوسرا بڑا ساحلی مقام ینبع ہے جو مدینہ منورہ کی بندرگاہ ہے۔[3]

اہل حجاز کی فضیلت

نبی کریم ﷺ نے اہل حجاز کے بارے میں فرمایا:

«غِلَظُ الْقُلُوبِ وَالْجَفَاءُ فِي الْمَشْرِقِ وَ الْإِيمَانُ فِي أَهْلِ الْحِجَازِ»

''دلوں کی سختی اور کھردرا پن مشرق والوں میں ہے اور ایمان حجاز والوں میں ہے۔''[4]

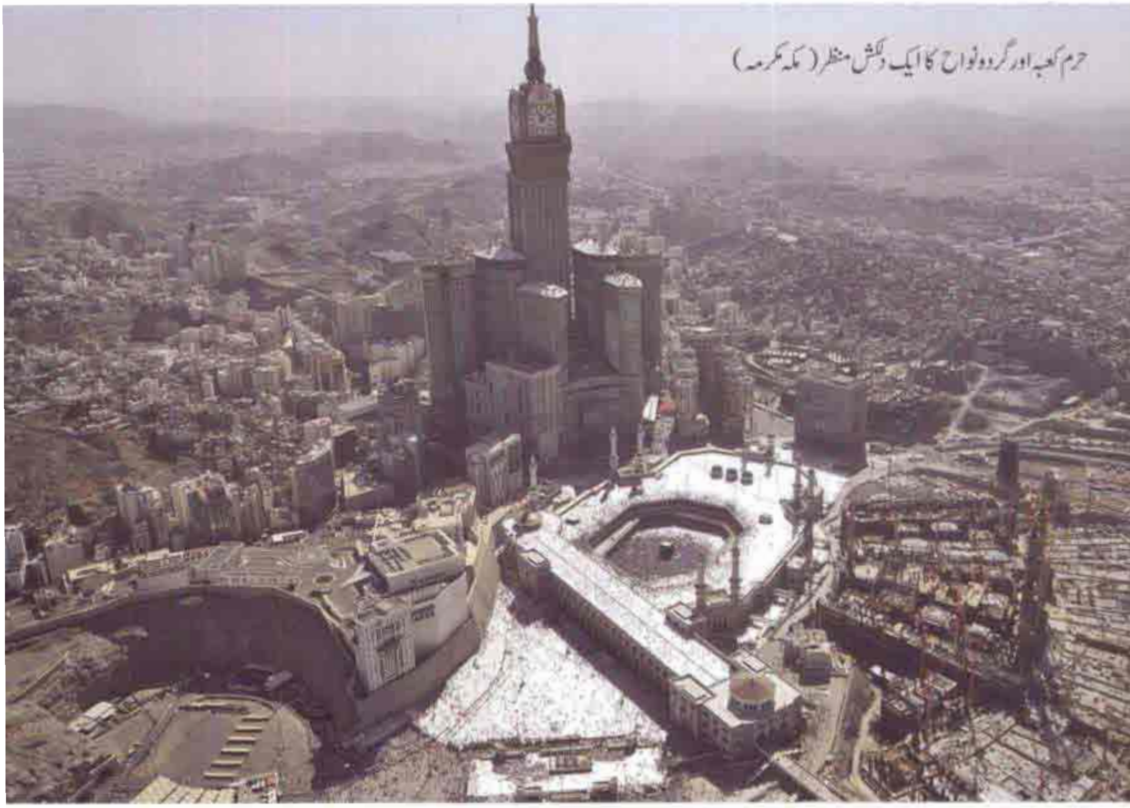
حجاز کے تاریخی شہر مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ اور طائف ہیں۔

1 أطلس المملكة العربية السعودية والعالم، ص: 17و19. 2 أطلس المملكة العربية السعودية والعالم، ص: 15 و 17 و 19.
3 تاریخ ارض القرآن (کامل): 81/1. 4 صحيح مسلم: 53.

مکہ مکرمہ

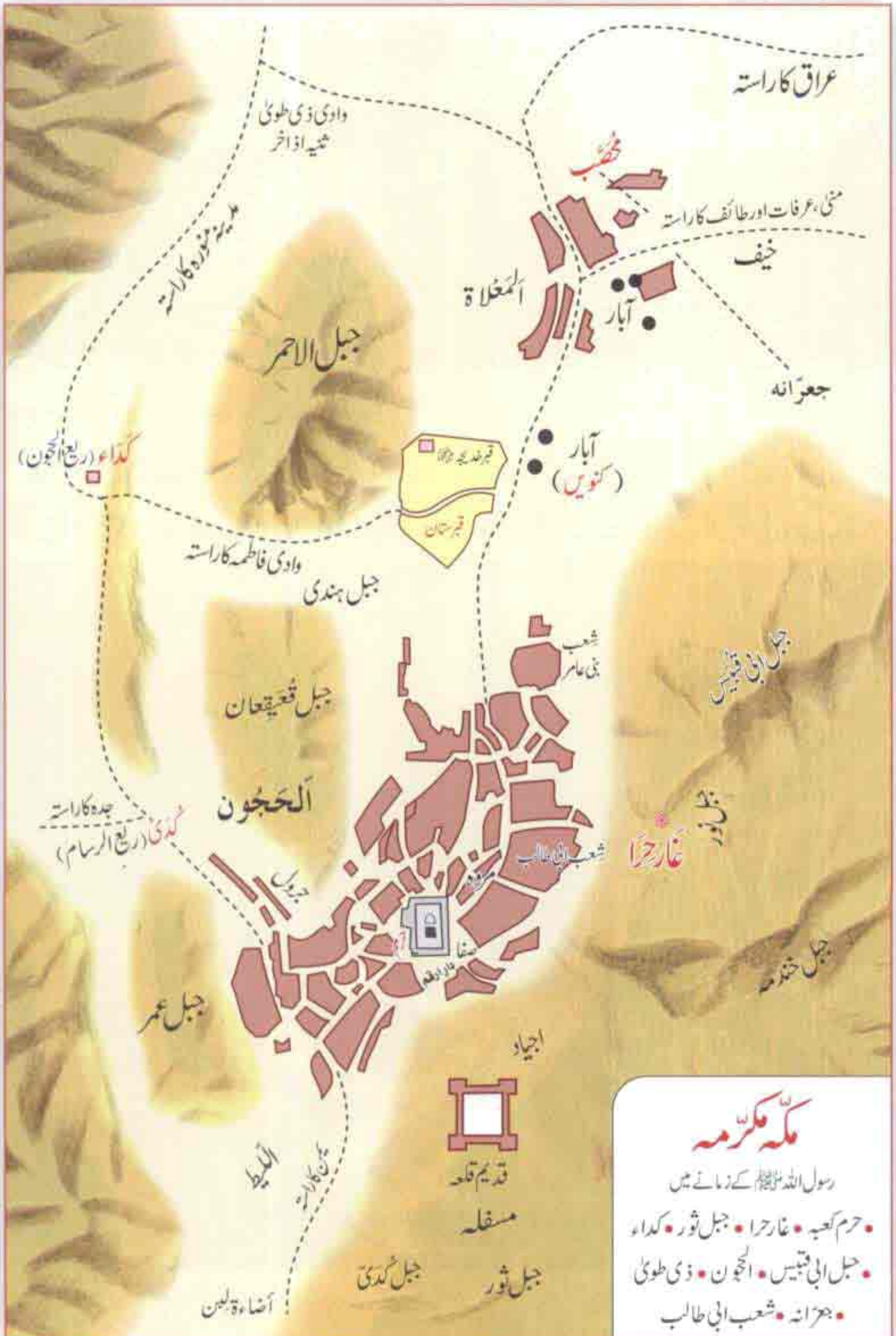
خشک پہاڑوں اور بے آب و گیاہ زمین پر آباد شہر مکہ کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ بقول سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ: ''یہ شہر ایک بوڑھے پیغمبر (ابراہیم علیہ السلام) کی بنا، ایک نوجوان پیغمبر (اسمٰعیل علیہ السلام) کی ہجرت گاہ اور ایک یتیم پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا مولد ہے۔''[1]

مکہ معظمہ 21 درجے 25 دقیقے عرض بلد شمالی اور 39 درجے 49 دقیقے طول بلد مشرقی پر واقع ہے اور سطح سمندر سے قریباً 300 میٹر بلند ہے۔ یہ وادئ ابراہیم میں آباد ہے جو چاروں طرف سے پہاڑوں میں گھری ہوئی ہے۔ اس



حرم کعبہ اور گردونواح کا ایک دلکش منظر (مکہ مکرمہ)

[1] تاریخ ارض القرآن (کامل): 81/1:1.



عراق کا راستہ
وادی ذی طویٰ
ثنیہ اذاخر
محصّب
منیٰ، عرفات اور طائف کا راستہ
خیف
المعلاۃ
آبار
مدینہ منورہ کا راستہ
جبل الاحمر
جعرانہ
کداء (ربع الحجون)
قبر خدیجہ
قبرستان
آبار (کنویں)
وادی فاطمہ کا راستہ
جبل ہندی
شعب بنی عامر
جبل ابی قبیس
جبل قعیقعان
الحجون
جدہ کا راستہ
کدیٰ (ربع الرسام)
غار حرا
شعب ابی طالب
مروہ
صفا
دار ارقم
جبل خندمہ
جبل عمر
اجیاد
قدیم قلعہ
مسفلہ
یمن کا راستہ
اللیط
جبل کدیٰ
جبل ثور
أضاۃ لبن
مکہ مکرمہ
رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں
• حرم کعبہ • غار حرا • جبل ثور • کداء
• جبل ابی قبیس • الحجون • ذی طویٰ
• جعرانہ • شعب ابی طالب



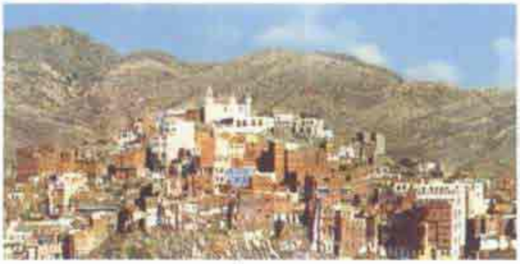
جبل قُعیقعان



جبل کُدَیّ



جبل اَلحَجُون



جبل ابوقبیس

کے مغربی جانب جبل قُعیقعان ہے۔ جنوب مشرق میں جبل ثور اور جنوب میں جبل کُدَیّ واقع ہیں۔ مشرق میں 420 میٹر بلند جبل ابوقبیس اور اس کے پیچھے کوہ خندمہ ہیں۔[1]

شمال مغرب میں جبل اَلحَجُون واقع ہے جس کی کَداء (موجودہ ریع الحجون) نامی گھاٹی کی طرف سے نبی ﷺ فتح مکہ کے وقت شہر میں داخل ہوئے۔ شمال مشرق میں جبل حراء سطح سمندر سے 642 میٹر بلند ہے جبکہ جبل ثور کی بلندی 728 میٹر ہے جو مسجد الحرام سے 4.123 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

مکہ کی آبادی پہاڑوں کے درمیان ہلال کی شکل میں لمبائی کے رُخ پھیلی ہوئی ہے۔ وادیٔ مکہ کے جنوبی علاقے کو بطحاء قریش یا صرف بطحاء کہا جاتا ہے۔ حرم سے نیچے کی نشیبی آبادی مسفلہ کہلاتی ہے اور بالائی علاقے کو معلاۃ یا المعلّٰی کہا جاتا ہے۔ مشرق میں شعب علی (شعب ابی طالب) ہے جو ''عقبہ'' کے راستے مکہ سے ملی ہوئی ہے۔ اسے دورِ جاہلیت میں شعب بنی ہاشم کہا جاتا تھا۔[2]

مکہ مکرمہ کی وجہ تسمیہ

مکہ کے لغوی معنی کے بارے میں مختلف اقوال ہیں:

1 یہ مکك سے مشتق ہے جس کے معنی ختم کر دینے کے ہیں۔ چونکہ مکہ لوگوں کے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے، اس

[1] المنجد في الأعلام، ص:21. [2] تاريخ العرب في الجاهلية، ص:350,349، معجم البلدان، مادة: مكة.

لیے اس کا نام مکہ پڑ گیا۔

2 اس کے معنی جذب کرنا ہیں۔ چونکہ یہ اطراف زمین میں بسنے والے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اس لیے اسے مکہ کہا جاتا ہے۔

3 مکہ ایسی جگہ کو کہا جاتا ہے جہاں پانی کم ہو۔ یہاں پانی کی قلت تھی، اس لیے اسے مکہ کہا جانے لگا۔[1]

مکہ مکرمہ کے نام

اس مقدس شہر کے پچاس نام ہیں۔[2] اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بھی ان میں سے بعض ناموں کا ذکر کیا ہے، مثلاً: مکہ، بکہ، قریہ، ام القریٰ اور البلد الأمین۔

سورۂ آل عمران میں لفظ ''بکہ'' کا ذکر

﴿ إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ۝ ﴾

''بے شک (اللہ کا) پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی ہے جو بکہ میں ہے، وہ تمام دنیا کے لیے برکت وہدایت والا ہے۔''[3]

سورۃ الانعام میں ''ام القریٰ'' کا تذکرہ

قرآن میں مکہ مکرمہ کا نام ''اُم القریٰ'' (بستیوں کی ماں) اس آیت میں ہے:

﴿ وَلِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾

''اور تاکہ آپ ام القریٰ (مکہ) اور اس کے آس پاس والوں کو (اللہ کے عذاب سے) ڈرائیں۔''[4]

سورۃ النحل میں مکہ کے لیے لفظ ''قریہ''

قرآن حکیم میں تاریخ کے رشتے سے اس مقدس شہر کا ذکر ''قریہ'' کے زیر عنوان آیا ہے:

﴿ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً ﴾

''اور اللہ نے مثال بیان کی ایک بستی (قریہ) کی جو امن اور چین والی تھی۔''[5]

---

1 التفسير الكبير للرازي، آل عمرٰن 3:96. 2 شفاء الغرام:1/48-53. 3 آل عمرٰن 3:96. 4 الأنعام 6:92. 5 النحل 16:112.

سورۃ الفتح میں لفظ ''مکہ'' کا ذکر

﴿وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ﴾

''اور وہ (اللہ) ہی تو ہے جس نے وادیٔ مکہ میں ان (کفار) کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیے بعد اس کے کہ اس نے تمھیں ان پر کامیابی دی تھی۔''[1] (یہاں مکہ کے پُر امن طور پر فتح ہونے کی طرف اشارہ ہے۔)

سورۃ البلد میں مکہ کے لیے لفظ ''البلد''

اللہ تعالیٰ نے اس شہر (البلد) کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا:

﴿لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۝﴾

''میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی!''[2]

سورۃ التین میں ''البلد الامین'' کا ذکر

سورۃ التین میں مکہ مکرمہ کو ''البلد الامین'' کہا گیا ہے:

﴿وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝﴾

''قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طور سیناء کی اور اس پُرامن شہر (مکہ) کی!''[3]

تاریخ میں مکہ کا اولین ذکر

لفظ مکہ لوگوں کی زبان سے کس وقت ادا ہونے لگا اور کتابوں کی زینت کب بنا، اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں: ''لفظ عرب دسویں صدی ق م میں پیدا ہوا ہے۔ حجاز کا لفظ اس کے بھی بعد کا ہے۔ مکہ کا نام دوسری صدی مسیحی میں بطلیموس کے ہاں سب سے پہلے ''مکاربا'' کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اسی لیے تورات نے اس کا نام ''مدبار'' یعنی بادیہ بتایا ہے۔ اور قرآن مجید نے اسے (ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے) وادیٔ غیر ذی زرع (بن کھیتی زمین) کہا کہ اس وقت اس کے سوا اس کا کوئی دوسرا نام نہ تھا۔ ...... لفظ عرب کے لغوی معنی بھی بادیہ وصحرا کے ہیں۔ یوں مدبار (بادیہ)، وادیٔ غیر ذی زرع اور عرب ہم معنی لفظ ہیں، اس لیے تورات کا یہ کہنا کہ اسمٰعیل علیہ السلام نے بادیہ میں سکونت کی، بالکل یہ معنی رکھتا ہے کہ انھوں نے عرب میں سکونت اختیار کی۔''[4]

[1] الفتح 24:48. [2] البلد 1:90. [3] التین 1:95-3. [4] تاریخ ارض القرآن (کامل): 37/2.

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''فج سے تنعیم تک کا علاقہ مکہ کہلاتا ہے اور بیت اللہ سے بطحاء تک کا علاقہ بکہ کہلاتا ہے۔'' امام شعبہ رحمہ اللہ ابراہیم نخعی کے حوالے سے نقل کرتے ہیں: ''بیت اللہ اور مسجد کا نام بکہ ہے۔'' امام زہری کا قول بھی یہی ہے۔ عکرمہ اور میمون بن مہران کا قول ہے کہ بیت اللہ اور اس کے اردگرد کا علاقہ بکہ ہے۔ اس کے باہر کا علاقہ مکہ ہے، البتہ ابومالک، ابوصالح، ابراہیم نخعی، عطیہ عوفی اور مقاتل بن حیان نے کہا ہے کہ بکہ صرف بیت اللہ شریف ہے اور اس کے ماسوا سارا شہر مکہ ہے۔ [1] بکہ، یعنی بیت اللہ کے اردگرد ہی وہ مخصوص مقام ہے جہاں طواف کیا جا سکتا ہے۔ مسجد الحرام سے باہر بکہ نہیں بلکہ مکہ ہے۔ [2]

مکہ مکرمہ کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے مکہ کو تمام شہروں پر فضیلت عطا فرمائی اور اس کا ذکر قرآن میں کئی جگہ فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے وقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکہ کے مقام و مرتبہ کا جو ذکر فرمایا، اس سے مکہ کی فضیلت خوب عیاں ہو جاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَاللّٰهِ! إِنَّكِ لَخَيْرُ أَرْضِ اللّٰهِ وَأَحَبُّ أَرْضِ اللّٰهِ إِلَى اللّٰهِ وَلَوْلَا أَنِّي أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ»

''اللہ کی قسم! تو اللہ کی سب سے بہتر اور اس کی سب سے محبوب زمین ہے اور اگر مجھے تجھ سے نکالا نہ جاتا تو میں نہ نکلتا۔'' [3]

مکہ کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ یہاں اللہ کا گھر ہے۔ یہی وہ اولین گھر ﴿ أَوَّلَ بَيْتٍ ﴾ ہے جو صرف اللہ کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کے اردگرد مسجد الحرام ہے۔ اس میں پڑھی گئی نماز دوسری ہر جگہ کی نماز سے افضل ہے جیسا کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«صَلَاةٌ فِي مَسْجِدِي هٰذَا أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ، وَ صَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَفْضَلُ مِنْ مِائَةِ أَلْفِ صَلَاةٍ»

''میری اس مسجد (نبوی) میں ایک نماز مسجد الحرام کے سوا دیگر مساجد میں ہزار نماز سے بہتر ہے، البتہ مسجد الحرام میں ایک نماز ایک لاکھ نماز سے بڑھ کر ہے۔'' [4]

[1] تفسیر ابن کثیر، آل عمران 3:96. [2] تفسیر الطبري، آل عمران 3:96. [3] المستدرك للحاكم: 3/7، حديث: 4270.
[4] مسند أحمد: 3/343.

مکہ روزِ اول سے حرم ہے

مکہ مکرمہ کو ''البلد الحرام'' کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت ہی سے حرم ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے لیے مکہ فتح فرما دیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ میں ہاتھیوں کو آنے سے روک دیا تھا لیکن اب اپنے رسول اور مومنین کو مکہ پر قابض فرما دیا ہے۔ مجھ سے پہلے مکہ مکرمہ کسی کے لیے حلال نہیں ہوا اور نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال ہوگا۔ میرے لیے بھی کچھ وقت تک کے لیے حلال کیا گیا تھا۔ (خبردار!) اس کے کسی شکار کو ڈرا کر بھگایا نہ جائے۔ اس کے کانٹے دار درخت نہ کاٹے جائیں۔ اس میں گری پڑی چیز نہ اٹھائی جائے، البتہ جو اعلان کرے، وہ اٹھا سکتا ہے۔ جس شخص کا کوئی رشتے دار قتل ہو جائے، اسے دو چیزوں (قتل اور دیت) میں سے بہتر کا اختیار ہے (جو وہ بہتر سمجھے، اسے اختیار کر سکتا ہے۔)'' سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے گزارش کی: ''اللہ کے رسول! اذخر (خوشبودار گھاس) کو مستثنیٰ فرما دیجیے کیونکہ ہم اسے گھروں اور قبروں میں استعمال کرتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں اذخر مستثنیٰ ہے (اسے کاٹا جا سکتا ہے)۔''[1]

حُدودِ حرم

سب سے پہلے حرم کی حدود سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے مقرر فرمائیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سیدنا جبریل علیہ السلام کی ہدایات کے مطابق حرم کی برجیاں نصب کیں، پھر ان میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی حتی کہ قُصَی نے انھی کی تجدید کی، پھر رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے سال سیدنا تمیم بن اسد خزاعی رضی اللہ عنہ کو بھیجا، انھوں نے ان برجیوں کو نئے سرے سے بنایا، پھر ان میں کوئی تبدیلی نہ کی گئی حتی کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے چار قریشیوں کو مقرر فرمایا جنھوں نے ان برجیوں کی پھر سے تجدید کی۔[2]



حدود حرم (وادی تنعیم)

مکہ مکرمہ اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ حرم ہے، البتہ اس کی حدود ہر طرف ایک جیسے فاصلے پر نہیں۔ مکہ مکرمہ کی

[1] صحيح البخاري:2434، صحيح مسلم:1355. [2] أخبار مكة للأزرقي :2/684.

طرف آنے والے بڑے بڑے راستوں پر حدود حرم کے نشانات لگا دیے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

1 مغرب کی طرف جدہ روڈ پر مقام شُمَیْسِي ہے جسے پہلے حُدَیْبِیَہ کہا جاتا تھا۔ یہ مکہ مکرمہ سے 22 کلومیٹر دور ہے۔

2 جنوب کی طرف تہامہ سے یمن کے راستے پر مقام اَضَاءَۃُ لِبْن ہے۔ اضاءۃ کا معنی ہے زمین اور ''لبن'' ایک پہاڑ کا نام ہے جو مکہ مکرمہ سے 12 کلومیٹر دور ہے۔

3 مشرق کی طرف وَادِی عُرَنَہ کا مغربی کنارہ ہے جو مکہ مکرمہ سے 15 کلومیٹر دور ہے۔

4 شمال مشرق کی طرف جِعِرَّانَہ کے راستے پر بستی شرائع المجاہدین ہے۔ یہ مکہ مکرمہ سے 16 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ بستی ان مجاہدین کی طرف منسوب ہے جو شاہ عبدالعزیز آل سعود کے ساتھ فتح حجاز میں شریک تھے۔[1]

5 شمال کی طرف مقام تَنْعِیم ہے جو مکہ سے 7 کلومیٹر دور طریق المدینہ (طریق الهجرہ) پر واقع ہے۔[2]

اب مکہ شہران حدود سے باہر تک پھیلتا جا رہا ہے۔

مکہ مکرمہ کے اہم مقامات

جبل ثور: جبل ثور پرانے مکہ سے تقریباً 3 میل کے فاصلے پر ہے۔ اس میں غار ثور واقع ہے جس کے اندر نبی ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ہجرت کے دوران میں تین راتیں مقیم رہے تھے۔ اس کا طول 18 بالشت (4.014 میٹر) اور عرض 11 بالشت (2.053 میٹر) ہے۔ غار کا ایک منہ دو ثلث بالشت (15.2 سم) اور دوسرا پانچ بالشت (1.15 میٹر) چوڑا ہے۔[3]

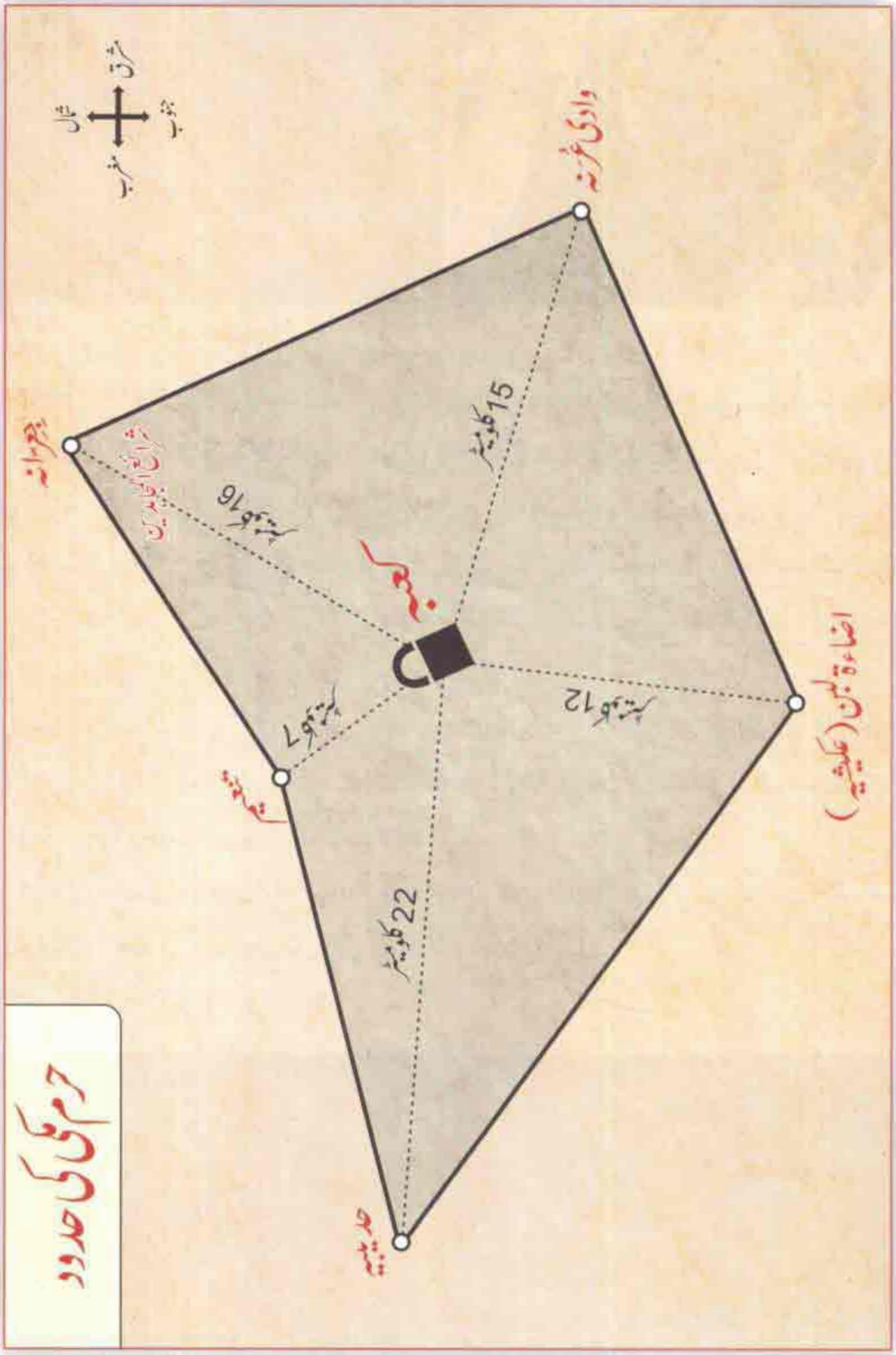


جبل ثور



غار ثور

1 وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا. 2 تاریخ مکہ مکرمہ، ص:19. 3 رحلة ابن جبير الأندلسي، ص:54.


حرم مکی کی حدود
شمال
جنوب
مشرق
مغرب
وادی نخلہ
جعرانہ
شرائع المجاہدین
کعبہ
15 کلومیٹر
16 کلومیٹر
7 کلومیٹر
12 کلومیٹر
22 کلومیٹر
تنعیم
حدیبیہ
اضاءۃ لبن (عکیشیہ)



کوہ حرا (جبل نور)



غار حرا (جبل نور)

جبل حرا: جبل حرا کو جبل نور بھی کہا جاتا ہے۔ مسجد الحرام سے اس کا فاصلہ قریباً چار کلو میٹر ہے۔ یہ مکہ مکرمہ کے شمال مشرق میں منیٰ اور عرفات جانے والی شاہراہ کے بائیں جانب واقع ہے۔ اس کی چوٹی سے قریباً ساٹھ میٹر نیچے پہلو میں غار حرا واقع ہے۔ کم و بیش نصف میٹر موٹے، زیادہ سے زیادہ پونے دو میٹر چوڑے اور تین چار میٹر لمبے پتھر کے چھوٹے بڑے خاکستری تختے پہاڑ کے ساتھ اس طرح ٹک گئے ہیں کہ ایک متساوی الساقین مثلث جیسے منہ والا غار بن گیا ہے جس کا ہر ضلع اڑھائی میٹر لمبا ہے اور قاعدہ ایک میٹر کے لگ بھگ ہے۔ غار اندر تک دو یا سوا دو میٹر چلا گیا ہے اور اس کی اونچائی آگے کو بتدریج کم ہوتی جاتی ہے۔[1]

عرفات: مکہ مکرمہ کے جنوب مشرق میں جبل رحمت کے دامن میں عرفہ یا عرفات کا میدان واقع ہے جہاں حج کا بنیادی رکن وقوفِ عرفات ادا کیا جاتا ہے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے 9 ذوالحجہ کو زوال شمس سے غروب شمس تک یہاں قیام فرمایا تھا۔ یہ میدان مکہ سے تقریباً 22 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

میدان عرفات کی حدود وادی عرنہ، ثوبہ اور نمرہ کے میدان سے ذوالمجاز تک اور مازمان کے آخری موقف تک ہیں۔ میدان عرفات کی مشہور جگہوں میں وادیِ نمرہ اور جبلِ رحمت شامل ہیں۔

[1] آنحضور ﷺ کے نقشِ قدم پر (حرم مکہ): 152/3.



جبل رحمت (عرفات)

عرفات کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ایک سے زیادہ اقوال ہیں، مثلاً: مصنف عبدالرزاق میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھیجا تو آپ نے ان کے ساتھ حج کیا حتی کہ جب آپ عرفہ تشریف لائے تو آپ نے فرمایا: قَدْ عَرَفْتُ ''میں نے اسے پہچان لیا ہے۔'' کیونکہ آپ ایک بار اس سے پہلے بھی یہاں تشریف لائے تھے۔ اسی وجہ سے اسے عرفہ کہا جانے لگا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما، عطاء بن ابی رباح اور ابومجلز رحمہم اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[1]

امام رازی رحمہ اللہ نے عرفات کے بارے میں آٹھ اقوال ذکر کیے ہیں۔ ان میں سے ایک قول یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم اور حواء علیہما السلام کو زمین پر اتارا تو یہ برسوں بعد میدان عرفات میں ایک دوسرے سے ملے اور دونوں نے وہاں ایک دوسرے کو پہچان لیا، اس لیے اسے عرفہ کہا جاتا ہے۔[2]

منیٰ: اس مقام پر حاجیوں کو عرفہ کی رات طلوع شمس تک ٹھہرنے، یوم نحر کو واپس منیٰ آنے اور بعد والے ایام تشریق میں یہاں ٹھہرنے اور ان کی راتیں گزارنے کا حکم ہے۔ یہیں حجاج کرام جمرات کو کنکریاں مارتے ہیں۔ منیٰ کی حد وادیٔ مُحَسِّر کے کنارے سے لے کر اس گھاٹی تک ہے جس کے پاس مکہ کی طرف والا آخری جمرہ ہے۔ اسے جمرۂ عقبہ کہا جاتا ہے۔[3]

مزدلفہ: مزدلفہ وہ جگہ ہے جہاں حج کے دوران میں عرفات سے واپسی پر نو اور دس ذوالحجہ کی درمیانی رات ٹھہرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ عرفہ اور وادیٔ مُحَسِّر کے دو تنگ پہاڑی راستوں کا درمیانی علاقہ ہے۔ مزدلفہ کو جَمْعٌ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ لوگ اس میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ اس کے قریب ہی اَلْمَشْعَرُ الْحَرَام کا پہاڑی مقام ہے جس کے بارے میں قرآن کریم نے کہا ہے:

﴿فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ عِندَ ٱلْمَشْعَرِ ٱلْحَرَامِ﴾ (البقرۃ 2:198)

[1] المصنف لعبد الرزاق: 96/5، تفسير ابن كثير، البقرة 2:198. [2] التفسير الكبير للرازي، البقرة 2:198. [3] دیکھیے: معجم البلدان، مادة: منى.



مسجد مشعر الحرام (مزدلفہ)



منیٰ میں مسجد خیف اور خیموں کی بستی

''جب تم عرفات سے واپس آؤ تو مشعرِ حرام کے پاس (ٹھہر کر) اللہ کا ذکر کرو۔''[1]

وادی مُحَسّر: یہ وہ جگہ ہے جہاں سے تیزی کے ساتھ گزر جانا ضروری ہے۔ مُحَسّر منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان ایک وادی ہے۔ یہ منیٰ میں شامل ہے نہ مزدلفہ میں۔ اسے وادی مُهَلّل بھی کہا جاتا ہے۔ حج کے دوران میں لوگ جب یہاں پہنچتے ہیں تو تکبیریں پڑھتے ہوئے تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ نبیِ کریم ﷺ کا عمل بھی یہی تھا۔ اسی جگہ ہاتھی والوں پر عذاب نازل کیا گیا۔ جن قوموں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا تھا، ان کے علاقوں میں جانے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''ایسے لوگوں کے گھروں (علاقے) میں داخل نہ ہوا کرو جنھیں عذاب دیا گیا تھا مگر اس حالت میں کہ تم رو رہے ہو۔ اگر رونا نہ آئے تو ان میں داخل نہ ہو، کہیں تم بھی اس عذاب کی گرفت میں نہ آ جاؤ جس میں وہ مبتلا ہوئے تھے۔''[2]

مکہ کے اردگرد کی مشہور وادیاں اور مقامات

وادی نخلہ (نخلہ الشامیہ، نخلہ الیمانیہ): بنو ہُذیل کی دو وادیاں نخلہ کہلاتی ہیں: نخلہ الشامیہ (بطن نخلہ) اور نخلہ الیمانیہ۔ ان دونوں کا سنگم مکہ مکرمہ سے تقریباً 43 کلومیٹر شمال مشرق میں بطن مَرّ اور سبوحہ (نخلہ الیمانیہ کی ایک شاخ) کے پاس ہے۔ نخلہ الیمانیہ قرن المنازل سے اترتی ہے جسے قرن الثعالب بھی کہتے ہیں۔ قرن المنازل مکہ سے 80 کلومیٹر دور مشرق میں ہے۔ نخلہ الشامیہ الریان کے پاس وادی فاطمہ سے ملتی ہے جو جدہ سے مکہ جانے والی شاہراہ کو قطع کر کے تہامہ میں جا نکلتی ہے۔ نخلہ الیمانیہ عموماً وادی نخلہ کہلاتی ہے جو الزیمہ سے چند کلومیٹر شمال میں نخلۃ الشامیہ سے جا ملتی ہے۔ سفر طائف سے واپسی پر رسول اللہ ﷺ نے نخلہ میں قیام فرمایا تھا جہاں جنّوں نے نبی اکرم ﷺ سے قرآن سنا۔ سید مودودی لکھتے ہیں کہ ''وہ مقام الزیمہ تھا یا السیل الکبیر۔ یہ دونوں مقام وادی نخلہ میں واقع ہیں اور ان کے درمیان تقریباً 35 کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔'' رجب 2 ھ میں بطن نخلہ میں سریہ عبداللہ بن جحش پیش آیا جو غزوۂ بدر کا ایک سبب بنا۔



وادی نخلہ الشامیہ

[1] تاریخ مکہ مکرمہ، ص: 123، 124، دیکھیے: معجم البلدان، مادۃ: مزدلفۃ. [2] صحیح البخاري: 4702، صحیح مسلم: 2980.

وادي حنين (الشرائع): یہ وادی مکہ کی وادیوں میں شمار ہوتی ہے اور یہ مکہ سے تقریباً 30 کلومیٹر مشرق میں ہے۔ ان دنوں اس کا نام الشرائع ہے اور اس کا بالائی حصہ آج بھی حنین کہلاتا ہے۔ اس کا پانی وادی المغمس کے ذریعے سے سیل عُرنہ میں جا گرتا ہے۔ مکہ سے طائف کو طریق الیمانیہ پر جائیں تو مسجد الحرام سے 28 کلومیٹر کے فاصلے پر وادی الشرائع آتی ہے۔ یہاں الشرائع نامی ایک چشمہ اور بستی ہے جن سے یہ وادی منسوب ہے۔ اس چشمے کا نام پہلے المشاش تھا جہاں سے ملکہ زبیدہ نے مکہ کی طرف نہر زبیدہ جاری کی تھی جو بعد میں بند ہوگئی۔ ان دنوں یہاں چند خاص لوگ ہی حُنین کے نام سے واقف ہیں۔[1]

الابطح: یہاں زمانۂ جاہلیت میں قُصی، خزاعہ اور بکر کے مابین لڑائیاں ہوئی تھیں۔ وادی مکہ کے موڑ سے لے کر الحجون تک کا علاقہ الابطح کہلاتا ہے، پھر اس کے بعد مسجد الحرام تک البطحاء ہے اور یہ دونوں المُعلاۃ میں شمار ہوتے ہیں۔ مکہ میں کئی گھاٹیاں ہیں جن کا پانی ابطح میں آ کر ملتا ہے۔ وادی مکہ کے موڑ (المنحنی) سے ریع الحجون تک سڑک شارع الابطح کہلاتی ہے۔ مسجد الحرام سے منیٰ جانے والے حاجی یہیں سے گزرتے ہیں۔[2]

البطحاء: اگرچہ بطحاء ہر اس وادی کو کہا جاتا ہے جس میں سے سیلاب گزرنے کے باعث اس کی زمین ریتلی ہوگئی ہو مگر علماء ''البطحاء'' سے وادیِ مکہ کا وہ حصہ مراد لیتے ہیں جو الحجون سے مسجد الحرام تک تھا۔ اس میں الغزہ اور سوق اللیل شامل تھے۔ اسے بطحاء مکہ بھی کہا جاتا ہے۔ اب اس کے کوئی آثار باقی نہیں۔ اس کے علاوہ بطحاء قریش تھا جو کوہ ثور کے پاس واقع تھا۔[3]

وادي عُرنه: یہ وہ وادی ہے کہ اگر مسجد نمرہ (مسجد عَرَفہ) کی قبلے والی دیوار گرے تو وہ اس وادی میں گرے گی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ دیوار اور امام کا مصلاّ عَرفہ میں شمار ہوتے ہیں لیکن دراصل یہ عَرفہ کے باہر ہیں۔ وادی عرنہ پر، عرفات

[1] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص:107. [2] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص:13، 14. [3] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص:46.



وادی حنین (الشرائع)



وادی عرنہ اور مسجد نمرہ



بطن سرف



وادی غران



وادی امج

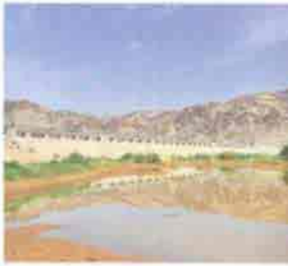
سے پہلے، قریباً ایک کلومیٹر کے اندر چودہ کشادہ پل بنے ہوئے ہیں۔ محرم 4 ھ میں سریہ عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ عرنہ کے پاس پیش آیا تھا۔ وادی عرنہ درحقیقت ایک بڑی وادی ہے جو ارض مغمس سے نکلتی ہے اور عرفات کے مغرب میں مسجد نمرہ کے پاس سے گزرتی ہے۔ کچھ دور جا کر وادی نعمان اس سے آملتی ہے اور پھر آگے اس کا نام وادی عرنہ ہی ہے جو مکہ کے جنوب سے ہو کر مغرب کا رُخ کرتی ہے حتی کہ جدہ سے تقریباً تیس میل جنوب میں سمندر سے جاملتی ہے۔ [1]

الرجیع: یہ ایک چشمہ ہے جو آج کل الوطیہ کہلاتا ہے اور مکہ سے تقریباً 70 کلومیٹر شمال میں وادی شامیہ ابن حمادی کے شمالی جانب حرہ بنی جابر کی ڈھلان پر واقع ہے۔ وادی شامیہ دراصل وادی الھَدَہ (ہدی الشام) کا نچلا حصہ ہے، اس پر قصبہ شامیہ آباد ہے۔ الوطیہ عُسفان کے مشرق میں 8 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اسے الوطیہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی نے قدم رکھے تھے۔ وادی شامیہ مکہ عسفان شاہراہ کے دائیں طرف بہتی ہوئی ذہبان کے بالائی جانب سمندر میں جاگرتی ہے۔ قبائل عضل اور قارہ کے لوگوں نے سریہ رجیع (صفر 4 ھ) میں مرثد بن ابی مرثد رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو یہاں شہید کر دیا تھا۔ [2]

ضَجنان (بحرة المحسنية): اس کا ذکر سفرِ معراج (حدیث الاسراء) میں آیا ہے۔ ضجنان ایک حرہ ہے جو مکہ سے 54 کلومیٹر شمال میں واقع ہے۔ طریق المدینہ اس کے نشیب وفراز سے گزرتا ہے۔ آج کل اس کا نام بحرة المحسنية ہے۔ [3]

اَمج: یہ مکہ سے 100 کلومیٹر شمال میں جادۂ عظمیٰ (مین روڈ) پر واقع ایک زرعی وادی ہے۔ قصبہ اَمج، خُلَیص کے جنوب میں 2 میل کی مسافت پر معروف ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سفرِ ہجرت میں یہاں سے گزرے تھے۔ اس جگہ بنوکنانہ آباد تھے مگر ان دنوں یہاں بنوحرب رہتے ہیں۔ [4] اَمج اور غُرّان دو وادیاں ہیں جو حرہ بنی سلیم سے نکل کر سمندر

[1] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 205. [2] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 138. [3] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 183. [4] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 32، معجم ما استعجم: 956/3.



وادی فاطمہ



مسجد عائشہ (تنعیم)



ثنیۃ الغزال

میں جا گرتی ہیں۔[1]

بطن سرف: یہ ایک وادی ہے جو جعرانہ کے پاس سے نکل کر مکہ سے 12 کلومیٹر شمال میں بہتی ہے۔ یہاں 38ھ میں ام المومنین میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا نے وفات پائی اور یہیں دفن ہوئیں۔[2]

مَرّالظهران (وادیٔ فاطمہ): یہ حجاز کی ایک بڑی وادی ہے جو نخلتین سے پانی حاصل کرتی ہے اور مکہ سے 22 کلومیٹر شمال میں گزرتی ہے۔ یہ جدہ سے تقریباً 20 کلومیٹر جنوب میں سمندر میں جا گرتی ہے۔ اس میں حداء، بحرہ اور الجموم نامی بستیاں واقع ہیں۔ ان دنوں اسے وادی فاطمہ کہا جاتا ہے۔[3]

البیضاء (ثنية التنعيم): اس گھاٹی کا ذکر نبی ﷺ کے سفرِ اسراء میں آتا ہے۔ مدینہ سے آنے والا راستہ یہاں سے مکہ کی وادی فخ میں اُترتا ہے۔ یہاں مسجد عائشہ بنی ہوئی ہے جہاں کسی عذر کی بنا پر زائرین حج یا عمرے کا احرام باندھتے ہیں۔ ثنية التنعيم کو المكان العمرة یا عمرة التنعيم بھی کہا جاتا ہے۔ ان دنوں اسے البیضاء کے نام سے کوئی نہیں جانتا۔ وادی التنعیم اس گھاٹی سے نکل کر وادی یاجج میں اور یاجج وادی مرّ الظہران میں گرتی ہے۔[4]

فخ: یہ مکہ کی ایک بڑی وادی ہے جو التنعیم اور مسجد الحرام کے درمیان واقع ہے۔ اسے وادی الظاہر بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں بلال رضی اللہ عنہ کو ہجرت سے پہلے بخار چڑھا تھا جس کا انھوں نے ایک شعر میں ذکر کیا۔[5]

ثنية غزال: یہ عُسفان کے شمال میں واقع ایک گھاٹی ہے۔ اس کے دوسری طرف وادیٔ غُرّان ہے۔

ثنية لفت (الفيت): ثنية غَزال کے بالمقابل واقع یہ گھاٹی ان دنوں ثنیۃ الفیت کہلاتی ہے۔ یہ خُلَیص کے شمال میں 30 کلومیٹر سے زیادہ فاصلے پر ہے۔ آج کل ریت کے ٹیلوں نے اس کا راستہ مسدود کر رکھا ہے۔

غُران: یہ اَمج اور عُسفان کے درمیان ایک بڑی وادی ہے۔ مکہ سے مدینہ جاتے ہوئے وادی غران 87 کلومیٹر کی

[1] معجم البلدان، مادة: أمج. [2] أطلس الحديث النبوي، ص: 72. [3] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 288، أطلس المملكة العربية السعودية، لوح: 12. [4] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 54,55. [5] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 234.

مسافت پر آتی ہے اور یہ ثنیۃ غزال کے قریب ہے۔ [1]

غدیر خم (الغربة): یہ الجحفة سے 8 کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔ ان دنوں اس کا نام الغُربہ ہے۔ یہاں خزاعہ اور کنانہ کے لوگ آباد ہیں۔ وادی غدیر خم کے پاس نبی ﷺ نے یمن کے وفد سے خطاب فرمایا تھا۔ [2]



چشمہ غدیر خم (الغربہ)

[1] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص :225. [2] معجم البلدان، مادة: خم، أطلس الحديث النبوي، ص : 285.

مدینہ منورہ: شہرِ نبوی

یہ رسول اللہ ﷺ کا شہر ہے۔ آپ نے خود اس کا نام مدینۃ النبی رکھا۔ یہ ان دنوں سعودی عرب کے صوبہ مدینہ کا دارالحکومت ہے۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کو ملا کر حرمین شریفین (دو بلند مرتبہ قابلِ احترام مقامات) کہا جاتا ہے۔

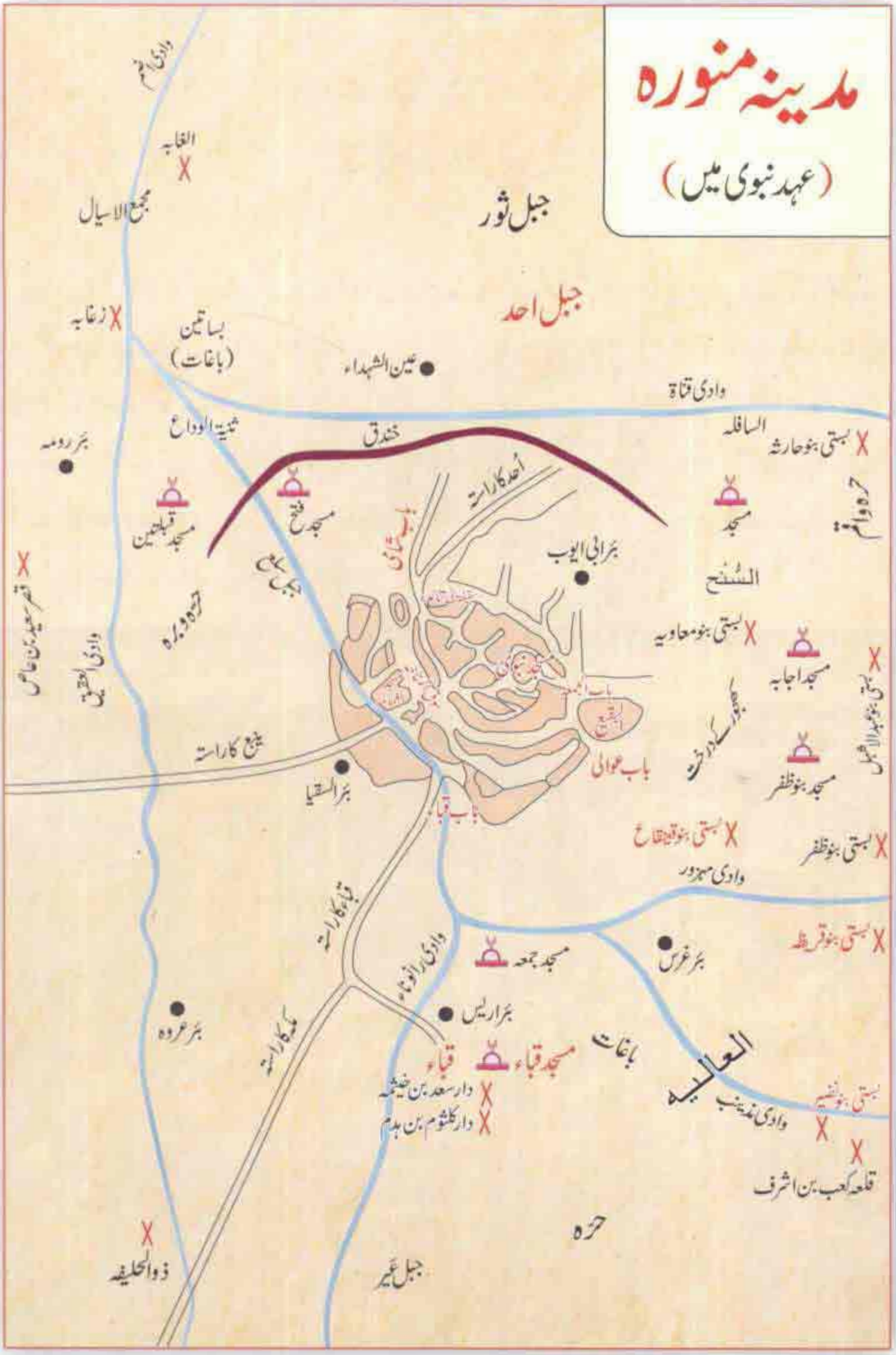
مدینہ منورہ کا پہلا نام یثرب تھا۔ صحیحین میں سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا:

''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مکہ مکرمہ چھوڑ کر ایسے علاقے کی طرف ہجرت کر رہا ہوں جس میں کھجوروں کے باغات بہت زیادہ ہیں۔ میں نے سمجھا شاید یہ ''یمامہ'' یا ''ہجر'' ہو لیکن وہ مدینہ، یعنی یثرب ہے۔''[1]

[1] صحيح البخاري: 3622، صحيح مسلم: 2272.



مسجد نبوی اور میدان بقیع (مدینہ منورہ)


مدینہ منورہ
(عہد نبوی میں)
جبل ثور
جبل احد
الغابہ
مجمع الاسیال
زغابہ
بساتین (باغات)
عین الشہداء
وادی قناة
ثنیۃ الوداع
بئر رومہ
خندق
السافلہ
بستی بنو حارثہ
مسجد قبلتین
مسجد فتح
مسجد
احد کا راستہ
بئر ابی ایوب
السنح
حرہ واقم
بستی بنو معاویہ
مسجد اجابہ
حرہ وبرہ
وادی العقیق
البقیع
باب عوالی
ینبع کا راستہ
بئر السقیا
باب قباء
مسجد بنو ظفر
بستی بنو قینقاع
بستی بنو ظفر
وادی مہزور
قباء کا راستہ
بستی بنو قریظہ
مسجد جمعہ
بئر غرس
بئر اریس
بئر عروہ
مکہ کا راستہ
مسجد قباء
قباء
باغات
العالیہ
دار سعد بن خیثمہ
دار کلثوم بن ہدم
وادی مذینب
بستی بنو نضیر
قلعہ کعب بن اشرف
حرہ
جبل عیر
ذوالحلیفہ

ابوالقاسم زجاجی کہتے ہیں: سام بن نوح علیہ السلام کی نسل سے ایک آدمی یثرب بن قاینہ یا ''قانیہ'' نے اس شہر کی بنیاد رکھی اور اس کی نسبت سے اس جگہ کا نام یثرب پڑ گیا۔[1]

بطلیموس کے جغرافیہ میں اس کا نام یثربہ (Jathripa) آیا ہے۔ غالباً اسے ''مدینۂ یثرب'' بھی کہا جاتا تھا جیسا کہ اسٹیفن بازنطینی نے اس کا نام Medinta (مدینہ) لکھا ہے جسے مدینۂ یثرب کا اختصار سمجھنا چاہیے۔ جنوبی عرب کی زبان میں یہ شہر ''ہگر'' کہلاتا تھا جیسا کہ یمن کے معینی کتبات میں رقم ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب ہجرت فرما کر یثرب آئے تو یہ مدينة النبي کہلایا، کثرت استعمال سے فقط مدینہ کہلانے لگا۔ نبی ﷺ نے اس شہر کو ''طیبہ'' اور ''طابہ'' بھی کہا۔[2] طابہ اور طیبہ، طیب (پاک) کے معنی میں ہیں کیونکہ اسلام کی برکت سے یہ شہر شرک سے پاک ہو گیا۔ ممکن ہے کہ نام کی تبدیلی کا سبب یہ بنا ہو کہ لغت میں ''یثرب'' کے معنی ملامت، فساد اور خرابی کے ہیں۔

یثرب اور مدینہ کا ذکر قرآن میں

قرآن مجید میں اس شہر کے نام یثرب اور مدینہ دونوں آئے ہیں:

- جب غزوۂ خندق کے موقع پر قریش مکہ اور دیگر قبائل کے متحدہ لشکروں نے مدینے پر چڑھائی کی تو منافقین نے مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیا اور گھروں میں جا بیٹھے بلکہ انھوں نے مسلمانوں کو بھی بد دل کرنا چاہا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر یوں آیا ہے:

﴿ وَإِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يَٰٓأَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا ﴾

''اور جب ان (منافقوں) میں سے ایک گروہ نے کہا تھا: اے اہل یثرب! (آج) تمھارے لیے (نبی ﷺ کے ساتھ) ٹھہرنے کا موقع نہیں، لہٰذا تم لوٹ چلو۔''[3]

- غزوۂ تبوک کے موقع پر جو منافقین اس غزوے میں شرکت سے دانستہ محروم رہے، ان کی مذمت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَٰفِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ ﴾

''اور تمھارے آس پاس جو دیہاتی ہیں، ان میں بعض منافق ہیں اور بعض اہل مدینہ بھی نفاق پر اڑے ہوئے ہیں۔''[4]

---

[1] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 128/4. [2] اٹلس سیرت نبوی، ص: 154، المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 130/4، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 228/20. [3] الأحزاب 13:33. [4] التوبة 101:9.

﴿مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنْ رَّسُولِ اللَّهِ﴾

''اہل مدینہ اور ان کے آس پاس رہنے والے دیہاتیوں کے لائق نہیں تھا کہ وہ (جہاد میں) اللہ کے رسول (ﷺ) سے پیچھے رہ جاتے۔'' [1]

- مدینہ میں مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور شرارتیں کرنے والے منافقوں کو انتباہ کیا گیا:

﴿لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا ۝﴾

''(اے نبی!) اگر منافقین اور جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے اور مدینہ میں جھوٹی افواہیں پھیلانے والے باز نہ آئے تو ہم ضرور آپ کو ان پر مسلط کر دیں گے، پھر وہ آپ کے پاس اس (مدینہ) میں تھوڑی مدت ہی رہ سکیں گے۔'' [2]

- غزوۂ بنو مصطلق سے واپسی پر رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی نے مہاجرین کے بارے میں جو ہرزہ سرائی کی تھی، اس پر ان الفاظ میں گرفت کی گئی:

﴿يَقُولُونَ لَئِنْ رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ ۚ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۝﴾

''وہ (منافقین) کہتے ہیں: البتہ اگر ہم لوٹ کر مدینے گئے تو معزز ترین لوگ (انصار) وہاں سے ذلیل ترین لوگوں (مہاجرین) کو نکال دیں گے۔ اور عزت اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے، مگر منافق یہ نہیں جانتے۔'' [3]

مدینہ منورہ کے مزید فضائل ''ہجرت مدینہ'' سے متصل باب ''فضائل مدینہ'' کے تحت دیکھیں۔

مدینہ کا محلِ وقوع

مدینہ منورہ 39 درجے 50 دقیقے طول بلد مشرقی اور 24 درجے 32 دقیقے عرض بلد شمالی پر خط سرطان کے شمال میں واقع ہے۔ یہ مکہ سے تقریباً 427 کلومیٹر [4] شمال میں اور ینبع سے 209 کلومیٹر مشرق میں سطح سمندر سے 600 میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ مدینے سے 4 کلومیٹر شمال میں جبل احد، جنوب میں قبا اور جنوب مغرب میں تقریباً 6 کلومیٹر دور جبل عیر واقع ہے۔ شہر کے مغرب میں حرہ وَبرہ اور مشرق میں حرہ واقم ہیں جو چھوٹے بڑے جلے ہوئے

[1] التوبة 9:120. [2] الأحزاب 33:60. [3] المنٰفقون 63:8. [4] أطلس المملكة العربية السعودية، ص:142.

سیاہ پتھروں کے میدان ہیں اور میلوں کی مسافت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ [1]

مدینہ کے چشمے، وادیاں اور پیداوار

مدینہ منورہ میں چوبیس سے زیادہ پانی کے چشمے ہیں جن میں اہم ترین عین الزرقا ہے۔ شہر کے اردگرد کئی وادیاں (برساتی ندیاں) ہیں جن میں وادی العقیق کے علاوہ وادی رانوناء، وادی مہزور، وادی بطحان، وادی القناۃ، وادی مذینب (یا مذینیب) اور وادی قُمی قابلِ ذکر ہیں۔

وادی قناۃ: یہ وادی مشرقی حجاز میں مہدالذہب کے جنوب سے حرۃ النار (موجودہ حرہ خیبر) کے وسط تک وسیع علاقے میں بہتی ہے۔ اس کی لمبائی قریباً 200 کلومیٹر ہے۔ مشرق سے الرَّبذہ، رَحرحان اور الشُّقران کے پانی اس میں ملتے ہیں۔ وادی قناۃ مدینہ اور احد کے درمیان سے گزر کر بطحان اور عقیق المدینہ سے جاملتی ہے اور ان سب کے ملاپ سے وادی اِضم بنتی ہے۔ جب نجد کی طرف سے وادی قناۃ بہتی تھی تو اس کا دھارا تقریباً ایک ماہ تک مدینے کے پاس سے گزرتا رہتا تھا۔ [2]

وادی رانوناء: یہ جنوب میں جبل عَیر سے نکلتی ہے اور حرہ قباء کے پاس سے گزر کر مسجد الغمام کے جنوب میں وادی بطحان سے جاملتی ہے۔ اب اس وادی کا نام بس چند لوگ جانتے ہیں، البتہ یہاں مسجد الجمعہ معروف ہے جہاں نبی ﷺ نے دورانِ ہجرت بستی بنی سالم بن عوف میں جمعہ پڑھایا تھا۔ یہ مدینہ میں پڑھا جانے والا پہلا جمعہ تھا۔ [3]

وادی بطحان: یہ وادی الحرۃ الشرقیہ کی طرف سے آکر مسجد نبوی کے مغرب میں بہتی تھی اور جمادات کے شمال میں وادی العقیق سے جاملتی تھی۔ وادی بطحان اور وادی العقیق کے درمیان ثنیۃ الوبرہ (حرۃ الغربیۃ) واقع ہے۔ [4]


جبل احد


عین الزرقا


وادی قناۃ


وادی رانوناء


وادی بطحان

---

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 228/20. [2] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 258,257. [3] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 135. [4] أطلس الحديث النبوي، ص: 70.



وادی الرمہ



وادی الصفراء



وادی القریٰ

بطحان دراصل مشرق سے آنے والی دو وادیوں مہزور اور مذینب کے ملاپ سے بنتی تھی جہاں بالترتیب یہود بنوقریظہ اور بنونضیر آباد تھے۔

وادی الرمہ: مدینہ کے شمال مشرق کی طرف حرہ فدک کے قریب وادی الرُّمّہ واقع ہے جو مشرق میں القصیم سے جاملتی ہے۔ وادی الرمہ کی لمبائی 950 کلومیٹر سے زیادہ ہے۔

وادی الصفراء: یہ حجاز کی ایک وادی ہے جو طریق الحاج (حاجیوں کے راستے) میں پڑتی ہے۔ اس میں بکثرت کھجور کے باغات ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ایک سے زیادہ مرتبہ یہاں سے گزرے۔ اس پر الصفراء نامی بستی آباد ہے۔ یہ وادی جبل ورقان سے نکل کر المسیجید کے پاس بہتی ہے اور اس کا پانی ینبع کی طرف جانکلتا ہے۔ یہاں جُہینہ، انصار، بنوفہر، نہد اور رضویٰ کے لوگ آباد تھے۔[1]

وادی القریٰ: یہ اہم وادی تبوک اور خیبر کے درمیان شام کو جانے والی قدیم تجارتی شاہراہ پر واقع ہے اور وادی دیدبان کے نام سے معروف ہے۔ یہ دو ندیوں، یعنی وادی الجزل اور وادی الحمض کی خشک گزرگاہ ہے جو اس کے وسط میں باہم ملتی ہیں۔ اس کے مشرق میں العُلا نامی شہر واقع ہے۔ العُلا کے دائیں جانب سے وادی السلسلہ الجزل سے آملتی ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں: غالباً العلا ہی وہ جگہ ہے جس کا ذکر کتب حدیث و تاریخ میں وادی القریٰ کے نام سے ملتا ہے۔ مدائن صالح العلا سے تقریباً 30 میل کے فاصلے پر ہے۔[2] غزوۂ خیبر (محرم 7ھ) کے بعد رسول اللہ ﷺ وادی القریٰ تشریف لے گئے اور یہاں کے یہود کو دعوتِ اسلام دی۔ انھوں نے دو روزہ لڑائی میں شکست کھا کر اطاعت قبول کر لی۔[3] وادی القریٰ (العُلا) مدینے سے 350 کلومیٹر شمال میں ہے۔

وادی الغمرہ: یہ وادی الحمض کی ایک معاون ندی ہے جو خیبر کے شمال میں حرہ خیبر سے نکل کر آتی ہے۔ قصبہ غمرہ جو ماضی میں الغمر یا غمر مرزوق کے نام سے معروف تھا، مدینہ سے تقریباً 195 کلومیٹر شمال میں خیبر سے تیماء جانے والی

[1] معجم البلدان، مادۃ : الصفراء، معجم مااستعجم :836/3. [2] سفرنامہ ارض القرآن (کامل) :206/1. [3] اٹلس سیرت نبوی، ص :331، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ :566/22.



وادی الغمر و



وادی العقیق



وادی بواط

شاہراہ پر واقع ہے۔ ربیع الاول 6 ھ میں نبی ﷺ نے عُکاشہ بن محصن اسدی رضی اللہ عنہ کو بنو اسد کے کنویں غمر مرزوق کی طرف بھیجا تھا، اسے سریہ غمر کہا جاتا ہے۔[1]

وادی العقیق: یہ وادی مدینے کے عین مغرب سے گزرتی ہے۔ العقیق مدینے سے تقریباً 140 کلومیٹر جنوب میں جبال قدس اور حرۃ الحجاز سے پانی لیتی ہے۔ بالائی جانب یہ وادی النقیع کہلاتی ہے۔ جبل عَیر اور حمراء الاسد کے درمیان اس کا نام الحسا ہے اور ذوالحلیفہ سے آگے یہ العقیق کہلاتی ہے۔ اس وادی اور مدینے کے درمیان حرۃ الوبرہ حائل ہے۔ یہ شمال کی طرف وادی الحمض (اِضَم) سے جا ملتی ہے۔ مدینے کے جنوب میں کوہِ عَیر وادی العقیق کے دائیں کنارے ہے۔ ایک متفق علیہ حدیث میں العقیق کو مبارک وادی کہا گیا ہے جہاں فرشتے نے رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھنے کو کہا۔ بئر رومہ اور بئر عروہ اسی وادی میں تھے۔ مدینے کی وادیوں مہزور، مذینیب، قناۃ اور بطحان کا پانی جہاں وادی العقیق سے ملتا ہے، اسے مجمع الاسیال کہا جاتا ہے۔ ایک اور وادی العقیق طائف کے قرب و جوار سے شروع ہو کر شمال کو بہتی ہے اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے درمیان دلدلی طاس العاقول میں جا گرتی ہے۔[2]

وادی بواط: مدینے کے شمال مغرب میں ایک وادی بواط جبل بواط (موجودہ جبال الاجرد) سے نکل کر وادی الحمض سے آملتی ہے اور دوسری جبل رضوی کے مشرق سے ینبع النخل کی طرف بہتی ہے۔ یہاں ربیع الاول 2 ھ میں غزوہ بواط پیش آیا۔ وادی الحمض پر قصبہ بواط آباد ہے جو مدینہ سے 42 کلومیٹر دور طریق خیبر پر واقع ہے۔

ان وادیوں میں بہت سے باغات اور کھیت ہیں۔ مدینے کا پانی ہلکا، سرد اور شیریں ہے۔ مدینہ منورہ کے مشرقی جانب کھجور، انگور اور انار بکثرت ہوتے ہیں۔ جنوب میں قبا، عوالی اور عقیق کی سیاہ مٹی میں گندم، جو، انار، رنگ برنگ کے پھول اور سبزیاں پیدا ہوتی ہیں۔[3]

---

[1] اٹلس سیرت نبوی، ص: 292. [2] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 414/13، معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 213. [3] جغرافية شبه جزيرة العرب لعمر رضا كحالة، ص: 137-147.

یثرب اور اس کے باشندے

یاقوت حموی لکھتے ہیں: ''مدینہ (یثرب) میں سب سے پہلے جن لوگوں نے کھیتی باڑی کی اور کھجور کے باغات لگائے، وہ عملاق بن ارفخشد بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ انھیں عمالیق کہا جاتا تھا۔''[1] جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حج بیت اللہ کیا تو ان کے ہمراہ بنی اسرائیل کے کچھ لوگ بھی تھے۔ حج سے واپسی پر وہ یثرب پہنچے تو انھیں اس جگہ آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شہر کی صفات نظر آئیں جن کے متعلق تورات میں خبر دی گئی تھی کہ وہ خاتم النبیین ہوں گے۔ ان میں سے ایک گروہ نے باہم مشورہ کرکے اس مقام پر سکونت اختیار کر لی، یہ جگہ بعد میں سوق بنی قینقاع کہلائی۔ ابن زبالہ[2] کے بقول سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے عمالیق کی سرکشی کے سدِ باب کے لیے ایک لشکر حجاز بھیجا تھا اور سیدنا داود علیہ السلام نے مدینے کے قبائل صعل اور فالج کے خلاف لشکر کشی کی تھی۔[3]

1 یہود کا یثرب میں ورود

زیادہ تر مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ یثرب کے اکثر یہودی فلسطین سے ہجرت کرکے آنے والوں کی نسل سے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ بیت المقدس پر بُختِ نَصَّر کے حملے (586ق م) کے بعد بھاگ کر آئے تھے۔ پھر 70ء اور 135ء میں رومیوں نے یہود کو تشدد کا نشانہ بنایا تو بنوقریظہ اور ان کے بھائی بند بنوہدل اور ان کے بعد بنونضیر ہجرت کرکے حجاز چلے آئے اور یثرب کی وادیوں ''مہزور'' اور ''مُذَینب'' میں آ بسے۔[4] بنوقینقاع جو وادی مہزور کے شمال میں بستے تھے، سیدنا یوسف علیہ السلام کی نسل سے تھے۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا تعلق اسی قبیلے سے تھا۔



قلعہ کعب بن اشرف

مدینہ اور قبا کے درمیان یہود کی قلعہ نما آطام، یعنی گڑھیاں (بلند مکان) واقع تھیں۔ قبا کی آبادی میں بنونضیر کی گڑھی ''عاصم'' کے اندر ایک کنواں تھا جسے قبا کہا جاتا تھا۔ کعب بن اشرف بنو نضیر ہی کا سردار تھا۔ ابن نجار کے بقول یثرب میں یہودی آطام کی کل تعداد 59 تھی۔[5] ان گڑھیوں کے دروازوں پر بازار بھی لگتے تھے۔

---

[1] معجم البلدان، مادة: مدينة. [2] ابن زبالہ (م: 180ھ/796ء): ابوالحسن محمد بن حسن بن زبالہ مدنی کو محدثین نے کذاب قرار دیا ہے۔ (تقریب التهذیب، ص: 836) [3] وفاء الوفا للسمهودي: 1/157-159. [4] دیکھیے: وفاء الوفا للسمهودي: 1/160،161. [5] وفاء الوفا للسمهودي: 1/164،165.

یہود کی مادری زبان عبرانی تھی مگر حجاز آ کر ان کی زبان رفتہ رفتہ عربی ہوگئی تھی اور وہ اسی زبان میں روز مرہ کا کام کرتے تھے۔ عبرانی ان کی مذہبی اور تعلیمی زبان تھی۔ یہود کے علاوہ مدینے میں کچھ عیسائی بھی بستے تھے۔ قبائلِ اوس مدینہ منورہ کے جنوب و مشرق میں اور خزرج وسطی اور شمالی علاقے میں آباد تھے۔ یہود ان دونوں قبیلوں کو لڑاتے رہتے تھے تاکہ وہ ان کا استحصال کرتے رہیں۔ مدینے کا سب سے اہم بازار سوقِ بنی قینقاع تھا جو سونے چاندی کے زیورات، مختلف مصنوعات اور کپڑے کا خاص بازار تھا۔[1]

2 اوس اور خزرج کا یثرب میں تمکن

جب اوس اور خزرج ہجرت کر کے یثرب پہنچے تو انھوں نے یہاں کا سارا معاشی و اقتصادی نظام یہود کے ہاتھ میں پایا۔ اوس و خزرج نے یہود کے ساتھ صلح اور امن و آشتی کے معاہدے کیے اور وہ لمبا عرصہ اکٹھے رہے یہاں تک کہ یہود نے عہد شکنی کی اور یثرب پر اپنا تسلط جمالیا۔ تب اوس اور خزرج نے اپنے اقرباء کے ساتھ مل کر یہود پر دھاوا بول دیا اور ان پر غلبہ پالیا۔[2]

جب اوس و خزرج یثرب میں یہودیوں کے زیردست تھے اور انھیں جلاوطن ہونے کا خطرہ درپیش تھا تو انھوں نے مالک بن عجلان خزرجی کو اپنا سردار بنالیا۔ تب فِطیَون یا فیطوان یہودِ یثرب کا حکمران تھا۔ اس کے ظلم و تعدی کا یہ عالم تھا کہ اوس وخزرج کی ہر دلہن اپنے شوہر کے پاس جانے سے پہلے فِطیَون کے ہاں رات گزارنے پر مجبور تھی۔ مالک بن عجلان کی بہن کی شادی اس کے ایک ہم قوم سے ہوئی تھی۔ مالک اپنے قبیلے کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ اس کی بہن دامن لٹکائے وہاں سے گزری۔ مالک بڑا شرمسار ہوا اور اس نے گھر جا کر بہن کو ڈانٹ ڈپٹ کی۔ وہ بولی: جب مجھے غیر کے پاس بھیجا جائے گا اور میرے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے، وہ کہیں بدتر ہے۔ اس پر مالک نے تلوار لی اور سرِ شام عورت کا بھیس بدل کر اپنی بہن کے ساتھ فطیون کے محل میں داخل ہوگیا اور موقع پا کر اسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد مالک بن عجلان نے شاہِ غسان ابوجُبیلہ سے یہودیوں کے خلاف مدد مانگی۔ ابوجُبیلہ ایک بڑا لشکر لے کر آیا اور اس نے یہود یثرب کے سرداروں کو قتل کر کے وہاں اوس وخزرج کو معزز بنا دیا۔[3]

ابن قُتَیبہ لکھتے ہیں کہ یثرب کے لوگ تُبَّع الاصغر شاہ یمن کے پاس گئے تھے اور یہود کی زیادتیوں کی شکایت کی تھی، چنانچہ تُبَّع نے یثرب پر لشکر کشی کی اور یہود کے 350 افراد باندھ کر قتل کر دیے۔ وہ یثرب (مدینہ منورہ) کو تباہ و برباد کر دینا چاہتا تھا مگر ایک بہت بوڑھا یہودی بولا: ''اے بادشاہ! غضب نہ دکھا۔ تو اس بستی کو تباہ نہیں کر سکتا

[1] التراتیب الإداریة:1/97. [2] المفصل في تاریخ العرب قبل الإسلام:4/130,129. [3] وفاء الوفا للسمھودي:1/178-180.

کیونکہ یہ اسماعیل (علیہ السلام) کی اولاد میں سے مہاجر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہجرت گاہ ہے جو بیت الحرام (مکہ) میں مبعوث ہوگا۔'' اس پر تُبّع اپنے ارادے سے باز آیا۔ اس نے اُس حبر (یہودی عالم) کے علاوہ ایک اور حبر کو ساتھ لیا اور مکہ آ کر کعبے پر غلاف چڑھایا اور لوگوں کی ضیافت کی۔ [1]



حدود حرم مدینہ

حرمِ مدینہ منورہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد مدینہ کو کئی اعتبار سے شرف و فضیلت حاصل ہوئی۔ ایک شرف یہ بھی ہے کہ مدینہ اپنے اردگرد کے علاقے سمیت حرم ہے۔ مدینہ منورہ کا حرم ہونا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ نے صراحت سے روایت کی ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا اور اس کے لیے دعا کی۔ میں نے اسی طرح مدینہ کو حرم قرار دیا ہے جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم قرار دیا تھا۔ میں نے اس کے لیے اس کے مد اور صاع (غلہ ماپنے کے دو پیمانے) کی برکت کے لیے دعا کی جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے دعا کی تھی۔'' [2]

صحیحین میں سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْمَدِينَةُ حَرَمٌ مَّا بَيْنَ عَيْرٍ إِلٰى ثَوْرٍ، فَمَنْ أَحْدَثَ فِيهَا حَدَثًا أَوْ اٰوٰى مُحْدِثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صَرْفًا وَّلَا عَدْلًا»

''مدینہ عیر پہاڑ سے ثور پہاڑ تک حرم ہے۔ جو شخص اس میں بدعت ایجاد کرے یا کسی بدعتی کو ٹھکانہ مہیا کرے، اس پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے کوئی فرض اور نفل عمل قبول نہیں فرمائے گا۔'' [3]

مدینہ منورہ بطور دار الخلافہ اور مابعد

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ کی مرکزیت قائم رکھی اور خلافتِ اسلامیہ کا پہلا دار الخلافہ 11ھ تا 36ھ مدینہ منورہ ہی رہا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں مرکزی بیت المال قائم کیا۔

[1] المعارف لابن قتيبة، ص:276. [2] صحيح البخاري:2129. [3] صحيح البخاري:1870، صحيح مسلم:1370.

مسجد نبوی میں توسیع کی۔ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک ہر منزل پر چوکیاں، سرائیں اور حوض تعمیر کرائے۔ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا بھی ایک اہم کارنامہ مسجد نبوی کی مزید توسیع و تعمیر ہے۔ انھوں نے ساری مسجد میں منقش پتھر لگوائے اور ستونوں کو سیسے سے مضبوط کیا۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے اسی مسجد سے عہد صدیقی میں قرآن مجید کے مدون نسخے کی نقلیں کرا کے اسلامی مملکت کے ہر علاقے میں بھجوائیں۔


حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منسوب مصحف کا ایک قلمی نسخہ

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے جنگِ جمل کے بعد کوفہ واپس آ کر مدینہ کے بجائے کوفے کو مرکزِ خلافت قرار دیا۔ علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حسن رضی اللہ عنہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے مصالحت کر کے خلافت سے دستبردار ہو گئے تو مرکز خلافت دمشق منتقل ہو گیا۔ یوں مدینہ کی حیثیت ایک صوبائی شہر کی رہ گئی لیکن اس کی علمی اور دینی مرکزیت اب بھی باقی تھی۔ حسن رضی اللہ عنہ بھی دستبرداری کے بعد مدینہ چلے آئے۔ مدینہ ہی میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک ہے اور یہ ایسا شرف ہے جس کا مقابلہ دنیا کا کوئی اور خطہ نہیں کر سکتا۔ امہات المؤمنین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند ابراہیم، آپ کی بنات طاہرات اور پہلے تین خلفائے راشدین اور بے شمار صحابہ اور صحابیات رضی اللہ عنہم، امام مالک اور دیگر تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ کی قبریں بھی مدینہ میں ہیں۔

مدینہ عثمانی اور سعودی ادوار میں

مدینہ منورہ تاریخ اسلام کے مختلف ادوار میں اموی، عباسی، عبیدی (فاطمی)، زنگی، ایوبی، مملوک اور عثمانی سلطنتوں میں شامل رہا۔ خلیفہ ولید بن عبدالملک، خلیفہ مہدی عباسی، مملوک سلطان اشرف قایتبائی اور عثمانی خلیفہ عبدالمجید اول کے ادوار میں مسجد نبوی میں توسیع کی گئی۔ ترکوں نے 1908ء میں دمشق مدینہ ریلوے لائن مکمل کر لی جو

خلافت عثمانیہ کے عہد میں مدینہ منورہ



پہلی جنگ عظیم کے دوران میں تباہ کر دی گئی اور شریف مکہ الحسین نے حجاز میں اپنی بادشاہت قائم کر لی۔ موجودہ سعودی حکومت کے بانی شاہ عبدالعزیز نے 1924ء میں حجاز پر قبضہ کرنے کے بعد مَلِک النجد والحجاز کا لقب اختیار کر کے ملک میں امن و امان قائم کیا۔



شاہ عبدالعزیز کے دور کا سکہ

1930ء کی دہائی میں تیل کی دریافت اور برآمد سے ملک کی خوشحالی اور اقتصادی ترقی کا نیا دور شروع ہوا۔ مدینہ منورہ کی موجودہ ترقی و خوشحالی شاہ فیصل بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور ان کے جانشینوں شاہ خالد اور شاہ فہد رحمہ اللہ کی رہینِ منت ہے جنھوں نے مسجد نبوی کی توسیع و تزئین پر کروڑوں پونڈ صرف کیے اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی بنیاد رکھی اور توسیع و تکمیل کی۔ مدینہ منورہ میں پاک و ہند کے، بخاری (ترکستانی) اور شامی مہاجرین کی خاصی تعداد آباد ہے۔[1]

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 20/238-244.



مدینہ منورہ میں جامعہ اسلامیہ کا ایک منظر

طائف اور بدر

طائف

مکہ کے جنوب مشرق میں جبل غزوان پر واقع طائف عرب کے قدیم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ ماضی میں یہ شہر چمڑا رنگنے میں خاصی شہرت رکھتا تھا حتی کہ اس کا نام ہی بلدالدباغ (چمڑا رنگنے کا شہر) پڑ گیا۔[1] اس کے علاوہ اہل طائف دیگر حجازیوں سے ہٹ کر لکڑی اور لوہے کے کام میں خوب مہارت رکھتے تھے۔[2] طائف اچھی آب و ہوا اور زرخیزی و شادابی کے لیے مشہور ہے۔ یہاں پھل دار درختوں کی کثرت ہے۔ زیادہ تر انگور، منقّی، کیلا اور انار پیدا ہوتا ہے۔ موسم سرما میں جبل غزوان کی چوٹی پر پانی برف بن جاتا ہے۔

طائف سرد علاقہ ہے، اس لیے زمانۂ قدیم سے یہ شہر اہل مکہ کا مصیف (گرمائی مقام) رہا ہے۔ ان دنوں بھی یہ سعودی حکومت کا گرمائی صدر مقام ہے۔[3] طائف مکہ سے تقریباً 65 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ سطح سمندر سے تقریباً 1630 میٹر بلند ہے۔ طائف میں جس جگہ لات (بنوثقیف کے بت) کا معبد تھا، وہاں اب شاندار دارالضیافہ

[1] صفة جزيرة العرب، ص:233. [2] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام:4/153. [3] المنجد في الأعلام، ص:354.

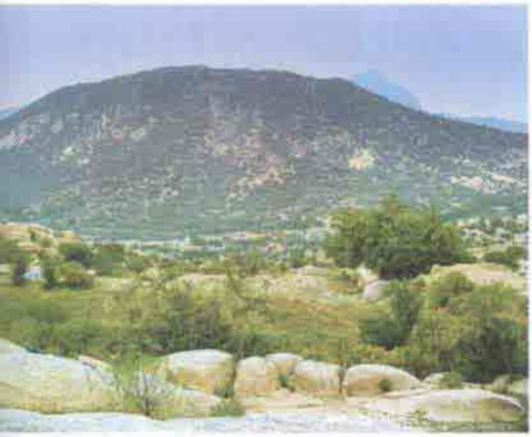


طائف شہر کا ایک خوبصورت منظر

بنا ہوا ہے۔ طائف کے اردگرد وادی القیم، وادی خشرب، وادی المحرم، وادی المادین، وادی لیّہ اور وادی وج نامی ندیاں بہتی ہیں جبکہ طائف کا محلّہ الشہداء غزوۂ طائف (8ھ) کے شہداء کی یاد دلاتا ہے۔[1]

عُکاظ: یہ طائف کے شمال میں ایک وادی میں واقع نخلستان تھا جہاں اُشیداء کے مقام پر عربوں کا ایک بازار (سوق) لگتا تھا۔ یہیں حربِ فجار برپا ہوئی تھی۔ اُشیداء ان دنوں الحویہ کہلاتا ہے جو طائف سے 35 کلومیٹر دور طریق الریاض پر ایک اہم قصبہ ہے۔ وادی شَرِب اور وادی العرج اس کے قریب باہم ملتی ہیں۔ طائف کا ہوائی اڈا الحویہ ہی میں واقع ہے۔[2] عُکاظ موجودہ قصبہ الحویّہ کے شمال مشرق میں واقع تھا۔

بنوثقیف طائف میں



بنوثقیف کا علاقہ

شروع میں طائف عمالقہ کے ایک سردار وَج بن عبدالحی کے نام پر ''وَجّ'' کہلاتا تھا، عمالقہ کی نسبت عملاق (عملیق) بن ارفخشد بن سام بن نوح کی طرف ہے جو عرب عاربہ سے تھے۔ ان کا مسکن بابل تھا جس پر فارس نے قبضہ کرلیا، پھر یہ جزیرہ نمائے عرب اور شام میں بکھر گئے۔ ان کی نسل سے عراق اور الجزیرہ کے بادشاہ پیدا ہوئے۔ جبابرۂ شام اور فراعنۂ مصر بھی انھی میں سے تھے۔ امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عمالقہ عرب اور عربی زبان بولنے والے تھے۔''[3] ان کے بعد یہاں عدنانی قبیلہ بنوعدوان بن عمرو بن قیس بن عیلان کو غلبہ حاصل ہوا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ثقیف (قَسی بن منبہ بن بکر بن ہوازن) اور نخع (جَسر) خالہ زاد بھائی تھے۔ دونوں چراگاہ کی تلاش میں نکلے تو شاہ یمن کے کارندے سے جھگڑا ہوگیا جسے انھوں نے قتل کردیا۔ تب انھوں نے مختلف سمتوں میں ہجرت کا فیصلہ کیا۔ نخع یمن چلا گیا اور قسی ام القریٰ میں ایک لاولد یہودیہ کے پاس جا پہنچا جس نے اسے اپنا بیٹا بنالیا۔ اس نے مرتے وقت اسے کچھ دینار اور انگور کی شاخ دی۔ قسی وہ لے کر وج چلا آیا۔ یہاں اس نے عامر بن ظرب عدوانی کی لونڈی کے بتائے ہوئے حیلے سے کام لے کر اس

[1] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 152/4. [2] معجم البلدان، مادة: عكاظ، أطلس الحديث، ص: 274، معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 215. [3] البداية والنهاية: 119/1، الأعلام: 88/5.

کے پاس پناہ لے لی۔ بعدازاں عامر نے اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی۔ چونکہ قسی نے حیلہ جوئی سے یہ کامیابی حاصل کی تھی، اس لیے اس کا نام ثقیف (چالاک و ہوشیار) مشہور ہوا۔ ثقیف کی اولاد وج میں خوب پھلی پھولی حتی کہ انھوں نے بنو عدوان کو طائف سے نکال باہر کیا اور وہ لوگ تہامہ کی طرف چلے گئے۔ بعد میں بنو صدف[1] کا ایک مالدار مفرور آدمی وَج پہنچا جو اپنے چچا زاد کا قاتل تھا۔ اس نے شہر کو عرب قبائل کی یلغار اور لوٹ مار سے بچاؤ کے لیے ایک دیوار بنانے کی تجویز دی، چنانچہ اس کی مدد سے بنوثقیف نے دیوار بنا کر ''وَج'' کو قلعے کی شکل دے دی۔ چونکہ یہ دیوار چاروں طرف شہر کو گھیرے ہوئے تھی، اس لیے وہ اسے طائف کہنے لگے۔[2]

ظہورِ اسلام کے زمانے میں بنوثقیف دو گروہوں بنو مالک اور احلاف میں بٹے ہوئے تھے۔ لفظِ احلاف قریش کے ان چھ قبائل کے لیے بولا جاتا ہے: عبد الدار، کعب، جمح، سہم، مخزوم اور عدی۔ ثقیف کی ایک قوم کا نام بھی احلاف ہے۔ ایک لڑائی میں احلاف نے بنو مالک کو طائف کے پیچھے وادئ لحب میں دھکیل دیا، چنانچہ بنو مالک احلاف کے خلاف دوس اور خثعم کے حلیف بن گئے۔[3]

مشہور تاریخی شخصیت حجاج بن یوسف ثقفی کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ فاتح سندھ محمد بن قاسم ثقفی حجاج بن یوسف ثقفی کے عم زاد بھائی قاسم کے بیٹے تھے۔[4] اس سے پہلے عہد فاروقی میں عراق میں رزم آرا اسلامی فوج کے سالار ابوعبید بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ (م 13ھ/634ء) کا تعلق بھی یہیں سے تھا۔ انھوں نے فارسیوں کے خلاف معرکۂ جسر (13ھ) میں مجاہدینِ اسلام کی قیادت کرتے ہوئے شہادت پائی۔[5]

طائف کی مشہور وادیاں

شوحطہ (خیبات بنوسعد): نبی ﷺ کی رضاعی ماں حلیمہ رضی اللہ عنہا کے قبیلہ بنو سعد کا علاقہ طائف کے جنوب مشرق میں تقریباً 70 کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ عبدالرحمٰن عبد اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں: ''طائف سے بیس کلومیٹر آئے ہوں گے کہ طریق یمن کو چھوڑ کر دائیں جانب کی سڑک پر ہو لیے ...... بنو سعد کا علاقہ میلوں تک پھیلا ہوا

[1] بنوصدف کے نام سے تین قبیلے مشہور ہیں: 1 صدف بن اسلم، یہ حضرموتی قحطانی قبیلہ ہے۔ 2 صدف بن عمرو، یہ حمیری قبیلہ ہے۔ 3 صدف بن مالک، یہ کندہ کی شاخ ہے جو قحطانی الاصل ہے۔ (معجم قبائل العرب: 637/2) [2] معجم ما استعجم: 67-64/1. [3] الكامل لابن الأثير: 543,542/1. [4] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 345/19. [5] أسد الغابة: 37/5، البداية والنهاية: 121/7.



بنوسعد کا علاقہ جہاں نبی ﷺ نے پرورش پائی

ہے۔ اس میں سے خاص حلیمہ سعدیہ کا علاقہ خیات کہلاتا ہے اور ان کی خاص بستی کا نام الشطہ ہے۔ خیات میں آکر الصحن کے مقام پر گاڑی سے اترے۔ آگے جا کر پکی سڑک ختم ہوگئی اور کچی سڑک پر ایک جگہ بنوسعد کا بورڈ لگا دیکھا۔'' [1]

مینیجنگ ڈائریکٹر دارالسلام جناب عبدالمالک مجاہد اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں: ''سیدہ حلیمہ کے گاؤں کا نام شوطہ ہے۔ بعض وقائع نگار اسے شطہ بھی لکھتے ہیں مگر شوطہ ہی صحیح ہے۔ یہ سڑک کے راستے مکہ سے 160 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ طریق یمن پر واقع شقصان سے وہاں تک کچا راستہ پندرہ بیس کلومیٹر تو ضرور ہوگا۔ دور سے ایک وادی کی طرف محترم سیف الرحمٰن نے اشارہ کیا کہ یہ رہا سیدہ حلیمہ کا گاؤں۔ گاڑی نے سیدھی طرف سے ایک چکر لگایا اور قدرے اونچے ٹیلے پر چڑھ گئی۔ پچھلی جانب شوطہ نامی گاؤں نظر آرہا تھا جو دوفرلانگ کے فاصلے پر ہوگا۔ گاڑی اوپر چڑھتی چلی گئی۔ نیچے قبرستان اور خشک کھیتیاں تھیں۔ سامنے چھوٹی سے پہاڑی کے دامن میں کچھ آثار نظر آئے کہ یہاں کبھی آبادی ہوتی تھی، یہ کوئی بڑی وادی نہیں، پندرہ بیس ایکڑ پر محیط ہوگی۔ پتھروں کے نشانات ہیں۔ چھوٹی چھوٹی چار دیواریاں ہیں۔ پہاڑی کے اوپر پیدل الٹی طرف چڑھتے ہوئے دوتین مقامات کی طرف اشارہ کرکے ہمیں بتایا گیا کہ یہاں سیدہ حلیمہ کے قبیلے والوں کے گھر تھے۔ کسی پاکستانی نے سفیدی سے

[1] آنحضور ﷺ کے نقش قدم پر (حرم عرفات): 65/4.



وادی محرم



میقات قرن المنازل



وادی لیہ

شکستہ خط میں لکھا ہوا تھا: بیتِ حلیمہ۔ نہایت چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔" [1]

وادی مَحرِم: یہ ان دنوں طائف سے آنے والے حجاج کے لیے میقات ہے جو مکہ سے آنے والی جدید شاہراہ پر طائف سے تقریباً 10 کلومیٹر دور واقع ہے۔ اس کے قریب سے وادی محرم نکل کر شمال کو بہتی ہے جو السیل الکبیر کے پاس وادی نخلہ الشامیہ سے جا ملتی ہے۔ وہیں میقات قرن المنازل ہے۔ غزوۂ طائف سے مکہ آتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ نے اسی مقام پر عمرے کے لیے احرام باندھا تھا۔ ہیکل نے "منزل الوحی" میں موجودہ السیل الکبیر کو قرن المنازل لکھا ہے۔

وادي لیّه: یہ طائف کی بڑی وادیوں میں شمار ہوتی ہے اور طائف کے جنوب مغرب میں واقع جبل السراۃ سے نکلتی ہے جہاں سے بنو ہذیل اور بنو ثقیف کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ پھر یہ مشرق کا رُخ کر کے طائف کے جنوب مشرق میں 15 کلومیٹر کے فاصلے سے گزرتی ہے جہاں بنوسعد کے علاقے اور یمن کو جانے والی شاہراہ اسے پار کرتی ہے۔ [2]

بدر

بدر میں 17 رمضان 2 ھ کو حق اور باطل میں فیصلہ کن معرکہ برپا ہوا تھا۔ یہاں بنوغِفار کا گھاٹ تھا جس نے بعد میں چشمے کی شکل اختیار کر لی۔ یہ بحیرۂ احمر کے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ شام و مصر سے آنے والے قافلوں کے راستے میں پڑتا تھا۔ فروغِ اسلام کے بعد یہ حجاج کی آمد و رفت کا مرکز بن گیا۔ ان دنوں بدر ایک بڑا قصبہ ہے جو زیریں وادی الصفراء (وادی الصریر) میں واقع ہے۔ مدینہ منورہ سے بدر کا فاصلہ 155 کلومیٹر

[1] ماہنامہ "ضیائے حدیث" مارچ 2011ء۔ [2] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 274.

اور مکہ مکرمہ سے 310 کلومیٹر ہے۔ ساحلِ سمندر سے یہ 75 کلومیٹر کی دوری پر ہے۔ اسے الجار نامی بندرگاہ لگتی تھی۔ جب وہ اُجڑ گئی تو اس کے قریب الرایس نامی موجودہ قصبہ آباد ہوگیا جہاں سے سمندری مچھلی بدر پہنچتی ہے۔ بدر سے تقریباً 5 کلومیٹر جنوب مغرب میں الغزلان نامی مقام ہے جہاں سے مکہ، جدہ اور ینبع کی شاہراہیں نکلتی ہیں۔ [1]

زمانۂ جاہلیت میں بدر میں ہر سال یکم ذوالقعدہ سے آٹھ روز تک ایک بڑا میلا لگتا تھا۔ بدر بیضوی شکل کا ساڑھے پانچ میل لمبا اور ساڑھے چار میل چوڑا وسیع میدان ہے جس کے اردگرد اونچے پہاڑ ہیں۔ اس کے دونوں سروں (شمال مغرب اور جنوب مشرق) پر سورۂ انفال میں مذکور العدوۃ الدنیا (قریبی ٹیلا) اور العدوۃ القصویٰ (دور کا ٹیلا) ہیں۔ ان کے درمیان جنوب مغرب میں خاصا بلند پہاڑ جبل اسفل واقع ہے جس کی بلندی سے سمندر (بحیرۂ قلزم) صاف نظر آتا ہے۔ بدر میں ایک ٹیلے پر جہاں نبی ﷺ کا خیمہ نصب تھا، وہاں مسجد العریش (مسجد غمامہ) تعمیر کی گئی ہے۔ بدر کے چھوٹے سے نخلستان کے خاتمے پر قبرستان موجود ہے اور اسی کی ایک جانب شہدائے بدر کا چھوٹا سا احاطہ ہے۔ [2]

مولانا عبدالمالک مجاہد ''مقام بدر اور غزوۂ بدر'' کے عنوان سے اپنے سفری مشاہدات میں لکھتے ہیں: ''بدر شہر میں 120 مساجد ہیں۔ شہر کی آبادی 40 ہزار سے متجاوز ہے۔ سعودیوں کے علاوہ اس شہر میں 2000 کے قریب بنگلہ دیشی، 2000 پاکستانی اور تقریباً 1000 دیگر ممالک کے لوگ بستے ہیں۔ میدانِ بدر کوئی بہت بڑا نہیں ہے۔ قبرستان اور معرکے کی جگہ میں فاصلہ کوئی آدھ کلومیٹر کا ہوگا۔ چودہ سو سال سے زائد عرصے میں اس میدان کی ہیئت بدل چکی ہے۔ اب یہاں کھجوروں کا باغ ہے۔ ایک طرف دیکھا تو لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ مدینہ منورہ کی طرف وادی بدر کا کنارہ العُدوۃ الدنیا ہے، یہاں مسلمانوں کا لشکر تھا۔ العدوۃ القصویٰ دور کا کنارہ ہے جہاں کافروں کا لشکر تھا اور یہ مکہ کی جانب تھا۔ مسلمانوں نے بارش کے پانی کا جو حوض بنالیا تھا، وہ غالباً العریش کے پیچھے تھا۔ مسجد العریش کے عقب میں دورویہ سڑک ہے۔ اس کے پچھلی جانب سوق قدیم کے کھنڈر ہیں جہاں نبی ﷺ 4 ہجری میں 1500 مجاہدین کے ساتھ آئے تھے۔ وہیں کہیں ''قلیب بدر'' نامی پرانا کنواں تھا جس میں مشرکین کے مقتول سرداروں کو پھینکا گیا تھا۔'' [3]

---

[1] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 42,41، أطلس المملكة العربية السعودية. [2] آنحضور ﷺ کے نقش قدم پر (حرم مدینہ): 42,41/2. [3] ماہنامہ ''ضیائے حدیث'' رمضان 1432ھ / اگست 2011ء.



بدر کا قبرستان



العدوۃ الدنیا (بدر)



مسجد العریش (جہاں نبی ﷺ کا خیمہ نصب تھا)



العدوۃ القصویٰ (بدر)

تہامہ، نجد اور حجاز کے بعض اہم مقامات

منصرف: یہ ان دنوں المُسَیْجِید کہلاتا ہے جو مسجد رسول اللہ ﷺ سے منسوب ہے۔ اس مسجد کے آثار موجود ہیں۔ المسیجید مدینہ سے 80 کلومیٹر دور طریق مکہ پر واقع ہے۔ 2ھ میں بدر کو جاتے ہوئے نبی ﷺ منصرف پہنچے تو آپ ﷺ نے شاہراہ مکہ بائیں طرف چھوڑ کر نازیہ کے راستے الصفراء کا سفر کیا تھا۔ [1]

بئر معونہ (دیار مطیر): ان دنوں بئرِ معونہ دیار مطیر کہلاتا ہے۔ یہ جبال اُبلیٰ کے دامن میں واقع ہے۔ ابلیٰ سیاہ پہاڑوں کا سلسلہ ہے جو مہد الذہب (معدن بنی سُلیم) کے شمال مغرب میں حرۃ الحجاز سے متصل ہے۔ عہدِ نبوی میں بئر معونہ کے نام پر یہ علاقہ بھی بئر معونہ کہلاتا تھا۔ یہاں صفر 4ھ میں بنوسُلیم نے 70 قراء شہید کر دیے تھے۔ [2]

قُدَید: یہ حجاز و تہامہ کی ایک زرخیز وادی ہے اور ''حرہ ذَرَہ'' سے نکلتی ہے۔ اس وادی کا بالائی حصہ ''سِتارہ'' اور زیریں حصہ ''قُدَید'' کہلاتا ہے۔ یہ وادی مکہ مدینہ شاہراہ کو تقریباً 120 کلومیٹر پر کاٹتی ہوئی القضیمہ کے پاس سمندر میں جا گرتی ہے۔ نبی ﷺ سفرِ ہجرت کے دوران میں اور غزوہ مریسیع کو جاتے ہوئے قدید سے گزرے تھے۔ یہاں حرب اور بنوسلیم کی بستیاں تھیں۔ [3]

المُرَیسیع: یہ وادی ستارہ (قُدید) کی ایک ندی ''خُورہ'' کا ایک چشمہ ہے جہاں غزوہ بنی مصطلق (5ھ) پیش آیا تھا۔ یہاں ان دنوں بنومصطلق (خزاعی) کے بجائے بنوسلیم کی بستیاں ہیں۔ المریسیع سمندر سے تقریباً 80 کلومیٹر دور جبالِ تہامہ (حجاز) میں واقع ہے۔ [4] جدید طریقِ مکہ مدینہ پر السُّلَیم نامی بستی وادی ستارہ کے مشرق میں آباد ہے۔ یہ مدینہ سے تقریباً 250 کلومیٹر جنوب میں ہے۔

ذوامَر: یہاں ربیع الاول 3ھ میں غزوۂ غطفان پیش آیا تھا۔ قدیم مؤرخین کے بقول ذوامر الحناکیہ سے تقریباً 15 کلومیٹر شمال میں النُخیل کے پاس واقع تھا۔ النُخیل ایک بستی اور وادی کا نام ہے۔ الحناکیہ مدینہ سے تقریباً 90 کلومیٹر دور طریق الریاض پر واقع ہے۔ آج کل ذوامر کے بارے میں یہاں کوئی نہیں جانتا۔ [5]

---

[1] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 303. [2] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 53,52.
[3] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 249. [4] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 290.
[5] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 33، أطلس المملكة العربية السعودية، لوحة: 9.

قرقرۃ الکدر: یہ مدینہ کے مشرق میں 40 کلومیٹر دور ایک نشیبی طاس (قاع) ہے جس میں کئی وادیاں آ کر ملتی ہیں۔ ان دنوں اسے قاع الخضوضاء کہا جاتا ہے۔ مدینہ سے الحنا کیہ جاتے ہوئے پچاس پچپن کلومیٹر پر ایک مقام الصویدرہ آتا ہے جس کے جنوب میں الخضوضاء کا وسیع طاس مہد الذہب تک پھیلا ہوا ہے۔ [1] نبی ﷺ نے غزوۂ سَوِیق (ذوالحجہ 2ھ) میں ابوسفیان کے لشکر کا قرقرۃ الکُدْر تک پیچھا کیا تھا۔

الابواء (الخُرَیبہ): یہ حجاز تہامیہ کی ایک وادی ہے جو وادی الفرع اور وادی القاحہ (وادی النخل) کے ملاپ سے بنتی ہے۔ پھر وادی الابواء ودان کے کھنڈروں کو بائیں طرف چھوڑ کر قصبہ مستورہ کے پاس سمندر میں جا گرتی ہے۔ آج کل اس کا نام وادی الخریبہ ہے، تاہم اہلِ علم میں الابواء ہی کے نام سے معروف ہے۔ [2] موجودہ قصبہ الابواء مستورہ سے تیس پینتیس کلومیٹر مشرق میں ہے۔ یہاں نبی ﷺ کی والدہ محترمہ آمنہ نے وفات پائی تھی۔

خیبر: یہ مدینہ سے 165 کلومیٹر شمال میں تیماء کے راستے میں آتا ہے۔ یہاں کئی وادیاں ہیں اور پانی کی فراوانی ہے اور یہ سرسبز فصلوں خصوصاً کھجور کے لیے مشہور ہے۔ اسے ریف الحجاز کہا جاتا تھا۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک شعر میں خیبر کا ذکر یوں کیا ہے:



وادی المنصرف



وادی قدید



وادی الرسیع



قاع حضوضاء، (قرقرۃ الکدر)



وادی الابواء (الخریبہ)



خیبر کا ایک منظر

[1] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص :251، أطلس المملكة العربية السعودية، لوحة : 10,9. [2] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص : 14.

فَإِنَّا وَمَنْ يُهْدِي الْقَصَائِدَ نَحْوَنَا كَمُسْتَبْضِعٍ تَمْرًا إِلَى أَهْلِ خَيْبَرَا

''بلاشبہ ہماری اور اس آدمی کی مثال جو ہمیں قصیدے سناتا ہے، اس طرح ہے جیسے کوئی اہل خیبر کو کھجور فروخت کرنے والا ہو۔''[1]

یہاں قبیلہ عنزہ کے لوگ آباد ہیں۔ خیبر کا مرکزی مقام الشریف کہلاتا ہے۔[2]

فدک (الحائط): یہ خیبر کے مشرق میں تقریباً 115 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک وادی میں آباد قصبہ ہے جو وادی الرمہ کی طرف جانکلتی ہے۔ ان دنوں یہ الحائط کے نام سے معروف ہے۔ فتح خیبر (6 ھ) کے بعد اہلِ فدک نے نبی ﷺ کی اطاعت قبول کر لی تھی۔[3] فدک طریق القصیم پر واقع قصبہ الحلیفۃ السفلٰی سے بجانبِ مغرب تقریباً 35 کلومیٹر دور ہے۔

خیمہ ام معبد: یہاں نبی ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سفرِ ہجرت میں ام معبد خزاعیہ رضی اللہ عنہا نے ان کی دودھ سے تواضع کی تھی۔ ان دنوں یہ مقام ''خیمہ ام معبد'' ہی کے نام سے معروف ہے۔ یہ ساحل کی طرف وادی قُدید کے شمالی کنارے پر واقع ہے اور ثنیۃ المشلل اس کے شمال میں ہے۔[4]

رَبذہ: یہاں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ دفن ہیں۔ یہ شاہراہِ حجاج (دربِ زبیدہ) پر واقع تھا۔ 319ھ میں قرامطہ نے اسے تباہ کر دیا۔ یہاں اب صرف برکہ ابوسُلیم مشہور ہے اور رَبذہ کا نام مقامی لوگ نہیں جانتے۔ یہ الحناکیہ کے جنوب مشرق میں تقریبا 80 کلومیٹر دور واقع ہے اور مہد الذہب سے 150 کلومیٹر شمال میں ہے۔

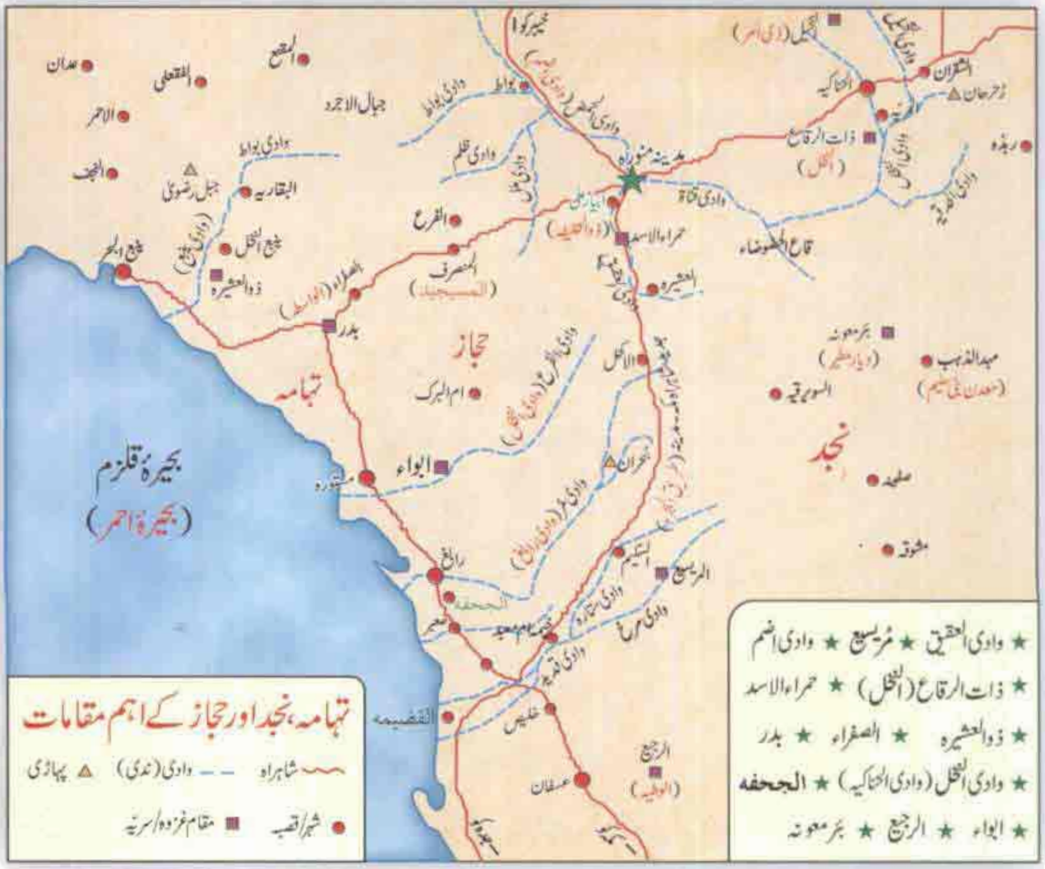
مشَلّل: یہ ایک گھاٹی ہے جو قدید کے شمال میں واقع ہے۔ قصبہ صعر سے جو رابغ اور القضیمہ کے درمیان ہے،


وادی فدک (الحائط)


مقام ربذہ


وادی العیص

[1] ديوان حسان بن ثابت الأنصاري، ص: 109. [2] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 118. [3] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 235، أطلس المملكة العربية السعودية، لوحة: 9. [4] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 120،119.



حرۂ مشلّل نظر آتا ہے جہاں مناۃ کا بُت نصب تھا۔ مشلّل ہی میں غسّان نامی چشمہ تھا جو اب معروف نہیں۔ [1]

ثنیۃ المُرّہ: یہ مقام سفرِ ہجرت نبوی میں الخرّار اور لِقف کے درمیان آیا تھا۔ ثنیۃ المرۃ آج تک غدیرِ خُم اور الفُرع کے درمیان معروف ہے۔ [2]

العیص: یہ مدینہ اور سمندر کے درمیان بنو جُہینہ کی وادی ہے جس کے نواح میں رمضان 1 ھ میں سریۂ حمزہ رضی اللہ عنہ پیش آیا تھا۔ یہ وادی جبل الاجرد الغربیہ اور خرار کی طرف سے آکر وادی اضم (الحمض) میں بائیں جانب سے ملتی ہے۔ شہر العیص ان دنوں مرکزِ امارت ہے جہاں مدارس، پولیس سٹیشن اور شرعی عدالت واقع ہے۔ العیص مدینے سے تقریباً 180 کلومیٹر شمال مغرب میں ہے جبکہ ساحلی شہر املج سے تقریباً 80 کلومیٹر مشرق میں ہے۔

الاصافر (الصُفر): نبی صلی اللہ علیہ وسلم بدر کو جاتے ہوئے ذفران کے بعد الأصافر کی گھاٹیوں سے گزرے تھے اور پھر نیچے اتر

[1] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص :298. [2] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص :289.

کر الدَّبّہ نامی بستی کی طرف ہو لیے تھے۔ الاصافر آج کل الصُّفُر کے نام سے معروف ہے۔ [1]

الدَّبّہ: ان دنوں الدَّبّہ کا تعین مشکل ہے۔ مدینے کی جانب سے اصافر یا الصُّفُر کی گھاٹیوں سے اتر کر آئیں تو سامنے البرکۃ نامی قصبہ آتا ہے جس کے ایک طرف ایک "دبّہ" ہے جبکہ اہلِ حجاز ریت کے گول ہموار ٹیلے کو "دبہ" کہتے ہیں۔ کتب سیرت میں مذکور دبہ یہی ہوگا۔ لیکن اب جو الدَّبّہ کے نام سے قصبہ معروف ہے، وہ بدر سے قبلے کی جانب (جنوب میں) ہے اور بدر کے مقامی لوگ اسی کو سیرت میں مذکور الدَّبّہ بتاتے ہیں۔ [2]

وادي اوطاس: غزوہ حنین (شوال 8ھ) میں اس وادی کا ذکر آتا ہے۔ درید بن صمہ کے ایک قول سے بعض کو شبہ ہوا کہ اوطاس وادی حنین میں ہے، حالانکہ یہ اس سے دور ہے۔ اوطاس ایک میدان تھا جو عراق سے آنے والے حاجیوں کے راستے میں پڑتا تھا۔ وہ برکہ زبیدہ (برکۃ العقیق) پہنچ کر وادی عقیق میں اترتے تھے۔ پھر ایک ساعت میں اوطاس پہنچ جاتے جو عقیق الیسریٰ کا ایک کنارہ ہے۔ پھر وہ حرہ کی چڑھائی چڑھ کر میقات کی محصول (چنگی) کا رخ کرتے جو قصبہ عشیرہ کے شمال میں اور مکہ سے تقریباً 160 کلومیٹر شمال مشرق میں ہے۔ مکہ مکرمہ سے اوطاس پہنچ کر حجاج کے دو راستے ہو جاتے۔ بصرہ والے دایاں راستہ اختیار کرتے اور کوفہ و بغداد والے بائیں راستے چلتے۔ [3]

الخرّار (غدیر خُم): یہ ایک وادی ہے جسے وادی الجحفہ یا غدیر خُم کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ قصبہ الخرار رابغ کے مشرق میں تقریباً 25 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس کے قریب ہی غدیر خُم ہے۔ ہجرت کے دوران میں نبی ﷺ خرار سے گزر کر ثنیۃ المرہ کی طرف گئے تھے۔ [4]

تبالہ: یہ ایک بڑی وادی ہے جو طائف کے جنوب مشرق میں تقریباً 200 کلومیٹر دور ہے۔ یہ الباحہ کے نواح میں سراۃ غامد، بلقرن اور بلجرش سے بہتی ہوئی مشرق کا رُخ کر کے وادی بیشہ میں جا گرتی ہے۔ یہاں کے باسی اب شہران کہلاتے ہیں۔ [5]

---

[1] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 125. [2] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 125.
[3] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 35,34. [4] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 112.
[5] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 56.


وادی الخرار (وادی الجحفہ)


وادی تبالہ

جزیرہ نمائے عرب کی اقوام و قبائل

عرب اقوام کی تقسیم، ہود، صالح، ابراہیم و اسماعیل علیہم السلام

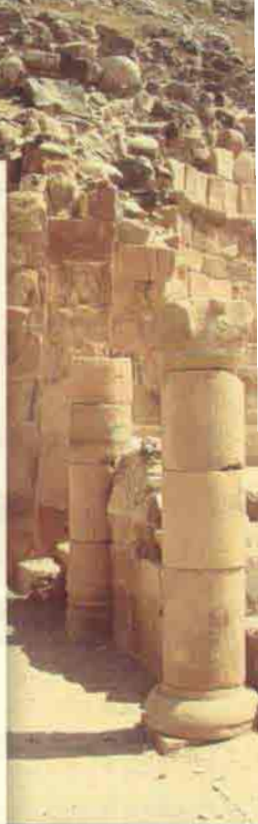
اور ان کی قوموں کی سرگزشت،

لوط اور شعیب علیہما السلام کی قوم کے عبرتناک واقعات

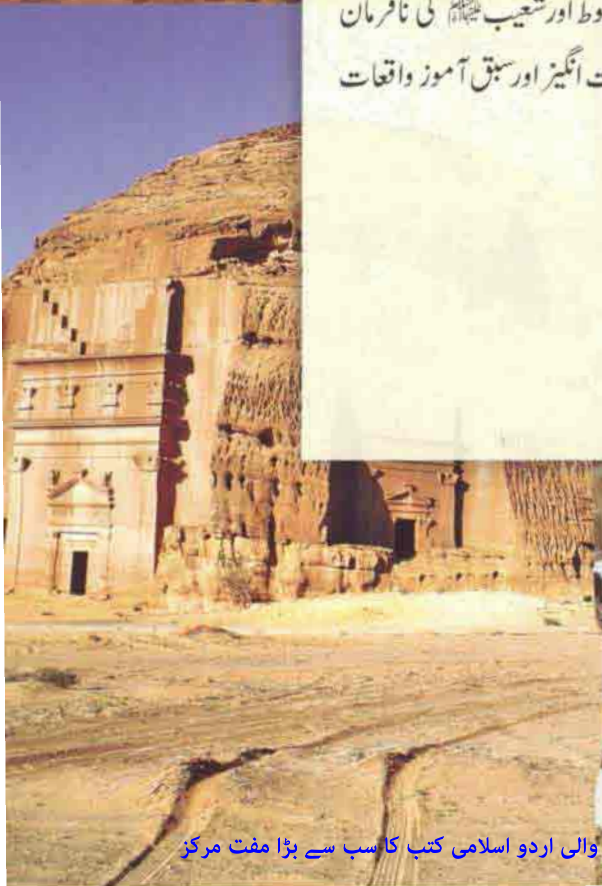
مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا

”محمد (ﷺ) تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں، اور اللہ ہر شے کو خوب جاننے والا ہے۔“ (الأحزاب 33:40)

اس باب میں

نابود ہو جانے والے عربوں (عرب بائدہ) اور ان میں مبعوث ہونے والے انبیائے کرام حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کی دعوتِ توحید اور اس دعوت کی مخالف قوموں کی تباہی کا تذکرہ ہے، وہیں عرب عاربہ، یعنی آلِ قحطان، ان کے مختلف قبائل اور عرب میں ان کے دور تک پھیلنے کی تفصیل دی گئی ہے۔ پھر تیسرے طبقے عرب مستعربہ کے ذیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عراق سے فلسطین کی طرف ہجرت، ان کی اہلیہ اور فرزندِ ارجمند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے وادی غیر ذی زرع (مکہ) میں بسنے اور پھر ان کی اولاد و احفاد سے مختلف قبائل کے جزیرہ نما میں پھیلنے کی تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ آخر میں لوط اور شعیب علیہما السلام کی نافرمان قوموں کی ہلاکت کے عبرت انگیز اور سبق آموز واقعات بیان کیے گئے ہیں۔




اقوامِ عرب کے تین طبقے

اکثر مؤرخین نے جزیرہ نمائے عرب میں بسنے والی اقوام کی تین قسمیں بتائی ہیں: عرب بائدہ، عرب عاربہ اور عرب مستعربہ۔ [1] علامہ ابن خلدون نے عرب اقوام کو ابتدا سے لے کر اپنے زمانے تک چار طبقوں میں تقسیم کیا ہے: عرب عاربہ، عرب مستعربہ، العرب التابعة للعرب اور عرب مستعجمہ۔ [2]

ان سب کے برعکس حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے عرب اقوام کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: عرب عاربہ اور عرب مستعربہ۔ انھوں نے عرب بائدہ ہی کو اصل عرب (عرب عاربہ) قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قدیم ترین باشندوں میں سے کچھ قبائل، مثلاً: عاد، ثمود، طسم، جدیس، عمالقہ، اُمیم، جرہم اور قحطان وغیرہ اپنا الگ وجود کھو بیٹھے، ان کی نسلیں دوسرے قبائل میں خلط ملط ہوگئیں اور نئے قبائلی ناموں سے ان کا سلسلہ آگے چلا۔ ان کے نزدیک عربوں کی دوسری قسم مستعربہ ہے جس میں بنو اسماعیل شامل ہیں۔ [3]

تاہم زیادہ تر مؤرخین اور سیرت نگاروں نے اسلام سے پہلے کے عربوں کو تین طبقوں، یعنی عرب بائدہ، عاربہ اور مستعربہ میں تقسیم کیا ہے۔ [4]

---

[1] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 294/1. [2] تاريخ ابن خلدون: 2/20-23. [3] البداية والنهاية: 145/2.
[4] تاريخ قريش للدكتور حسين مؤنس، ص: 18.

1

عرب بائدہ

یہ قدیم عرب اقوام ہیں جو بالکل ناپید ہوگئیں لیکن ان کے نام اور کچھ حالات نسل در نسل منتقل ہوتے رہے اور بعثت نبوی کے وقت بھی یہ نام لوگوں میں معروف تھے۔ قرآن حکیم میں عبرت اور نصیحت کے لیے عرب میں بسنے والی متعدد سابقہ امتوں کے حالات و واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان قوموں میں سے اکثر نے اللہ کے پیغمبروں کی دعوت مسترد کردی۔ بہت کم افراد ایسے تھے جنھوں نے پیغمبروں کی دعوت پر لبیک کہا۔ اکثریت نے نہ صرف پیغامِ ہدایت کو رد کیا بلکہ انھیں اور ان کی پیروی کرنے والوں کو شدید اذیتیں دیں۔ انبیاء علیہم السلام پر کذب و افترا، جادوگری، پاگل پن، خودنمائی اور نفع اندوزی کے جھوٹے الزامات لگائے۔ ان نافرمانوں کے سرغنوں نے بعض انبیاء علیہم السلام کو قتل بھی کیا۔ اسی سرکشی کے باعث نافرمان قوموں پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور وہ صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹادی گئیں۔ ان میں سے بعض کے آثار، عبرت کی کہانیاں سنانے کے لیے، باقی رہ گئے۔ ان تباہ شدہ اقوام میں سے قوم عاد، ثمود، عمالقہ، طَسم، جدیس، اُمَیم، یثرب میں مقیم عبیل اور جرہم عربوں میں معروف تھیں۔

سب سے پہلے انھی مٹ جانے والی بعض اقوام کے احوال پیش کیے جائیں گے۔ اس کے بعد عرب عاربہ اور مستعربہ کا ذکر ہوگا۔

[1] قومِ عاد

قوم عاد نوح علیہ السلام کے بعد رُونما ہونے والی سب سے قدیم اور انتہائی طاقتور قوم تھی جسے عرب کی سرزمین پر شان و شوکت اور عظمت حاصل ہوئی۔

عاد کا نسب

ڈاکٹر جواد علی لکھتے ہیں: عاد کا نسب اس طرح بیان کیا جاتا ہے: عاد بن عوض [1] بن ارم بن سام بن نوح (علیہ السلام)۔ قومِ عاد کا قدیم ترین ہونا اہلِ عرب کے ہاں ضرب المثل تھا۔ وہ جب کسی چیز کو انتہائی قدیم قرار دینا چاہتے تو اسے عاد سے منسوب کر دیتے اور کہتے تھے: إِنَّهُ عَادِيٌّ (بے شک یہ چیز عاد کے زمانے کی ہے۔) کوئی سال خوردہ عمارت نظر آتی اور اس کے مالک کا علم نہ ہوتا تو کہتے: إِنَّهُ بِنَاءٌ عَادِيٌّ (یقیناً یہ قومِ عاد کی عمارت ہے۔) [2]

قرآن کریم میں بھی قومِ نوح، عاد اور ثمود کا تذکرہ قدیم اقوام کے طور پر کیا گیا ہے:

﴿ أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۛ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ ﴾

”کیا تمھارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے، یعنی قومِ نوح کی اور عاد اور ثمود کی اور ان لوگوں کی جو ان کے بعد تھے۔“ [3]

عاد کا زمانہ

سورۂ اعراف میں عاد کو قومِ نوح کا جانشین کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کے بعد سرزمینِ شام و عرب کی دوبارہ آبادی اور بنو سام کی ترقی عاد سے شروع ہوتی ہے۔ اس آیت سے نہ صرف زمانے کا کسی حد تک اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ سامیہ اولیٰ اور عاد ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ اسی لیے

---

[1] بائبل میں عاد کا نام عوض (Uz) آیا ہے۔ سید سلیمان ندوی کی رائے یہ ہے: عربوں کو عاد بن ارم سے واقفیت تھی۔ یہود نے عوض بن ارم کہا تو عربوں نے دونوں ناموں کو جوڑ کر عاد بن عوض بن ارم کہہ دیا، حالانکہ ”عاد“ اور ”عوض“ ایک ہی نام ہے۔ (تاریخ ارض القرآن (کامل): 106/1) [2] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام:1/309,308. [3] إبرٰهيم 9:14.


قوم عاد کے مساکن
(1) شام یا آرام (عاد اولیٰ یا عاد وارم)
(2) احقاف یمن (عاد ثانیہ یا قوم ہود)
کلومیٹر
1000
800
600
400
200
100
0
سعودی عرب
نجد
حجاز
یمن
عسیر
الاحساء
احقاف
حضرموت
عمان
عراق
اردن
مدین
فارس (ایران)
خلیج فارس (خلیج العربی)
بحیرۂ قلزم (احمر)
بحیرۂ عرب
مکہ مکرمہ
مدینہ منورہ
سوڈان
حبش

قرآن کریم نے انھیں عاد اولیٰ کہا ہے۔ قرائن سے ان کا زمانہ 3000 ق م سے کچھ پہلے کا بنتا ہے۔

آج کل کے مؤرخین عموماً یہ کہتے ہیں کہ بنوسام کی معلوم ترقی کا عہد 2200 ق م تا 2000 ق م تھا اور سامی اقوام کے بابل اور مصر پر حملہ کرنے کی تاریخ بھی یہی ہے۔ اپنے عروج کا زمانہ گزارنے کے بعد یہ لوگ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے پہلے ہی تباہ ہو گئے۔ قرآن کریم کے بیان سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر در پردہ ایمان لانے والا ایک اہم شخص فرعون کے دربار میں کہتا ہے:

﴿ يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ مِّثْلَ يَوْمِ الْاَحْزَابِ ۝ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ﴾ (المؤمن 40:30، 31)

''اے میری قوم! بلاشبہ مجھے تمھاری نسبت دوسرے گروہوں (سابقہ امتوں) جیسے دن (کے عذاب) کا ڈر ہے، جیسے قومِ نوح کا حال (ہوا) اور عاد اور ثمود اور ان لوگوں کا جو ان کے بعد ہوئے۔''[1]

عاد اولیٰ اور عاد ثانیہ

مسلمان مؤرخین نے قوم عاد کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے: عاد اولیٰ اور عاد ثانیہ۔ قوم عاد کی یہ تقسیم سورۂ نجم سے لی گئی ہے۔ اللہ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا ِۨالْاُوْلٰى ۝ ﴾ ''اور یہ کہ بے شک اسی نے عاد اولیٰ کو ہلاک کیا۔''[2]

عاد اولیٰ یا قدیم قوم عاد اپنے کفر و شرک کی بنا پر جب عذاب میں مبتلا ہوئی تو کچھ لوگ باقی بچے جو اہل ایمان تھے۔ وہ عذاب زدہ علاقے سے نکل کر دور ایسی جگہ آباد ہو گئے جو کسی حد تک ان کے ابتدائی وطن سے ملتی جلتی تھی۔ انھوں نے بھی عروج پایا، پھر سابقہ اقوام کی طرح کفر اور بے راہ روی کا شکار ہو کر تباہ ہو گئے۔ عاد ثانیہ کی اس نسل کا ذکر ان کے وطن کے حوالے سے کیا گیا جیسا کہ بعد کے صفحات میں واضح ہوگا۔

قدیم اور جدید مفسرین اور مؤرخین نے قرآن مجید کی اصطلاح ''عاد اولیٰ'' کو سامنے رکھتے ہوئے عادِ ثانیہ کا تذکرہ کیا اور اپنی اپنی رائے کے مطابق ان کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ انھیں تاریخ میں عاد اخریٰ یا عاد ثانیہ کے نام سے یاد کیا گیا۔[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عاد ارم سے مراد عاد اولیٰ ہے۔[4] علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے عاد ارم کو قوم ہود قرار دیا ہے اور مسعودی رحمہ اللہ نے عاد ارم کو عاد ثانیہ لکھا ہے۔[5]

---

[1] تاریخ ارض القرآن (کامل): 1/106، 107. [2] النجم 53:50. [3] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 1/301. [4] دیکھیے: البداية والنهاية: 1/117. [5] تفسير البيضاوي، الفجر 89:7، مروج الذهب: 2/44.

سید طنطاوی کہتے ہیں: عاد اولیٰ سے مراد قوم ہود اور عاد ثانیہ سے مراد قوم ثمود ہے اور ان دونوں کے درمیان تقریباً ایک سو سال کا فرق ہے۔[1] عبدالرحمٰن بن ناصر سعدی رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے کہ عاد ثانیہ سے مراد قوم ثمود ہے۔[2]

کیا عادِ اولیٰ ہی عادِ ارم ہیں؟

عہد جدید کے اکتشافات، کتبات، غیر عرب لیکن ہم عصر مؤرخین کے بیانات اور مختلف تہذیبوں اور قوموں کی تاریخ کے تفصیلی مطالعے کی روشنی میں وہی رائے صحیح لگتی ہے جو ابن کثیر رحمہ اللہ اور ابن خلدون نے اختیار کی کہ عاد اولیٰ اور عاد ارم ایک ہیں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ طوفان نوح کے بعد سام بن نوح (علیہ السلام) کی اولاد اسی علاقے میں آباد ہوئی جو طوفان عظیم کی سرزمین، یعنی وادیِ دجلہ وفرات، سے متصل تھا اور عراق سے لے کر شام و فلسطین اور شمالی عرب تک پھیلا ہوا تھا۔ تاریخی شواہد اسی کی تائید کرتے ہیں۔

علمائے انساب نے عاد (یا عوض) کو ارم بن سام بن نوح (علیہ السلام) کی اولاد بتایا ہے، چنانچہ اس حوالے سے عاد اولیٰ وہی ہیں جو اِرم بن سام (Shem) بن نوح (علیہ السلام) کی قریب ترین نسل ہیں۔ سام کی نسبت سے ملک سُوریہ (Syria) کو شام کہا گیا۔ یاقوت حموی لکھتے ہیں: ''مؤرخین کے مطابق یہ نام (شام) نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کے نام پر ہے۔''[3]

شام کا ایک اور قدیم نام ''اِرم'' یا ''ارام'' یا ''آرام'' (Aram) بھی ہے جو سام بن نوح (علیہ السلام) کے بیٹے ارم کے نام پر ہے۔ وہ خود اور اس کے بعد اس کی اولاد اسی جگہ آباد رہے۔ اردو بائبل کے عہد نامہ قدیم میں جہاں جہاں لفظ ''ارام'' آیا ہے، اس کی جگہ انگلش بائبل میں Syria (سیریا) لکھا ہے۔ گویا عہدِ قدیم سے آرام یا سیریا ایک ہی علاقے کو کہا جاتا تھا۔

قرین قیاس یہی ہے کہ ارامی سامی خاندان جن جن مقامات میں پھیلے، ان علاقوں کا نام ''ارم'' یا ''ارام'' ہو گیا، چنانچہ تورات کی زبان میں میسوپوٹیمیا (مابین النہرین) یا عراق کا نام ''ارم نہرائم'' یا ''پدان ارام'' (عربی میں ''فدان آرام'') بتایا گیا ہے۔ شام کو ''ارام'' کے علاوہ ''ارام دمشق'' بھی کہا گیا ہے۔ سارے شمالی عرب کو بھی ''ارام'' سے موسوم کیا گیا ہے۔[4]

[1] تفسیر الوسیط لمحمد سید طنطاوي، الأعراف 65:7. [2] تیسیر اللطیف المنان في خلاصة تفسیر القرآن، قصة صالح علیہ السلام 347/1:. [3] معجم البلدان، مادة: شأم. [4] ملاحظہ فرمائیں: کتاب مقدس (پیدائش) 23,22:10 و 15:46، (سلاطین-1) 31-1:22,43-1:20

ایک اور قوی شہادت یہ بھی ہے کہ بابل (عراق)، اشور (الجزیرہ)، شام، کنعان (فلسطین)، فنیقیہ (لبنان) اور شمالی عرب میں جو قدیم کتبات پائے گئے ہیں، ان میں سے اکثر کی زبان آرامی ہے یا ان میں آرامی الفاظ کثرت سے موجود ہیں۔ [1]

عرب جغرافیہ دانوں کے بیانات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ یاقوت حموی لکھتے ہیں: ''حِسْمٰی اِرم نامی پہاڑ جبال طے کے پاس واقع ہے۔ اس کی بلندی پر عاد و اِرم کے مساکن ہیں جہاں پتھروں میں تصویریں کھدی ہیں۔'' [2] یہاں یاقوت رحمہ اللہ نے عاد اور ارم کا ذکر کیا ہے لیکن صحیح تر بات یہ ہے کہ عاد اور ارم کے الفاظ کے درمیان واؤ کا اضافہ کسی کاتب کا سہو ہے۔ جاہلی شعراء طرفہ وائلی، نابغہ، [3] زہیر بن ابی سلمٰی مزنی مضری، شعرائے ہذلیین، طفیل بن عوف غنوی، متمم بن نویرہ، اس کے بھائی مالک بن نویرہ اور امیہ بن ابی صلت کے اشعار میں بھی مساکنِ عاد کا ذکر انھی مقامات کے حوالے سے ہوا ہے جو عرب کے شمالی حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ 1932ء میں اردن کے محکمہ آثار قدیمہ کے زیر اہتمام ہارس فیلڈ نے ''جبل رم'' کے مقام پر کھدائی کی جو عقبہ سے 25 میل مشرق میں واقع ہے۔ ہارس فیلڈ، سافیناک (Savignac) اور ایچ ڈبلیو گلیڈن نے یہاں سے نکلنے والے کتبات کو پڑھ کر جو رائے دی ہے، اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہی علاقہ ارم ہے جس

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا۔ [2] معجم البلدان، مادة: حِسْمٰی۔ [3] ابن اثیر رحمہ اللہ نے اسے نابغہ جَعْدی لکھا ہے۔ ابن سعد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''نابغہ'' قبیلۂ عدی بن نجار میں سے تھا۔ شعراء کی ایک جماعت کا لقب بھی ''نابغہ'' ہے۔ (الطبقات لابن سعد: 99/1، تاریخ الطبري: 8/2، الکامل لابن الأثیر: 548/1)



جبل رَم (اردن)

کا ذکر قرآن میں عاد کے حوالے سے آیا ہے۔[1]

ڈاکٹر جواد علی مزید لکھتے ہیں: ''بطلیموس نے جن عاد (Oaditae) کا ذکر کیا ہے، وہی عاد ہیں جو جزیرہ نمائے عرب کے شمال مغربی علاقے (بالائی حجاز) میں حِسمَی کے آس پاس رہتے تھے۔ معروف ماہر آثار قدیمہ موریتس کا کہنا بھی یہی ہے کہ بطلیموس کے جغرافیے میں آراموا (Aramaua) نامی جس مقام کا ذکر ہوا ہے، وہ ارم یا ارم ذات العماد ہے جسے ان دنوں ''رم'' کہا جاتا ہے۔[2]



باب جیرون۔ دمشق

ابن خلدون، مسعودی اور بعض دیگر عرب مؤرخین نے یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ دمشق ہی ''ارم'' یا ''ارم ذات العماد'' ہے کیونکہ دمشق آرامیوں کا اہم ترین مرکز تھا۔ مسعودی کے مطابق یہ شہر جیرون بن سعد بن عاد نے تعمیر کیا تھا اور اس کا نام ارم رکھا تھا۔ اس جیرون کے نام پر دمشق کا ایک دروازہ اب بھی باب جیرون کہلاتا ہے۔[3]

ابلائی تہذیب



ابلا (شام) کے کھنڈروں سے ملنے والی تختی

1964-75ء کے دوران میں اطالوی ماہرین آثار قدیمہ نے شام کے شہر تل مردیخ کے پاس کھدائی کی تو قدیم شہر ''عبیل'' یا ''ابلا'' (Ebla) کے کھنڈر دریافت ہوئے جس کا ذکر مصری اور اکادی کتبوں میں آیا ہے۔ ان کھنڈروں سے 15 ہزار کے قریب تختیاں برآمد ہوئیں جن پر میخی رسم الخط میں سامی بولی ''ابلائی'' (Eblaite) کی تحریریں پائی گئیں۔ ان ابلائی تختیوں پر آدم، حوا، ابراما (ابراہیم)، اشائیل (اسماعیل)، اسورائیل، میکائیل یا ''میکایا''، عیسو، ساؤل (طالوت)، ڈیوڈ (داود) علیہم السلام، سینائی، یروسلوم (بیت المقدس)، جوپا (یافا)، اُور، سدوم اور عامورہ (Gomorrah) کے نام پائے گئے۔ ابلا کے حکمران مالیکوم یا مَلِکوم (بادشاہ) کہلاتے تھے۔ ایک بادشاہ کا نام ''ابریئم'' تھا۔ ابلائی زبان کے بہت سے مشترک الفاظ عربی زبان میں آج بھی زندہ ہیں، مثلاً: کتب، ملک، ید، قَمْح (گندم)، جزر (گاجر)، تین (انجیر)،

[1] المفصّل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 307,306/1. [2] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 305/1. [3] تاريخ ابن خلدون: 25/2.



شام کے قدیم شہر ابلا کے کھنڈر

مائۃ (عدد 100)۔ ان تختیوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر حلب ان دنوں ارمی (Armi) کہلاتا تھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حلب بھی اس علاقے میں واقع دیگر آرامی شہروں کی طرح عاد ارم ہی کا ایک شہر ہے۔

ابلائی (عبیلائی) معاشرہ 2500 ق م میں پروان چڑھا تھا، پھر اس قوم کو تباہی نے آلیا۔ دوسری بار انھوں نے 1850 ق م تا 1600 ق م عروج حاصل کیا۔ 1750 ق م میں حمورابی نے اور پھر حتّی بادشاہ مرسیلی اول نے انھیں تباہ و برباد کر دیا۔[1]

عاد ارم کی باقیات

ان شواہد کی روشنی میں قرین قیاس یہی ہے کہ عاد ارم سے مراد وہی قدیم قوم (ارم بن سام کی اولاد) ہے جسے سورۂ فجر (7,6:89) میں عاد ارم اور سورۂ نجم (50:53) میں عاد اولیٰ کہا گیا ہے۔ اسی ارم کی اولاد میں سے ایک شاخ ثمود نے عاد ارم کے اصل وطن سے ذرا ہٹ کر کسی قدر جنوب (اَلحِجر، شمالی عرب) میں اپنا ٹھکانا بنایا اور بہت عروج حاصل کیا اور پھر تباہی کا شکار ہو گئے۔ باقی آرامیوں (Aramaeans) کا ایک حصہ شام کے علاقوں ہی میں آباد رہا۔ آرامی کے نام سے انھیں پھر سے تیرہویں صدی قبل مسیح میں عروج حاصل ہوا۔ ان کی زبان آرامی دیگر سامی زبانوں میں بڑا اہم مقام رکھتی تھی۔[2]

انھی کا کچھ حصہ جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی زرخیز علاقوں کی طرف چلا گیا اور وہاں قابض ہو کر ایک بار پھر عروج حاصل کیا۔ تفصیل عاد ثانیہ کے تحت آگے آئے گی۔

شدّاد کا باغِ ارم؟

بعض مفسرین نے ''ارم'' سے ایک عجیب الخلقت باغ مراد لیا ہے جو شداد نے جنت کے مقابلے میں تیار کرایا

1 أطلس التاريخ العربي الإسلامي، ص: 9، وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا۔ 2 أطلس القرآن (اردو)، ص: 57.

تھا۔[1] اس نے اس شہر کا نام ''ارم'' رکھا تھا۔[2] یاقوت حموی نے شداد کی ''جنت'' (باغ ارم) کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس کی جائے وقوع یمن میں حضر موت اور صنعاء کے مابین بتائی ہے۔[3]

اس سے ثابت ہوا کہ بعض مؤرخین اور جغرافیہ دان اگرچہ عادِ اولیٰ اور عادِ ثانیہ کے علاقوں کا صحیح طور پر تعین نہیں کر پائے لیکن ان کے ہاں قوم عاد کے مساکن کے حوالے سے دونوں طرح کی روایات موجود تھیں۔ ایک یہ کہ عاد کا علاقہ شام اور جزیرہ نمائے عرب کا شمالی علاقہ ہے۔ دوسری یہ کہ وہ جنوبی عرب کے باشندے تھے۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان دونوں علاقوں میں اپنے اپنے عہد میں قومِ عاد نے عروج حاصل کیا، پھر اپنی بداعتقادی اور برے اعمال کی بنا پر عذاب کا شکار ہوئے۔

عادِ ثانیہ کا علاقہ

قرآن مجید کے مطابق قوم عاد کے رسول نے ان کو احقاف میں ان کے برے اعمال کے نتائج سے ڈرایا اور سیدھے راستے پر آنے کی تلقین کی۔ موجودہ دور میں احقاف جزیرہ نمائے عرب کے نقشے میں الربع الخالی اور حضر موت کے درمیان دکھایا جاتا ہے۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ عاد، عرب کے ان تمام حصوں پر جو اس زمانے میں بہترین تھے، قابض ہوئے۔ ان کے علاقے حجاز کے شمال سے لے کر حضر موت اور یمن تک پھیلے ہوئے تھے۔ فرمان الٰہی: ﴿وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ ۖ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ﴾ ''اور عاد کے بھائی (ہود) کو یاد کیجیے جب اس نے احقاف میں اپنی قوم کو ڈرایا''[4] سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد کا مرکزی مسکن احقاف تھا۔

احقاف سے کون سا علاقہ مراد ہو سکتا ہے؟

اگرچہ اکثر مفسرین اور مؤرخین احقاف کی جائے وقوع جنوبی عرب ہی میں بتاتے ہیں مگر اس ضمن میں دیگر اقوال بھی ہیں: مجاہد رحمہ اللہ کی روایت ہے کہ ﴿إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ﴾ میں احقاف سے مراد حِسمٰی کے علاقے میں حشاف (میدانی زمین میں نرم چٹانیں) ہیں۔[5] یاقوت حموی نے جہاں ابن اسحاق کے حوالے سے احقاف کو عُمان اور حضر موت کے درمیان اور قتادہ کی روایت میں شحر (جنوبی یمن کے ساحلی شہر) کے پاس بتایا ہے، وہیں ضحاک کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ احقاف شام کے ایک پہاڑ کا نام ہے۔[6]

---

[1] آثار البلاد وأخبار العباد، ص: 16,15. [2] تاریخ ابن خلدون، المقدمة: 14/1. [3] معجم البلدان، مادة: إرم. [4] الأحقاف 21:46. [5] تفسير القرطبي، الأحقاف 21:46. [6] معجم البلدان، مادة: الأحقاف.

اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں: ''احقاف ریگستان کو کہتے ہیں۔ یہ صحرا جنوبی اور شمالی عرب میں دونوں طرف واقع ہے۔ اس بنا پر پیغمبرِ عاد کے مقامِ بعثت کی جنوبی صحرا (یمن) کے ساتھ تخصیص کا کوئی سبب نہیں۔''[1]

جس طرح جنوبی صحرا الربع الخالی میں ریت کے ٹیلے (احقاف) ہیں، اس طرح کے ٹیلے شمالی صحرا (نفود اور بادیۂ شام) میں بھی پائے جاتے ہیں۔

دراصل احقاف سے صرف ریگستان یا محض ریت کے ٹیلے مراد نہیں لیے جا سکتے بلکہ احقاف سے مراد ریت کے وہ مخصوص ٹیلے ہیں جو لمبے اور مڑے ہوئے ہوں۔ لسان العرب میں ہے:

اَلْحِقْفُ مِنَ الرَّمْلِ: اَلْمُعْوَجُّ ...... وَقَدِ احْقَوْقَفَ الرَّمْلُ إِذَا طَالَ وَاعْوَجَّ.

''احقاف ریت کے ان ٹیلوں کو کہتے ہیں جو بہت لمبے ہوں اور مڑے ہوئے ہوں۔''[2]

ماوردی اپنی تفسیر میں واضح کرتے ہیں:

اَلْأَحْقَافُ: وَهِيَ جَمْعُ حِقْفٍ، وَهُوَ مَا اسْتَطَالَ وَاعْوَجَّ مِنَ الرَّمْلِ الْعَظِيمِ، وَلَا يَبْلُغُ أَنْ يَكُونَ جَبَلًا.

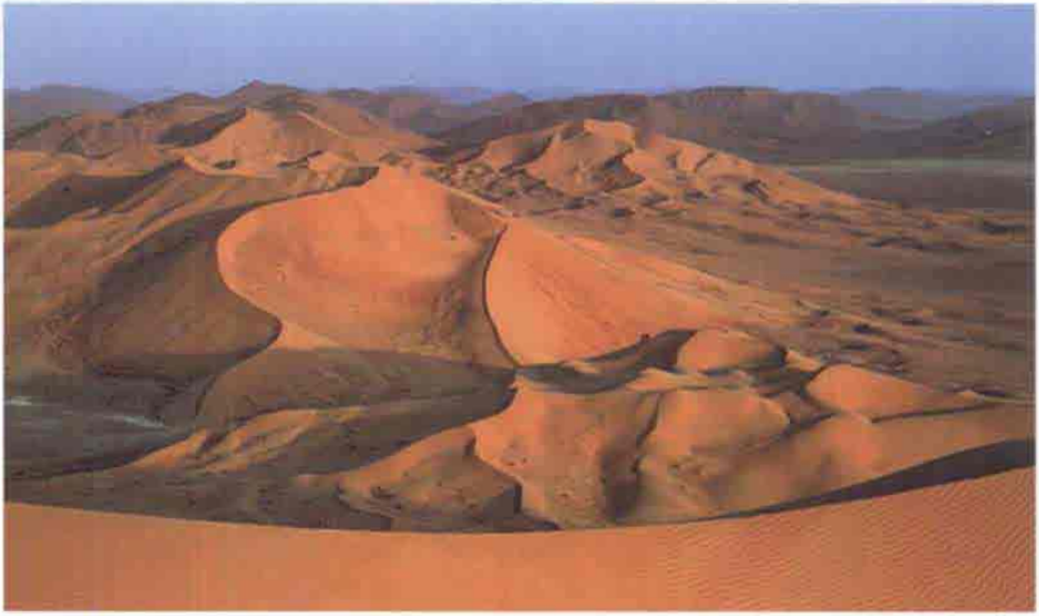
''احقاف حقف کی جمع ہے اور اس سے مراد ریت کا وہ عظیم ٹیلا ہے جو بہت لمبا اور مڑا ہوا ہو مگر وہ پہاڑ کے درجے تک نہ پہنچا ہو۔''[3]

اس طرح کے لمبے اور مڑے ہوئے ریتلے ٹیلے الربع الخالی کے جنوبی کنارے کے سوا پورے جزیرہ نمائے عرب، شام اور عراق وغیرہ میں کہیں نہیں پائے جاتے۔ آج بھی جنوبی عرب کا علاقہ ہی الاحقاف کے نام سے معروف ہے۔ یہ عجیب وغریب ٹیلے یمن و سعودی عرب سرحد کے دونوں طرف، سعودی عرب و عُمان سرحد کے دونوں طرف اور عرب امارات میں مغرب سے مشرق کی طرف جاتی ہوئی ایک پٹی کی شکل میں موجود ہیں۔ اس پٹی کی لمبائی تقریباً 1200 کلومیٹر بنتی ہے۔ اس کی چوڑائی 50 کلومیٹر سے لے کر 300 کلومیٹر تک ہے۔ یہ ٹیلے یمن میں صنعاء سے تقریباً 150 کلومیٹر کے فاصلے سے شروع ہوتے ہیں، پھر عُمان اور سعودی عرب کی سرحد کے دونوں طرف پھیلتے ہوئے متحدہ عرب امارات میں خلیج فارس پر واقع شہر العین سے تقریباً 100 کلومیٹر پہلے ختم ہوتے ہیں۔ احقاف کی اس پٹی میں سے 150 کلومیٹر حصہ یمن میں واقع ہے۔ 600 کلومیٹر یمن اور سعودی عرب کی مشترکہ سرحد کے دونوں طرف، 200 کلومیٹر سعودی عرب اور عمان کی سرحد کے دونوں طرف، آگے 300 کلومیٹر سعودی عرب میں اور

[1] تاریخ ارض القرآن (کامل): 134/1. [2] لسان العرب، مادة: حقف. [3] تفسیر الماوردي، الأحقاف 21:46.

آخری 50 کلومیٹر کا حصہ عرب امارات میں واقع ہے۔

ان میں سے ہر لمبے ٹیلے کی چوڑائی ایک آدھ کلومیٹر ہے جبکہ اونچائی 50 تا 150 میٹر ہے۔ ان مڑے ہوئے لمبے ٹیلوں میں سے بعض کی لمبائی بغیر کسی انقطاع کے سیکڑوں کلومیٹر تک ہے۔ مندرجہ ذیل تصویروں سے اوپر بیان کی گئی ساری تفصیلات بالکل واضح ہوجاتی ہیں:



الاحقاف (الربع الخالی) کے لمبے مڑے ہوئے ٹیلے

یہ بات واضح رہے کہ تصویروں میں یہ لمبے مڑے ہوئے ٹیلے چاہے دیکھنے والوں کو سخت چٹانوں سے بنے ہوئے معلوم ہوں، حقیقت میں یہ سب کے سب انتہائی نرم ریت سے بنے ہوئے ہیں اور حیرت ناک بات ہے کہ یہ ٹیلے اپنی بناوٹ اور اپنے اندر کے کیمیائی مادوں کی وجہ سے شدید آندھیوں کے باوجود اپنی شکل برقرار رکھتے ہیں۔ آج تک جزیرہ نمائے عرب کے اسی حصے کا نام الاحقاف ہے۔

ماہرین طبقات الارض (Geologists) واضح کرتے ہیں کہ الاحقاف میں زیر زمین پانی کی ایک بہت بڑی مقدار موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یمن اور عُمان کے پہاڑی سلسلوں میں بحیرۂ عرب سے آنے والی مون سون ہوائیں جو بارش برساتی ہیں، اس کا پانی رحوت اور اعرابہ جیسی معروف وادیوں کے ذریعے الربع الخالی کے لمبے مڑے ہوئے ٹیلوں والے اسی جنوبی حصے میں گم ہو جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں زیر زمین چلا جاتا ہے۔ ان اونچے اونچے ٹیلوں



الربع الخالی میں پانی کا وجود

کے درمیان، نشیبی علاقے میں، جہاں پانی سطح زمین کے قریب ہے یا چشموں کی شکل میں ملتا ہے، صدیوں سے انسان آباد ہیں، وہاں کے لوگ زراعت پیشہ ہیں۔ ان علاقوں میں سرسبز نخلستان اور جانوروں کے ریوڑ پائے جاتے ہیں۔

اب قرآن مجید کی ان آیات پر غور کریں جن میں سیدنا ہود علیہ السلام کی زبانی قوم عاد کو مخاطب کیا گیا ہے۔ ان میں بعینہ وہی نقشہ دکھایا گیا ہے جو اب سائنس دانوں کے ایجاد کردہ خلائی کیمروں کی مدد سے Google Earth ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ یہاں قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات کا مطالعہ مفید ہوگا:

﴿ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۝ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ ﴾

''کیا تم ہر اونچی جگہ پر بطور کھیل تماشا یادگاریں بناتے ہو؟ اور تم مضبوط محل بناتے ہو، شاید تم ہمیشہ (یہیں) رہو گے۔ اور جب تم (کسی پر) ہاتھ ڈالتے ہو تو سرکش بن کر ہی ہاتھ ڈالتے ہو۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اور تم اس ذات سے ڈرو جس نے تمھیں ان چیزوں میں بڑھایا (امداد دی) ہے جو تم جانتے ہو۔ اس نے تمھیں بڑھایا ہے مویشیوں اور بیٹوں میں۔ اور باغوں اور چشموں میں۔''[1]

﴿ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۚ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ...... ﴾

''پھر جب انھوں نے اس (عذاب) کو دیکھا کہ ان کی وادیوں کے سامنے ایک بادل چلا آ رہا ہے (تو) وہ

[1] الشعرآء 26:128-134.

کہنے لگے: یہ بادل ہم پر بارش برسانے والا ہے (ہود علیہ السلام نے کہا: نہیں!) بلکہ یہ تو وہ عذاب ہے جسے تم جلدی طلب کرتے تھے۔ (یہ) آندھی ہے، اس میں نہایت دردناک عذاب ہے۔ وہ اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر دے گی، پھر وہ ایسے ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوا وہاں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا......۔" [1]

سورۃ الحاقہ میں صحرائی علاقوں میں صرصر (تند و تیز اور یخ ٹھنڈی ہوا) کے عذاب کا پورا منظر بتایا گیا اور واضح کیا گیا کہ آخر کار ان کا نام و نشان تک مٹ گیا:

﴿ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝ ﴾

"اور جو عاد تھے تو وہ یخ تند و تیز بے قابو آندھی سے ہلاک ہوئے۔ اللہ نے اسے ان پر سات راتیں اور آٹھ دن جڑ کاٹنے (فنا کرنے) کے لیے مسلط رکھا، پھر تم اس قوم کو پچھاڑے (ہلاک کیے) ہوئے دیکھتے ہو گویا وہ کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں۔ پھر کیا آپ ان کی کوئی باقیات دیکھتے ہیں؟" [2]

﴿ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝ ﴾

"چنانچہ ہم نے ان پر منحوس (ثابت ہونے والے) دنوں میں طوفانی ہوا بھیجی تاکہ ہم انھیں دنیاوی زندگی ہی میں ذلت و رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھائیں اور بلاشبہ آخرت کا عذاب سب سے زیادہ رسوا کن ہے اور ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔" [3]

سیدنا ہود علیہ السلام اور ان کی قوم کے وطن اور دیگر کوائف کے تعین کے لیے قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات کا مطالعہ مفید ہوگا:

﴿ وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَاۗءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۭ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاۗءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

[1] الأحقاف 46:24،25۔ [2] الحآقّة 69:6-8۔ [3] حٰم السجدة 41:16۔

’’اور ہم نے قومِ عاد کی طرف ان کے بھائی ہود (علیہ السلام) کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارے لیے کوئی معبود نہیں، کیا پھر تم ڈرتے نہیں؟ اس کی قوم میں سے کافر وڈیرے کہنے لگے: بے شک ہم تجھے بے وقوفی میں پڑا دیکھتے ہیں اور بے شک ہم تجھے جھوٹوں میں شمار کرتے ہیں۔ ہود (علیہ السلام) نے کہا: اے میری قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں بلکہ میں تو سب جہانوں کے رب کی طرف سے رسول ہوں۔ میں اپنے رب کے پیغامات تمھیں پہنچاتا ہوں اور میں تمھارا خیرخواہ اور امین ہوں۔ کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس ایک ایسے آدمی کے ذریعے سے نصیحت آئی ہے جو تمھی میں سے ہے تاکہ وہ تمھیں ڈرائے؟ اور یاد کرو! جب اس نے قومِ نوح کے بعد تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور تمھیں قد و قامت میں بڑھوتری دی، لہٰذا تم اللہ کی نعمتیں (احسانات) یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔‘‘[1]

﴿كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝﴾

’’(قوم) عاد نے رسولوں کو جھٹلایا۔ جب ان سے ان کے بھائی ہود نے کہا: کیا تم (اللہ تعالیٰ سے) ڈرتے نہیں؟‘‘[2]

﴿وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝﴾

’’اور عاد کے بھائی (ہود) کو یاد کیجیے جب اس نے احقاف (یمن) میں اپنی قوم کو ڈرایا اور یقیناً اس سے پہلے بھی کئی ڈرانے والے گزر چکے اور اس کے بعد بھی، کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بلاشبہ میں تم پر ایک عظیم دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔‘‘[3]

﴿وَتِلْكَ عَادٌ ۣ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝﴾

’’اور (دیکھو) یہ عاد تھے، انھوں نے اپنے رب کی آیتوں کا انکار کیا تھا اور اللہ کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر سرکش اور (حق سے) عناد رکھنے والے کا کہا مانا۔‘‘[4]

اہم نکات

ان آیاتِ مبارکہ سے چند باتیں واضح ہوتی ہیں:

[1] الأعراف 7:65-69. [2] الشعرآء 26:123، 124. [3] الأحقاف 46:21. [4] ہود 11:59.

1 عاد ایک ایسی قوم تھی جسے بار بار عروج حاصل ہوا۔ جب عاد کی ابتدائی نسلوں کو عروج حاصل ہوا، اس وقت بھی وہ فساد کا شکار ہوئے اور اللہ نے انھیں ہلاک کر دیا۔

2 جب حضرت ہود علیہ السلام کو عاد کی طرف بھیجا گیا تو انھوں نے حق کی دعوت دیتے ہوئے ان کے سامنے انھی کی تاریخ کا حوالہ دیا اور اللہ کی نعمتیں یاد دلائیں کہ کس طرح اللہ نے انھیں زمین پر حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا جانشین بنایا تھا اور ان کی نسل کو وسعت اور تنومندی عطا کی تھی۔ یہ قوم عاد کے عروج کے ابتدائی مرحلے کا تذکرہ ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ ان کی طاقتور نسل کو قد و قامت اور وسعت میں بڑھایا گیا، یعنی وہ دور دور تک پھیل گئے۔

3 یہ بھی قوم عاد کی تاریخ تھی کہ وہ ہمیشہ اللہ کی نعمتوں کے اقرار کے بجائے ان کا انکار کرتے رہے۔ ان کے پاس رسول آئے مگر وہ ان کی نافرمانی اور ان کے بالمقابل سخت قسم کے سرکشوں کی فرمانبرداری کر کے فساد پھیلاتے رہے۔

4 قوم عاد اپنی تاریخ میں پہلے بھی رسولوں کو جھٹلا چکی تھی۔ جب حضرت ہود علیہ السلام نے آ کر انھیں تقویٰ اختیار کرنے کی دعوت دی تو انھوں نے پھر وہی روش اختیار کی۔

5 حضرت ہود علیہ السلام کو عاد کی اس نسل میں مبعوث کیا گیا جو الاحقاف میں قیام پذیر تھی۔

ان آیات کی روشنی میں یہ کہنا درست ہوگا کہ عاد اولیٰ یا عاد ارم شمالی عرب اور شام میں آباد تھے۔[1] عروج حاصل کرنے والی ان کی پہلی نسل اپنے کفر و تمرّد اور سرکشی کے باعث عذاب الٰہی کی لپیٹ میں آ کر نیست و نابود ہوگئی۔ اس کے برعکس عاد ثانیہ یا عاد اخریٰ وہ ہو سکتے ہیں جو جزیرہ نمائے عرب کے اندر یمن میں حضر موت کے قریب الاحقاف میں آباد تھے۔


الاحقاف کے ٹیلوں کے نیچے سے برآمد ہونے والے قوم عاد کے آثار

1 المعارف لابن قتیبة، ص: 14.

مسند احمد (482/3) کی ایک حدیث جس کی سند حسن ہے، اس میں ہے کہ حارث بن حسان بکری کہتے ہیں کہ میں اور علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نکلے..... اس حدیث میں یہ الفاظ ہیں..... میں نے کہا: ''میں اللہ اور اس کے رسول کی پناہ میں آتا ہوں کہ میں عاد کے قاصد کی طرح ہو جاؤں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''عاد کے قاصد کا کیا معاملہ ہے؟'' حالانکہ آپ اس کے متعلق خوب جانتے تھے لیکن آپ لطف کے طور پر اس سے پوچھ رہے تھے۔

حارث بن حسان کہتے ہیں: ''میں نے کہا: بے شک عاد قحط میں مبتلا کر دیے گئے تو انھوں نے قیل بن عنزہ کو مکہ میں معاویہ بن بکر کی طرف بھیجا کہ وہ ان کے لیے بارش طلب کرے، چنانچہ (ان کا قاصد) قیل وہاں ایک مہینہ معاویہ کا مہمان بن کر ٹھہرا رہا۔ دو گانے والیاں اسے گانا سناتی رہتیں۔ جب ایک مہینہ گزر گیا تو وہ نکلا اور بڑا غمگین ہوا اور ان (قوم عاد) کے لیے بارش طلب کی تو چند بادل آئے۔ اس نے ان میں سے سیاہ بادل کا انتخاب کیا تو آواز دی گئی کہ لے لے اسے اس حال میں کہ یہ راکھ ہے جلی ہوئی جو عاد میں سے کسی کو نہیں چھوڑے گی۔''

جامع ترمذی میں بھی یہی روایت مذکور ہے۔ اس سے مزید واضح ہو جاتا ہے کہ یہی لوگ تھے جن پر ﴿الرِّيحَ الْعَقِيمَ﴾ ''نسل کاٹنے والی آندھی'' کا عذاب نازل ہوا تھا۔[1]

اس قوم کا ایک کتبہ 1834ء میں حصن غراب سے ملا تھا۔ یہ مقام عدن کے قریب واقع ہے۔ اس کتبے میں رقم ہے کہ ان کے بادشاہ شریروں کو ہود علیہ السلام کی شریعت کے مطابق سزا دیتے تھے۔ یہی یا اسی طرح کا کتبہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس دور کے علمائے آثار نے پڑھا تھا۔ اس کتبے سے بھی اسی قول کی تائید ہوتی ہے کہ ہود علیہ السلام عاد الاخیرہ کی طرف مبعوث کیے گئے۔ ریورنڈ فارسٹر کے بقول اس کتبے کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اٹھارہ سو برس قبل کا بنتا ہے۔[2] ظاہر ہے حضرت ہود کا زمانہ اس سے پہلے کا ہوگا۔

بہت سے مفسرین اور مؤرخین نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے منقول ایک اثر کا حوالہ دیا ہے کہ ہود علیہ السلام کی قبر حضرموت میں کثیب احمر (سرخ ٹیلے) پر ہے اور ان کے سرہانے جھاؤ کا درخت ہے۔[3] یہ اثر سنداً تو کمزور ہے لیکن بحیرۂ عرب کے ساحل پر واقع شہر المکلا سے تقریباً 200 کلومیٹر شمال کی جانب حضرموت کے ایک مقام پر وہاں کے لوگوں نے حضرت ہود علیہ السلام کی قبر کی موجودگی مشہور کر رکھی ہے۔ ان کے بالمقابل اہل فلسطین بھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت ہود علیہ السلام کی قبر فلسطین میں ہے۔ مقام کے تعین کے بارے میں تو حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اہل حضرموت کا

---

[1] جامع الترمذي: 3273. [2] تاریخ ارض القرآن (کامل): 32/1، Historical Geography of Arabia, P: 90,91 [3] المستدرك للحاكم: 564/2.



حضرموت میں حضرت ہود علیہ السلام سے منسوب قبر



دار عاد (حضرموت)

دعویٰ اہل فلسطین کے دعوے کے مقابلے میں زیادہ قرین صحت ہے کیونکہ حضرت ہود علیہ السلام کے اسی علاقے میں مبعوث ہونے کے قرائن مضبوط تر ہیں۔

حضرموت میں کئی اور ایسے کھنڈر ہیں جنھیں مقامی باشندے آج تک دارِ عاد کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔[1] گویا ہزاروں برس پہلے احقاف میں ایک شاندار تمدن رکھنے والی قوم عاد (عاد ثانیہ) آباد تھی جو تباہ ہوگئی۔1843ء میں بوریا (جرمنی) کا ایک فوجی حضرموت کے پاس اس خطے کے جنوبی کنارے تک پہنچا۔ اس کے بقول حضرموت کی شمالی سطح پر کھڑے ہوکر دیکھا جائے تو یہ صحرا ایک ہزار فٹ نشیب میں نظر آتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ ایسے سفید ریتلے قطعے ہیں جن میں کوئی چیز گر جائے تو وہ ریت میں غرق ہوتی چلی جاتی ہے کیونکہ یہ ریت بالکل باریک سفوف کی طرح ہے۔[2]

ایسا لگتا ہے کہ وہ اسی علاقے میں پہنچا تھا جہاں مساکنِ عاد پر ریحِ عقیم کا طوفان آیا جس طرح کہ قرآن نے کہا ہے:

﴿وَفِيْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ۝ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ۝﴾

”اور عاد (کے قصے) میں (نشانی ہے) جب ہم نے ان پر بے خیر و برکت ہوا بھیجی، وہ جس چیز پر سے بھی گزرتی، اسے گلی سڑی ہڈی کے مانند ریزہ ریزہ کرڈالتی۔“[3]

قوم عاد کا مذہب

قوم عاد اولیٰ ہو یا ثانیہ، بتوں کی پوجا ہی میں لگی رہی۔ عرب مؤرخین نے ذکر کیا ہے کہ ان کے تین بڑے بت

[1] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 305,304/1، البداية والنهاية: 113/1.

[2] Arabia and the Isles, Harold Ingrams, London, 1946.

[3] الذّٰریٰت 42:51.

تھے: صدا، صمود اور ہباء (یا ہراء)۔ یہ پہلی قوم ہے جس کے افراد نے طوفانِ نوح کے بعد بتوں کی عبادت کا آغاز کیا۔ قومِ عاد دنیا کی بہت بڑی کافر، بت پرست اور دیگر بتوں کے ساتھ چاند کی پوجا کرنے والی عرب قوم تھی۔ [1]

حضرت ہود علیہ السلام کی بعثت

قرآن نے عاد اولیٰ کا تذکرہ تو مختصر انداز میں کیا، البتہ جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے میں بسنے والی قوم عاد، اس کے کردار اور پھر اس کے عبرت ناک انجام کو مختلف مقامات پر خاصی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ قرآن کریم واضح کرتا ہے کہ جب یہ قوم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی میں حد سے بڑھ گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف انھی میں سے اپنے پیغمبر ہود علیہ السلام کو بھیجا اور انھوں نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف میں حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

﴿ وَ اِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝﴾

’’اور (اسی طرح) قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ انھوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ کیا تم ڈرتے نہیں؟‘‘ [2]

ہود علیہ السلام کی دعوت اور قوم کا رویہ

جب ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا حکم دیا، اس کے احکام کی تعمیل اور اس سے مغفرت طلب کرنے کی ترغیب دی اور ایمان نہ لانے کی صورت میں دنیا اور آخرت میں سزا کی وعید سنائی تو قوم کے کافر سرداروں نے کہا: ﴿ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ ﴾ ’’بلاشبہ ہم تجھے بے وقوفی میں پڑا دیکھتے ہیں۔‘‘ [3]

گویا ہود علیہ السلام انھیں جس عقیدے کی دعوت دے رہے تھے، ان کے خیال میں وہ حماقت پر مبنی تھا اور بُت پرستی صحیح راستہ تھا۔ انھوں نے ہود علیہ السلام سے یہ بھی کہا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے، آپ کا یہ دعویٰ جھوٹا ہے۔ اس پر ہود علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ یٰقَوْمِ لَیْسَ بِیْ سَفَاهَةٌ وَّ لٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾

’’اے میری قوم! مجھ میں حماقت کی کوئی بات نہیں بلکہ میں رب العالمین کا پیغمبر ہوں۔‘‘ [4]

[1] تاريخ الطبري: 150/1، البداية والنهاية: 113/1. [2] الأعراف 65:7. [3] الأعراف 66:7. [4] الأعراف 67:7.

قوم کا مخالفانہ ردعمل

آپ کی قوم کے لوگوں نے نہ صرف آپ کی نبوت کا انکار کیا بلکہ وہ یوم آخرت کو بھی جھوٹی بات تصور کرتے تھے اور اُن کے نزدیک یہ بات بھی خلافِ عقل اور بعید از قیاس تھی کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو رسول بنا کر مبعوث کرسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے باطل قیاسات اس طرح بیان فرمائے ہیں:

﴿وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ۝ وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَرًا مِثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا لَخَاسِرُونَ ۝ أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَّكُمْ مُخْرَجُونَ ۝﴾

''اور اُن کی قوم کے سردار جو کافر تھے اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے تھے اور دنیا کی زندگی میں ہم نے انھیں آسودگی دے رکھی تھی، کہنے لگے کہ یہ تو تمھارے جیسا آدمی ہے۔ جو کھانا تم کھاتے ہو، اسی طرح کا یہ بھی کھاتا ہے اور جو پانی تم پیتے ہو، اسی قسم کا (پانی) یہ بھی پیتا ہے اور اگر تم نے اپنے ہی جیسے آدمی کا کہا مان لیا تو گھاٹے میں پڑ جاؤ گے۔ کیا وہ تمھیں وعدہ دیتا ہے کہ جب تم مر گئے اور مٹی اور ہڈیاں بن گئے تو تم (زمین سے) نکالے جاؤ گے؟'' [1]

ہود علیہ السلام کا بتوں سے اعلانِ براءت

جب قوم نے دعوتِ حق کو تسلیم نہ کیا تو ہود علیہ السلام نے ان کے معبودانِ باطلہ سے بے زاری اور براءت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ ۝ مِنْ دُونِهِ فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُونِ ۝﴾

''بے شک میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ بے شک میں بری ہوں ان سے جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو اس (اللہ) کے سوا۔ چنانچہ تم سب مل کر میرے بارے میں تدبیر کرلو، پھر تم مجھے مہلت نہ دو۔'' [2]

ہود علیہ السلام کی فریاد اور عذابِ الٰہی

قوم کی ہٹ دھرمی اور دعوتِ حق کو مسلسل جھٹلانے پر حضرت ہود علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے مدد کی درخواست کی تو

[1] المؤمنون 23:33-35. [2] ھود 11:54,55.

قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا:

﴿قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝ قَالَ عَمَّا قَلِيْلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نٰدِمِيْنَ ۝ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنٰهُمْ غُثَآءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

''ہود (علیہ السلام) نے کہا: اے پروردگار! تو میری مدد فرما، اس لیے کہ انھوں نے میری تکذیب کی۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ وہ تھوڑے ہی عرصے میں پشیمان ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر انھیں انصاف کے ساتھ چنگھاڑ نے آ پکڑا تو ہم نے انھیں کوڑا کر ڈالا، پس ظالم لوگوں کے لیے دوری ہو۔'' [1]

جب ان پر عذاب نازل ہونے کا وقت آیا تو وہ خوش ہوئے کہ بارش بھرے بادل ہماری طرف آ رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ اللہ کا عذاب تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝﴾

''پھر جب انھوں نے اس (عذاب) کو دیکھا کہ بادل (کی صورت میں) اُن کی وادیوں کی طرف آ رہا ہے تو کہنے لگے: یہ تو بادل ہے جو ہم پر برس کر رہے گا۔ (نہیں!) بلکہ یہ وہ عذاب ہے جس کے لیے تم جلدی کرتے تھے، یعنی آندھی ہے جس میں دردناک عذاب بھرا ہوا ہے، جو ہر چیز کو اپنے پروردگار کے حکم سے تباہ کر دے گی، پھر وہ ایسے ہو گئے کہ اُن کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ گناہ گار لوگوں کو ہم اسی طرح سزا دیا کرتے ہیں۔'' [2]

ساری مجرم قوم بری طرح تباہ ہوگئی لیکن اللہ تعالیٰ نے ہود علیہ السلام اور آپ پر ایمان لانے والوں کو محفوظ رکھا:

﴿وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝﴾

''اور جب ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا تو ہم نے ہود کو اور جو لوگ اُن کے ساتھ ایمان لائے تھے، انھیں اپنی مہربانی سے بچا لیا اور انھیں عذابِ شدید سے نجات دی۔'' [3]

قرآن مجید کے مطابق عاد پر تند و تیز، یخ بستہ اور نسل کاٹنے والی آندھی کا عذاب مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن مسلط رہا جس نے انھیں تہس نہس کر دیا حتی کہ اُن کے لاشے اس طرح گرے پڑے تھے جیسے کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں۔ [4]

---

[1] المؤمنون 23:39-41. [2] الأحقاف 46:24,25. [3] هود 11:58. [4] الحاقّة 69:7.

2 قومِ ثمود

ثمود عرب کے ایک مشہور اور قدیم قبیلے کا نام ہے۔ ان کے جدِّ امجد ثمود بھی ارم بن سام بن نوح (علیہ السلام) کی اولاد میں سے تھے۔ قومِ ثمود عروج اور خوشحالی کے زمانے میں جب سرکشی اور نافرمانی کی حدیں پار کر گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف اپنے بندے صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا۔ مؤرخین نے مختلف ذرائع سے ان کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے: صالح بن عبید بن اسف بن ماسخ بن عبید بن خادر بن ثمود بن جاثر (عابر) بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام۔ [1]

قومِ ثمود کا زمانہ

یہ قوم بھی عرب بائدہ میں شمار ہوتی ہے۔ تاریخ اس کے زمانے کا ٹھیک ٹھیک تعین کرنے سے قاصر ہے، تاہم آسمانی کتابوں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قومِ ثمود سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بعثت سے پہلے ہلاک ہو چکی تھی۔

قومِ عاد کی طرح ثمود بھی سام بن نوح (علیہ السلام) کی اولاد میں سے تھے، لہٰذا وہ عاد کے سیاسی جانشین بنے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ﴾

''اور یاد کرو جب اس نے تمھیں عاد کے بعد جانشین بنایا۔'' [2]

قومِ ثمود کے مساکن

قومِ ثمود الحجر کے علاقے میں پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے۔ ان کا تذکرہ قرآن نے اس طرح کیا ہے:

﴿وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝ وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ۝﴾

''اور بلاشبہ یقیناً ''حجر'' والوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔ ہم نے انھیں اپنی نشانیاں عطا کیں، پھر وہ ان سے منہ

[1] تاریخ الطبری: 158/1، مزید دیکھیے: البدایة والنھایة: 123/1. [2] الأعراف 74:7.

موڑتے تھے۔ اور وہ بے خوف ہو کر پہاڑوں سے گھر تراشتے تھے۔''[1]

اس سے پتا چلتا ہے کہ ''الحِجر'' قوم ثمود کا مرکزی شہر تھا۔ اس کے کھنڈر مدینہ کے شمال مغرب میں ''العلاء'' سے کچھ فاصلے پر واقع ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تبوک کو تشریف لے جاتے وقت جب الحِجر سے گزرے تو آپ نے اپنی چادر سے اپنا سر مبارک ڈھانپ لیا، اپنی سواری کی رفتار تیز کر دی اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ''ان لوگوں کے گھروں (علاقے) میں داخل نہ ہوا کرو جنھیں عذاب دیا گیا تھا مگر اس حالت میں کہ تم رو رہے ہو اور اگر رونا نہ آئے تو ان میں داخل نہ ہو، کہیں تم بھی اس عذاب کی گرفت میں نہ آ جاؤ جس میں وہ مبتلا ہوئے تھے۔''[2]

قرآن کریم میں دوسری جگہ وادی القریٰ کو ثمود کی جائے سکونت بتایا گیا ہے:

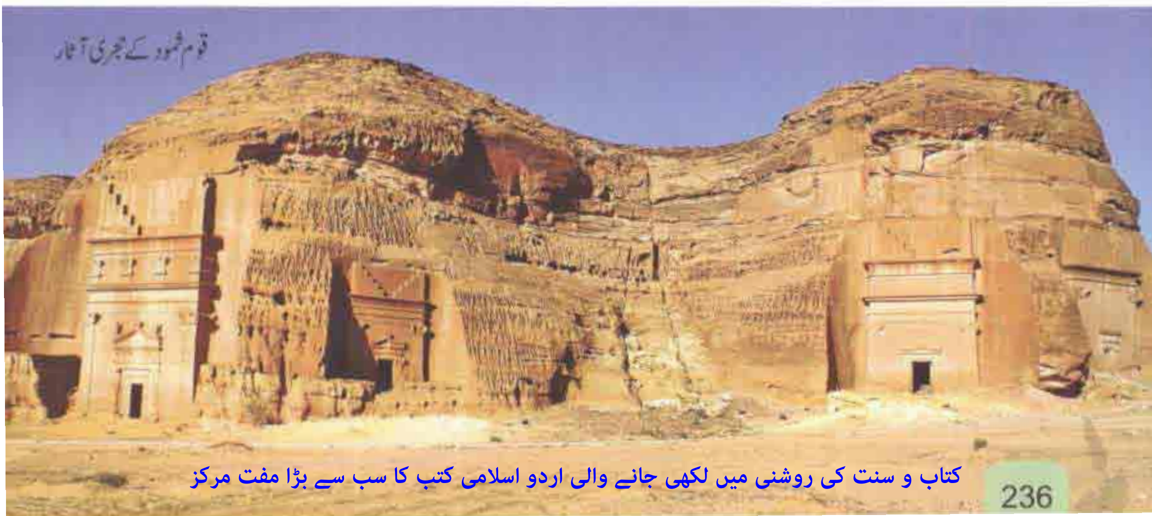
﴿ وَثَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ ﴾

''اور (آپ کے رب نے) ثمود کے ساتھ (کیسا سلوک کیا) جو وادی میں چٹانیں تراشتے تھے۔''[3]

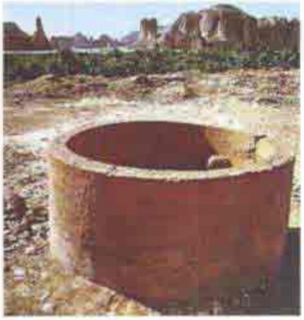
مفسرین بیان کرتے ہیں کہ ﴿ بِالْوَادِ ﴾ میں ''واد'' سے مراد وادی القریٰ ہے، جہاں قوم ثمود کی چٹانوں میں تراشی ہوئی رہائش گاہیں تھیں۔[4]

بعض جغرافیہ دانوں اور سیاحوں نے اس جگہ کو دیکھا اور بیان کیا ہے۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی کے شریک سفر محمد عاصم الحداد لکھتے ہیں: ان مکانات کے دروازے باقاعدہ تراشے ہوئے ہیں اور ان پر بعض جانوروں (گھوڑوں، عقاب وغیرہ) کی تصاویر بھی کندہ ہیں۔ ایک مکان کے دروازے کے اوپر عبارت بھی موجود ہے...... بعض مکانات کے اندر الماریاں اور سامان رکھنے کی جگہیں بھی بنی ہوئی ہیں۔ چوکھٹ کسی مکان کے دروازے پر نہیں ہے۔[5]

[1] الحجر 15:80-82. [2] صحيح البخاري: 4419 و 4702، صحيح مسلم: 2980. [3] الفجر 89:9. [4] تفسير القرطبي، الفجر 89:9. [5] سفرنامہ ارض القرآن: 1/209,210.



قوم ثمود کے حجری آثار



ثمود کا کنواں (بئرِ ثمود)

یہاں ایک کنواں بھی ہے جو ''بئرِ ثمود'' کے نام سے معروف ہے۔[1] ثمودی کتبات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود ''العلاء'' اور اس کے نواح میں اور اردن اور حجاز کے درمیانی علاقوں میں رہتی تھی۔

بعض کتبات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ثمودی حائل، تبوک، تیماء، مدائنِ صالح اور حجاز کے متعدد علاقوں پر قابض تھے اور بعض نصوص اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ طائف اور حجاز کے ساحلی شہر ''الوجہ'' تک بھی رہائش پذیر رہے۔ بعض کتبات وآثار میں ثمود کی رہائش گاہیں یمن میں بھی بتائی گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں قومِ ثمود کے بعض قبائل جنوبی عرب (یمن) تک چلے گئے ہوں اور وہاں انھوں نے اپنی آبادیاں بسائی ہوں۔[2] شاید اسی لیے بعض علماء نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ثمود عاد ثانیہ ہیں۔

رابغ سے عقبہ تک اور مدینہ وخیبر سے تیماء اور تبوک تک کا سارا علاقہ ثمود کے آثار سے بھرا پڑا ہے۔ جنوب میں خیبر تک اور شمال میں اردن کے اندر 50 کلومیٹر تک قاش قاش پہاڑ پائے جاتے ہیں گویا عہدِ قدیم میں یہاں جو زلزلہ آیا تھا، اس نے تقریباً 500 کلومیٹر لمبے اور تقریباً 150 کلومیٹر چوڑے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔[3]

الحِجر اور مدائن صالح

ان دنوں الحجر کو مدائن صالح کہا جاتا ہے۔ یہ عوام میں رائج ایک ایسی بات ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ متقدمین میں سے کسی نے الحجر کو مدائن صالح نہیں کہا۔ سعد بن عبداللہ بن جنیدل دورِ حاضر کے ایک محقق عالم حمد الجاسر کی تحقیق کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''آج کل لوگ وادی الحجر کو، جو العلاء شہر کے شمال میں واقع ہے، مدائن صالح کا نام دیتے ہیں۔ یہ دراصل ایک بڑی غلط فہمی ہے جس میں عرصے سے لوگ مبتلا ہیں۔ حقیقت اس طرح ہے:

1. الحجر ایک ایسی قوم کی وادی ہے جس پر ظہورِ اسلام سے پہلے اللہ تعالیٰ کا خوفناک عذاب نازل ہوا تھا۔ اسی لیے اس جگہ کے پانی تک کو استعمال کرنے سے روکا گیا ہے۔
2. العلاء شہر کے جنوب میں تقریباً 55 کلومیٹر کی دوری پر پرانی عمارتوں کے کھنڈر ملتے ہیں جنھیں آج کل ''المابیات''

[1] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 324/1. [2] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 329,328/1. [3] آنحضور ﷺ کے نقش قدم پر (حرم مدینہ): 117/2.



المابیات کے کھنڈر (علاقہ ثمود)

کہتے ہیں۔ یہ اس جگہ کا نیا نام ہے جبکہ ساتویں صدی ہجری کے لگ بھگ یہ جگہ مدینۂ صالح کہلاتی تھی، پھر مدائنِ صالح کے نام سے معروف ہوئی۔

ساتویں صدی ہجری سے پہلے غالباً اس جگہ کا نام الرُّحبہ تھا۔ یہ نام اکثر سفرناموں اور معاجم میں آیا ہے۔ پھر کچھ عرصے بعد الرحبہ کی طرح مدینۂ صالح یا مدائنِ صالح کا نام بھی طاقِ نسیان کی زینت بن گیا اور یہ جگہ وادی العطاس کے نام سے مشہور ہوئی۔ ابن بطوطہ کے سفرنامے میں اس جگہ کا ذکر اسی نام سے آیا ہے۔ ابن بطوطہ آٹھویں صدی ہجری میں سفر کرتا اس علاقے میں آیا تھا جبکہ یہ جگہ عرب وعجم کی کتابوں میں وادیِ دَیدان، ددان اور دادان کے نام سے معروف تھی۔ یاقوت حموی لکھتے ہیں: الرُّحبہ، مدینہ اور شام کے درمیان وادی القریٰ کے نزدیک ایک بستی ہے۔[1]

وادیِ دیدان جس میں مدینہ صالح واقع ہے اور جو مدائن صالح کے نام سے بھی مشہور ہوئی، وادی الحجر سے متصل نہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان خاصا فاصلہ ہے۔

غلط فہمی کا سبب

مرورِ ایام سے العلاء کے شمال میں واقع وادی الحجر کے پرانے آثار اور اوائلِ اسلام میں العلاء کے جنوب کی طرف وجود میں آنے والے آثار و مظاہر دونوں خلط ملط ہوگئے۔

العلاء کے جنوب میں واقع مدینہ صالح دراصل بنوعباس کے ایک شخص ''صالح'' کی طرف منسوب تھا جو اس شہر کا بانی تھا۔ یہ شہر چوتھی صدی ہجری تک آباد رہا۔ اس کے برعکس الحجر کے باشندے قومِ صالح کے نام سے معروف تھے۔ یہاں کا ایک کنواں بئر ناقہ کہلاتا تھا اور ایک مقام مسجد صالح کے نام سے مشہور تھا، اس لیے الحجر کو غلط طور پر مدائنِ صالح کا نام دے دیا گیا۔

میں نے جس قدیم ترین کتاب میں یہ غلطی لکھی پائی، وہ ترکی زبان کی ایک کتاب کا عربی ترجمہ ہے۔ اس کا نام بهجة المنازل یا نهجة المنازل ہے۔ اس کے ترک مؤلف کا نام محمد ادیب ہے جو عثمانی سلطنت کا وقائع نگار تھا جیسا کہ ایضاح المكنون میں درج ہے۔[2] اس کے مطابق الحجر مدائنِ صالح یا قُریٰ صالح یا عدال کے نام سے

[1] معجم البلدان، مادة: رحبة. [2] دیکھیے: إيضاح المكنون في الذيل على كشف الظنون: 696/2.

معروف تھا۔ ان دونوں مقامات کو سب سے پہلے جس نے باہم خلط ملط کیا اور العلاء کے جنوب میں واقع مقام (مدائن صالح) کو قوم ثمود کا الحجر قرار دیا، وہ اندلسی سیاح البلوی تھا جس نے 738ھ میں شام کی طرف سے الکرک کے حجاج کے ساتھ سفر حج اختیار کیا تھا۔"[1]

حمد الجاسر کی اس تحقیق سے یہ معلوم ہوا کہ ماضی میں الحجر اور مدائنِ صالح الگ الگ جگہوں کے نام تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ العلاء کے جنوب میں واقع مدائن صالح کا نام بھلا دیا گیا اور اب الحجر ہی کو مدائن صالح کہا جاتا ہے۔ انگریز سیاح ڈاوٹی نے بھی اسی بات کی تائید کی ہے کہ الحجر اور مدائن صالح دو الگ الگ جگہیں تھیں۔[2]

قوم ثمود کا مذہب

ثمود بت پرست قوم تھی۔ وہ لوگ اللہ وحدہٗ لاشریک کو چھوڑ کر بہت سارے معبودوں کی پرستش میں مبتلا تھے۔ ثمود کے کتبات میں درج بعض مشہور بتوں کے نام یہ ہیں:

ودّ، یغوث، شمس، مناف، مناۃ، بعلہ یا بعل، ہبل، قین، الہٰ، اَلِی، الہی، اللّات، ذوشریٰ۔[3] ودّ اور یغوث نامی بتوں کو عربوں سے پہلے قومِ نوح نے پوجا۔ اس کے بعد عربوں سمیت بہت سی مشرک اقوام میں ان کی پوجا رائج رہی۔ یہی حال قوم نوح کے بت نسر اور دوسرے بتوں کا رہا۔ یہ نام قرآن میں اس طرح آئے ہیں: "اور انھوں (کفار) نے کہا: تم اپنے معبودوں کو نہ چھوڑو۔ اور نہ چھوڑو تم ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو۔"[4] بعل فنیقیوں کے معبود کا نام ہے۔ اس کے بارے میں وہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ زرخیزی پیدا کرتا ہے۔[5]

صالح علیہ السلام کی دعوت اور اونٹنی والا معجزہ

جب قوم ثمود کفر و شرک کی دلدل میں دھنس گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف سیدنا صالح علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر بھیجا۔ انھوں نے قوم کو اللہ وحدہٗ لاشریک کی طرف بلایا تو کچھ لوگ ایمان لے آئے لیکن قوم کے خوش حال لوگوں نے مومنوں کا مذاق اڑایا۔ کفار کے تکبر اور انکارِ حق کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِيْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝﴾

[1] معجم الأمكنة الوارد ذكرها في القرآن الكريم لسعد بن عبدالله بن جنيدل، ص: 118-120. [2] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 326/1. [3] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 329/1-331. [4] نوح 71:23. [5] المنجد في الأعلام، ص: 130.

''ان (صالح علیہ السلام) کی قوم کے وڈیرے جنھوں نے تکبر کیا، ان میں سے کمزور سمجھے جانے والے ایمانداروں سے کہنے لگے: کیا تم سمجھتے ہو کہ واقعی صالح (علیہ السلام) اپنے رب کی طرف سے بھیجا ہوا ہے؟ انھوں نے کہا: (ہاں) بلاشبہ ہم اس چیز پر ایمان لانے والے ہیں جس کے ساتھ اسے بھیجا گیا ہے۔ ان لوگوں نے کہا جنھوں نے تکبر کیا: بے شک ہم اس چیز کا انکار کرنے والے ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو۔''[1]

قوم نے دعوتِ حق کے جواب میں صالح علیہ السلام کو سحر زدہ کہا اور ساتھ ہی کوئی نشانی پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ایک اونٹنی کی نشانی مقرر کی لیکن سرکش قوم نے اس کی بے حرمتی کی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِيْنَ ۝ ﴾

''صالح (علیہ السلام) نے کہا: یہ اونٹنی (معجزہ) ہے، (ایک دن) اس کے پینے کی باری ہے اور ایک مقرر دن تمھارے پینے کی باری ہے اور اسے بری نیت سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ تمھیں بڑے دن کا عذاب آ پکڑے گا، پھر انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں، پھر وہ نادم ہوئے۔''[2]

قوم جب کفر و سرکشی کی تمام حدیں پار کر گئی تو صالح علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ﴾

''اپنے گھروں میں تین دن فائدہ اٹھا لو۔''[3]

قومِ ثمود پر نزولِ عذاب

جب قوم نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو نتیجہ ان کی تباہی کی صورت میں نکلا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ۝ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ﴾

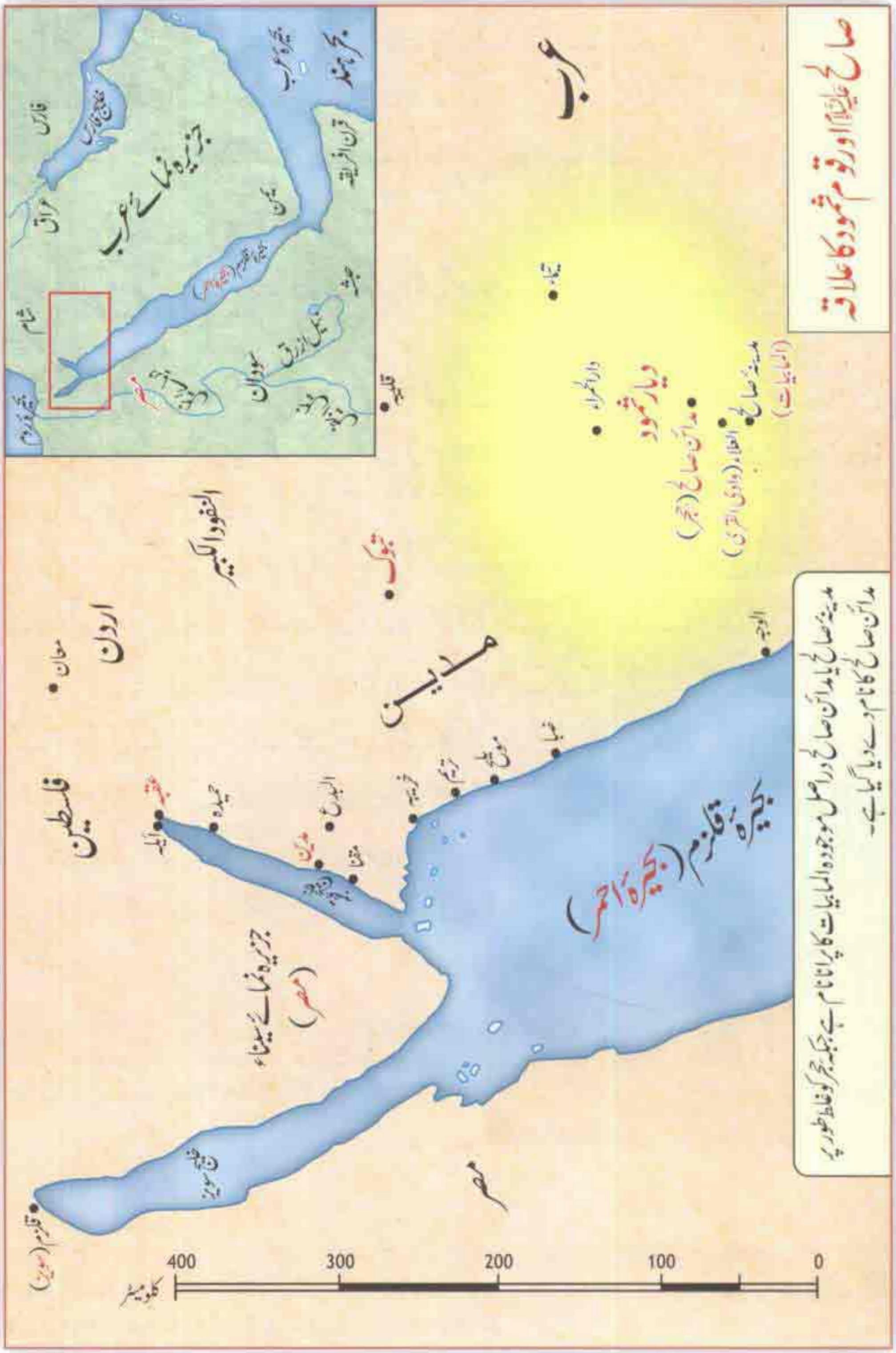
''چنانچہ انھیں صبح ہوتے ہی چنگھاڑ نے آ پکڑا۔ پھر ان کے کچھ کام نہ آیا جو وہ کماتے تھے۔''[4]

دوسری جگہ عذاب کی کیفیت یوں بیان کی گئی:

﴿ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ۝ ﴾

''بلاشبہ ہم نے ان پر ایک ہی چنگھاڑ بھیجی تو وہ باڑ لگانے والے کی روندی ہوئی باڑ کی طرح (چُور چُور) ہو گئے۔''[5]

[1] الأعراف 7:75، 76۔ [2] الشعرآء 26:155-157۔ [3] ھود 11:65۔ [4] الحجر 15:83، 84۔ [5] القمر 54:31۔



صالح علیہ السلام اور قوم ثمود کا علاقہ
عرب
فلسطین
اردن
مدین
تبوک
دیارِ ثمود
جزیرہ نمائے عرب
جزیرہ نمائے سیناء (مصر)
بحیرۂ قلزم (بحیرۂ احمر)
مصر
مدینہ صالح یا مدائن صالح دراصل موجودہ العلا کا پرانا نام ہے جبکہ حجر کو غلط طور پر مدائن صالح کا نام دے دیا گیا ہے۔
0
100
200
300
400
کلومیٹر

اللہ تعالیٰ نے صالح علیہ السلام کو اپنے پیروکاروں سمیت بچالیا، فرمان الٰہی ہے:

﴿ وَأَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○ ﴾

"اور ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو ایمان لائے اور وہ (اللہ سے) ڈرتے تھے۔"[1]

ثمودِ ثانیہ کا ظہور

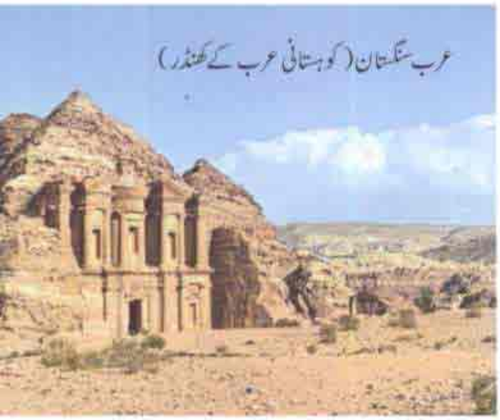
جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے نجات دی، تاریخ میں انھیں ثمود ثانیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

تاریخ میں ثمود ثانیہ کا نام ایک طرف تو اسیریا (اشور) کے کتبوں میں نظر آتا ہے اور دوسری طرف رومیوں کی تاریخ میں۔ شاہِ اشور سرجون یا شرغون ثانی (722 ق م تا 705 ق م) کے کتبۂ فتح میں جن محکوم عرب قبائل کا ذکر ہے، ان میں ثمود کا نام بھی ہے۔

یونانی مؤرخ ڈائیڈورس نے ثمود کا تلفظ تھموڈینی (Thamudeni) اور بطلیموس نے تھموڈیٹی (Thamuditae) کیا ہے۔ ایک دوسرے یونانی مصنف اورانوس (Uranus) کا کہنا ہے کہ ثمود انباط کے پہلو میں آباد تھے۔

قیصر جسٹینین کے عہد (527ء تا 565ء) میں 300 ثمودی عرب بھی رومی فوج میں شامل تھے۔ ان کے لمبے نیزے اور سواری کے اونٹ معروف تھے۔ ثمود کے ملک کا اکثر حصہ چونکہ پہلے اہل مدین نے دبا لیا تھا اور باقی حصے پر بعد میں انباط قابض ہوگئے تھے، لہٰذا مسیح علیہ السلام سے کچھ پہلے جب رومیوں نے عرب سنگستان (Arabia Petra)[2] پر قبضہ کیا تو انباط کی مخالفت میں ثمود نے شمالی ہمسایوں کے ہاں پناہ لی اور انھیں کا ساتھ دیا۔

جب اسلام آیا تو عرب میں ثمود کا نام ونشان نہ تھا۔ ان کے علاقوں میں قبائل جہینہ، بَلِیّ اور یہود آباد تھے۔[3]



عرب سنگستان (کوہستانی عرب کے کھنڈر)

---

[1] النمل 53:27. [2] اردن کا موجودہ شہر البتراء (Petra) عرب سنگستان (Arabia Petra) کی یاد دلاتا ہے۔ [3] تاریخ ارض القرآن (کامل): 160,159/1، المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 325/1.

3 طسم و جدیس

طسم اور جدیس ان قوموں میں سے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے خوشحالی سے نوازا لیکن انھوں نے بھی عاد اور ثمود کی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی اور کفر و شرک کی دلدل میں پھنس گئے۔ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے انھیں نیست و نابود کر دیا۔

علمائے انساب طسم و جدیس کے مورث لاوُذ کا نسب یوں بیان کرتے ہیں: لاوُذ بن ارم بن سام بن نوح (علیہ السلام)۔ طسم اور جدیس دونوں بھائی تھے اور ان کی اولاد یمامہ میں سکونت پذیر تھی۔

ان کی بدعملیوں کی سزا انھیں باہمی مخاصمت کی صورت میں ملی۔ کہا جاتا ہے کہ بنوجدیس نے بنوطسم سے تعلق رکھنے والے حکمران عملوق (یا عملیق) کے ظلم کے ردِعمل میں بنوطسم کا قتل عام کیا تو ان کا ایک آدمی رباح بن مرہ بچ نکلا۔ اس نے حسان بن تبع سے فریاد کی تو اس نے بنوجدیس پر حملہ کر کے انھیں نیست و نابود کر دیا۔[1] واقعے کی تفصیل ''زرقاء الیمامہ اور یمامہ کی وجہ تسمیہ'' کے ذیل میں دیکھیے۔



طسم و جدیس کے علاقے کی ایک بستی

حَجر یمامہ طسم اور جدیس کی بارونق اور شاندار بستی تھی۔ وہ قومیں تو ہلاک ہو گئیں لیکن عظیم الشان محلّات اور باغات چھوڑ گئیں۔ حجر سے نصف فرسخ کے فاصلے پر بعد میں بنو یربوع بن ثعلبہ بن الدول بن حنیفہ کی بستی ''بادیہ'' آباد ہوئی۔[2]

---

[1] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 1/334-339، وفاء الوفا للسمهودي: 1/183-186. [2] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 3/870.

4 بنو جُرہم

جُرہم کی قومیت کیا تھی اور اس کا نسب کس سے ملتا تھا، اس سلسلے میں ہمدانی بیان کرتے ہیں کہ جرہم دو تھے: جُرہم اولی کا تعلق امم سامیہ اولی سے تھا اور جُرہم ثانیہ قحطانی تھے۔ جرہم اولی کا وجود مٹا دیا گیا۔ یہ عاد اور ثمود کے ہم عصر تھے۔[1]

جُرہم ثانیہ قحطان کے بیٹے جرہم کی نسل سے ہیں۔ جرہم کا دوسرا بھائی یعرب بن قحطان تھا جو یمن کا مالک تھا جبکہ جُرہم بن قحطان کے حصے میں حجاز کا خطہ آیا اور یہ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے سسرال ہیں۔[2] سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے مضاض جرہمی کی بیٹی سے دوسری شادی کی جس سے ان کے بارہ بیٹے پیدا ہوئے۔[3] ان میں سے نابت اور قیدار تاریخ میں زندۂ جاوید رہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات کے بعد بیت اللہ کی تولیت نابت بن اسماعیل کے ہاتھ آئی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پہلے قیدار بیت اللہ کے متولی بنے، پھر نابت بن اسماعیل نے یہ منصب سنبھالا۔ اسماعیل علیہ السلام کی زیادہ اولاد کشائش رزق کے لیے ادھر ادھر نکل گئی، تاہم ایک گروہ حرمِ کعبہ کے پاس ہی مقیم رہا۔ جب نابت کی وفات ہوئی، اس وقت بنواسماعیل منتشر ہو چکے تھے اور جو مکہ میں رہتے تھے، وہ تعداد میں کم اور عمروں میں چھوٹے تھے، لہٰذا بیت اللہ کی دیکھ بھال مضاض (ثانی) بن عمرو جرہمی نے سنبھالی۔ تولیتِ کعبہ کے معاملے میں عمالقہ میں سے سُمیدع بن ہوبر نے اس سے جھگڑا کیا لیکن مضاض غالب رہا۔ سمیدع شام چلا گیا اور یوں مکہ کی حکمرانی اور بیت اللہ کی تولیت مضاض کے ہاتھ رہی حتی کہ وہ فوت ہو گئے۔

بنو اسماعیل عرب میں جہاں بھی گئے غالب رہے، تاہم وہ اپنے اخوال (ننھیال) بنو جرہم کی حکومت تسلیم کرتے تھے اور بنو جرہم ان کی بات مانتے تھے۔ بنو جرہم کے زمانے میں امور کعبہ کی نگرانی بنو اسماعیل کے ہاتھ میں تھی کیونکہ بنو جرہم اِن کی بہت تعظیم کرتے اور ان کے مرتبے سے آشنا تھے۔ نابت بن اسماعیل کے جانشین امین، پھر یشجب بن امین، پھر ہَمَیسع، پھر اُدد ہوئے۔ اس دوران میں بنو جرہم نے ظلم و بغاوت اور فسق و فجور کی روش اختیار کی جسے اُدد

---

[1] الإكليل للهمداني:1/78. [2] صحيح البخاري:3364. [3] تاريخ اليعقوبي:1/190.

سخت ناپسند کرتے تھے۔ مضاض جرہمی کی نسل میں سے حارث بن مضاض ثانی بن عمرو، بنو جرہم کا آخری بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں وہ لوگ ظلم و سرکشی کی تمام حدیں پار کر گئے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انھیں چیونٹیوں کے عذاب میں مبتلا کر دیا اور وہ سب اُدد کی زندگی ہی میں ہلاک ہو گئے۔ [1]

[1] تاريخ اليعقوبي:1/190، 191.

2

عرب عارِبہ

یہ عرب قبائل سبا بن یشجب بن یَعرُب بن قحطان کی نسل سے ہیں۔ انھیں قحطانی عرب کہا جاتا ہے۔ اکثر اہل علم قحطان کا نسب ارم بن سام بن نوح (علیہ السلام) سے ملاتے ہیں جبکہ بعض انھیں عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح (علیہ السلام) سے منسوب کرتے ہیں۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے قحطان کے آل اسماعیل ہونے کو راجح قرار دیا ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ قحطان کو ابوالیمن بھی کہا جاتا ہے کیونکہ قحطانی عربوں کا اصل گہوارہ ملک یمن تھا۔ سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان کے دو بیٹوں حمیر اور کہلان کے ناموں سے دو قبیلوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔

بنوحمیر کی مشہور شاخیں زید الجمہور، قضاعہ اور سکسک تھیں۔

بنوکہلان کی مشہور شاخیں مندرجہ ذیل ہیں:

ہمدان، انمار، طے، خزاعہ، مذحج، کندہ، لخم و جذام، ازد، اوس، خزرج اور جفنہ۔

عام کہلانی قبائل نے بعد میں یمن چھوڑ دیا اور جزیرہ نمائے عرب کے مختلف اطراف میں پھیل گئے۔ ان کے عمومی ترکِ وطن کا واقعہ سیلِ عَرِم سے کسی قدر پہلے اس وقت پیش آیا جب رومیوں نے مصر و شام پر قبضہ کر کے اہلِ یمن کی تجارت کے بحری راستے پر اپنا تسلط جما لیا۔ لیکن حمیری قبائل اپنی جگہ برقرار رہے۔



عرب عاربہ کے علاقے مأرب کی ایک بستی

بُنُو قحطان
اور اُن کے ذیلی قبائل

عرب کے قدیم ترین قبائل میں سے بنو قحطان کا جدِ امجد قحطان (ارم بن سام یا عابر بن شالخ بن سام) بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا۔ بعض اسے اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے بتاتے ہیں۔ بنو قحطان نجران، یمن، عسیر اور جنوبی نجد میں آباد تھے۔ ان کی آبادیاں صنعاء، مکی، تثلیث، شہران، بیشہ، دو اسر، بیشم اور بحیرہ بحران میں واقع تھیں۔ سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان کے نام پر قدیم یمن کو سبا کہا جاتا تھا۔ قرآن مجید کی سورت نمبر 34 بھی سبا کے نام سے موسوم ہے۔



بنو قحطان میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ■ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام □ قبیلے کا جدِ امجد □ بعد الجدکی بالواسطہ اولاد ← عمرو بن لحی وہ پہلا شخص ہے جس نے حرم و قدسے عرب میں بت پرستی کو رواج دیا ■

ماخذ: الأطلس التاريخي لسيرة الرسول ★ معجم قبائل العرب ★ أسد الغابة ★ معجم ما استعجم ★ كتاب الشجرة النبوية ★ سالك الذهب

ترک وطن کرنے والے کہلانی قبائل

جن کہلانی قبائل نے یمن سے ترکِ وطن کیا، ان کی چار شاخیں معروف ہیں:

1 ازد 2 لخم و جذام 3 بنو طے 4 بنو کندہ۔

1 قبائل ازد

ازد کا نسب ازد بن الغوث بن نبت بن مالک بن زید بن کہلان ہے۔ ازد کے بیٹے مازن، نصر، عبداللہ، عمرو، الھنوء اور الحارث تھے۔[1]

(ا) مازن بن ازد

بنو مازن بن ازد نے اپنے سردار عمران بن عمرو مزیقیا بن عامر ماء السماء کے مشورے پر ترکِ وطن کیا۔ یہ پہلے تو یمن ہی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے۔ بعد میں انھوں نے شمال کا رُخ کیا اور مختلف شاخیں مختلف جگہ سکونت پذیر ہوئیں۔ عمرو مزیقیا کے چار بیٹوں میں انصار مدینہ کے جد امجد ثعلبہ بہلول، بنو خزاعہ کے جدامجد حارثہ، عمران (ازد عمان) اور جفنہ (آل غسان) اور ان کی اولاد کے ترکِ وطن کی تفصیل درج ذیل ہے:

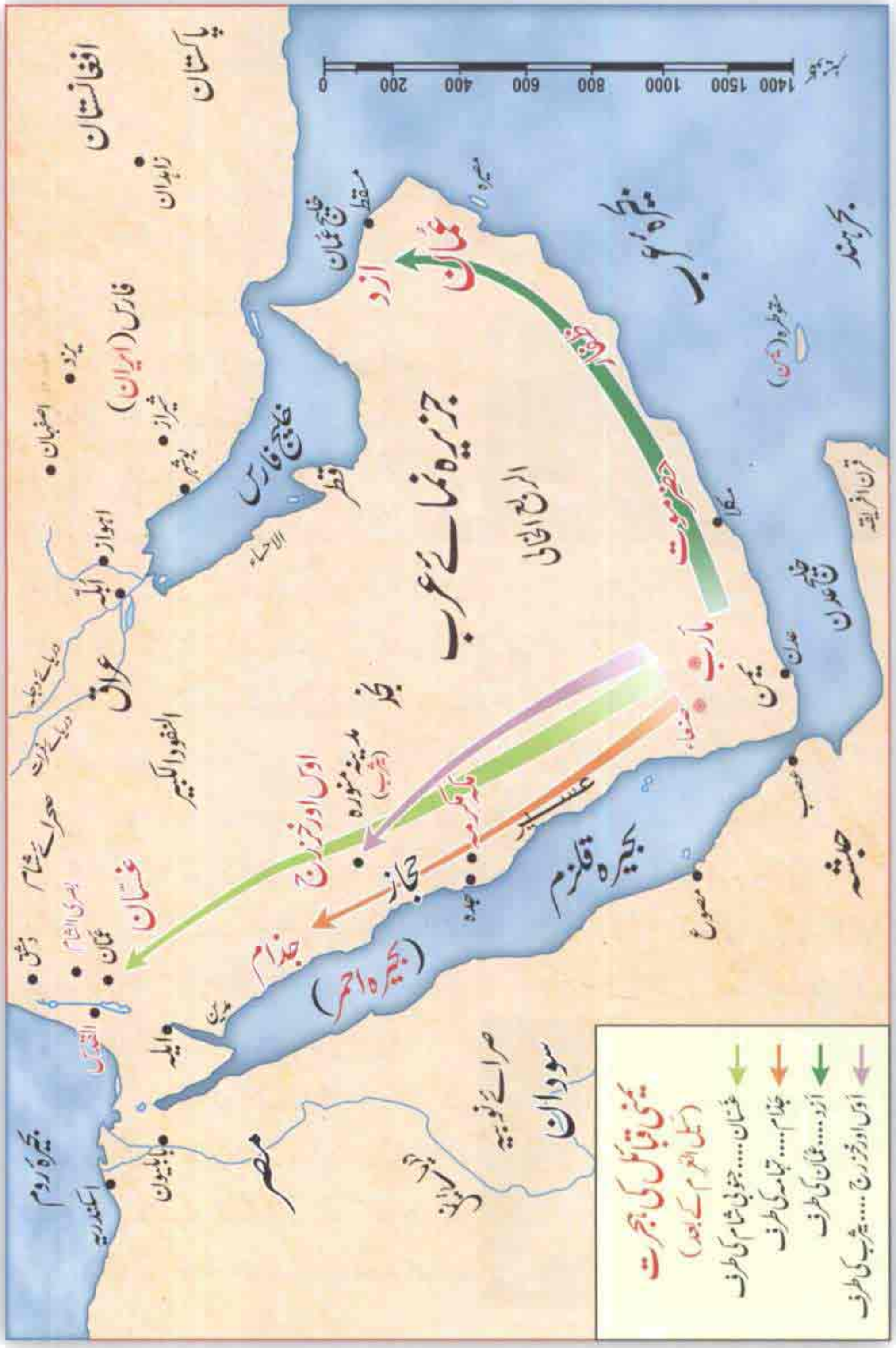
1 ثعلبہ بن عمرو مزیقیا

اس نے اپنے خاندان سمیت اولاً حجاز کا رُخ کیا اور ثعلبیہ اور ذی قار کے درمیان اقامت اختیار کی، پھر اس کی اولاد نے یثرب (مدینہ) کی طرف کوچ کیا اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ علمائے انساب (کی اکثریت) کے مطابق حارثہ بن ثعلبہ بن عمرو کی نسل ہی سے اوس اور خزرج ہیں۔[2]

اوس وخزرج

عرب قبیلے اوس اور خزرج حارثہ بن ثعلبہ بُہلُول بن عمرو مُزَیقیا بن عامر ماء السَّماء بن حارثہ الغطریف کی اولاد ہیں۔ جو علماء انھیں ازدی قحطانی قرار دیتے ہیں، وہ ان کا اُوپر کا نسب یوں لکھتے ہیں: حارثہ الغطریف بن امرؤ القیس بن ثعلبہ بن مازن (بن عبداللہ) بن ازد۔ حارثہ کے بیٹوں اوس اور خزرج کی والدہ کا نام قَیلہ تھا، لہٰذا انھیں بنو قیلہ بھی کہا جاتا ہے۔ ابن کلبی اور یاقوت کے بقول جاہلیت میں اوس اور خزرج کو مجموعی طور پر ''خزرج'' کہا جاتا تھا۔

1 سبائك الذهب، ص: 270۔ 2 الرحيق المختوم، ص: 17,16۔


یمنی قبائل کی ہجرت
(سیل العرم کے بعد)
غسان ..... جنوبی شام کی طرف
جذام ..... تہامہ کی طرف
ازد ..... عمان کی طرف
اوس اور خزرج ..... یثرب کی طرف
جزیرہ نمائے عرب
الربع الخالی
النفود الکبیر
صحرائے شام
بحیرہ احمر
بحیرہ قلزم
خلیج فارس
خلیج عمان
خلیج عدن
بحیرۂ عرب
بحر ہند
بحیرۂ روم
افغانستان
پاکستان
فارس (ایران)
عراق
مصر
سوڈان
حبشہ
حجاز
نجد
یمن
عمان
مأرب
حضرموت
غسان
جذام
ازد
اوس اور خزرج

بنوخزرج کے جدِ امجد خزرج بن حارثہ خزرج اکبر کہلاتے تھے۔

بنو اوس کے ذیلی قبیلے

1 بنوحارثہ بن حارث بن خزرج اصغر بن عمرو (نبیت) بن مالک بن اوس: حرہ شرقیہ کے پاس دار بنی عبدالاشہل میں ان کی گڑھی "المسیر" کہلاتی تھی۔ بعد میں انھوں نے شمال مغرب میں جا کر الریان نامی گڑھی تعمیر کی۔ براء بن عازب رضی اللہ عنہما اسی قبیلے سے تھے۔



حرہ واقم (نزد مدینہ)

2 بنوعبدالاشہل بن جشم بن حارث بن خزرج اصغر: یہ بھی حرہ شرقیہ (حرہ واقم) کے پاس آباد تھے۔ ان کی گڑھی کا نام "واقم" تھا۔ جب بنو حارثہ ان سے لڑ جھگڑ کر مشہد حمزہ (شہادت گاہِ حمزہ رضی اللہ عنہ) کے مغرب میں منتقل ہو گئے تو بنوعبدالاشہل المسیر میں مقیم ہو گئے۔ دار بنی عبدالاشہل موجودہ مقام شیخین کے قریب تھا جہاں احد کے دن نبی ﷺ کا معسکر (کیمپ) تھا۔

بنو زعوراء بن جُشم بھی ان کے بھائی بند تھے۔ اوس کے سردار سعد بن معاذ اور اُسید بن حضیر رضی اللہ عنہما بنوعبدالاشہل سے تھے۔ بنو حارثہ، عبدالاشہل، بنو زعوراء اور بنوظفر کو "نبیت" کہا جاتا تھا۔

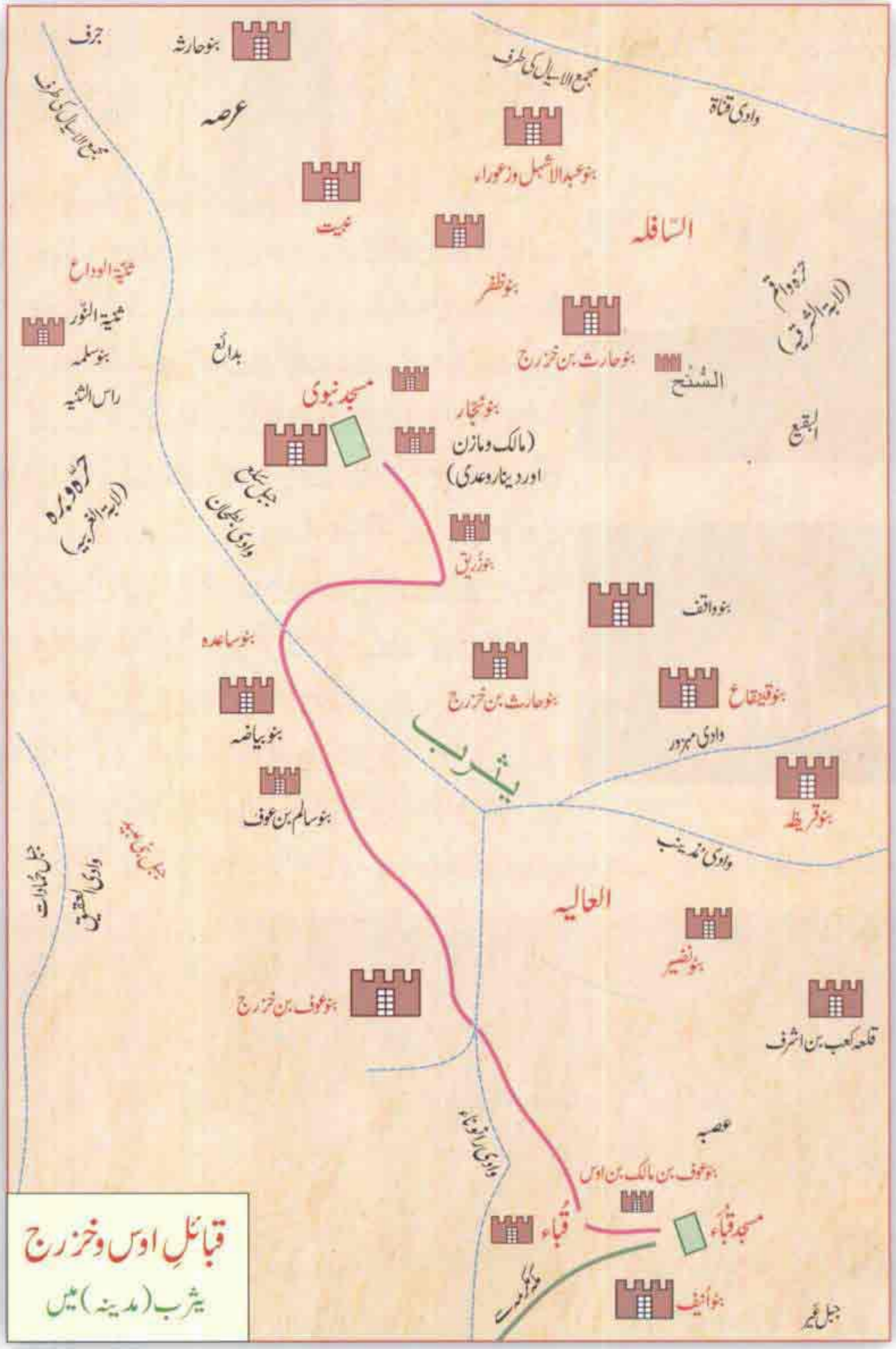
3 بنوظفر (کعب) بن خزرج اصغر: یہ بقیع کے مشرق میں عبدالاشہل کے پڑوس میں مقیم تھے۔ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ اسی قبیلے سے تھے جنھیں نبی ﷺ نے غزوۂ احد میں حاسر (بے زرہ، برہنہ سر) کا لقب دیا۔

4 بنوعمرو بن عوف بن مالک بن اوس: ان کا مسکن قبا تھا۔ وہاں ان کی گڑھی "الشُنَیف" کہلاتی تھی۔ عاصم بن ثابت بن ابوالافلح رضی اللہ عنہ کا تعلق اسی قبیلے سے تھا اور کلثوم بن ہدم بن امرؤالقیس رضی اللہ عنہ بھی اسی قبیلے سے تھے جن کے ہاں رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے پڑاؤ کیا تھا۔



مسجد اجابہ (مدینہ)

5 بنومعاویہ بن مالک بن عوف بن عمرو بن عوف بن مالک بن اوس: یہ مدینہ کے مشہور قبرستان بقیع الغرقد کے پیچھے اسی نام کے محلے میں آباد تھے۔ مسجد اجابہ انھی کی بستی میں بنی۔ عبداللہ بن عبداللہ بن ثابت بن قیس اور سُبَیع بن حاطب بن قیس رضی اللہ عنہم اسی قبیلے سے تھے۔


قبائلِ اوس وخزرج
یثرب (مدینہ) میں
جرف
بنوحارثہ
عرصہ
مجمع الاسیال کی طرف
وادی قناۃ
بنوعبدالاشہل وزعوراء
السافلہ
بنوظفر
ثنیۃ الوداع
ثنیۃ النور
بنوسلمہ
راس الثنیہ
بدائع
بنوحارث بن خزرج
السنح
مسجد نبوی
بنونجار
(مالک ومازن
اور دینار وعدی)
البقیع
حرۂ وبرہ
(اللابۃ الغربیہ)
حرۂ واقم
(اللابۃ الشرقیہ)
وادی بطحان
بنوزریق
بنوواقف
بنوساعدہ
بنوحارث بن خزرج
بنوقینقاع
یثرب
وادی مہزور
بنوبیاضہ
بنوقریظہ
بنوسالم بن عوف
وادی مذینب
العالیہ
وادی العقیق
بنونضیر
بنوعوف بن خزرج
قلعہ کعب بن اشرف
وادی رانوناء
عصبہ
بنوعوف بن مالک بن اوس
قباء
مسجد قباء
مکہ کی طرف
بنوانیف
جبل عیر

6 بنو امیہ بن زید بن قیس بن عامر بن مُرّہ بن مالک بن اوس: مذینب نامی ندی ان کی بستی کے درمیان سے گزرتی تھی۔ ان کے بھائی بند بنو وائل بن زید کی گڑھی ''الموجا'' کہلاتی تھی۔

بنوخزرج کے ذیلی قبیلے



وادی بطحان

1 بنوحارث بن خزرج اکبر بن حارثہ: یہ وادیِ بطحان کے مشرق میں عوالی میں رہتے تھے۔ حارث بن خزرج کے جڑواں بیٹے جشم اور زید محلّہ السُّنح میں مقیم تھے۔ عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہما اسی قبیلے سے تھے جنھیں خواب میں اذان سنائی گئی۔



مسجد جمعہ (مدینہ)

2 سالم و غنم ابنائے عوف بن عمرو بن عوف بن خزرج اکبر: یہ حرہ غربیہ کی طرف وادی رانوناء میں دار بنی سالم میں مقیم تھے جہاں مسجد جمعہ واقع ہے۔ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ اسی قبیلے سے تھے۔ بنو سالم کی گڑھی ''المزدلف'' کہلاتی تھی۔ بنو سالم کے حارث بن خزمہ رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی ڈھونڈ کر لائے۔

3 بنوحبلی (مالک) بن سالم: بنوسالم کی یہ شاخ قباء اور دار بنی حارث بن خزرج اکبر کے درمیان قیام پذیر تھی۔ دار بنی حبلی میں ''مزاحم'' نامی گڑھی کا مالک منافقوں کا سردار عبداللہ بن ابی ابن سلول تھا۔

اس قبیلے میں سے بدری صحابہ رضی اللہ عنہم کی خاصی تعداد ہے۔ ان میں عبداللہ بن عبداللہ بن اُبَی اور اوس بن خولی رضی اللہ عنہما شامل ہیں۔

4 بنوجُشم بن خزرج اکبر کی شاخ بنوسَلِمہ بن سعد: یہ مسجد قبلتین اور اطم بنی حرام کے درمیان آباد تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بستی ''دارخُربیٰ'' کا نام بدل کر ''صُلحہ'' رکھا۔ ابوالیَسَر کعب بن عمرو سُلَمی رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر میں عمِ رسول عباس رضی اللہ عنہ کو گرفتار کیا تھا۔ ان کا تعلق بنوسلمہ سے تھا۔ بنوسَلِمہ اور بنوحرام کے باغات اور کھیت مسجد قبلتین اور مسجد الخربہ کے درمیان واقع تھے۔

5 بنوعبید بن عدی بن غنم: یہ بنوسلمہ کی ذیلی شاخ تھی۔ یہ لوگ مسجد الخربہ کے پاس آباد تھے۔ ان کے سردار براء بن معرور رضی اللہ عنہ کی گڑھی ''الْاَشْنَقْ'' کہلاتی تھی۔ جابر بن عبداللہ بن رِئاب رضی اللہ عنہ بھی اسی قبیلے سے تھے۔


مسجد بنی حرام (مدینہ)

6 بنوحرام بن کعب بن عدی: یہ بھی بنوسلمہ سے تھے۔ یہ مقبرہ بنی سلمہ سے مذاد تک بستے تھے۔ جابر بن عبداللہ بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہما اس قبیلے سے تھے۔ مسجد "بنی حرام الصغیر" میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا کی تھی۔ ان کی دوسری مسجد "بنی حرام الکبیر" جبل سلع کے قریب واقع تھی۔

7 بنو مالک بن غضب بن جُشم بن خزرج اکبر: ان کی پانچ ذیلی شاخیں بنو بیاضہ وزُرَیق، بنو حبیب، بنوعذارہ، بنوالللین اور بنواجدع تھیں۔ یہ مسجد جمعہ کے پاس واقع دار بنی سالم سے وادی بطحان تک آباد تھے۔ ان کی 19 گڑھیاں تھیں۔ سلمہ بن صخر بن سلمان رضی اللہ عنہ بنو مالک میں سے تھے۔ زیاد بن لبید بن سِنان بدری رضی اللہ عنہ بنو بیاضہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ذکوان بن عبدقیس بن خلدہ رضی اللہ عنہ کا تعلق بنوزریق سے تھا۔

8 بنوساعدہ بن کعب بن خزرج اکبر کی دو شاخیں بنوعمرو اور بنوثعلبہ دار بنی ساعدہ میں آباد تھیں جو سوق مدینہ اور محلّہ بنی ضمرہ کے مابین واقع تھا۔ ابودجانہ رضی اللہ عنہ بنوثعلبہ سے تعلق رکھتے تھے۔

9 بنوساعدہ کی ایک شاخ بنوابی خزیمہ بن ثعلبہ، سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا قبیلہ تھا۔ ان کا محلّہ شہر کے شمال میں تھا جو سقیفہ بنی ساعدہ کہلاتا تھا۔ سقیفہ بنی ساعدہ مسجد نبوی کے شمال مغرب میں قبیلہ خزرج کی شاخ بنوساعدہ کے علاقے میں ایک سایہ دار چبوترہ تھا۔ لوگ دھوپ سے بچنے کے لیے یہاں آبیٹھتے تھے۔ اسی جگہ لوگ اکٹھے ہو کر اپنے معاملات کے فیصلے کرتے اور ایک دوسرے کے حال احوال دریافت کرتے تھے۔ سقیفہ بنی ساعدہ ہی میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی بیعت کی گئی۔[1] بنوساعدہ ہی میں سے بنووقش اور بنوعناق تھے جن کا محلّہ بنوطریف (یا بنوساعدہ) کہلاتا تھا۔

[1] معجم البلدان، مادة: سقيفة بني ساعدة، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا.


سقیفہ بنو ساعدہ (مدینہ) کا باغیچہ


بنواوس اور بنوخزرج
کا شجرہ نسب
اوس بنواوس کا جدِ امجد
خزرج الاکبر بنوخزرج کا جدِ امجد

10 بنونجار کا جد امجد نجار (تیم اللہ) بن ثعلبہ بن عمرو بن خزرج اکبر تھا۔ یہ نبی ﷺ کے دادا عبدالمطلب کا ننھیالی قبیلہ تھا۔ بنونجار کی چار شاخیں تھیں: بنو مالک، بنوعدی، بنو مازن اور بنو دینار۔ بنوعدی مسجد نبوی کے مغرب میں رہتے تھے جبکہ بنو دینار وادیِ بطحان کے پیچھے آباد تھے۔ مسجد بنو دینار کے پیچھے ان کی گڑھی ''المنیف'' واقع تھی۔ بصرہ میں سب سے آخر میں فوت ہونے والے صحابی خادم رسول انس بن مالک رضی اللہ عنہ بنوعدی بن نجار میں سے تھے۔ سلیط بن قیس عدوی رضی اللہ عنہ عراق کی جنگ ''یوم جسر'' میں شہید ہوئے۔ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ بنو مالک بن نجار سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی گڑھی کا نام ''فارع'' تھا۔ بنو مالک کے سہل بن عتیک رضی اللہ عنہ بیعت عقبہ میں شریک تھے۔ سہیل بن رافع اور سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہما کا تعلق بھی بنو مالک سے تھا۔ بدری صحابی قیس بن مخلد بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ بنو مازن میں سے تھے اور حبیب بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا۔ حارث بن ابی صعصعہ مازنی رضی اللہ عنہ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے اور ان کے دو بھائیوں ابوکلاب اور جعفر رضی اللہ عنہما نے غزوہ مؤتہ میں شہادت پائی تھی۔ انھیں اللہ کے رسول ﷺ نے یمامہ میں مسیلمہ کذاب کی طرف قاصد بنا کر بھیجا تھا۔ بدری صحابہ نعمان بن عبد، عمرو بن مسعود اور ان کے بھائی ضحاک، نیز کعب بن زید بن قیس اور عبداللہ بن ابوخالد بن قیس رضی اللہ عنہم کا تعلق بنو دینار سے تھا۔[1]

بُعاث کا خون ریز معرکہ

اسلام سے پہلے یہودیوں کی سازشوں کے باعث اوس اور خزرج میں 120 برس تک وقتاً فوقتاً لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ان میں سے مشہور یہ ہیں: حربِ سُمیر، حربِ کعب بن عمرو، یوم السرارہ، یوم الدّیک اور حربِ بُعاث۔ بیشتر جنگوں میں خزرج فتح یاب رہے۔ آخر کار اوس نے یہود بنوقریظہ سے اتحاد کر لیا اور جب خزرج نے یہود کو جنگ کی دھمکی دی تو انھوں نے غیر جانبداری ظاہر کی۔ اس پر خزرج نے یہود سے یرغمال مانگے تو انھوں نے اپنے چالیس نوجوان خزرج کے حوالے کر دیے جو ان کے مختلف قبیلوں نے بانٹ لیے۔ اس کے بعد قبائل خزرج نے متحد ہو کر اوس پر حملہ کر دیا جس میں بہت سے اوسی مارے گئے۔

ابوالفرج اصفہانی کہتے ہیں کہ اوس کے ایک شخص نے خزرج کے ایک حلیف کو قتل کر دیا۔ انھوں نے قصاص یا خون بہا مانگا تو اوس نے انکار کر دیا، یوں ان میں جنگ چھڑ گئی جو جنگ بعاث کہلاتی ہے۔

یہ جنگ 7 نبوی/617ء میں نخلستانِ عوالی کے شمال مغرب میں بنوقریظہ کے علاقے بُعاث میں لڑی گئی۔[2] اوس کا سالار حضیر بن سماک (اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کا والد) تھا۔ اس کا مدِ مقابل سردار عمرو بن نعمان تھا۔ اس کے ساتھیوں

[1] ملخص از وفاء الوفا للسمهودي: 1/190-214. [2] معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 47.

میں بڑی تعداد تو خزرج کی تھی لیکن بنو جُہینہ کے کچھ بدوی بھی ان کے ساتھ آ ملے تھے۔ دوسری طرف تمام اوسی قبائل رزم آرا تھے، سوائے بنو حارثہ کے جنھیں عبدالاشہل نے ان کے علاقے سے نکال دیا تھا۔ جنگ میں اوّل اوّل اوس کو پیچھے ہٹا دیا گیا تھا لیکن انجام کار انھوں نے اپنے مخالفوں کو بھگا دیا۔ اگرچہ دونوں طرف کے سالار لڑائی میں ہلاک ہوگئے، پھر بھی کوئی قطعی تصفیہ نہ ہوسکا بلکہ لڑائی کا خاتمہ ایک غیر تسلی بخش عارضی صلح پر ہوا حتی کہ اسلام نے آکر اوس اور خزرج کو باہم شیر وشکر کر دیا۔ [1]

اوس وخزرج آلِ اسماعیل ہیں؟

انصار کے قبائل اوس اور خزرج کے نسب کے بارے میں ماہرین انساب میں خاصا اختلاف ہے۔ عام مؤرخین اور اہلِ انساب کا کہنا ہے کہ اوس اور خزرج یمن سے آئے تھے اور وہ قحطان کی اولاد سے ہیں جو عرب متعربہ (عرب عاربہ) یعنی تمام اہلِ یمن کا جدامجد تھا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ (م 852ھ) نے فتح الباری میں صحیح البخاری کے باب "نسبة اليمن إلى إسماعيل" کی شرح میں اس پر خاصی بحث کی ہے، وہ لکھتے ہیں: "قحطان کے نسب میں اختلاف ہے۔ اکثر اہل علم کا خیال ہے کہ قحطان، عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح (علیہ السلام) کا بیٹا یا ہود علیہ السلام کی اولاد یا ان کا بھتیجا تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے عربی میں کلام کیا اور وہ عرب متعربہ کا جد اعلیٰ ہے جبکہ اسماعیل علیہ السلام عرب مستعربہ کے جدِّ امجد تھے...... لیکن زبیر بن بکار کے خیال میں خود قحطان، اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے تھا اور اس کا نسب یہ ہے: قحطان بن ہمیسع بن تیم بن نبت بن اسماعیل۔" [2]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بیان کردہ قصۂ ہاجرہ سے بھی واضح ہے جبکہ انھوں نے انصار سے کہا تھا: فَتِلْكَ أُمُّكُمْ يَا بَنِي مَاءِ السَّمَاءِ! "اے آسمانی پانی کے بیٹو! وہ تمھاری ماں تھیں۔" [3] امام ابوحاتم ابن حبان رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ تمام اولادِ ہاجرہ بنی ماء السماء کہلاتی ہے کیونکہ اسماعیل علیہ السلام حضرت ہاجرہ کے بیٹے ہیں اور انھوں نے آبِ زمزم سے پرورش پائی جو آسمان سے اترنے والا پانی ہے۔ [4]

بنو قحطان آلِ اسماعیل کیونکر؟

ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک قحطان کے آل اسماعیل ہونے کی بات راجح ہے کیونکہ کبار (انصاری)

---

[1] وفاء الوفا للسمهودي: 1/215-218، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 4/623. [2] فتح الباري: 6/657. [3] صحيح البخاري: 3358. [4] صحيح ابن حبان (الإحسان): 7/496.

صحابہ اور قحطان کے مابین آباء کی تعداد اس تعداد کے لگ بھگ ہے جو کبار (قریشی) صحابہ اور عدنان کے درمیان آباء کی ہے۔ اس کے بعد ابن حجر رحمہ اللہ نے عدنان اور اسماعیل علیہ السلام کے مابین سلسلۂ نسب کے دس سے زیادہ مختلف اقوال بیان کیے ہیں جن میں نسبی کڑیوں کی تعداد چار پانچ سے لے کر چالیس تک بتائی گئی ہے۔[1] ہم ان شدید اختلافات سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں: حدیث سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمنی قبیلہ بنو اسلم خزاعی قحطانی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ وہ بنو اسماعیل سے ہیں۔ ابن عبدالبر قرطبی نے قعقاع بن ابی حدرد رضی اللہ عنہ[2] کی روایت میں لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو اسلم اور خزاعہ کے ایک گروہ سے جو تیر اندازی کا مقابلہ کر رہے تھے، کہا تھا: ''اے بنو اسماعیل! تیر چلاؤ۔'' بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان میں بنوخزاعہ (اسماعیلی) زیادہ تھے، شاید اس لیے آپ نے ان سب کو بنو اسماعیل کہہ کر پکارا۔ اس بات سے اختلاف کرنے والے ہمدانی کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بنو اسلم اور بنوخزاعہ کو بنو اسماعیل کہنا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ اپنے باپوں کی طرف سے اولادِ اسماعیل ہیں، بلکہ ہوسکتا ہے وہ ماؤں کی طرف سے اولادِ اسماعیل ہوں کیونکہ قحطانی اور عدنانی باہم رشتے ناتے کر کے گھل مل گئے تھے۔ یوں آل قحطان ماؤں کی طرف سے بنو اسماعیل ہوسکتے ہیں۔ اہلِ یمن کے بنو اسماعیل سے ہونے کی ایک دلیل سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے دادا ابن منذر بن عمرو بن حرام[3] کے یہ اشعار بھی ہیں:

وَرِثْنَا مِنَ الْبُهْلُولِ عَمْرِو بْنِ عَامِرٍ وَ حَارِثَةَ الْغِطْرِيفِ مَجْدًا مُؤَثَّلَا

مَآثِرَ مِنْ آلِ نَبْتِ ابْنِ مَالِكٍ وَنَبْتِ ابْنِ إِسْمٰعِيلَ مَا إِنْ تَحَوَّلَا

''ہم نے بہلول عمرو (ثعلبہ) بن عامر اور حارثہ الغطریف کی حقیقی بزرگی ورثے میں پائی۔ اگر تحول (تبدیل) کر کے نسب نبت بن مالک[4] اور نبت بن اسماعیل میں سے کسی کے ساتھ بھی جوڑا جائے تو ہمیں ان دونوں کی وراثت ملی ہے۔''[5]

سید سلیمان ندوی کے دلائل

معروف محقق اور مؤرخ سید سلیمان ندوی نے انسابِ عرب پر بڑی تحقیق کی ہے۔ وہ ہشام بن محمد بن سائب کلبی

[1] فتح الباري:6/657-659. [2] بعض علماء نے ان کا نام قعقاع بن عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی رضی اللہ عنہ بتایا ہے۔ امام بخاری نے انھیں صحابہ میں شمار کیا ہے۔ [3] أسدالغابة (7/2) اور الإصابة (55/2) میں حسان رضی اللہ عنہ کے دادا کا نام ''منذر بن حرام بن عمرو'' ہے۔ [4] یہ نبت بن مالک قحطانی اور ازد بن غوث کے دادا تھے۔ (سبائك الذهب، ص: 118). [5] فتح الباري:6/659.

اور ابن ہشام کی آراء کو مسترد کرتے ہوئے حافظ ابن حجر ؒ کی رائے کی مطابقت میں اوس اور خزرج کے اسماعیلی ہونے پر درج ذیل مضبوط دلائل پیش کرتے ہیں:

1. صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے انصار کے ایک مجمع کو مخاطب کر کے حضرت ہاجرہ کا قصہ سُنایا اور آخر میں کہا: ''اے آسمان کے پانی کے بیٹو (پاک نسب والو)! یہ تھیں تمھاری ماں۔'' محدثین کو اس حدیث کی تاویل میں نہایت دقتیں پیش آئیں لیکن آج جدید تحقیق نے تاویل واشتباہ کا پردہ چاک کر دیا ہے۔

2. تمام علمائے انساب اس بات پر متفق ہیں کہ اوس اور خزرج، غسان کے ہم نسب ہیں اور اوس اور خزرج کا بھی بجائے خود یہی دعویٰ ہے، لہٰذا غسان کے نابتی الاصل (اسماعیلی) ہونے کے دلائل بعینہٖ اوس اور خزرج کے نابتی ہونے پر بھی دلالت کرتے ہیں۔

3. اوس وخزرج کے اسماعیلی ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ قریش سے ان کے رشتے ناتے تھے اور وہ ہر سال پابندی سے حج کو آتے تھے۔

4. منذر بن حرام (حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا دادا) جو زمانۂ جاہلیت میں تھا اور خزرج کے قبیلے سے تھا، (مذکورہ بالا) اشعار میں اپنا نسب نابت (یا نبت) بن اسماعیل تک پہنچاتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے۔

5. عمرو (مزیقیا) بن عامر بن حارثہ غسان اور اوس وخزرج دونوں کے پدرِ اعلیٰ تھے۔ غسان نے شام کا رُخ کیا اور اوس وخزرج نے حجاز کے شہر یثرب میں سکونت اختیار کی۔[1]

2 حارثہ بن عمرو مزیقیا



وادی مرالظہران (وادی فاطمہ)

بنو حارثہ بن عمرو مزیقیا میں خزاعہ بن عمرو بن لحی بن حارثہ کی اولاد بنو خزاعہ کہلائی۔ یہ لوگ پہلے سرزمین حجاز میں گھومتے ہوئے مَرّ الظّہران میں خیمہ زن ہوئے، پھر حرم پر دھاوا بول دیا اور بنو جرہم کو نکال کر خود مکہ میں بود وباش اختیار کر لی۔ عمرو بن لُحی ہی نے سب سے پہلے مکہ میں بُت پرستی کو رواج دیا۔ اُم المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا قبیلہ بنو مصطلق (جُزیمہ) انھی میں سے تھا۔ بنو حارثہ کی دیگر شاخیں اسلم،

[1] تاریخ ارض القرآن (کامل): 66,65/2.

بارق اور غامد تھیں۔ بنواسلم میں بُریدہ بن حُصیب اسلمی رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہوئے۔

3 عمران بن عمرو مزیقیا

عمران اوراس کی اولاد نے عُمان میں سکونت اختیار کی، اس لیے یہ لوگ ازدعمان کہلاتے ہیں۔ [1]

4 جفنہ بن عمرو مزیقیا (آل غسّان)

جفنہ نے شام کا رُخ کیا اور اپنی اولاد سمیت وہاں مقیم ہوگیا۔ انھیں آلِ غسّان اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے ازدی اجداد نے شام منتقل ہونے سے پہلے مشلّل (تہامہ) یا یمن میں غسّان نامی چشمے پر کچھ عرصہ قیام کیا تھا۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ مازن بن ازد کا نام غسان تھا جو غسانیوں کا جدِّ اعلیٰ ہے۔ [2]

علمائے انساب اوس وخزرج کی طرح غسانیوں کو بھی قحطانی قرار دیتے ہیں مگر ابوطاہر مقدسی البدء والاخبار میں لکھتے ہیں: ''سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے دادا منذر بن حرام جو زمانۂ جاہلیت کے شاعر تھے، ان (اوس وخزرج) کا نسب غسان تک، پھر ثابت بن مالک تک اور پھر نابت بن اسماعیل بن ابراہیم علیہ السلام تک بیان کرتے ہیں۔'' سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ انھیں عدنانی قرار دیتے ہوئے اس کی ایک یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ آل غسان کی زبان شمالی عربی اور خط تحریر نبطی ہے۔ اگر یہ قحطانی خاندان ہوتا تو زبان و خط دونوں حمیری ہوتے۔ [3]

(ب) نصر (شنوءہ) بن ازد

اس سے تعلق رکھنے والے قبائل نے تہامہ میں قیام کیا۔ یہ لوگ اَزدشَنُوءَہ کہلاتے ہیں۔ [4] نصر شنوءہ کی اولاد میں بنودوس نے شہرت پائی۔ طُفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ اسی قبیلے سے تھے۔

2 لَخم و جذام

زید بن کہلان کی اولاد میں عدی بن حارث بن مُرّہ بن اُدد بن زید کے چار بیٹے تھے: لَخم (مالک)، جُذام، عاملہ (حارث) اور عُفیر۔ لَخم کی بستیاں شام وفلسطین میں اور جُذام کی بستیاں مدین سے تبوک تک تھیں۔ قبول اسلام کے بعد بنولَخم مصر، المغرب (مراکش)، جولان (شام) اور کنعان (فلسطین) میں بکھرے ہوئے تھے۔ عراق میں آل منذر (غسانی) اور مغرب واندلس میں بنوعباد انھی میں سے تھے۔ قبل از اسلام یہ مشتری سیارے کی عبادت کرتے

---

1 محاضرات تاریخ الأمم الإسلامیة: 15/1. 2 معجم قبائل العرب: 884/3، محاضرات تاریخ الأمم الإسلامیة: 15/1.
3 تاریخ ارض القرآن (کامل): 61,60/2. 4 محاضرات تاریخ الأمم الإسلامیة: 15/1.

تھے۔ ان کے بُت کا نام اقیصر تھا۔

3 بنو طے

یہ طے (جلہمہ) بن اُدَد بن زید بن یشجب بن عریب بن زید بن کہلان کی اولاد ہیں۔ اس قبیلے نے بنو اُزد کے ترکِ وطن کے بعد شمال کا رخ کیا اور اجا اور سلمیٰ نامی دو پہاڑوں کے اطراف میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہو گیا یہاں تک کہ یہ دونوں پہاڑ قبیلہ طے کی نسبت سے مشہور ہو گئے۔ مشہورِ عالم، سخی عرب سردار حاتم طائی کا تعلق اسی قبیلے سے تھا۔ ان کے فرزند عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور جلیل القدر صحابہ میں شمار ہوئے۔

4 بنو کندہ

یہ لوگ لخم و جذام کے بھائی عفیر بن عدی بن حارث بن مرہ بن ادد بن زید بن یشجب کی نسل سے تھے۔ یہ پہلے بحرین (موجودہ اَلْاَحْسَاء) میں خیمہ زن ہوئے لیکن مجبورًا وہاں سے منتقل ہو کر حضرموت چلے گئے، تاہم انھیں وہاں بھی امان نہ ملی اور آخر کار نجد میں ڈیرے ڈالنے پڑے، پھر یہاں ان لوگوں نے ایک عظیم الشان حکومت کی داغ بیل ڈالی۔



جبال اجا و سلمیٰ (حائل)

بنو حمیر کے معروف قبائل

بنو حمیر کے تین قبائل زیادہ مشہور ہوئے: 1 بنو قضاعہ 2 بنو سکسک 3 زید الجمہور۔

1 بنو قضاعہ

مالک بن حمیر کی اولاد میں سے قبیلہ قضاعہ مشہور ہے (اگرچہ اس کا حمیری ہونا مختلف فیہ ہے)۔ انھوں نے یمن سے ترکِ وطن کر کے حدود عراق میں بادیہ سماوہ کے اندر بود و باش اختیار کی۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں قضاعہ کی شاخیں بلی، کلب، عذرہ اور جُہینہ مشہور تھیں۔

2 بنو سکسک

زید بن وائلہ (وائل) بن حمیر کے بیٹے سکسک کی اولاد سکاسک کہلائی۔ سکسک یمن کا بادشاہ تھا، اس کا لقب مُقَعْقِعُ الْعُمُد (بہت زیادہ سفر کرنے والا) تھا۔ اس نے عراق میں وفات پائی اور یمن میں دفن کیا گیا۔[1] (بنو کندہ کی ایک شاخ حُمیس السکسک کہلاتی تھی۔)[2]

3 زید الجمہور

ان کا نسب نامہ زید الجمہور بن سہل بن عمرو بن قیس بن معاویہ بن جشم بن عبد شمس بن وائل بن الغوث بن قطن بن عریب بن ایمن بن حمیر ہے۔

[1] معجم البلدان، مادة: السكاسك، معجم قبائل العرب: 527/2، الأعلام: 105/3. [2] ان قبائل کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: قلب جزيرة العرب، ص: 231-236، محاضرات تاريخ الأمم الإسلامية: 16,15/1.

3

عرب مستعربہ

بیشتر مؤرخین کے مطابق عرب بائدہ اور عرب عاربہ کے بعد عربوں کا تیسرا بڑا نسلی گروہ عرب مستعربہ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد ہیں۔ اسماعیل علیہ السلام سُریانی عبرانی زبان بولتے تھے اور مکہ میں قحطانی قبیلہ بنوجرہم کے ساتھ رہ کر انھوں نے اور ان کی اولاد نے عربی زبان سیکھ لی، لہٰذا وہ عرب مستعربہ کہلائے۔ لیکن شام کے محقق شوقی ابوخلیل اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتے اور یہ کہتے ہیں کہ ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی زبان بذات خود عربی تھی۔ وہ لکھتے ہیں: ''عرب مستعربہ والی بات ایک خود ساختہ کہانی ہے جو بعض مؤرخین نے بیان کی اور چلی آرہی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کا دور بذاتِ خود عربی دور ہے، اس کا سُریانی زبان بولنے والوں یا یہود سے کوئی تعلق نہیں...... ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں اس خطے کی زبان ایک ہی (لغت ام، یعنی مادری زبان) تھی اور جزیرہ نمائے عرب کے لوگ ہلال خصیب (Fertile Crescent) کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے وہی زبان (عربی) بولتے تھے۔ اس وقت ابھی اس زبان کی مختلف بولیاں، جیسے کنعانی، آرامی اور عموری وجود میں نہیں آئی تھیں۔ یوں آرامی قبائل جن سے ابراہیم علیہ السلام تعلق رکھتے تھے، ان کی زبان بھی وہی تھی جسے فلسطین کے کنعانی اور عموری بولتے تھے اور وہ لغت اُم (عربی آرامی) کے بہت قریب تھی...... سیدنا ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام عربی آرامی قبائل سے تعلق رکھتے تھے جو کہ اسرائیلیوں، موسویوں اور یہود کے وجود میں آنے سے صدیوں پہلے اس خطے میں آباد تھے...... ''سامی'' اور ''غیر سامی'' کی اصطلاحات کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتیں۔ ''سامی'' کا شوشہ سب سے پہلے جرمن عالم اے ایل شلوتسر نے، یہودی دعاوی کی حمایت میں، اپنی کتاب ''توراتی و مشرقی ادب کی فہرست'' (مطبوعہ 1781ء) میں چھوڑا تھا۔''[1]



آرامی عربی کا عکس

عرب مستعربہ کا آغاز سیدنا ابراہیم اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہما السلام سے ہوتا ہے، اس لیے ان دونوں برگزیدہ ہستیوں کے مختصر احوال یہاں پیش خدمت ہیں۔

[1] اطلس القرآن، ص: 44-47.

1 ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا نسب نامہ بائبل میں یوں ہے:

ابراہیم بن تارخ (آزر) بن ناحور بن شاروغ بن ارغوا بن فالغ بن عابر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح (علیہما السلام)۔[1] اُردو بائبل میں والد کا نام ''تارح'' درج ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام

ارشاد باری ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِيمُ لِأَبِيهِ ءَازَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا ءَالِهَةً﴾

''اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا: کیا تم بتوں کو معبود ٹھہراتے ہو؟''[2]

ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر علمائے انساب کا یہ کہنا ہے کہ اس کا اصل نام تارح تھا۔[3] امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے فرمایا: میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ اس کا نام آزر تھا۔ ممکن ہے، اسے دو ناموں سے پکارا جاتا ہو۔[4] قرآن مجید نے صراحت سے آزر کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا باپ کہا ہے۔ علاوہ ازیں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ابراہیم (علیہ السلام) کی روز قیامت اپنے باپ آزر سے ملاقات ہوگی، جب کہ آزر کے چہرے پر سیاہی اور گرد پڑ رہی ہوگی۔''[5] یوں کتاب و سنت دونوں ابراہیم علیہ السلام کے باپ کے نام ''آزر'' پر متفق ہیں، لہٰذا صحیح ترین قول یہی ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی جائے پیدائش: کوثیٰ

یہ بات مشہور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی جائے پیدائش بابل (عراق) کا شہر ''اُور'' تھا۔ دراصل آپ کی پیدائش بابل کے شمال مشرق میں واقع ''کوثی'' نامی قصبے میں ہوئی، البتہ آگ سے صحیح سلامت بچ نکلنے کے بعد آپ اُور چلے

---

[1] المعارف لابن قتيبة، ص: 15، کتاب مقدس (پیدائش) 11:10-27. [2] الأنعام 6:74. [3] البداية والنهاية: 1/134. [4] تفسير الطبري، الأنعام 6:74. [5] صحيح البخاري: 3350.



حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب شہر ''اُور''

آئے اور وہیں سے آپ نے پہلے حران کی طرف اور پھر حران سے فلسطین کی طرف ہجرت کی تھی۔[1] کوثیٰ کا بابل شہر سے فاصلہ تقریباً 40 کلومیٹر ہے۔ معجم البلدان میں کوثیٰ کے ذیل میں لکھا ہے:

''یہ نہر کوثیٰ کے کنارے واقع تھا جو بنو ارفخشد بن سام بن نوح (علیہ السلام) میں سے کوثیٰ نامی شخص سے موسوم تھی۔ وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی والدہ بونا بنت کرنبا بن کوثیٰ کے دادا تھے۔ نہر کوثیٰ فرات سے نکالی گئی پہلی نہر تھی۔ مشہور تابعی عبیدہ سلمانی رحمہ اللہ نے علی رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم کوثیٰ کے نبطی ہیں۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ قول مروی ہے کہ ہم خاندانِ قریش، نبط کوثیٰ کی ایک شاخ ہیں۔ عہد فاروقی میں فتح قادسیہ کے بعد سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے حکم پر سیدنا زہرہ بن حَوِیَّہ رضی اللہ عنہ نے کوثیٰ پر حملہ کیا اور وہاں کے حاکم شہر یار کو قتل کر کے شہر پر قبضہ کرلیا۔ مقامی روایت کے مطابق یہ وہی جگہ تھی جہاں نمرود اور اس کے اہل وطن نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا تھا۔ سعد رضی اللہ عنہ نے بابل سے کوثیٰ جا کر اس شہر کی زیارت کی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام پر درود بھیجا اور آیت پڑھی:

﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (آل عمرٰن 3:140)

''ہم زمانے کو لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔''[2]

ابراہیم علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان مشابہت

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سیدنا ابراہیم علیہ السلام (کا حلیہ معلوم کرنے) کے لیے اپنے ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھ لو۔ رہے موسیٰ علیہ السلام تو وہ گھنگریالے بالوں والے، گندمی رنگت کے تھے، سرخ اونٹ پر سوار تھے جس کی نکیل کھجور کے پتوں کی تھی،

[1] اٹلس سیرت نبوی (دارالسلام)، ص:43. [2] اٹلس سیرت نبوی، ص:44،43، معجم البلدان، مادۃ: کوثی۔

گویا میں انھیں دیکھ رہا ہوں کہ وادی کے نشیب میں اتر رہے ہیں۔''[1]

بت پرست باپ سے مکالمہ

ابراہیم علیہ السلام کا والد بتوں کا پجاری تھا، پجاری ہی نہیں بت تراش بھی تھا، چنانچہ آپ نے سب سے پہلے اسی کو دعوتِ توحید دی۔ آپ نے پیار بھرے حکیمانہ انداز میں توحید کا درس دیا مگر باپ نے انتہائی سخت رویہ اختیار کیا اور ابراہیم علیہ السلام کو سخت دھمکی دی۔ ارشاد باری ہے:

﴿ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝﴾

''جب اس (ابراہیم علیہ السلام) نے اپنے باپ سے کہا: اے میرے باپ! تو اس کی عبادت کیوں کرتا ہے جو نہ سنے، نہ دیکھے اور نہ تیرے کچھ کام آئے؟ اے میرے باپ! بے شک میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا' لہٰذا تو میرا اتباع کر، میں تجھے سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ! تو شیطان کی عبادت نہ کر، بلاشبہ شیطان رحمٰن کا سخت نافرمان ہے۔ اے ابا جان! بے شک میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تجھے رحمٰن کی طرف سے عذاب آ پکڑے، پھر تو شیطان کا ساتھی ہو جائے۔ وہ (آزر) کہنے لگا: اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے منہ پھیرے ہوئے ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے ضرور رجم کر دوں گا اور تو لمبا عرصہ مجھ سے دور چلا جا۔ اس (ابراہیم علیہ السلام) نے کہا: تجھ پر سلامتی ہو' عنقریب میں تیرے لیے اپنے رب سے استغفار کروں گا' بے شک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ اور میں کنارہ کش ہوتا ہوں تم سے اور اُن سے جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو اور میں تو اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں۔ امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر محروم نہ رہوں گا۔''[2]

اجرامِ فلکی کے غروب سے معرفتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو مظاہرِ قدرت کے حکیمانہ مشاہدے کے ذریعے سے ایمان و یقین کا اعلیٰ ترین

[1] صحيح البخاري: 3355. [2] مريم 19:42-48.

رتبہ عطا فرمایا تاکہ آپ پُرزور طریقے سے اور دلائل کی روشنی میں دعوتِ توحید دے سکیں۔ ارشاد باری ہے:

﴿ وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ○ فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ○ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ ﴾

''اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی دکھاتے تھے، تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے، چنانچہ جب اس پر رات چھا گئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا۔ اس نے کہا: یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ غروب ہو گیا تو کہا: میں غروب ہونے والوں سے محبت نہیں کرتا۔ پھر جب اس نے چاند چمکتا ہوا دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے۔ پھر جب وہ غروب ہو گیا تو اس نے کہا: اگر میرے رب نے مجھے ہدایت نہ دی تو یقیناً میں گمراہ قوم میں سے ہو جاؤں گا۔ چنانچہ جب اس نے سورج کو جگمگاتا ہوا دیکھا تو کہا: یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے۔ پھر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو اس نے کہا: اے میری قوم! بے شک جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو، میں ان سے بیزار ہوں۔ بے شک میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف مرکوز کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، میں اسی (اللہ) کا پرستار ہوں اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔''[1]

بُت پرستوں کو بت شکن کی طرف سے دعوتِ غور و فکر

اہلِ بابل بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام نے ایک روز اُن سے بت پرستی کے بارے میں مناظرہ کیا اور وہ لوگ ہٹ دھرم ثابت ہوئے تو ابراہیم علیہ السلام نے ان کے بتوں کو توڑ پھوڑ کر قوم کے سامنے ان کا باطل ہونا واضح فرمایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ○ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ۭ ○ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓي اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ○ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۭ ○ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ڰ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ○ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۙ○ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰي رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَاۗءِ يَنْطِقُوْنَ ○ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْـــًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۭ○

[1] الأنعام 6:75-79.

﴿ أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾

''چنانچہ اس نے ان کے بڑے (بت) کو چھوڑ کر باقی سب کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ وہ (آئے اور) کہنے لگے: کس نے ہمارے معبودوں کا یہ حال کیا ہے؟ بلاشبہ وہ ضرور ظالموں میں سے ہے۔ لوگوں نے بتایا: ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا، اسے ابراہیم کہا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا: پھر تم اسے لوگوں کے سامنے لے آؤ تاکہ وہ دیکھیں۔ (ابراہیم علیہ السلام بُلانے پر آئے تو) انھوں نے پوچھا: اے ابراہیم! کیا تو نے ہمارے معبودوں کا یہ حال کیا ہے؟ انھوں نے کہا: (نہیں) بلکہ یہ کام ان کے اس بڑے نے کیا ہے، لہٰذا تم ان سے پوچھ لو اگر وہ بولتے ہیں۔ پھر انھوں نے اپنے دل میں سوچا تو (باہم) کہنے لگے: بے شک تم ہی ظالم ہو۔ پھر وہ (شرمندگی کے مارے) اپنے سر ڈال کر اوندھے ہو رہے (اور کہا:) بلاشبہ تو جانتا ہے کہ یہ (بت) بولتے نہیں۔ ابراہیم نے کہا: کیا پھر تم اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہو جو تمھیں کچھ نفع نہیں دے سکتے اور نہ تمھیں نقصان دے سکتے ہیں۔ تُف ہے تم پر اور ان پر جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو، کیا پھر تم عقل نہیں رکھتے؟''[1]

نارِ نمرود کا سرد ہونا

گمراہ قوم نے لاجواب ہونے پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو نشانِ عبرت بنانے کا پروگرام بنایا۔ انھوں نے ابراہیم علیہ السلام کو بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص تدبیر سے اپنے خلیل کو بچا کر اپنی قدرت کاملہ کا اظہار اور اہل ایمان کے لیے وعدۂ نصرت کا اثبات فرمایا۔ فرمانِ الٰہی ہے:

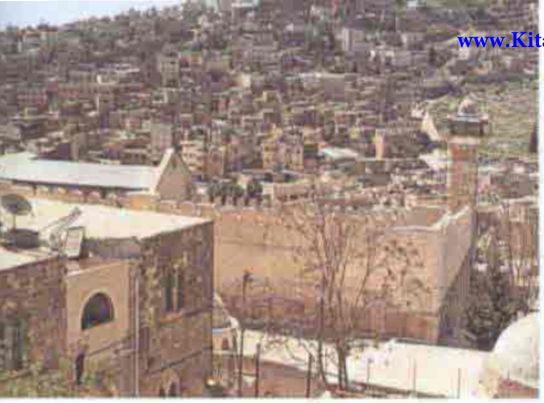
﴿ قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝ وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۝ ﴾

''انھوں نے کہا: اگر تمھیں کچھ کرنا ہے تو اس (ابراہیم) کو جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ ہم نے کہا: اے آگ! تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا۔ اور انھوں نے ابراہیم کا برا چاہا تھا، تو ہم نے انھیں ہی بہت خسارے میں ڈال دیا۔''[2]

اُور، حران اور فلسطین کی طرف ہجرت

سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے والد اور قوم سے جدا ہو کر فرات کے دائیں کنارے ایک بستی میں چلے گئے جو ''اُور کلدانیہ''

[1] الأنبیآء 21:58-67. [2] الأنبیآء 21:68-70.



الخلیل میں مسجد ابراہیمی



حران (ترکی) کے آثار

کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ ان کے بھتیجے لوط علیہ السلام اور زوجہ سارہ علیہا السلام ان کے ہمراہ تھے۔ کچھ دنوں بعد یہاں سے حران (الجزیرہ) کی راہ لی اور وہاں جا کر دین حنیف کی تبلیغ شروع کر دی۔ اس کے بعد ابراہیم علیہ السلام حلب (شام) سے ہوتے ہوئے فلسطین جا پہنچے اور اسے دعوت و تبلیغ کا مرکز بنالیا۔[1]

سفرِ مصر اور حضرت ہاجرہ سے شادی

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فلسطین کو دعوت و تبلیغ کا مرکز بنا لیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک بار آپ مصر تشریف لے گئے۔ آپ کی بیوی سیدہ سارہ علیہا السلام بھی ہمراہ تھیں۔ وہاں کے جابر بادشاہ کو ان کے بہت حسین ہونے کے بارے میں بتایا گیا تو وہ بدنیت ہوگیا اور انھیں اپنے پاس بُرے ارادے سے بلایا لیکن اللہ تعالیٰ نے سیدہ سارہ علیہا السلام کی دعا کے نتیجے میں اسے اپنی شدید گرفت میں لے لیا تو وہ برے ارادے سے باز آ گیا اور اس نے ایک شہزادی ہاجرہ علیہا السلام کو ان کی خدمت میں دے دیا۔ پھر سیدہ سارہ علیہا السلام نے سیدہ ہاجرہ علیہا السلام کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی زوجیت میں دے دیا۔[2]

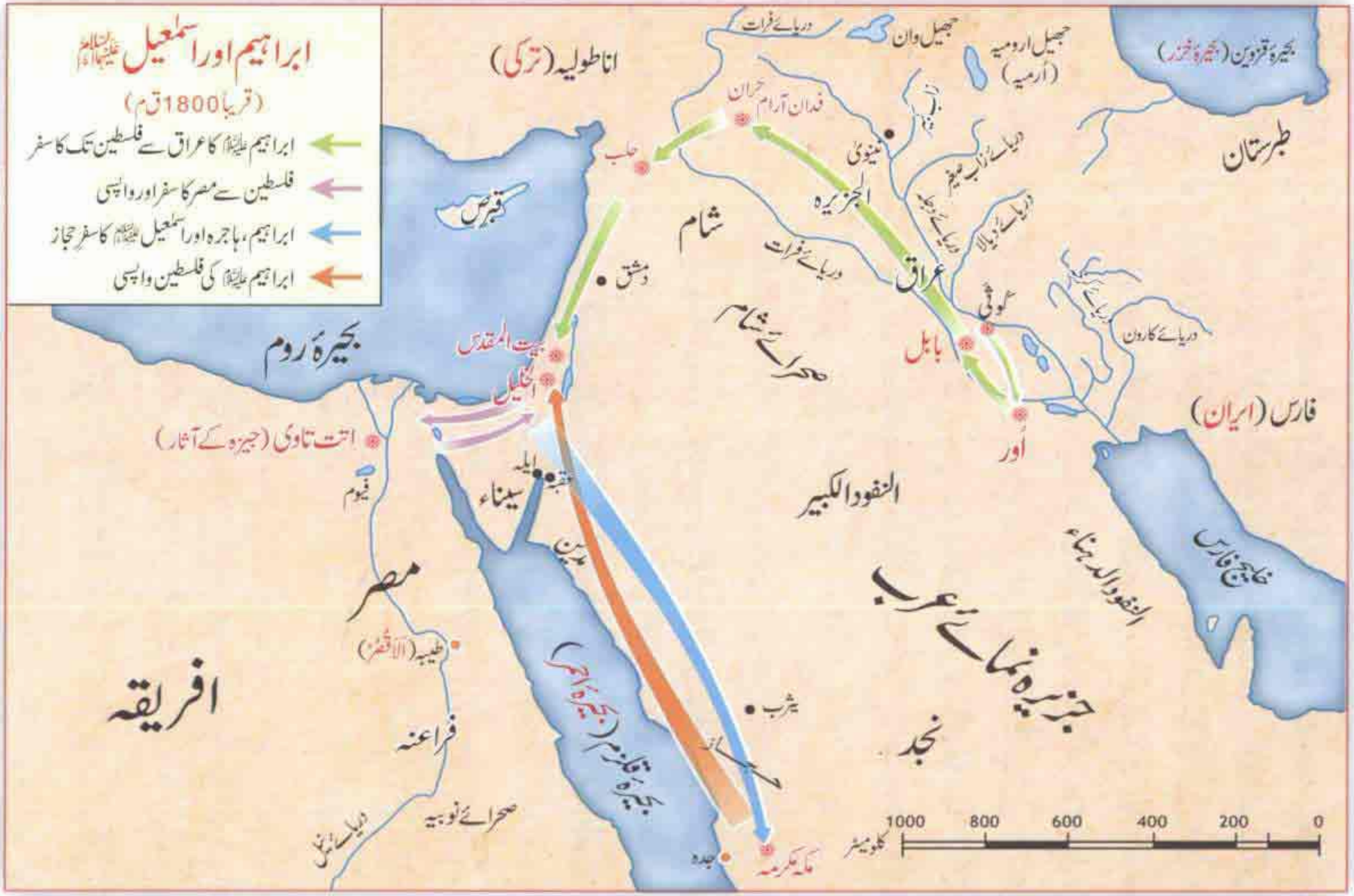
مشہور ہے کہ سیدہ ہاجرہ علیہا السلام لونڈی تھیں لیکن علامہ سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ نے مفصل تحقیق کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ لونڈی نہیں بلکہ آزاد تھیں اور شہزادی تھیں۔[3]

حضرت سارہ کی فرمائش اور حکمِ الٰہی

سیدنا ابراہیم علیہ السلام سیدہ سارہ علیہا السلام کو ہمراہ لے کر فلسطین واپس تشریف لائے، پھر اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو سیدہ ہاجرہ کے بطن سے ایک فرزند ارجمند اسماعیل علیہ السلام عطا فرمایا لیکن بشری تقاضے سے سیدہ سارہ کو، جو بے اولاد تھیں، اپنی محرومی کا شدید احساس ہوا اور انھوں نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو مجبور کیا کہ ہاجرہ کو ان کے نوزائیدہ بچے سمیت کسی اور جگہ بسائیں۔ یہ سیدہ سارہ ہی کی خواہش نہ تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کو چونکہ اپنے گھر بیت اللہ (خانہ کعبہ) کو

---

[1] اطلس القرآن (اردو)، ص: 74 و 80. [2] صحیح البخاري: 2217 و 3358. [3] دیکھیے: رحمۃ للعالمین: 2/38-41.


ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام
(قریباً 1800 ق م)
ابراہیم علیہ السلام کا عراق سے فلسطین تک کا سفر
فلسطین سے مصر کا سفر اور واپسی
ابراہیم، ہاجرہ اور اسمٰعیل علیہ السلام کا سفرِ حجاز
ابراہیم علیہ السلام کی فلسطین واپسی
اناطولیہ (ترکی)
بحیرۂ قزوین (بحیرۂ خزر)
طبرستان
جھیل وان
جھیل ارومیہ (ارمیہ)
دریائے فرات
حلب
فدان آرام حران
نینوی
الجزیرہ
شام
دمشق
قبرص
بحیرۂ روم
بیت المقدس
الخلیل
عراق
بابل
کوثی
اُور
دریائے کارون
فارس (ایران)
صحرائے شام
النفود الکبیر
النفود الدہناء
خلیج فارس
جزیرہ نمائے عرب
نجد
یثرب
مکہ مکرمہ
جدہ
سیناء
ایلہ
مدین
بحیرۂ قلزم (بحیرۂ احمر)
اتت تاوی (جیزہ کے آثار)
فیوم
مصر
طیبہ (الاقصر)
افریقہ
فراعنہ
صحرائے نوبیہ
دریائے نیل
1000 800 600 400 200 0
کلومیٹر

آباد کرنا مقصود تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی یہی تھی جس کی تائید صحیح بخاری کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سیدہ ہاجرہ اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو ہمراہ لے کر حجاز تشریف لائے اور وہاں ایک بے آب و گیاہ وادی میں بیت اللہ کے قریب ٹھہرا دیا۔ اُس وقت بیت اللہ شریف نہ تھا، صرف ٹیلے کی طرح اُبھری ہوئی زمین تھی۔ سیلاب آتا تو پانی دائیں بائیں سے نکل جاتا تھا۔ وہیں ایک بہت بڑا درخت تھا۔ آپ نے اسی درخت کے پاس سیدہ ہاجرہ اور سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو چھوڑا اور ایک توشہ دان میں کھجوریں اور ایک مشکیزے میں پانی ان کے لیے رکھ دیا اور واپس چل پڑے۔ سیدہ ہاجرہ ان کے پیچھے بھاگیں اور پوچھا: ابراہیم! آپ ہمیں اس ویران وادی میں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟ مگر ان کے بار بار پکارنے پر جواب دینا تو کجا ابراہیم علیہ السلام نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ آخر کار وہ کہنے لگیں: کیا آپ کو ہمیں یہاں چھوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا: ہاں! سیدہ ہاجرہ یہ سن کر لوٹ آئیں اور کہنے لگیں: ''تب اللہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔''

آلِ ابراہیم وادیِ غیر ذی زرع میں

ابراہیم علیہ السلام چلتے گئے حتی کہ جب ایک گھاٹی کے پاس پہنچے اور بیوی بچے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو بیت اللہ کی طرف منہ کیا اور یہ دعا کی:

﴿رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَشْكُرُوْنَ ۝﴾

''اے ہمارے رب! بے شک میں نے اپنی کچھ اولاد ایک بے زراعت وادی میں بسائی ہے، تیرے محترم گھر (کعبے) کے پاس تاکہ اے ہمارے رب! وہ نماز قائم کریں، لہٰذا تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انھیں ہر قسم کے پھلوں سے رزق دے تاکہ وہ (تیرا) شکر کریں۔''[1]

چشمۂ زمزم کا جاری ہونا

چند دنوں میں پانی ختم ہو گیا۔ حضرت ہاجرہ اور ان کا بیٹا پیاس اور بھوک سے بے چین ہو گئے۔ بلکتا بچہ ماں سے دیکھا نہ گیا، وہ بھاگیں اور قریبی پہاڑی صفا پر چڑھیں اور وادی میں ادھر ادھر دیکھنے لگیں، شاید کوئی نظر آ جائے لیکن اس سنسان فضا میں کوئی نظر نہ آیا۔ وہ صفا سے اتریں، ہموار زمین پر آئیں اور دامن اٹھا کر کچھ دور تیزی سے

[1] إبراهيم 14:37.

بھاگیں، پھر مروہ پہاڑی پر جا کھڑی ہوئیں۔ وہاں بھی کوئی نظر نہ آیا تو نیچے اتر آئیں۔ وہ بے قراری کے عالم میں اسی طرح دونوں پہاڑیوں کے درمیان چکر لگاتی رہیں اور اس طرح انھوں نے سات چکر لگائے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''حج اور عمرے میں سعی کرنے کی بنیاد یہی ہے۔'' (ساتویں چکر میں) جب حضرت ہاجرہ مروہ پر چڑھیں تو جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور زمزم کی جگہ پر اپنی ایڑی یا پر رگڑنے لگے حتی کہ وہاں سے پانی نکل آیا۔ وہ دیکھ کر بھاگیں اور آ کر حوض سا بنانے لگیں تا کہ پانی محفوظ ہو جائے۔ انھوں نے پانی جلدی جلدی اپنے مشکیزے میں بھرا جو فوارے کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

«يَرْحَمُ اللّٰهُ أُمَّ إِسْمٰعِيلَ، لَوْ تَرَكَتْ زَمْزَمَ ۔ أَوْ قَالَ: لَوْلَمْ تَغْرِفْ مِنْ زَمْزَمَ ۔ لَكَانَتْ زَمْزَمُ عَيْنًا مَّعِينًا»

''اللہ تعالیٰ ام اسماعیل پر رحمتیں نازل فرمائے! اگر وہ زمزم چھوڑ دیتیں (بہنے دیتیں) یا فرمایا: اگر وہ زمزم سے چلو نہ بھرتیں تو زمزم ایک جاری چشمہ ہوتا۔''

حضرت ہاجرہ نے وہ پانی پیا اور اپنے بیٹے کو دودھ پلایا۔ اس کے بعد فرشتے نے ان سے کہا: اپنے ہلاک ہونے کا بالکل خوف نہ کرنا کیونکہ یہاں اللہ تعالیٰ کا گھر ہے جسے یہ بچہ اور اس کا باپ تعمیر کریں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ضائع نہیں کرتا۔

بنوجرہم کی آمد اور وادیٔ مکہ میں سکونت

اس طرح وہاں ماں بیٹے کے شب و روز گزرتے رہے۔ آخر ایک دن قبیلۂ جرہم کی ایک جماعت یا چند گھرانے اس راستے سے گزرے، انھوں نے قریب ہی مقام کداء (مکہ کا بالائی حصہ) کے راستے سے گزر کر مکہ کے نشیبی علاقے میں پڑاؤ کیا۔ (قریب ہی) آسمان پر منڈلاتے ہوئے کچھ پرندے دیکھے تو انھوں نے کہا: یہ پرندے ضرور پانی پر منڈلا رہے ہیں، حالانکہ اس سے پہلے جب بھی ہم اس جگہ سے گزرے ہیں، یہاں پانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ آخر انھوں نے اپنے ایک دو آدمی بھیجے۔ انھوں نے واپس آ کر ساتھیوں کو پانی موجود ہونے کی اطلاع دی۔ اب یہ سب لوگ یہاں آئے۔ اس وقت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ پانی ہی کے قریب بیٹھی تھیں۔ ان لوگوں نے کہا: کیا آپ ہمیں اپنے پڑوس میں پڑاؤ ڈالنے کی اجازت دیں گی؟ ہاجرہ علیہا السلام نے فرمایا: ہاں! لیکن پانی پر تمھارا کوئی حق

(ملکیت) نہیں ہوگا۔ انھوں نے یہ شرط تسلیم کر لی۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اب ام اسماعیل علیہا السلام کو پڑوسی مل گئے۔ وہ انسانوں کی موجودگی کو پسند کرتی تھیں۔'' ان لوگوں نے خود بھی یہاں قیام کیا اور اپنے قبیلے کے باقی لوگوں کو بھی پیغام بھیج کر بلالیا، اس طرح وہاں ان کے کئی گھرانے آباد ہوگئے۔[1]

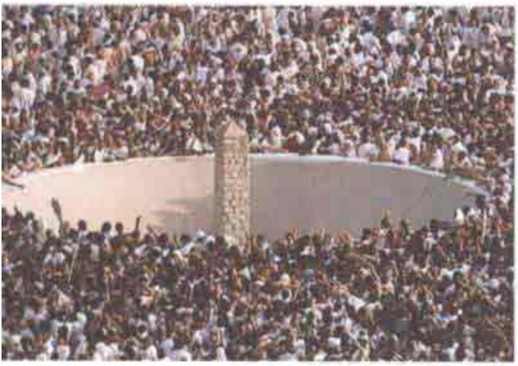
[1] صحيح البخاري:3364.

2 اسماعیل علیہ السلام اور ذبحِ عظیم

سیدنا ابراہیم علیہ السلام وقتاً فوقتاً مکہ تشریف لایا کرتے تھے۔ ایک روز اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں دکھایا کہ وہ اپنے صاحبزادے (اسماعیل) کو ذبح کر رہے ہیں۔ پیغمبر کو معلوم ہوگیا کہ یہ حکمِ الٰہی ہے۔ اس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر سات سال تھی۔

شیطان کی نامرادی

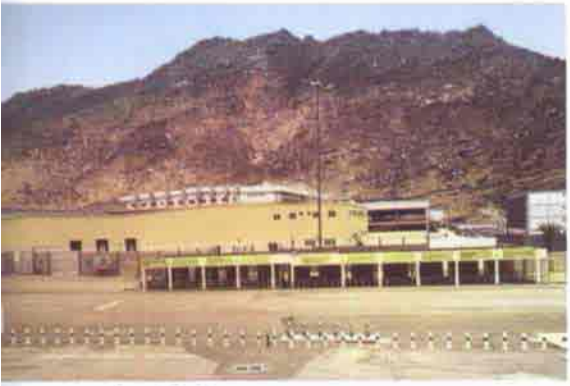
جب باپ بیٹا دونوں اس حکمِ الٰہی کی تعمیل کے لیے تیار ہوگئے اور دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا تو شیطان ایک آدمی کی شکل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے ابراہیم! تو کہاں جانا چاہتا ہے؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: میں اپنے کام کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ شیطان کہنے لگا: تُو چاہتا ہے کہ اسماعیل کو ذبح کرے؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: تمھارا خیال ہے کہ باپ اپنے بیٹے کو ذبح کر سکتا ہے؟ شیطان کہنے لگا: ہاں! تم اسے ذبح کرنے جا رہے ہو۔ وہ فرمانے لگے: یہ کیسے ممکن ہے؟ شیطان کہنے لگا: تمھارا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں حکم دیا ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام فرمانے لگے: اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے تو پھر ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ شیطان نامراد لوٹ گیا۔ پھر وہ سیدہ ہاجرہ کے پاس گیا اور ان سے اسی طرح بات کی اور انھوں نے بھی سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی طرح جواب دیا۔ پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس آیا اور ان سے بھی وہی بات کہی۔ انھوں نے بھی کہا: اگر اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے تو ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ شیطان رسوا ہو کر نامراد لوٹ گیا۔



جمرات وہ مقام ہے جہاں شیطان نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش کی۔ مسلمان فریضہ حج کے دوران میں اس جگہ کنکریاں مارتے ہیں

باپ بیٹا قربان گاہ کی جانب

سیدنا ابراہیم علیہ السلام سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو لے کر منیٰ کی طرف چل دیے جہاں اللہ نے (اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے


میدان منیٰ میں وہ جگہ جہاں قربانی کی جاتی ہے

کا) حکم دیا تھا۔ یہی جگہ ہے جہاں آج کل قربانیاں کی جاتی ہیں۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اے میرے بیٹے! اللہ جل جلالہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمھیں ذبح کروں۔ اسماعیل علیہ السلام کہنے لگے: اللہ کے حکم کی تعمیل کیجیے کیونکہ ہر قسم کی بھلائی اسی کی تعمیل میں ہے، پھر پوچھا: کیا میری والدہ کو اس کا علم ہے؟ انھوں نے فرمایا: نہیں! اسماعیل علیہ السلام کہنے لگے: آپ نے اچھا کیا کیونکہ مجھے ان کے غمگین ہونے کا خدشہ تھا، لیکن اے میرے والد محترم! جب آپ چھری چلائیں تو اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیں، اس طرح آپ مجھے نہیں دیکھیں گے اور صبر کریں گے۔

اللہ کے حضور سرخروئی

اس کے بعد باپ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کی گردن پر چھری چلانے لگے لیکن چھری گلا نہ کاٹ سکی۔ حضرت ابراہیم نے دو یا تین مرتبہ چھری کو پتھر پر تیز کیا لیکن ہر مرتبہ چھری نے عمل نہ کیا۔ اس وقت اللہ نے پکارا: ''اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا۔ بے شک ہم نیکو کاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک کھلی آزمائش تھی اور ہم نے اس (اسماعیل) کے بدلے میں ایک عظیم ذبیحہ عطا فرمایا۔''[1] (الصّٰٓفّٰت 37 : 102-107)

ذبیح کون تھے؟

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی ؕ قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ؗ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ۝ۚ وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰٓاِبْرٰهِیْمُ ۝ۙ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۝ وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ۝﴾

''پھر جب وہ (لڑکا) اس کے ساتھ دوڑنے بھاگنے (کی عمر) کو پہنچا تو اس نے کہا: اے میرے پیارے بیٹے!

[1] [ضعیف] المستدرك للحاكم: 556,555/2، حدیث: 4040۔

بلاشبہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ بے شک میں تجھے ذبح کررہا ہوں، اب تو دیکھ! تیری کیا رائے ہے؟ اس (بیٹے) نے کہا: اباجان! جو آپ کو حکم دیا گیا ہے، کرگزریں، اگر اللہ نے چاہا تو عنقریب آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے، پھر جب دونوں مطیع ہو گئے اور اس (باپ) نے اس (بیٹے) کو پیشانی کی ایک جانب لٹا دیا اور ہم نے اسے پکارا: اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب یقیناً سچ کردکھایا، بے شک ہم نیکوکاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ تو کھلی آزمائش ہی ہے اور ہم نے اس (اسمٰعیل) کے بدلے میں ایک عظیم القدر (جانور) ذبح کرنے کو دیا اور ہم نے اس (ابراہیم علیہ السلام کے ذکرِ خیر) کو پیچھے آنے والوں میں باقی رکھا۔''[1]

اہلِ کتاب اس کے برعکس یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ذبیح اسحٰق علیہ السلام تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب میں جہاں سیدنا اسماعیل کا نام تھا، وہاں اسحٰق لکھ دیا۔ لیکن موجودہ تحریف شدہ بائبل کے دوسرے مقامات سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کا نام ڈالنے کی وجہ سے بائبل کی عبارات میں اس معاملے میں واضح تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ ایک طرف اکلوتے فرزند کے ساتھ اسماعیل کی بجائے اسحٰق لکھا گیا اور دوسری طرف واضح طور پر موجود ہے کہ اسحاق سے تیرہ یا چودہ سال پہلے ابراہیم علیہ السلام کے ہاں اسماعیل پیدا ہوئے تھے۔ بائبل کا پہلا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اِن باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے اَبرہام (ابرام) کو آزمایا اور اُسے کہا: اے ابرہام! اُس نے کہا: میں حاضر ہوں۔ تب اُس نے کہا کہ تو اپنے بیٹے اِضحاق کو جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اُسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر جو میں تجھے بتاؤں گا سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔ تب ابرہام نے صبح سویرے اُٹھ کر اپنے گدھے پر چارجامہ کسا اور اپنے ساتھ دو جوانوں اور اپنے بیٹے اضحاق کو لیا اور سوختنی قربانی کے لئے لکڑیاں چیریں اور اُٹھ کر اُس جگہ کو جو خدا نے اُسے بتائی تھی روانہ ہوا۔ تیسرے دن ابرہام نے نگاہ کی اور اُس جگہ کو دور سے دیکھا۔ تب ابرہام نے اپنے جوانوں سے کہا: تم یہیں گدھے کے پاس ٹھہرو۔ میں اور یہ لڑکا دونوں ذرا وہاں تک جاتے ہیں اور سجدہ کر کے پھر تمھارے پاس لوٹ آئیں گے۔ اور ابرہام نے سوختنی قربانی کی لکڑیاں لے کر اپنے بیٹے اضحاق پر رکھیں اور آگ اور چھری اپنے ہاتھ میں لی اور دونوں اکٹھے روانہ ہوئے۔ تب اضحاق نے اپنے باپ ابرہام سے کہا: اے باپ! اُس نے جواب دیا کہ اے میرے بیٹے! میں حاضر ہوں۔ اُس نے کہا: دیکھ آگ اور لکڑیاں تو ہیں پر سوختنی قربانی کے لیے برّہ کہاں ہے؟ ابرہام نے کہا: اے میرے بیٹے! خدا آپ ہی اپنے واسطے سوختنی قربانی کے لئے برہ مہیا کرے گا۔ سو وہ دونوں آگے

[1] الصّٰٓفّٰت 37:102-108.

چلتے گئے۔ اور اُس جگہ پہنچے جو خدا نے بتائی تھی۔ وہاں ابرہام نے قربان گاہ بنائی اور اُس پر لکڑیاں چنیں اور اپنے بیٹے اضحاق کو باندھا اور اُسے قربان گاہ پر لکڑیوں کے اوپر رکھا۔ اور ابرہام نے ہاتھ بڑھا کر چھری لی کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرے۔ تب خداوند کے فرشتہ نے اُسے آسمان سے پکارا کہ اے ابرہام! اے ابرہام! اُس نے کہا: میں حاضر ہوں۔ پھر اُس نے کہا: تو اپنا ہاتھ لڑکے پر نہ چلا اور نہ اُس سے کچھ کر کیونکہ میں اب جان گیا کہ تو خدا سے ڈرتا ہے، اس لیے کہ تو نے اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے مجھ سے دریغ نہ کیا۔'' [1]

مذکورہ بالا اقتباس کی تردید بائبل ہی سے ملاحظہ ہو:

''اور ابرام کی بیوی سارَی کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اُس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔ اور سارَی نے ابرام سے کہا کہ دیکھ خداوند نے مجھے اولاد سے محروم رکھا ہے سو تو میری لونڈی کے پاس جا شاید اُس سے میرا گھر آباد ہو اور ابرام نے سارَی کی بات مانی۔ اور ابرام کو ملک کنعان (فلسطین اور فنیقیہ) میں رہتے دس برس ہوگئے تھے جب اُس کی بیوی سارَی نے اپنی مصری لونڈی اُسے دی کہ اُس کی بیوی بنے۔ اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور جب اُسے معلوم ہوا کہ وہ حاملہ ہوگئی تو اپنی بی بی کو حقیر جاننے لگی۔'' [2]

اسی باب کی آیت نمبر 11 میں ہے:

''اور خداوند کے فرشتہ نے اُس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا ہوگا۔ اُس کا نام اسماعیل رکھنا، اِس لیے کہ خداوند نے تیرا دُکھ سن لیا۔''

بائبل کی رو سے جب اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیاسی (86) سال تھی:

''اور جب ابرام سے ہاجرہ کے اسماعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔'' [3]

اور جس وقت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے، اس وقت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو برس تھی:

''اور جب اُس کا بیٹا اضحاق اُس سے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا۔'' [4]

جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دی تو کہا:

''سارَی جو تیری بیوی ہے، سو اُس کو سارَی نہ پکارنا۔ اُس کا نام سارہ ہوگا۔ اور میں اُسے برکت دوں گا

[1] کتاب مقدس (پیدائش) 22: 1-12. [2] کتاب مقدس (پیدائش) 16: 1-4. [3] کتاب مقدس (پیدائش) 16: 16. [4] کتاب مقدس (پیدائش) 21: 5.

اور اس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشوں گا۔ یقیناً میں اسے برکت دوں گا کہ قومیں اُس کی نسل سے ہوں گی اور عالم کے بادشاہ اُس سے پیدا ہوں گے۔ تب ابرہام سرنگوں ہوا اور ہنس کر دل میں کہنے لگا کہ ''کیا سو برس کے بڈھے سے کوئی بچہ ہو گا اور کیا سارہ کے جو نوّے برس کی ہے اولاد ہو گی؟'' اور ابرہام نے خدا سے کہا کہ ''کاش! اسمٰعیل ہی تیرے حضور جیتا رہے۔'' تب خدا نے فرمایا کہ ''بے شک تیری بیوی سارہ کے تجھ سے بیٹا ہو گا۔ تو اُس کا نام اضحاق رکھنا اور میں اُس سے اور پھر اُس کی اولاد سے اپنا عہد جو ابدی عہد ہے باندھوں گا۔''[1]

اس اقتباس میں اسحاق علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہی ان کی زندگی اور اولاد کے بارے میں بتایا جا رہا ہے، پھر کیسی قربانی اور کیسی آزمائش؟

امام ابن القیم نے زاد المعاد میں بیس قطعی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ذبیح اسماعیل علیہ السلام تھے، اسحاق علیہ السلام نہیں تھے۔[2]

اسماعیل علیہ السلام کی شادی اور والد مکرم کی تشریف آوری

حضرت اسماعیل علیہ السلام بنو جرہم کے بچوں میں جوان ہوئے۔ وہ ان کے ساتھ عربی زبان بولتے تھے۔ جوانی میں سیدنا اسماعیل علیہ السلام اتنے خوبصورت تھے کہ سب کی نظریں آپ کی طرف اٹھتی تھیں۔ آپ سب سے زیادہ بھلے لگتے تھے، چنانچہ جرہم والوں نے آپ کی اپنے قبیلے میں شادی کر دی، پھر سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ایک روز سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنے خاندان کو دیکھنے آئے۔ سیدنا اسماعیل علیہ السلام گھر پر نہ تھے، اس لیے آپ نے ان کی بیوی سے ان کے متعلق پوچھا تو اُس نے بتایا کہ روزی کی تلاش میں کہیں گئے ہیں۔ پھر آپ نے اس سے ان کی معاش وغیرہ کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا: حالت اچھی نہیں ہے، بڑی مشکل سے گزر اوقات ہوتی ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: جب تمھارے شوہر آئیں تو انھیں میرا سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ وہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل ڈالیں۔

پھر جب سیدنا اسماعیل علیہ السلام واپس تشریف لائے تو جیسے انھوں نے کوئی چیز محسوس کی اور دریافت کیا: کیا یہاں کوئی صاحب آئے تھے؟ ان کی بیوی نے بتایا کہ ہاں، ایک بزرگ اس اس حلیے کے آئے تھے اور آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں نے انھیں بتایا، پھر انھوں نے پوچھا کہ تمھاری گزر اوقات کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا کہ ہماری گزر اوقات بڑی تنگی سے ہوتی ہے۔ سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے دریافت کیا کہ انھوں نے تم سے کچھ کہا بھی ہے؟ بیوی

[1] کتاب مقدس (پیدائش) 17: 15-19۔ [2] زاد المعاد: 1/71-75۔

نے کہا: ہاں، انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کو ان کا سلام اور یہ پیغام پہنچادوں کہ آپ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دیں۔

فرمانِ پدری کی تعمیل میں دوسری شادی

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بیوی سے فرمایا: وہ بزرگ میرے والد تھے اور مجھے حکم دے گئے ہیں کہ میں تمھیں جدا کردوں، اب تم اپنے گھر جاسکتی ہو۔ سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے اسے طلاق دے دی اور بنوجرہم ہی کے ایک شخص مضاض کی بیٹی سے شادی کرلی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کچھ عرصے کے بعد دوبارہ تشریف لائے تو اس مرتبہ بھی اسماعیل علیہ السلام گھر پر موجود نہ تھے۔ آپ نے ان کی نئی بیوی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ہمارے لیے روزی تلاش کرنے گئے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان کی گزر بسر اور دوسرے حالات کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ہمارا حال بہت اچھا ہے، بڑی فراخی ہے، نیز اس نے ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی۔ ابراہیم علیہ السلام نے دریافت کیا: تم کھاتے کیا ہو؟ اس نے بتایا: گوشت۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ پیتے کیا ہو؟ بتایا کہ پانی۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعا کی: ''اے اللہ! ان کے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان دنوں ان کے ہاں اناج نہیں تھا۔ اگر اناج بھی ان کے کھانے میں شامل ہوتا تو ضرور آپ اس میں بھی برکت کی دعا فرماتے۔'' چنانچہ صرف گوشت اور پانی کی خوراک پر گزارا کرنا مکہ کے سوا کہیں بھی موافق نہیں آتا۔

ابراہیم علیہ السلام نے ان سے فرمایا: جب تمھارے شوہر واپس آجائیں تو ان سے میرا سلام کہنا اور ان سے کہہ دینا کہ وہ اپنے دروازے کی چوکھٹ باقی رکھیں۔ جب اسماعیل علیہ السلام واپس تشریف لائے تو انھیں کسی کی آمد محسوس ہوئی، انھوں نے پوچھا: کیا یہاں کوئی آیا تھا؟ بیوی نے بتایا: جی ہاں! ایک بزرگ بڑی اچھی شکل وصورت کے آئے تھے۔ اس نے بزرگ کی تعریف کی اور کہا: انھوں نے مجھ سے آپ کے متعلق پوچھا تو میں نے بتادیا، پھر انھوں نے پوچھا: تمھاری گزر بسر کیسے ہوتی ہے؟ میں نے بتایا کہ ہم اچھی حالت میں ہیں۔ سیدنا اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا: کیا انھوں نے تمھیں کوئی نصیحت بھی کی تھی؟ اس نے کہا: جی ہاں! انھوں نے آپ کو سلام کہا تھا اور یہ کہا تھا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ کی حفاظت کریں۔

اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا: یہ بزرگ میرے والد تھے۔ چوکھٹ تم ہو اور وہ مجھے حکم دے گئے ہیں کہ میں تمھیں

اپنے ساتھ رکھوں۔

تعمیرِ کعبہ

اس کے بعد جب ابراہیم علیہ السلام ان کے ہاں تشریف لائے تو دیکھا کہ اسماعیل علیہ السلام زمزم کے قریب ایک بڑے درخت کے سائے میں (جہاں ابراہیم علیہ السلام انھیں چھوڑ گئے تھے) اپنے تیر بنا رہے ہیں۔ جب اسماعیل علیہ السلام نے ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا تو ان کے استقبال کو کھڑے ہوگئے۔ باپ بیٹا محبت سے ملے، پھر ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اسماعیل! اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس مقام پر اللہ تعالیٰ کا ایک گھر بناؤں اور یہ کہہ کر آپ نے ایک اونچے ٹیلے اور اس کے اردگرد کی طرف اشارہ کیا۔

اس جگہ ان دونوں نے بیت اللہ کی بنیادیں اٹھائیں۔ اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے اور ابراہیم علیہ السلام تعمیر کرتے جاتے تھے۔ جب دیواریں بلند ہوگئیں تو اسماعیل علیہ السلام یہ پتھر (مقام ابراہیم) لے آئے جس پر کھڑے ہوکر سیدنا ابراہیم علیہ السلام تعمیر کرنے لگے۔ اسماعیل علیہ السلام پتھر دیے جاتے تھے۔ وہ دونوں اس کے گرد گھوم گھوم کر تعمیر کرتے ہوئے یہ دعا پڑھتے جاتے:

﴿ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ ﴾ (البقرة 2:127)

"اے ہمارے رب! تو ہم سے (یہ نیکی) قبول کرلے، بے شک تو ہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔"[1]



مقام ابراہیم (حرم کعبہ)

[1] صحيح البخاري: 3364.

3 بنو اسماعیل اور انباط

اللہ تعالیٰ نے بنت مضاض سے اسماعیل علیہ السلام کو بارہ بیٹے عطا فرمائے جن کے نام یہ تھے: نابت یا نبایوت (نبت، نبط یا نبایوط)، قیدار، ادبائیل، مبشام، مشماع، دوما، میشا، حدر یا حدد، تیما، یطور، نفیس، قیدمان۔ انھوں نے مکہ ہی میں بودوباش اختیار کی۔ ان کی معیشت کا دار و مدار زیادہ تر یمن اور مصر و شام کے علاقوں سے تجارت پر تھا۔ بعد میں یہ لوگ جزیرہ نمائے عرب کے مختلف اطراف میں بلکہ بیرونِ عرب بھی پھیل گئے۔ ان میں صرف نابت اور قیدار کی اولاد نے تاریخ میں شہرت پائی۔[1] یاد رہے کہ اسماعیل علیہ السلام کے علاّتی بھائی اسحٰق علیہ السلام کے بھی بارہ بیٹے تھے۔

نبطیوں کا عروج

نابت (نبط) کی اولاد کو نبطی یا انباط کہا جاتا ہے۔ نبطیوں کے تمدن کو شمالی حجاز میں عروج حاصل ہوا۔ انھوں نے ایک طاقتور حکومت قائم کر کے گرد و پیش کے تمام لوگوں پر اپنی حکومت قائم کر لی اور دوسری ریاستوں کو اپنا باجگزار بنالیا۔ پطرا (Petra) ان کا دارالحکومت تھا (جس کے کھنڈر جنوب مغربی اردن میں موجود ہیں)۔ پھر رومیوں کا دور آیا اور انھوں نے نبطیوں سے سلطنت چھین لی۔ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے ثابت کیا ہے کہ آلِ غسان اور انصار، یعنی اوس و خزرج قحطانی عرب نہ تھے بلکہ اس علاقے میں نابت بن اسماعیل علیہ السلام کی جو نسل بچی کھچی رہ گئی تھی، آل غسان اور اوس و خزرج انھیں میں سے تھے۔[2]

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل مکہ میں پھلتی پھولتی رہی یہاں تک کہ عدنان اور پھر ان کے بیٹے مَعَدّ کا زمانہ آگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عدنانی عربوں کا سلسلۂ نسب صحیح طور پر یہیں تک محفوظ ہے۔

عدنان قیدار کی اولاد ہیں یا نابت کی؟

نابت حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ان کی اور ان کے بھائی قیدار کی اولاد نے عرب میں

[1] قلب جزیرۃ العرب، ص: 230. نابت بن اسماعیل (علیہ السلام) کے بعد بیت اللہ کی تولیت بنوجرہم کو مل گئی تھی، تاہم امور کعبہ کی نگرانی بدستور بنو اسماعیل کے پاس رہی جو ان کے نزدیک معزز و محترم تھے۔ [2] دیکھیے: تاریخ ارض القرآن (کامل): 2/60-69.



مآخذ: الأطلس التاريخي لسيرة الرسول ★ معجم قبائل العرب ★ أسد الغابة ★ معجم ما استعجم ★ كتاب الشجرة النبوية ★ سبائك الذهب

پرورش پائی۔ عدنان کے نسب کے بارے میں مؤرخین میں خاصا اختلاف ہے۔ ابن اسحاق، ابن ہشام اور امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کو نابت کی اولاد میں شمار کیا ہے جبکہ ابن سعد اور ابن جریر طبری رحمہما اللہ نے انھیں قیدار کی اولاد بتایا ہے۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ ابن سعد اور طبری رحمہما اللہ نے ان کا نسب اہلِ کتاب سے لیا ہے جیسا کہ ابن سعد نے وضاحت کی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بعض روایات میں عدنان کو نابت بن قیدار بن اسماعیل کی اولاد بتایا گیا ہے جیسا کہ قصی بن کلاب نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے:

''مکے میں قیدار اور نبیت (نابت) کی اولاد بستی ہے۔'' گویا نابت بن اسماعیل (علیہ السلام) کے ایک بھتیجے نابت بن قیدار بن اسماعیل (علیہ السلام) تھے جو عدنان کے جد امجد تھے اور یہ بات طبری نے بھی لکھی ہے۔ یاد رہے، سارے مؤرخین اور محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ عدنان سے اسماعیل علیہ السلام تک نسب کی کئی کڑیاں گم ہیں جس کی وجہ سے عدنان کے نسب میں اختلاف در آیا ہے۔[1]

[1] السيرة لابن إسحاق: 17/1، السيرة لابن هشام: 34/1، الطبقات لابن سعد: 56/1، تاريخ الطبري: 28/2، التاريخ الكبير: 5/1.

بنوعدنان کے مختلف قبائل

عدنان، نبیِ اکرم ﷺ کے سلسلۂ نسب میں اکیسویں پشت پر ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ ﷺ جب اپنا سلسلۂ نسب بیان فرماتے تو عدنان پر پہنچ کر رک جاتے اور آگے نہ بڑھتے بلکہ فرماتے کہ آگے اہل انساب غلط کہتے ہیں۔ [1] علماء کی ایک جماعت کے مطابق عدنان اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے درمیان چالیس پشتیں ہیں۔ یہ بھی روایت ہے کہ عدنان کے بیٹے معد، شاہِ بابل بخت نصر کے ہم عصر تھے۔ قاضی سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے لیکن رسول اللہ ﷺ سے لے کر اس دور تک اتنے کم واسطے ہیں کہ یہ معاصرت ممکن نظر نہیں آتی۔ واللہ اعلم بالصواب!

امام ابن قتیبہ فرماتے ہیں کہ معد بن عدنان کے آٹھ بیٹے تھے۔ ان میں سے چار مشہور ہوئے۔ ان چاروں کے نام یہ ہیں: قضاعہ، نزار، قنص اور ایاد۔ قضاعہ سے حمیری قبائل پھلے پھولے۔ شاہانِ حیرہ قنص کی نسل سے تھے۔ ایاد کی نسل سے کوئی قابلِ ذکر قبائل نہیں ملتے۔ نزار نے ان میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ [2] نزار کے چار بیٹے تھے: ایاد، انمار، ربیعہ اور مُضر۔ [3]

ان میں سے مؤخر الذکر دو قبیلوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ ربیعہ سے عبدالقیس اور وائل، ان سے بکر اور تغلب اور بکر سے بنوحنیفہ اور بنوعجل نے تاریخِ عرب میں خاص مقام حاصل کیا۔

قیسی قبائل

مُضر کی اولاد دو بڑے قبیلوں میں تقسیم ہوئی: 1 قیس بن عیلان بن مضر 2 الیاس بن مضر۔

قیس عیلان کی نسل سے بہت زیادہ قبائل نکلے، مثلاً: بنوغطفان، بنوسلیم، بنوہوازن اور بنومازن۔ بنوغطفان سے عبس، ذبیان، غنی (بنواعصر) اور اشجع قبائل وجود میں آئے۔ نبی ﷺ کی رضاعی ماں حلیمہ رضی اللہ عنہا سعد بن بکر بن ہوازن

---

[1] تاریخ الطبري: 2/28-32، الأعلام: 4/218، السلسلة الضعيفة: 1/229,228، حديث: 111. [2] المعارف لابن قتيبة، ص: 29. [3] الأنساب للسمعاني: 1/23، الروض الأنف: 1/160.

سے تھیں جبکہ امہات المؤمنین میمونہ بنت حارث اور زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کا تعلق ہوازن کی شاخ بنو ہلال سے تھا۔ بنومحارب اور بنوثقیف بھی قیس عیلان سے تعلق رکھتے ہیں۔ بنوفزارہ، بنوذبیان کی شاخ ہیں اور عدوان اور باہلہ بھی قیس عیلان کے ذیلی قبیلے ہیں۔ رعل، ذکوان اور عصیہ بنوسُلیم کی شاخیں ہیں۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل بنوسلیم کی طرف ستر (70) قرائے کرام دین کی تعلیم کے لیے روانہ کیے تو انھوں نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دھوکے سے شہید کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان قبائل کے خلاف ایک ماہ اور دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ چالیس دن بددعا کی۔[2]

مضری قبائل

بنوتمیم، بنومُدرِکہ اور بنوخُزیمہ: الیاس بن مُضر کے بیٹے مدرکہ اور ان کے بیٹے خزیمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں تھے۔ طابخہ بن الیاس بن مضر سے مشہور قبیلہ تمیم بن مُر اور مُدرکہ بن الیاس سے ہُذَیل بن مدرکہ، بنو اسد بن خُزیمہ اور کِنانہ بن خُزیمہ ہیں۔ ابوذر غِفاری رضی اللہ عنہ کا تعلق بکر بن عبدمناۃ بن کنانہ سے تھا۔

کنانہ اور اسد کے علاوہ خزیمہ کے ایک اور بیٹے ہون تھے۔ بنواسد اور قارہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خُزیمہ میں جمع ہوتے ہیں۔ عضل بن ہُون بن خزیمہ اور دیش بن ہون بن خزیمہ دونوں قبیلوں کو ملا کر قارہ (یا عضل و قارہ) کہا جاتا ہے۔ ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا بنواسد سے تعلق رکھتی تھیں۔ مُدرکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بنوہُذیل ملتے ہیں۔ مشہور صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اسی قبیلے کے ایک ممتاز فرد ہیں۔ بنوتمیم اور مُزَینہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ الیاس میں ملتے ہیں۔

بنوکنانہ: بنوکنانہ بن خُزیمہ بن مُدرکہ بن الیاس بن مُضر ایک بڑے عرب قبیلے کا نام ہے جس کی خیمہ گاہیں آغاز اسلام کے وقت مکے کے گردونواح کے اس علاقے میں تھیں جو شہر کے جنوب مغرب میں تہامہ سے لے کر شہر کے شمال مشرق تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور عرب نسابوں کی نظر میں ان کی خاص اہمیت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ قریش کا نسب اوپر جا کر اسی قبیلے کنانہ سے مل جاتا ہے۔ فہر (قریش)، کنانہ کے پڑپوتے تھے۔

بنوکنانہ حرم کعبہ کے پڑوس میں رہتے تھے، اس لیے زمانۂ قبل از اسلام کی تاریخ میں ان کا نہایت اہم کردار رہا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ خاندان قریش کے سردار قُصَی نے شہر مکہ کی حکومت بنوخزاعہ سے خریدی تھی۔ بعد ازاں

[1] مختصر سیرۃ الرسول (اردو)، ص: 28,27. [2] صحیح البخاري: 1300 و 2801.

اس سلسلے میں جھگڑا کھڑا ہوا تو کنانہ کے شیخ یعمر بن عوف کو آخری فیصلہ دینے کے لیے منتخب کیا گیا۔ انھوں نے دلائل و شواہد کی روشنی میں کنانہ ہی کی دوسری شاخ "قریش" کے حق میں فیصلہ صادر کیا۔ اسی فیصلے کے باعث انھیں الشدّاخ کا لقب ملا۔ ابن ہشام کے بقول انھیں الشُدّاخ بھی کہا گیا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے فیصلے کے ذریعے سے اس جھگڑے کو کچل دیا تھا۔[1]

بنوکنانہ میں قریش کے علاوہ بنوبکر، بنومُدلج، بنولیث، بنوضمرہ اور بنوحارث (جن میں سے احابیش ہوئے) شامل ہیں۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بنوضمرہ میں سے تھے۔

قبیلہ قریش اور اس کی شاخیں

بنوکنانہ ہی کی ایک شاخ قریش ہے۔ یہ قبیلہ فہر (قریش) بن مالک بن نضر بن کنانہ کی اولاد ہے جو نبی کریم ﷺ کے دسویں جدامجد تھے۔ قریش بھی مختلف شاخوں میں تقسیم ہوئے۔ مشہور قریشی شاخوں کے نام یہ ہیں: حارث، محارب، غالب، جمح، سہم، عامر، عدی، مخزوم، تیم، کلاب، زُہرہ، اسد، ہاشم اور اُمیّہ۔

بنو غالب، بنومحارب اور بنو حارث: فہر کے تین بیٹے غالب، محارب اور حارث تھے۔ غالب کی اولاد میں سے لؤیّ نمایاں تھے اور ان کی اولاد میں بنوکعب اور بنوعامر مشہور ہوئے۔ ام المؤمنین سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا بنوعامر میں سے تھیں۔ ابوعُبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ بنوحارث بن فہر میں سے تھے جبکہ بدری صحابی ضرار بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قبیلہ بنومحارب تھا۔ کعب نبی ﷺ کے ساتویں جدِ امجد تھے۔

بنوعدی، بنوسہم اور بنوجمح: کعب بن لؤی کے تین فرزند تھے: عدی، مُرّہ اور ہُصَیص۔ بنوعدی میں آگے چل کر خلیفۂ ثانی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے شہرت پائی۔ ہصیص کی اولاد میں بنوسہم اور بنوجمح نامور ہوئے۔ عمرو بن عاص اور عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہما سہمی تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا نسب آٹھویں پشت میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ کعب بن لؤی پر جا ملتا ہے۔ مکہ کی شہری ریاست میں سفارت اور تصفیۂ مقدمات کے شعبے بنوعدی کو حاصل تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی یہ اعزازات ملے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چچا زاد زید بن عمرو بن نفیل اپنے زمانے میں دین ابراہیمی کے پیروکار تھے۔ ان کے بیٹے سعید بن زید رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔

بنوتیم، بنویقظہ اور بنوکلاب: مُرّہ بن کعب کے تین فرزند کلاب، تیم اور یقظہ تھے۔ کلاب کے فرزند قصی رسول اللہ ﷺ کے چوتھے جدّامجد تھے۔ کلاب کے دوسرے بیٹے زہرہ کی اولاد بنوزہرہ کہلائی۔ رسول اللہ ﷺ کی والدہ محترمہ سیدہ آمنہ

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 412،411/17، السیرۃ لابن ہشام: 124/1۔

اور آپ کے مشہور ساتھیوں سعد بن ابی وقاص اور عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کا تعلق بنو زہرہ سے تھا۔ بنو تیم میں سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نمایاں ہوئے جن کا نسب ان کی ساتویں پشت میں مُرہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب سے مل جاتا ہے۔ یقظہ بن مُرہ کے بیٹے مخزوم کی اولاد میں ام المؤمنین ام سلمہ، خالد بن ولید اور ارقم بن ابی ارقم رضی اللہ عنہم اور ابوجہل (عمرو) بن ہشام تھے۔

بنو ہاشم، بنو عبدالدار اور بنو اسد: قُصی بن کلاب کے چار بیٹے تھے: عبدالعزیٰ، عبد مناف، عبدالدار اور عبد (عبد قصی)۔ عبد مناف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ بنو عبدالدار کے پاس سقایہ اور رفادہ کے مناصب رہے۔ [1] عبدالعزیٰ کے بیٹے اسد تھے۔ بنو اسد میں سے ام المؤمنین سیدہ خدیجہ بنت خویلد بن اسد رضی اللہ عنہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی زوجہ محترمہ تھیں۔ زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے حقیقی بھتیجے تھے۔

بنو عبد شمس اور بنو اُمیّہ: عبد مناف بن قُصی کے چار فرزند تھے: عبد شمس، نوفل، ہاشم اور المطلب۔ ان کی اولاد میں سے بنو عبد شمس اور بنو ہاشم زیادہ مشہور ہوئے۔ عبد شمس کے بیٹے امیہ کی اولاد بنو امیہ کہلائی جن میں ابو العاص، عاص اور حرب نمایاں تھے۔ خلیفۂ ثالث سیدنا عثمان بن عفان، ابوسفیان اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کا تعلق بنو امیہ ہی سے تھا۔ امیہ ہاشم کے سگے بھتیجے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے والد عفان بن ابی العاص بن امیہ اور ابوسفیان بن حرب بن امیہ باہم چچازاد تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی والدہ اروی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی ام حکیم بیضاء بنت عبدالمطلب کی صاحبزادی تھیں۔ [2] سعید بن عاص بن سعید بن عاص بن امیہ رضی اللہ عنہ ہجرتِ نبوی کے سال پیدا ہوئے، ان کے والد عاص جنگِ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مارے گئے۔ [3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسماعیل علیہ السلام کا انتخاب فرمایا، پھر اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کنانہ کو منتخب کیا اور کنانہ کی نسل سے قریش کو چنا، پھر قریش میں سے بنو ہاشم کا انتخاب کیا اور بنو ہاشم میں سے میرا انتخاب کیا۔“ [4]

بنو نوفل اور بنو مطلب: نوفل بن عبد مناف کی اولاد میں عدی بن خیار بن عدی بن نوفل رضی اللہ عنہ مشہور صحابی تھے جبکہ قَیس بن مَخرمہ اور قاسم بن مخرمہ رضی اللہ عنہما اور شہیدِ بدر عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ مطّلب بن عبد مناف کے پوتے تھے۔ مطلب اپنے دونوں بھائیوں ہاشم اور عبد شمس سے بڑے تھے۔ ان کی والدہ کا نام عاتِکہ بنت مُرّہ بن ہلال ہے۔ ہاشم کے بعد یہ

---

[1] السيرة النبوية لابن كثير، ص: 31,30. [2] اٹلس سیرتِ نبوی، ص: 57. [3] أسد الغابة: 328/2. [4] صحيح مسلم: 2276، جامع الترمذي: 3605.

حاجیوں کو پانی پلانے اور بیت اللہ کی صفائی ستھرائی کے ذمے دار ٹھہرے۔ تجارت کے لیے یمن گئے اور وہیں رَدمان کے علاقے میں انتقال کر گئے۔ [1]

آلِ عدنان کا عرب میں پھیلاؤ

عدنان کی نسل جب زیادہ بڑھ گئی تو وہ چارے پانی کی تلاش میں عرب کے مختلف اطراف میں بکھر گئی، چنانچہ آلِ ربیعہ میں قبیلہ عبدالقیس اور بکر بن وائل کی کئی شاخوں اور بنوطابخہ بن الیاس بن مضر کی شاخ بنوتمیم کے خاندانوں نے بحرین (الأحساء) کا رُخ کیا اور مشرقی عرب کے علاقے میں جا بسے۔

بنوحنیفہ بن صعب بن علی بن بکر نے یمامہ کا رُخ کیا اور اس کے مرکز حَجر میں سکونت پذیر ہوگئے۔ بکر بن وائل کی بقیہ شاخوں نے، یمامہ سے لے کر بحرین، ساحل کاظمہ (موجودہ کویت)، خلیج، سوادِ عراق، اُبُلّہ اور ہیت (عراق) تک کے علاقوں میں بودوباش اختیار کی۔

بنوتغلب بن وائل جزیرہ فراتیہ (الجزیرہ) میں اقامت گزیں ہوئے، البتہ ان کی بعض شاخوں نے بنوبکر کے ساتھ سکونت اختیار کی۔ بنوتمیم نجد اور بصرہ، یمامہ اور عُذیب نزد کوفہ تک پھیل گئے۔

بنوقیس کے قبیلے بنوسُلَیم نے یثرب (مدینہ) کے قریب ڈیرے ڈالے۔ ان کا مسکن وادی القریٰ سے شروع ہوکر خیبر اور مدینہ کے مشرق سے ہوتا ہوا حرّہ بنوسلیم سے متصل دو پہاڑوں تک پھیلا ہوا تھا۔

بنوثقیف نے طائف کو وطن بنا لیا اور بنوہوازن نے مکہ کے مشرق میں وادیِ اَوطاس کے گرد و پیش ڈیرے ڈالے۔ بنوثقیف دراصل بنوہوازن ہی کی ایک شاخ ہیں۔ ان کے جدامجد ثقیف بن منبہ بن بکر بن ہوازن تھے۔

[1] محاضرات تاریخ الأمم الإسلامية: 1/17-19، مزید دیکھیے: معجم قبائل العرب، الجمهرة لابن حزم.





بنو اسد بن خزیمہ تیماء (صوبہ تبوک) کے مشرق اور کوفہ کے مغرب میں خیمہ زن ہوئے۔ ان کے اور تیماء کے درمیان بنو طے کا ایک خاندان بحتر آباد تھا۔ بنو اسد کی آبادی اور کوفے کے درمیان پانچ دن کی مسافت تھی۔ بنوذبیان تیماء کے قریب اور حوران (شام) کے اطراف میں آباد ہوئے۔

تہامہ میں بنو کنانہ کے خاندان رہ گئے تھے۔ ان میں سے قریشی خاندانوں کی بودوباش مکہ اور اس کے اطراف میں تھی۔ یہ لوگ پراگندہ رہے حتی کہ قُصَیّ بن کلاب نے قریشیوں کو متحد کر کے شرف وعزت اور بلندی و وقار سے بہرہ ور کیا۔[1]



بنو کنانہ کا علاقہ

[1] الطبقات لابن سعد: 1/81-83، السيرة لابن هشام: 1/106، تاريخ الطبري: 2/14.

4 قومِ لوط

لوط علیہ السلام کا نام ونسب

حضرت لوط علیہ السلام ہاران کے بیٹے اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ ہاران یا حاران تارح (تارخ) کے سب سے چھوٹے بیٹے، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بھائی اور سیدنا لوط علیہ السلام کے باپ تھے۔ وہ اپنے باپ سے پہلے اُور میں فوت ہوئے۔[1] سیدنا ابراہیم علیہ السلام، ہاران اور ناحور آپس میں بھائی تھے۔[2] حضرت لوط علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور اُنھی کے ساتھ عراق سے حاران یا حرّان (ترکی) کی طرف ہجرت کی تھی۔ وہاں سے فلسطین آئے اور بیت المقدس (بیتِ ایل) کے مشرق میں واقع پہاڑی پر ڈیرا لگایا۔ لوط علیہ السلام کی اہلیہ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ چرواہے بادشاہوں کے دور میں وہ لوگ مصر پہنچے مگر وہاں حالات ناسازگار پائے تو واپس فلسطین کی راہ لی۔[3]

لوط علیہ السلام کی جائے نبوت

لوط علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے توسط سے اللہ تعالیٰ کے حکم پر ارضِ مقدس (فلسطین) کے شہر حبرون (الخلیل) سے منتقل ہوکر غورزغر (ضوغر) کے شہر ''سدوم'' میں رہائش پذیر ہوگئے تھے تاکہ وہاں کے لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچائیں۔ یہ علاقہ بحیرۂ مردار کے جنوب میں ہے۔ سدوم اس علاقے کا مرکزی مقام تھا۔ یہاں کے باشندے انتہائی فاسق و فاجر، کافر اور انتہائی بدکردار تھے۔ وہ راہزنی کے عادی اور سرعام بدفعلی کرنے والے تھے۔[4]



غار لوط علیہ السلام۔ سدوم (اردن)

---

[1] قاموس الکتاب، ص: 316، الروض الأنف: 40/1. [2] البداية والنهاية: 132/1. [3] کتاب مقدس (پیدائش)، باب: 11-13، اطلس القرآن (اردو)، ص: 104-106. [4] دیکھیے: البداية والنهاية: 144/1.



لوط علیہ السلام کی قوم کے مساکن

سدوم، عامورہ اور ضوعز

لوط علیہ السلام کی دعوت اور قوم کا جواب

اہلِ سدوم بے حیائی میں اس قدر حد سے گزر گئے کہ وہ نفسانی خواہش عورتوں کے بجائے مردوں سے پوری کرتے۔ لوط علیہ السلام نے انھیں اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی طرف بلایا اور ان تمام برائیوں سے باز رہنے کی تلقین کی تو انھوں نے پیغمبر کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑایا۔ اس جرم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ ان کا ذکر کیا ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے:

﴿ وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ○ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ○﴾

''اور (ہم نے) لوط کو (بھیجا) جب اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ایسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہو جو تم سے پہلے سارے جہان میں کسی نے نہیں کی۔ بے شک تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس شہوت سے آتے ہو بلکہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو۔''[1]

دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

﴿ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ○ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ○ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ○ وَمَآ اَسْــَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○﴾

''لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔ جب ان کے بھائی لوط نے ان سے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں؟ بے شک میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ پس اللہ سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ اور میں تم سے اس پر کسی اجر کا سوال نہیں کرتا۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمے ہے۔''[2]

قوم کے لوگوں نے اپنے نبی کی کوئی بات نہ مانی اور نہ آپ پر ایمان لائے بلکہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے رسول کو بستی سے نکال دینے کا ارادہ کر لیا، وہ کہنے لگے:

﴿ اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ○﴾

''لوط کے پیروکاروں کو اپنی بستی سے نکال دو۔ بلاشبہ یہ ایسے لوگ ہیں جو بہت پاکباز بنتے ہیں۔''[3]

[1] الأعراف7:81,80. [2] الشعرآء26:160-164. [3] النمل27:56.

نزولِ عذاب

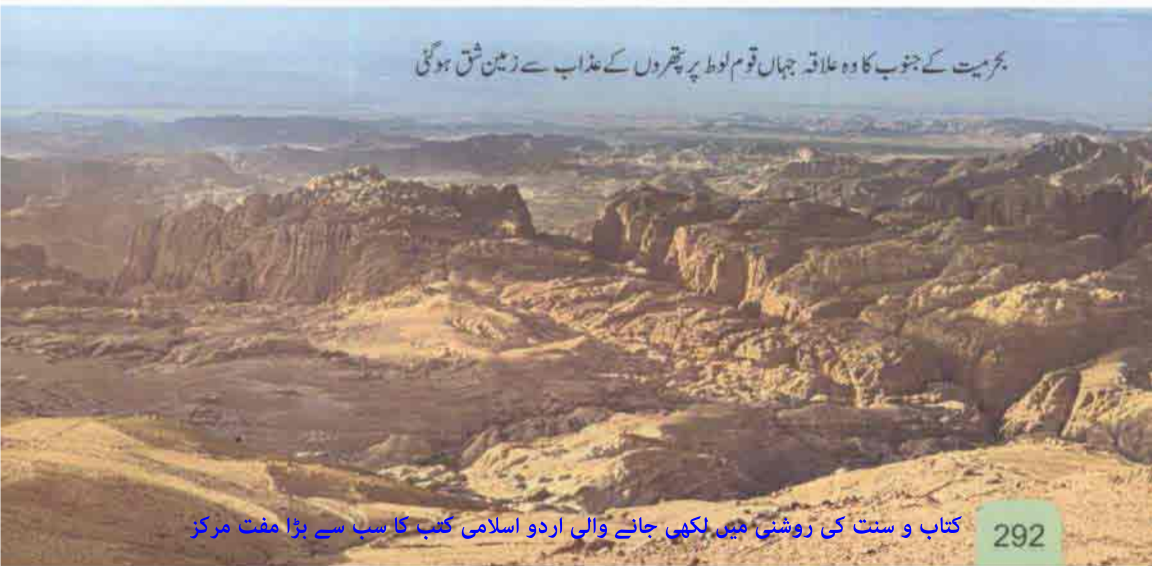
جب قوم نے گناہوں سے توبہ کرنے کے بجائے حضرت لوط علیہ السلام سے کہا کہ ''ہم پر اللہ کا عذاب لے آؤ اگر تم سچے ہو۔''[1] تو عذابِ الٰہی ان پر مسلط کر دیا گیا اور آپ کی نافرمان بیوی بھی اسی عذاب میں مبتلا ہوگئی۔ عذاب اس طرح آیا:

﴿ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ وَمَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ ۝﴾

''پھر جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے اس کے اوپر والے حصے کو اس کا نیچا کر دیا اور ان پر تہ بہ تہ کھنگر کے پتھر برسائے۔ جو تیرے رب کے ہاں سے نشان لگائے ہوئے تھے اور وہ (بستی) ان ظالموں (قریشِ مکہ) سے کچھ دور نہیں۔''[2]

یوں قومِ لوط پتھروں کی بارش سے نیست و نابود کر دی گئی۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی رودادِ سفر میں لکھا ہے: ''ہم بحرِ میت کے مشرقی ساحل پر اس جگہ پہنچے جسے اللسان کہا جاتا ہے۔ اسی کے قریب جنوب کی طرف بحرِ میت کا وہ حصہ ہے جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں سدوم اور قومِ لوط کے دوسرے شہر غرق ہوئے تھے۔ اسی لیے بحرِ میت کے اس حصے کو بحیرۂ لوط کہا جاتا ہے۔ بحرِ میت کے گرد و پیش پورے علاقے کو دیکھ کر آج بھی صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں زبردست عذاب نے زمین کو جگہ جگہ سے شق کر دیا ہے اور جگہ جگہ زمین دھنس گئی ہے۔''[3]

[1] العنکبوت 29:29. [2] ہود 11:82،83. [3] سفرنامۂ ارض القرآن، ص:236.



بحرِ میت کے جنوب کا وہ علاقہ جہاں قومِ لوط پر پتھروں کے عذاب سے زمین شق ہوگئی

5 بنو قطورا: قومِ شعیب

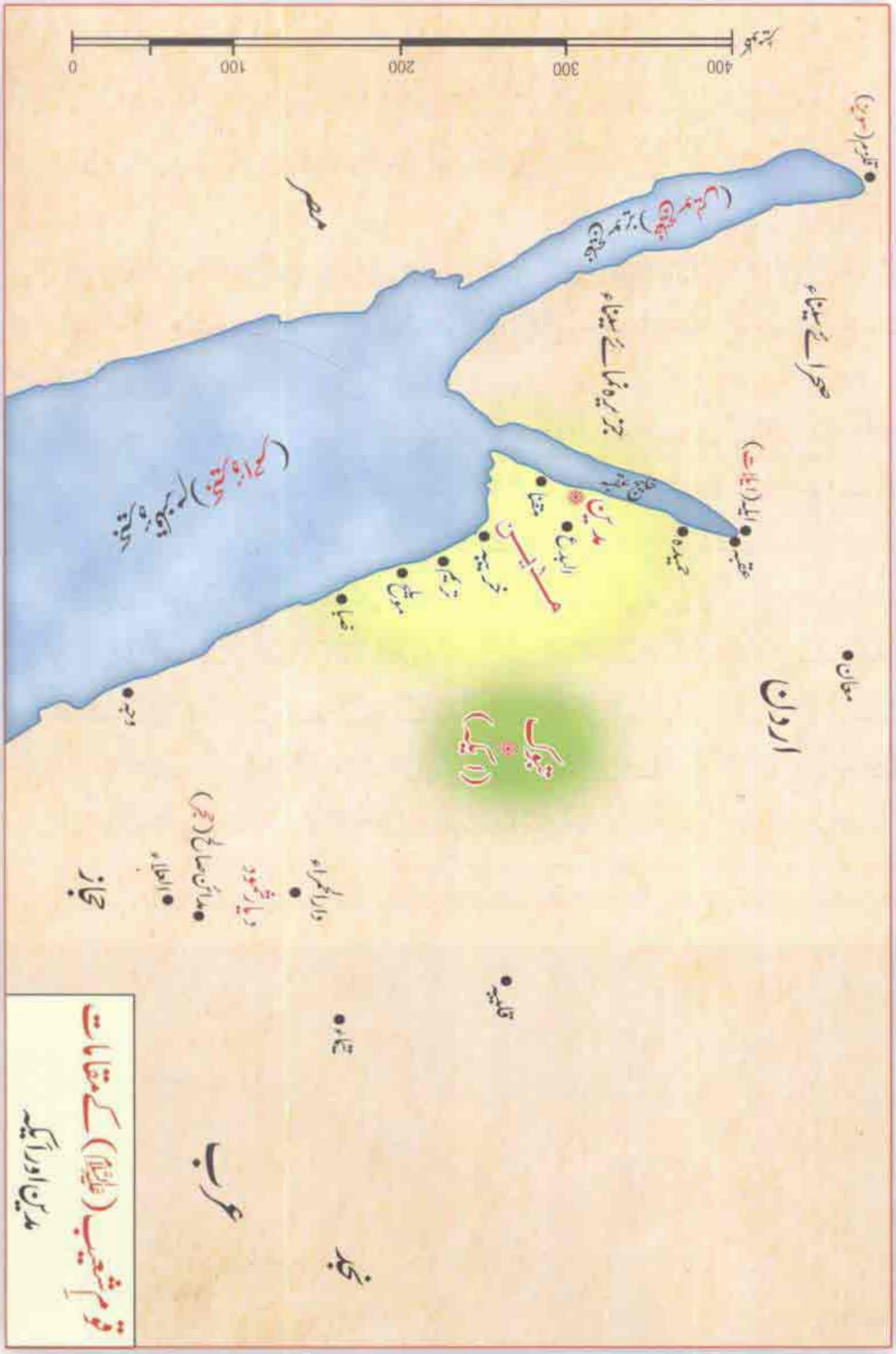
حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت مدین (مدیان) میں ہوئی۔ مدین دراصل ایک قبیلے کا نام ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدین کی نسل سے تھا۔ مدین یا مدیان ابراہیم علیہ السلام کی تیسری بیوی ''قطورا'' سے پیدا ہوئے، اس لیے ان کا خاندان بنو قطورا کہلاتا تھا۔

اہلِ مدین عرب باشندے تھے۔ [1] ان کی بستیاں خلیج عقبہ کی بندرگاہ اَیلہ کے جنوب میں خلیج عقبہ اور بحیرۂ قلزم کے ساتھ ساتھ اور مشرق میں تبوک تک واقع تھیں۔ ایلہ یہود کا شہر تھا جن پر اللہ تعالیٰ نے ہفتے (سبت) کے دن کے شکار کی حرمت نازل فرمائی تھی لیکن انھوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس شہر کا نام ایلہ بنت مدین کے نام پر رکھا گیا۔ [2] ان دنوں یہ علاقہ اسرائیل کے تسلط میں ہے اور ایلات کہلاتا ہے۔ اہل مدین کی جگہ شام (اردن) سے متصل حجاز کا آخری حصہ تھی۔ عہد نبوی میں حجاز والوں کو شام، فلسطین اور مصر تک جاتے ہوئے مدین کے کھنڈر راہ میں پڑتے تھے۔ مدین سے گزرنے والے اہلِ حجاز کے تجارتی راستے کو قرآن مجید میں ''امام مبین'' (کھلی اور صاف شاہراہ) قرار دیا گیا ہے۔ [3] یہ شاہراہ قومِ لوط اور اہلِ مدین دونوں کے علاقوں سے گزرتی تھی۔ مدین کے علاقے میں آج کل البدع، الحمیدہ، مقنا، الخریبہ، تریم، مویلح اور ضَبا نامی بستیاں آباد ہیں۔ [4]

---

[1] البداية والنهاية: 173/1. [2] معجم البلدان، مادة: أيلة. [3] دیکھیے: الحجر 79:15. [4] اطلس القرآن (اردو)، ص: 128.


البدع کا علاقہ جہاں قوم شعیب آباد تھی


قوم شعیب (علیہ السلام) کے مقامات
مدین اور آیکہ
اردن
مصر
عرب
نجد
تبوک
(ایکہ)
مدین
معان
0
100
200
300
400

اصحابِ اَیکہ

اکثر مؤرخین کے نزدیک قومِ مدین اور اصحابِ اَیکہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں جو باپ کی نسبت سے مدین کہلائی اور زمین کی طبعی و جغرافیائی حیثیت سے اصحابِ اَیکہ کے لقب سے مشہور ہوئی۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ قومِ مدین اور اصحابِ اَیکہ الگ الگ دو اقوام ہیں جن کی طرف شعیب علیہ السلام کو بھیجا گیا۔ پہلے شعیب علیہ السلام کی بعثت قومِ مدین کی طرف ہوئی اور بعد میں اصحاب ایکہ کے لیے بھی انھی کو رسول بنایا گیا۔[1]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ كَذَّبَ أَصْحَٰبُ لْـَٔيْكَةِ ٱلْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ ﴾

''اصحابِ اَیکہ نے رسولوں کو جھٹلایا۔ جب ان سے شعیب نے کہا: کیا تم ڈرتے نہیں؟''[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''صحیح قول کے مطابق اصحاب ایکہ سے مراد اہل مدین ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا تعلق بھی انھی سے تھا۔ یہاں سورۂ اعراف کی طرح شعیب علیہ السلام کے لیے ''ان (قوم مدین) کے بھائی'' کے الفاظ استعمال نہیں کیے گئے بلکہ ان لوگوں کی یہاں اَیکہ (بَن) کی عبادت کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ بن ایک درخت ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جھنڈ کی طرح گھنے درخت تھے جن کی وہ عبادت کرتے تھے، اس لیے جب یہ فرمایا:

﴿ كَذَّبَ أَصْحَٰبُ لْـَٔيْكَةِ ٱلْمُرْسَلِينَ ۝ ﴾ (الشعراء 176:26)

''بن کے رہنے والوں نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا۔''

تو یہ نہیں کہا: جب ان سے ان کے بھائی شعیب نے کہا بلکہ صرف یہ فرمایا:

﴿ إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ ﴾ (الشعراء 177:26)

''جب شعیب نے ان سے کہا۔''

جس سبب سے ان کی نسبت بن کی طرف کی گئی ہے، حضرت شعیب علیہ السلام سے اس نسبت کو قطع کرنے کی غرض سے یہاں انھیں ان کا بھائی قرار نہیں دیا گیا، گو وہ نسبی طور پر ان کے بھائی ہی تھے۔ کچھ لوگ جو اس نکتے کو نہیں سمجھ سکے، انھوں نے یہ گمان کیا ہے کہ اصحاب ایکہ اصحاب مدین نہیں، نیز ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو دو امتوں کی طرف بھیجا تھا۔ اس طرح کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ آپ کو تین امتوں کی طرف مبعوث فرمایا گیا تھا۔[3]

---

[1] المنتظم: 324/1. [2] الشعراء 177,176:26. [3] تفسیر ابن کثیر، الشعراء 176:26-180.

حدیث میں شعیب علیہ السلام کو خطیب الانبیاء کہا گیا ہے کیونکہ وہ اپنی قوم کو ایمان کی دعوت دیتے وقت فصاحت و بلاغت اور اعلیٰ زبان سے کام لیتے تھے۔[1]

مدین کے لوگ بُت پرست کافر تھے۔ رہزنی کرتے، مسافروں میں دہشت پھیلاتے اور اَیکہ نامی درخت کی پوجا کرتے تھے۔ ان لوگوں کا لین دین کا معاملہ بھی بہت برا تھا۔ ناپ تول میں کمی کرتے تھے۔ لیتے وقت بڑے پیمانے سے ماپتے اور بڑے باٹوں سے تولتے اور دیتے وقت چھوٹے پیمانے اور کم وزن کے باٹ استعمال کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے انھی میں سے ایک عظیم شخصیت شعیب علیہ السلام کو منصبِ رسالت پر فائز کیا۔

شعیب علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ

سیدنا شعیب علیہ السلام نے اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی دعوت دی اور انھیں حکم دیا کہ وہ ناپ تول میں کمی نہ کریں، نیز آپ نے انھیں زمین میں فتنہ وفساد پھیلانے سے منع کیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۝ ﴾

”اور (ہم نے) مدین والوں کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا)، اس نے کہا: اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں اور تم ناپ تول میں کمی نہ کرو، بے شک میں تمھیں خوشحال دیکھتا ہوں اور بے شک مجھے تم پر گھیرنے والے دن کے عذاب سے خوف آتا ہے۔“[2]

سیدنا شعیب علیہ السلام نے قوم کی ہر طرح سے خیر خواہی کی، انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل شدہ خیر و برکت یاد دلائی اور برائیوں سے روکا مگر قوم نے ماننے کے بجائے آپ کو سنگسار کرنے اور بستی سے نکال دینے کی دھمکیاں دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ﴾

”اس کی قوم میں سے جو سردار تکبر کرتے تھے، انھوں نے کہا: اے شعیب! ہم تمھیں اور ان لوگوں کو جو تمھارے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے ضرور ہی نکال دیں گے یا بہر صورت تم ہمارے دین میں واپس آؤ گے۔“[3]

[1] المستدرك للحاكم: 568/2. [2] هود 84:11. [3] الأعراف 88:7.

شعیب علیہ السلام کی قوم کو سرزنش

اللہ تعالیٰ کے نبی شعیب علیہ السلام جب قوم سے مایوس ہو گئے تو فرمایا:

﴿ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْۤا اِنِّيْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۝ ﴾

''اور اے میری قوم! تم اپنی جگہ عمل کرو، بے شک میں بھی عمل کر رہا ہوں۔ جلد تم جان لو گے کہ کس پر رسوا کن عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ اور تم انتظار کرو، بے شک میں بھی تمھارے ساتھ منتظر ہوں۔''[1]

قومِ شعیب پر مختلف قسم کے عذاب

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ ﴾

''اور جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے شعیب کو اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے تھے، انھیں تو اپنی رحمت سے

[1] هود 11:93.



قومِ شعیب کے مساکن (البدع)

بچالیا اور جو ظالم تھے، انھیں زبردست چیخ نے آدبوچا، پھر وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔''[1]

یہاں ﴿ الصَّيْحَةُ ﴾ کا لفظ ہے جس کے معنی زبردست چیخ کے ہیں۔ سورۂ اعراف (91:7) میں ﴿ الرَّجْفَةُ ﴾ کا لفظ ہے جس کے معنی بھونچال کے ہیں اور سورۂ شعراء (189:26) میں ﴿ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ﴾ ''سائبان کے دن کا عذاب'' کے الفاظ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ عذاب الٰہی کی ان تینوں صورتوں میں مبتلا ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں سات دن بے حد شدید گرمی میں مبتلا رکھا، پھر ایک بادل آکر ان کے سروں پر سایہ فگن ہوگیا اور وہ گرمی سے بچنے کے لیے اس کے سائے میں جا کھڑے ہوئے۔ جب وہ سب کے سب جمع ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر آگ کے شعلوں اور انگاروں کی بارش کر دی، زمین پر زلزلہ طاری ہوگیا، پھر ایک زور دار چیخ بھی سُنائی دی جس کی وجہ سے ان کے جسموں سے روحیں نکل گئیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ إِنَّهُ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ ﴾ (الشعرآء 189:26)

''بے شک وہ بڑے (سخت) دن کا عذاب تھا۔''[2]

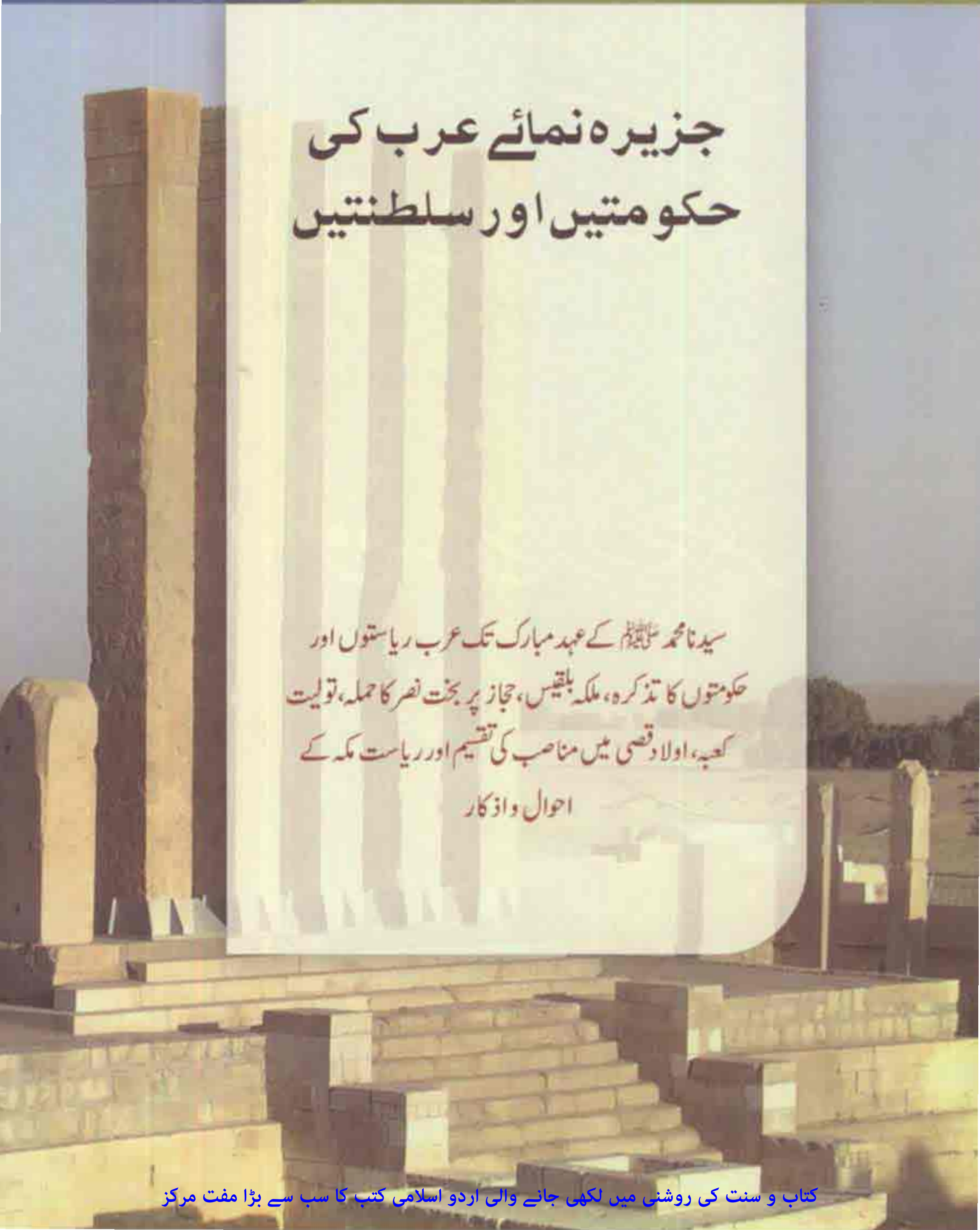
---

[1] ھود 94:11. [2] تفسیر ابن کثیر، الشعرآء 26:185-191.

باب 3

جزیرہ نمائے عرب کی حکومتیں اور سلطنتیں

سیدنا محمد ﷺ کے عہد مبارک تک عرب ریاستوں اور حکومتوں کا تذکرہ، ملکہ بلقیس، حجاز پر بخت نصر کا حملہ، تولیت کعبہ، اولاد قصی میں مناصب کی تقسیم اور ریاست مکہ کے احوال و اذکار

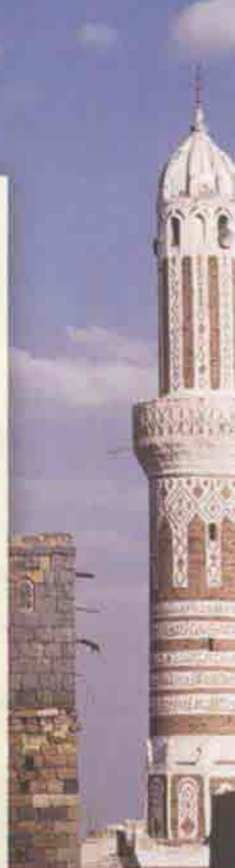


لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ

”(لوگو!) تمھارے پاس تمھی میں سے ایک رسول آ گیا ہے، اس پر تمھارا تکلیف میں مبتلا ہونا گراں (گزرتا) ہے، تمھارے لیے (بھلائی کا) حریص ہے، مومنوں پر نہایت شفیق، بہت رحم کرنے والا ہے۔“ (التوبة 9:128)

اس باب میں





جزیرہ نمائے عرب میں عہد نبوی تک قائم ہونے والی عرب سلطنتوں اور حکومتوں کی تاریخ کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں یمن کی سلطنتوں، دولتِ مَعین، سلطنتِ سبا اور اس کے مذہب، ملکہ بلقیس، سلطنتِ قتبان، مملکتِ حِمیَر، سدّ مأرب کی تعمیر اور اس کے انہدام، جاہلیت میں تبع اسعد ابوکرب کے قبول اسلام، یمن پر حبشیوں اور پھر ایرانیوں کے تسلط، حیرہ کی لخمی بادشاہت اور جنگ ذی قار میں عربوں کی فتح کا تذکرہ ہے۔

علاوہ ازیں اس میں شام کی غسانی بادشاہت، عمان کی بادشاہت، سلطنتِ کِندہ، حجاز پر بخت نصر کا حملہ اور معد بن عدنان کو اپنے ہمراہ لے جانا، بنو جرہم کا مکہ سے اخراج اور بنوخزاعہ کا تسلط، قُصَیّ کی واپسی اور تولیتِ کعبہ، اولادِ قصیّ میں تقسیم مناصب، ریاستِ مکہ اور دیگر عرب سرداریاں جیسے مباحث سمٹ آئے ہیں۔





عرب کے حکمران

جزیرہ نمائے عرب میں قدیم زمانے سے یمن، بحرین، عمان، حیرہ، شام اور کندہ کی بادشاہتیں چلی آ رہی تھیں، تاہم جس وقت خورشید اسلام کی شعاعیں ضوفگن ہوئیں، یہاں تین قسم کے حکمران تھے:

1 تاج پوش بادشاہ جو حقیقت میں مکمل طور پر آزاد و خودمختار نہ تھے بلکہ اس دور کی دو بڑی طاقتوں روم اور فارس میں سے کسی ایک کے باجگزار تھے۔

تاج پوش حکمران یہ تھے: شاہانِ بحرین، شاہانِ عُمان، شاہانِ آلِ غسان (شام) اور شاہانِ حیرہ (عراق)۔

2 قبائلی حکمران اور سردار جنھیں داخلی طور پر وہی حیثیت حاصل تھی جو تاج پوش بادشاہوں کی تھی لیکن ان کی اکثریت کو ایک مزید امتیاز یہ بھی حاصل تھا کہ وہ پورے طور پر آزاد اور خودمختار تھے، کسی بڑی سلطنت کے باجگزار نہ تھے۔

3 یمن کے گورنر جو براہِ راست دربارِ فارس کے نامزد تھے۔

علاوہ ازیں جزیرہ نمائے عرب کے وسط میں کندہ کی بادشاہت 425ء سے 550ء تک برقرار رہی تھی جو اپنے عروج کے زمانے میں یمن سے لے کر شمال میں دومۃ الجندل تک پھیلی ہوئی تھی۔

اگلے صفحات میں ہم ان سلطنتوں، قبائلی امارتوں اور سرداریوں کی اہمیت کے پیش نظر ان کا تاریخی پس منظر بیان کیے دیتے ہیں۔

1

یمن کی سلطنتیں

عرب عاربہ میں سے جو قدیم ترین یمانی قوم سامنے آتی ہے، وہ قومِ سبا ہے۔ اُور (عراق) سے جو کتبات برآمد ہوئے ہیں، ان میں ڈھائی ہزار سال قبل مسیح میں اس قوم کا ذکر ملتا ہے۔ سبا (قوم) اور سبا (ملک) دونوں عبد شمس سبا سے منسوب ہیں جسے اہلِ نسب نے قحطان کا پرپوتا لکھا ہے۔

قدیم یمن میں یکے بعد دیگرے چار سلطنتیں قائم ہوئیں: معین، سبا، قتبان اور حمیر۔

دولتِ معین



دولت معین کے دور کا کتبہ

یمن کی تاریخ میں پہلی باقاعدہ سلطنت معین تھی جو 1600ق م کے لگ بھگ احقاف یمن (وادی الجوف) میں قائم ہوئی۔ اس کے مشرق میں حضر موت اور جنوب مغرب میں سبا واقع تھا۔ اپنے عہد عروج میں یہ سلطنت خلیج (عدن) سے حجاز تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا دارالحکومت معین یا القرن صنعاء کے شمال مشرق میں واقع تھا جس سے یہ مملکت منسوب ہوئی۔ اس کے کھنڈروں میں عشتار دیوی کا معبد ہے۔ ساتویں صدی ق م میں دولت معین کی جگہ سلطنت سبا نے لے لی۔ [1]

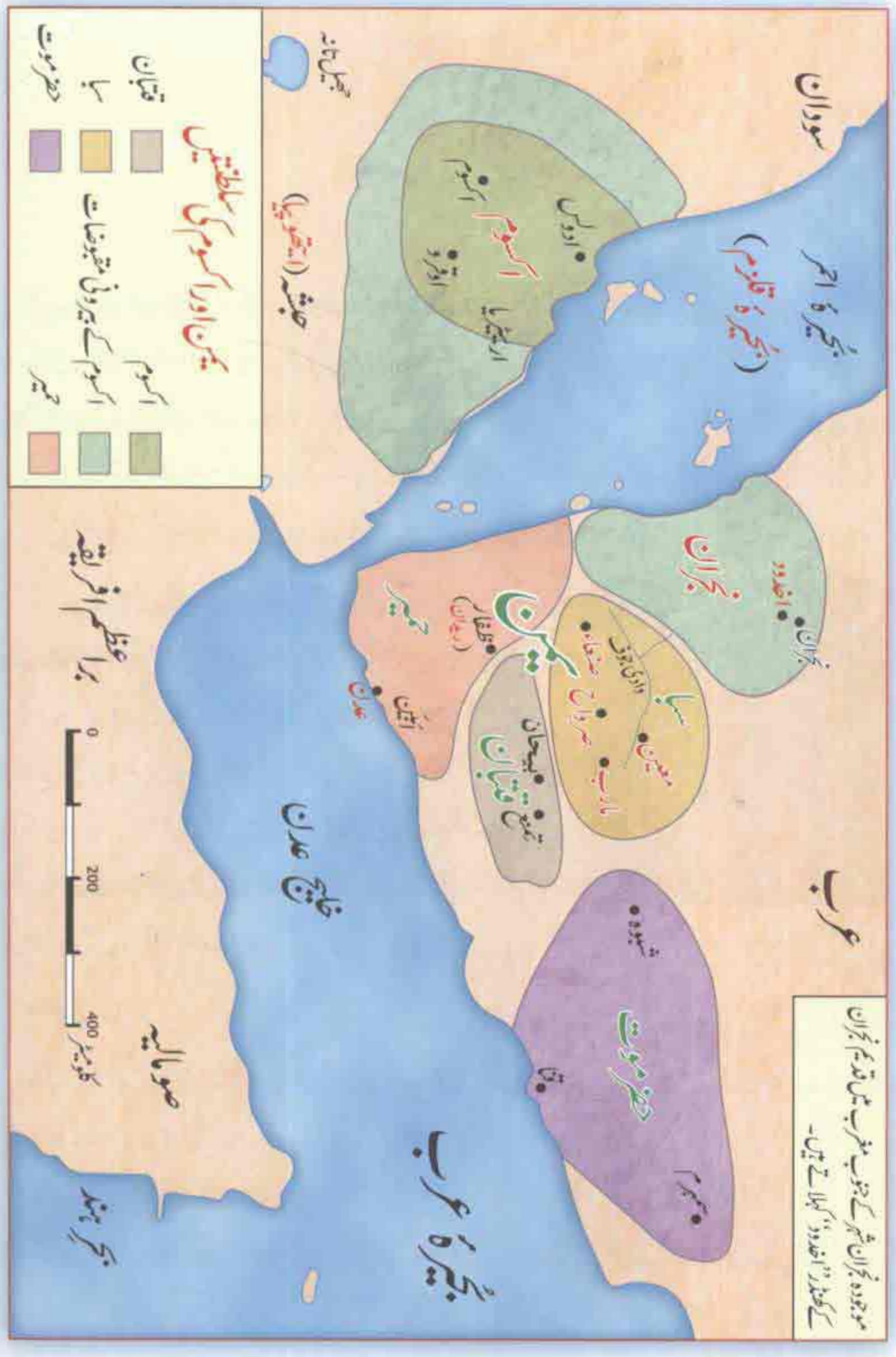
سلطنتِ سبا

مُلکِ سبا عبد شمس سبا سے منسوب ہے جس کا نسب اہلِ انساب کے نزدیک سبا بن یشجب بن یعرب بن قحطان ہے۔ سبائے یمن کی تاریخ کے دو ادوار ہیں:

1 مکاربِ سبا 2 ملوکِ سبا

1 مکاربِ سبا (1000 ق م تا 650 ق م): شاہانِ سَبا کا لقب ''مکارب'' یا ''مکرب'' تھا۔ سبائی زبان میں ''رب'' کا

[1] المنجد في الأعلام، ص: 538، قصة و تاريخ الحضارات العربية: 29/15.


موجودہ نجران شہر کے جنوب مغرب میں قدیم نجران
کے کھنڈر "اخدود" کہلاتے ہیں۔
عرب
بُحیرۂ احمر
(بُحیرۂ قلزم)
سوڈان
نجران
اخدود
نجران
سبا
معین
وادی جوف
مارب
صرواح
صنعاء
یمن
تمنع
بیحان
قتبان
ظفار
(ریدان)
حمیر
اَبْیَن
عدن
حضر موت
شبوہ
سمہرم
قنا
بُحیرۂ عرب
خلیج عدن
ادولس
اکسوم
اریٹیریا
اکسوم
اوقرو
جھیل تانہ
حبشہ (ایتھوپیا)
صومالیہ
براعظم افریقہ
بحرِ ہند
کلومیٹر 400
200
0
یمن اور اکسوم کی سلطنتیں
اکسوم
اکسوم کے بیرونی مقبوضات
حمیر
قتبان
سبا
حضر موت



معنی ہے ''بڑا'' یا ''بادشاہ'' اور ''مکارب'' کے معنی ہیں ''کاہن بادشاہ''۔ مکاربینِ سبا کا پایۂ تخت صرواح تھا جس کے کھنڈر آج بھی مأرب اور صنعاء کے درمیان وادی واکفہ میں پائے جاتے ہیں اور خُریبہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی دَور میں مأرب کے مشہور بند کی بنیاد رکھی گئی جسے عربِ حجاز ''سد'' اور عربِ یمن ''عَرِم'' کہتے تھے۔

عرم جنوبی عرب کی زبان کے لفظ عرمن سے ماخوذ ہے جس کے معنی بند کے ہیں۔ یمن کے قدیم کتبات میں یہ لفظ اس معنی میں بکثرت استعمال ہوا ہے، مثلاً: 542ء یا 543ء کا ایک کتبہ جو یمن کے حبشی گورنر ابرہہ نے سد مأرب کی مرمت کرانے کے بعد نصب کرایا تھا۔ اس میں وہ اس لفظ کو بار بار ''بند'' کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔[1]

سد مأرب تقریباً 800 ق م میں تعمیر کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس دور میں سلطنتِ سبا کو اس قدر عروج حاصل ہوا کہ انھوں نے عرب کے اندر اور عرب کے باہر جگہ جگہ اپنی نو آبادیاں قائم کر لی تھیں۔

اہلِ سبا کا مذہب

اہل سبا کا مذہب آفتاب پرستی تھا جیسا کہ ہُد ہُد نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو سبا کی ملکہ بلقیس کی خبر دیتے ہوئے کہا تھا: ﴿وَجَدْتُّهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُوْنَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ''میں نے اسے (ملکۂ سبا) اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ اللہ کے سوا سورج کو سجدہ کرتے ہیں۔''[2]

یہودیوں کی کتاب ترگوم میں بھی ملکہ بلقیس کے سورج کی عبادت کرنے کا ذکر ہے اور یونانی مؤرخ تھیوفراسٹیس ''آفتاب کے ہیکل'' میں بخورات کے ڈھیر کا ذکر کرتا ہے، نیز قبیلۂ سبا کے بانی کا لقب ''عبدشمس'' مشہور ہے جس کے معنی ''پرستارِ آفتاب'' کے ہیں۔ اوائل اسلام میں یمن کی ایک عمارت کے کتبے پر یہ عبارت منقوش پائی گئی:

[1] تفہیم القرآن: 192/4۔ [2] النمل 24:27۔

بِسْمِ اللّٰهِ هٰذَا مَا بَنَاهُ شَمَّرَ يَرْعَشْ لِسَيِّدَةِ الشَّمْسِ

"اللہ کے نام سے، یہ وہ عمارت ہے جسے بادشاہ شمّر یرعش نے سورج دیوی کے لیے بنایا۔"[1]

ملکہ بلقیس نے سیدنا سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا تھا۔[2] بعد میں قومِ سبا دوبارہ گمراہی کا شکار ہو گئی۔

تاریخی آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے سے قومِ سبا میں ایک ایسا عُنصر موجود تھا جو خدائے واحد کو مانتا تھا۔ تقریباً 650 ق م کے بعض کتبات بتاتے ہیں کہ سبا کے متعدد مقامات پر اس معبود کا نام ملکن ذُسموی (آسمانوں کا مالک بادشاہ) لکھا گیا ہے، نیز 378ء کے ایک کتبے میں الٰہ ذوسموی کے نام سے ایک عبادت گاہ کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے۔ پھر 465ء کے ایک کتبے میں یہ الفاظ مرقوم ہیں: بنصر و ردا الٰهن بعل سمين وارضين (اس الٰہ کی مدد اور تائید سے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔) ایک اور کتبے (458ء) میں اسی الٰہ کے لیے رحمٰن کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اصل الفاظ ہیں: بردا رحمنن (رحمٰن کی مدد سے)۔[3]

سدِ مأرب اور اس کی تباہی

اہلِ سبا نے جو سدِ مأرب (ڈیم) تیار کیا تھا، وہ مأرب شہر کے مشرق میں وادی اُذَینہ میں واقع تھا۔[4] قومِ سبا اور اس کے تعمیر کردہ بند کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہوا ہے:

---

[1] تاریخ ارض القرآن (کامل): 215,214/1، ملوك الأرض، ص: 110. [2] النمل 27:44. [3] تفہیم القرآن: 194/4. [4] اطلس القرآن (اردو)، ص: 173، المنجد في الأعلام، ص: 510.



سد مأرب کے آثار

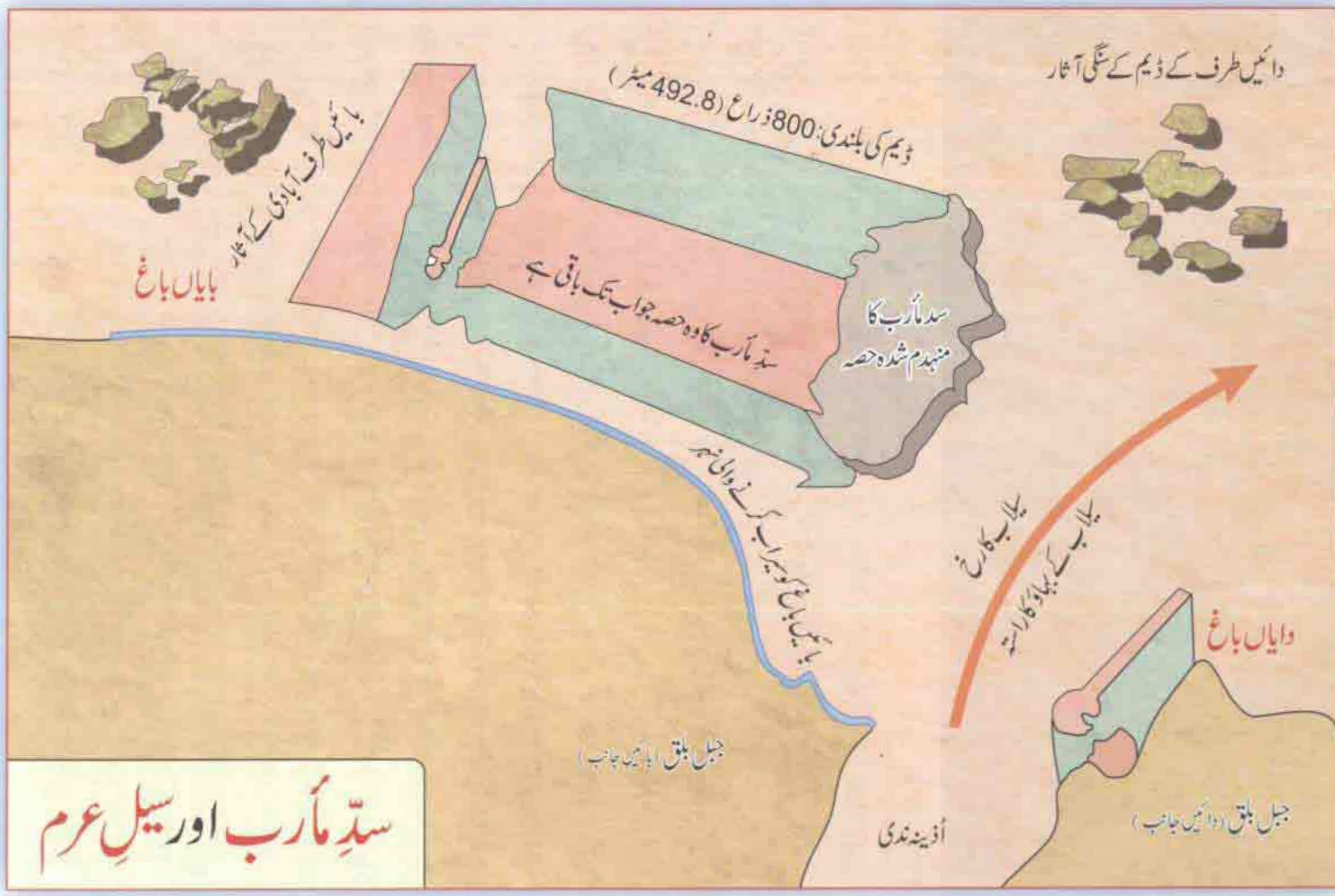
﴿ لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۬ ۚ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ ○ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ○ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۭ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ○ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ۭ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ ○ فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ○ ﴾

''سبا (قوم) کے لیے ان کی بستی میں یقیناً ایک عظیم نشانی تھی، دائیں اور بائیں طرف دو باغ تھے، (ہم نے کہا:) تم اپنے رب کے رزق سے کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو، (یہ) پاکیزہ شہر ہے اور رب بڑا بخشنے والا ہے۔ پھر انھوں نے (جب ہدایت سے) منہ موڑا تو ہم نے ان پر بند (ڈیم) کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے دونوں باغوں کے بدلے میں ہم نے انھیں دو ایسے باغ دیے جو بدمزہ پھل، (بکثرت) جھاؤ اور کچھ بیریوں والے تھے۔ یہ ہم نے انھیں ان کی ناشکری کی سزا دی اور ہم ناشکروں ہی کو سزا دیتے ہیں۔ اور ہم نے ان (اہل سبا) کے اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکت رکھی تھی، کئی بستیاں باہم متصل (سرِراہ آباد) رکھی تھیں اور ان میں ہم نے چلنے (آنے جانے) کی منزلیں مقرر کر دی تھیں، (ہم نے کہا:) تم ان میں راتوں اور دنوں کو امن سے سفر کرو۔ پھر انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہمارے سفروں میں دوری پیدا کر دے اور انھوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا، چنانچہ ہم نے انھیں افسانے بنا ڈالا اور انھیں مکمل طور پر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، بلاشبہ اس میں ہر صابر و شاکر کے لیے عظیم نشانیاں ہیں۔'' [1]

[1] سبا 34:15-19.

مآرب کے کھنڈر





سدِّ مأرب اور سیلِ عرم
دائیں طرف کے ڈیم کے سنگی آثار
ڈیم کی بلندی: 800 ذراع (492.8 میٹر)
بائیں طرف آبادی کے آثار
بایاں باغ
سدِ مأرب کا وہ حصہ جو اب تک باقی ہے
سدِ مأرب کا منہدم شدہ حصہ
بائیں باغ کو سیراب کرنے والی نہر
سیلاب کا رخ
سیلاب کے بہاؤ کا راستہ
دایاں باغ
جبل بلق (بائیں جانب)
اُذینہ ندی
جبل بلق (دائیں جانب)

سبا کا عروج و زوال

ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں: قومِ سبا کا عروج دراصل دو بنیادوں پر قائم تھا: ایک زراعت، دوسری تجارت۔ زراعت کو انھوں نے آب پاشی کے ایک بہترین نظام کے ذریعے سے ترقی دی تھی جس کے مثل کوئی دوسرا نظامِ آب پاشی بابل کے سوا قدیم زمانے میں کہیں نہ پایا جاتا تھا۔ ان کی سرزمین میں قدرتی دریا نہ تھے۔ بارش کے زمانے میں پہاڑوں سے برساتی نالے بہ نکلتے تھے۔ انھی نالوں پر سارے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر انھوں نے تالاب بنا لیے تھے اور ان سے نہریں نکال نکال کر پورے ملک کو اس طرح سیراب کر دیا تھا کہ قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق ہر طرف باغ ہی باغ نظر آتے تھے۔ اس نظامِ آب پاشی کا سب سے بڑا مخزنِ آب وہ تالاب تھا جو شہر مأرب کے قریب کوہ بلق کی درمیانی ندی پر بند باندھ کر تیار کیا گیا تھا۔ مگر جب اللہ کی نظرِ عنایت ان سے پھر گئی تو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں یہ عظیم الشان بند ٹوٹ گیا اور اس سے نکلنے والا سیلاب راستے میں بند پر بند توڑتا چلا گیا یہاں تک کہ ملک کا پورا نظامِ آب پاشی تباہ ہو کر رہ گیا، پھر کوئی اسے بحال نہ کر سکا۔

ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک یہ قوم مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا واسطہ بنی رہی۔ ایک طرف ان کی بندرگاہوں میں چین کا ریشم، انڈونیشیا اور مالا بار کے گرم مسالے، ہندوستان کے کپڑے اور تلواریں، مشرقی افریقہ کے زنگی غلام، بندر، شترمرغ کے پر اور ہاتھی دانت پہنچتے تھے اور دوسری طرف یہ ان چیزوں کو مصر اور شام کی منڈیوں میں پہنچاتے تھے جہاں سے روم و یونان تک یہ مال روانہ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خود ان کے علاقے میں لوبان، عود، عنبر، مشک، مُرّ، قرفہ، قصب الذّریرہ، سلیخہ اور دوسری اُن خوشبودار چیزوں کی بڑی پیداوار تھی جنھیں مصر و شام اور روم و یونان کے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

اس عظیم الشان تجارت کے دو بڑے راستے تھے: ایک بحری، دوسرا برّی۔ بحری تجارت کا اجارہ ہزار سال تک انھی سبائیوں کے ہاتھ میں تھا کیونکہ بُحیرۂ احمر کی موسمی ہواؤں، زیرِ آب چٹانوں اور لنگر اندازی کے مقامات کا راز یہی لوگ جانتے تھے اور دوسری کوئی قوم اس خطرناک سمندر میں جہاز چلانے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ اس بحری راستے سے یہ لوگ اردن اور مصر کی بندرگاہوں تک اپنا مال پہنچایا کرتے تھے۔ برّی راستے عدن اور حضرموت سے مأرب پر جا کر ملتے تھے اور پھر وہاں سے ایک شاہراہ مکہ، جدہ، یثرب، العُلاء، تبوک اور اَیلہ سے گزرتی ہوئی پٹرا تک پہنچتی تھی۔ اس کے بعد ایک راستہ مصر کی طرف اور دوسرا راستہ شام کی طرف جاتا تھا۔ اس برّی راستے پر جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے، یمن سے حدودِ شام تک سبائیوں کی نوآبادیاں مسلسل قائم تھیں اور شب و روز اُن کے تجارتی قافلے یہاں

سے گزرتے رہتے تھے۔ آج تک ان میں سے بہت سی نو آبادیوں کے آثار اس علاقے میں موجود ہیں اور وہاں سبائی و حمیری زبان کے کتبات مل رہے ہیں۔[1]



ام عمرو بن معدیکرب سے منسوب کتبہ (مأرب)

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں: شہر مأرب کے جنوب میں دائیں بائیں دو پہاڑ ہیں جن کا نام کوہ بلق ہے۔ دونوں پہاڑوں کے بیچ میں وادیِ اذینہ ہے۔ پہاڑوں سے پانی جمع ہوکر وادیِ اذینہ میں ایک دریا جاری ہوجاتا ہے۔ سبا نے ان دونوں پہاڑوں کے بیچ میں تقریباً 800 ق م میں سدِ مأرب تعمیر کیا تھا۔ سدّ مأرب کے بقیہ حصے پر جو کتبات ہیں، ان میں اس کے بانیوں (مکاربین سبا) کے نام یثع امربین، سمہعلی ینوف، کرب ایل بین، ذمرعلی اور یدع ایل پڑھے گئے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سد طویل زمانے میں مختلف سلاطینِ یمن کے عہد میں تعمیر ہوا ہے۔ اس نظام آب رسانی سے اس ریگستان کے اندر 200 مربع میل میں سینکڑوں کوس تک بہشت زار تیار ہوگئی تھی جس میں انواع و اقسام کے میوے اور خوشبودار درخت تھے۔ سدِ مأرب 542ء اور 570ء کے درمیان تباہ ہوگیا۔[2]

2 **ملوکِ سبا** (650 تا 115 ق م): اس دور میں شاہانِ سَبا نے مَلک (بادشاہ) کا لقب اختیار کر لیا اور مأرب کو دارالسلطنت بنایا۔ اس کا دوسرا نام شہرِ سبا تھا۔ مأرب کا قصرِ شاہی سَلْحِین تھا جس کے کھنڈر صنعاء سے 60 میل مشرق میں پائے جاتے ہیں۔[3] ماضی قریب میں مأرب صوبہ بیضاء کا صدر مقام تھا۔ بیضاء یمن کے دارالحکومت صنعاء سے 130 میل کے فاصلے پر جنوب مشرق میں واقع ہے۔ آج کل مأرب بجائے خود ایک صُوبہ ہے۔

سلطنت قتبان (قِتبان)



سلطنت قتبان کا سکہ

بنوقتبان کا جد امجد قتبان بن ردمان بن وائل بن غوث حمیری تھا۔[4] یمن کی یہ سلطنت 500 ق م سے لے کر 200ء تک سبا کے جنوب مشرق میں وادئ بیحان میں قائم رہی۔ اس کا ذکر جنوبی عرب کے قدیم کتبوں اور یونانی اور رومی ادب میں ملتا ہے۔ اس

[1] تفہیم القرآن: 198,197/4. [2] تاریخ ارض القرآن (کامل): 202/1، المنجد في الأعلام، ص: 510، المفصل في تاریخ العرب قبل الإسلام: 285/2. [3] تاریخ ارض القرآن (کامل): 188/1-196. [4] المفصل في تاریخ العرب قبل الإسلام: 173/2.

کا دارالحکومت تمنع تھا جو اس تجارتی شاہراہ پر واقع تھا جو حضرموت، سبا اور معین کی سلطنتوں میں سے گزرتی تھی۔ ان کا سب سے بڑا دیوتا عم تھا جس کی نسبت سے وہ لوگ بنوعم کہلائے۔ اس سلطنت کے حکمران مکرب کہلاتے تھے۔ [1]

مملکتِ حمیر

بنوحمیر آلِ سبا میں سے تھے اور یہ مغربی یمن میں بحیرۂ احمر اور بحیرۂ عرب کے متصل آباد تھے۔ ان پر ''ذو'' (امیر) حکومت کرتے تھے۔ قلعہ ریدان ان کا مسکن تھا۔ یہ قلعہ پایۂ تخت ظفار کے متصل تھا۔ ظفار کے آثار صنعاء کے جنوب میں شہر ''یریم'' کے قریب ایک مدوّر پہاڑی پر پائے جاتے ہیں۔ سبا کی تباہی کے بعد حمیر نے مأرب تک اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ اس وقت ان کا لقبِ شاہی ''ملک سبا و ذو ریدان'' تھا۔ اسی دور میں سلطنت کے ایک حصے کی حیثیت سے پہلی مرتبہ لفظ ''یمنت'' اور ''یمنات'' کا استعمال شروع ہوا اور رفتہ رفتہ یمن اس پورے علاقے کا نام ہوگیا جو عسیر سے عدن تک اور باب المندب سے حضرموت تک واقع ہے۔



حمیری دور کے سکے

اہلِ حبش کے بعض کتبات میں ''حمیر'' اور ''ارض حمیر'' کے الفاظ ملتے ہیں، نیز یونانی مؤرخین نے حمیر کا پہلی بار ذکر 20 ق م میں کیا ہے۔ حمیر عربی اور حبشی زبان میں ''حُمر'' (سرخ) سے مشتق ہوگا۔ چونکہ عرب اہلِ حبش کو اسود اور سودان کہتے ہیں، اس کے مقابلے میں اہلِ حبش عربوں کو حمیر، یعنی گورے رنگ کے کہتے ہوں گے۔ یمن کے حبشی فاتح ابرہہ کے ایک کتبے میں لکھا ہے: ''بادشاہ حبشی حمیری فوج لے آیا۔'' گویا کالی گوری دونوں پلٹنیں آئیں۔

حمیر کا طبقۂ اُولیٰ اور حبشیوں کا تسلط



شاہ اُذینہ کے دور کے سکے

سبائے حمیر کی تاریخ دوسری صدی ق م کے اواخر (115 ق م) یا پہلی صدی ق م کے وسط سے شروع ہوتی ہے۔ پہلی صدی ق م سے تیسری صدی عیسوی کے اواخر تک حمیر کا طبقۂ اول فرمانروائی کرتا رہا۔ ان سلاطین کا لقب ''ملک سبا و ذو ریدان'' تھا۔ دوسری صدی عیسوی سے سبائی الاصل اکسومی حبشیوں نے یمن پر حملے شروع کیے، تاہم تبع اکبر حارث الرائش (شمر یہرعش 280ء تا 315ء) نے انھیں حضرموت سے نکال باہر کیا اور یمن اور حضرموت دونوں کا پہلا بادشاہ بنا۔ پھر 340ء سے 375ء

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 266/1/16، وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا۔

تک اکسومی حبشی اکسوم سے یمن (حمیر) اور حضر موت پر قابض رہے۔ اس دوران شاہ ازینہ اور اس کے جانشین خود کو "ملک اکسوم وحمیر وریدان واثیوبیا وسبا وزیلع" کہتے تھے۔ [1]

حمیر کا طبقۂ ثانیہ یا تبابعہ

حمیر کے طبقۂ ثانیہ کے سلاطین جن کا لقب "ملک سبا وذوریدان وحضر موت" ہے، عرب ان کو تبع (جمع تبابعہ) کہتے ہیں۔ ممکن ہے "تبع" عربی لفظ "متبوع" کے معنی میں ہو جس کی لوگ پیروی یا اطاعت کرتے ہیں لیکن بہ تحقیق جدید یہ حبشی لفظ ہے۔ حبشی زبان میں تبع کے معنی "قادر، جبار اور صاحبِ قوت" ہیں۔ پہلا تبع کلیکرب یا کتبات کے مطابق ملک یکرب تھا جس نے 375ء میں اکسومیوں کو نکال کر یمن وحضر موت پر اپنی حکومت قائم کی۔ [2]

تبع اسعد ابوکرب کا قبولِ اسلام

تبابعۂ یمن میں سے تین زیادہ مشہور ہوئے: تبع اکبر حارث الرائش (280ء تا 315ء)، تبع اوسط اسعد ابوکرب بن کلیکرب (400ء تا 425ء) اور تبع اصغر حسان بن تبع (425ء تا 455ء)۔ [3] تبع اسعد ابوکرب نے یہودیت قبول کر لی تھی۔

سمہودی لکھتے ہیں: "جب تُبّع اول تبان اسعد ابوکرب بن کلیکرب مدینہ (یثرب) سے گزرا، اس کے ہمراہ چار سو علماء تھے۔ انھوں نے اسی شہر میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ تبع اسعد نے وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ ہم نے اپنی کتابوں میں لکھا پایا ہے کہ آخری اور عظیم ترین نبی جس کا نام احمد اور محمد (ﷺ) ہوگا، ہجرت کر کے اس شہر میں آئے گا، لہٰذا ہم یہیں قیام کریں گے، شاید ان سے ملاقات ہو جائے۔ تبع نے ان سب کے لیے گھر بار بنا دیے، پھر اس نے ایک مکتوب لکھا جس میں اپنے قبولِ اسلام کا ذکر کیا اور اس میں یہ شعر بھی رقم کیے:

شَهِدْتُ عَلٰى أَحْمَدَ أَنَّهٗ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ بَارِئِ النَّسَمِ
فَلَوْ مُدَّ عُمْرِي إِلٰى عُمْرِهٖ لَكُنْتُ وَزِيْرًا لَّهٗ وَ ابْنَ عَمّ

"میں احمد (ﷺ) کے بارے میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ خالق کائنات کی طرف سے رسول ہیں۔ اگر میں نے ان کا زمانہ پایا تو میں ان کا معاون اور قرابتدار بنوں گا۔"

[1] ملخص از تاریخ ارض القرآن (کامل): 1/221-228. زیلع ان دنوں صومالیہ میں خلیج عدن کے ساحل پر واقع ہے۔ [2] تاریخ ارض القرآن (کامل): 1/229,228. [3] تاریخ ارض القرآن (کامل): 1/231,230.

اس نے مکتوب پر سونے کی مہر لگائی اور سب سے بڑے عالم کے سپرد کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ نبی ﷺ کا زمانہ پائے تو انھیں دے دے اور اگر وہ ان کا عہد نہ پائے تو اس کے بیٹے یا پوتے یہ کام انجام دیں۔ اس نے نبی ﷺ کے لیے ایک مکان تعمیر کیا تا کہ آپ جب مدینہ تشریف لائیں تو اس میں قیام فرمائیں۔ وقت گزرنے پر اس مکان کے مالک ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بنے جو اسی عالم کی اولاد میں سے تھے۔ [1]

امام احمد، سہل بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت مرفوعاً بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَسُبُّوا تُبَّعًا فَإِنَّهُ قَدْ كَانَ أَسْلَمَ»

”تبع کو بُرا بھلا مت کہو۔ بے شک اس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔“ [2]

تبابعہ کے عہد اول کے آخر میں رومیوں نے یمن کی سب سے بڑی بندرگاہ عدن پر فوجی تسلط قائم کر لیا اور ان کی مدد سے اکسومی حبشیوں نے حمیر و ہمدان کی باہمی کشاکش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 340ء میں پہلی بار یمن پر قبضہ کیا جو 375ء تک برقرار رہا۔

اس کے بعد یمن کی آزادی تو بحال ہوگئی مگر ”مَأرب“ کے مشہور بند میں رخنے پڑنا شروع ہو گئے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا 542ء اور 570ء کے درمیان یہ بند ٹوٹ گیا۔ [3] اور وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر قرآن مجید میں سَیلِ عَرِم کے نام سے کیا گیا ہے۔ [4] اس سیلاب میں بستیوں کی بستیاں ویران ہوگئیں اور بہت سے قبائل اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

حبشیوں کا یمن پر دوبارہ تسلط



ابرہہ کے سکے

قیصر روم نے اپنے باجگزار شاہِ حبش کو یمن پر حملے کی ترغیب دیتے ہوئے بحری بیڑہ مہیا کیا۔ یوں 525ء میں ارياط کے زیر قیادت ستر ہزار حبشی فوج نے حملہ کر کے یمن پر قبضہ کر لیا۔ کچھ عرصہ شاہ حبش کے گورنر کی حیثیت سے ارياط نے یمن پر حکمرانی کی۔ پھر اس کی فوج کے ایک ماتحت کمانڈر أبْرَہَہ اشرم (ابرہہ نکٹا) نے اسے قتل کر کے خود اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ عام الفیل میں ابرہہ کی ہلاکت کے بعد اس کے دو بیٹے یکسوم اور مسروق یکے بعد دیگرے فرمانروائے یمن ہوئے۔

[1] وفاء الوفا للسمهودي :1/189,188. [2] مسند أحمد :5/340، السلسلة الصحيحة :2423. [3] المنجد في الأعلام، ص:510، المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام:2/285. [4] سبأ 34:16.

یمن پر ایرانی قبضہ

چند سال بعد یمنیوں نے علم بغاوت بلند کر کے سیف ذی یَزَن حمیری کے بیٹے معدیکرب کی قیادت میں حبشیوں کو ملک سے نکال باہر کیا۔ یہ 575ء کا واقعہ ہے۔ شاہ معدیکرب نے کچھ حبشیوں کو اپنی خدمت اور شاہی جلوس کی زینت کے لیے روک لیا لیکن یہ شوق مہنگا ثابت ہوا۔ ان حبشیوں نے ایک روز معدیکرب کو دھوکے سے قتل کر دیا۔

اب سیف ذی یزن نے کسریٰ نوشیرواں کے دربار میں پہنچ کر فریاد کی کہ کوّوں نے ہمارا ملک تاراج کر دیا ہے۔ نوشیرواں نے پوچھا: کون سے کوے، حبشی یا ہندوستانی؟ سیف بولا: یہ کوے حبش سے آئے ہیں۔ نوشیرواں نے جواب دیا: ہمیں تمھارے دور دراز ملک پر قبضہ کرنے کی ہوس نہیں۔ اس میں بھیڑوں اور اونٹوں کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ پھر اس نے سفیرِ یمن کو دس ہزار درہم اور خلعت دے کر رخصت کر دیا۔ سیف نے دربار سے باہر نکلتے ہی درہموں کے دسوں توڑے شاہی محل کے غلاموں، کنیزوں اور دربانوں میں لٹا دیے۔ نوشیرواں کو پتہ چلا تو اس نے سیف کو واپس بلا کر شاہی عطیے کی اس بے توقیری کا سبب پوچھا۔ اس نے جواب دیا: میں تمھارے ان سیم و زر کے سکوں کے تحفے کو کیا کرتا! جس ملک سے میں آیا ہوں، وہاں تو پہاڑ بھی سونے چاندی کے ہیں۔ نوشیرواں نے نرم پڑ کر اسے کچھ دن اور ٹھہرا لیا۔



ضام (یمن) کی ایک شاندار مسجد

مشاورت ہوئی تو وزرائے سلطنت نے رائے دی کہ شاہی بندی خانوں کے قیدی اس کے ہمراہ کر دیے جائیں کہ اگر یہ سارا گروہ مارا بھی گیا تو کچھ مجرم ہی کیفرِ کردار کو پہنچیں گے۔ نوشیرواں کو یہ رائے پسند آئی، چنانچہ آٹھ سو خونیں مجرم قید خانوں سے نکال کر سالخوردہ فوجی افسر وہرز کی کمان میں سیف کو دے دیے گئے۔ وہ انھیں چند جہازوں میں سوار کر کے حضر موت کے ساحل پر اُترا۔ یمنیوں کی جمعیت بھی اس ایرانی فوج سے آملی۔ ابرہہ کا بیٹا مسروق مقابلے کو نکلا مگر وہرز کے ہاتھوں مارا گیا اور حبشی فوج بھاگ نکلی۔ یوں کسریٰ نے یمن کو فارس کا ایک صوبہ بنا لیا۔ وہرز یمن کا پہلا ایرانی گورنر مقرر ہوا۔ آخری عجمی گورنر باذان نے 628ء میں اسلام قبول کر لیا اور اس کے ساتھ ہی یمن فارسی اقتدار سے آزاد ہو کر اسلام کی عملداری میں آ گیا۔[1]

[1] محاضرات تاریخ الأمم الإسلامیۃ:1/30,29، غلبۂ روم، مولانا ظفر علی خان، ص:16-18.

اصحابِ اُخدود

نجران یمن کے حوالے سے کتبِ احادیث میں ایک حیرت انگیز واقعہ بیان ہوا ہے۔ امام مسلم اور امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم سے پہلے لوگوں میں ایک بادشاہ تھا۔ اس کا ایک جادوگر تھا۔ جادوگر بوڑھا ہوگیا تو اس نے بادشاہ سے کہا کہ میری عمر زیادہ ہوگئی ہے، موت قریب آ گئی ہے، لہٰذا ایک بچہ میرے سپرد کردو تا کہ میں اسے جادو سکھادوں۔ بادشاہ نے ایک بچہ اس کے حوالے کردیا اور اس نے بچے کو جادو سکھانا شروع کردیا۔ جادوگر (کے ٹھکانے) اور بادشاہ کے (محل کے) درمیان ایک راہب بھی رہتا تھا۔ بچہ راستے میں راہب کے پاس رک جاتا اور اس کی گفتگو سنتا، اسے راہب کا طریقہ اور گفتگو بہت اچھی لگتی۔ جب وہ جادوگر کے پاس جاتا تو جادوگر اسے مارتا اور پوچھتا کہ دیر سے کیوں آئے ہو؟ اسی طرح جب وہ اپنے گھر جاتا تو گھر والے بھی پٹائی کرتے اور پوچھتے کہ دیر سے کیوں آئے ہو؟ اس نے اس امر کی شکایت راہب سے کی۔ راہب نے کہا کہ جب جادوگر تمھیں مارنے لگے تو اس سے کہہ دیا کرو کہ گھر والوں نے روک لیا تھا اور اسی طرح جب گھر والے مارنے لگیں تو کہہ دیا کرو کہ مجھے جادوگر کے پاس دیر ہوگئی۔ اس طرح دن گزرتے رہے۔

خوفناک بلا کا صفایا: ایک دن اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑے خوفناک جانور نے لوگوں کا راستہ روک رکھا ہے اور لوگ اس کے خوف کی وجہ سے راستہ عبور نہیں کرسکتے۔ اس نے کہا: آج میں جان لوں گا کہ جادوگر افضل ہے یا راہب افضل ہے، چنانچہ اس نے ایک پتھر پکڑا اور کہا: اے اللہ! اگر راہب کا دین جادوگر کے دین کی نسبت تجھے زیادہ پسندیدہ ہے تو اس جانور کو ہلاک کردے تا کہ لوگ راستے سے گزر جائیں۔ یہ کہہ کر اس نے پتھر مارا اور اس جانور کو ہلاک کردیا۔ راستہ صاف ہوگیا اور لوگ گزرنے لگے۔ اس نے راہب کو یہ خبر دی تو اس نے کہا: اے میرے پیارے بیٹے! اب تم مجھ سے بھی (آگے) بڑھ گئے ہو اور یقیناً عنقریب تم آزمائش میں ڈالے جاؤ گے۔ اگر تمھیں آزمایا جائے تو میرے بارے میں کسی کو نہ بتانا۔

درباری ایمان لے آیا: اب یہ بچہ مادر زاد اندھوں اور پھلبہری (ایک بیماری جس سے بدن پر سفید داغ پڑجاتے ہیں) اور دیگر بیماریوں میں مبتلا مریضوں کا علاج کرتا اور انھیں شفا نصیب ہوجاتی تھی۔ بادشاہ کا ایک ہم نشین تھا، وہ اندھا ہوگیا۔ اس نے اس بچے کی شہرت سنی، وہ اس کے پاس بہت سے تحائف لے کر آیا۔ اس نے کہا کہ مجھے شفا دے دو تو یہ تمام سامان تمھارا ہوگا۔ بچے نے کہا کہ میں کسی کو شفا نہیں دے سکتا، شفا دینا تو

صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اگر تم اللہ پر ایمان لے آؤ تو میں دعا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ تمھیں شفا عطا فرما دے گا، چنانچہ وہ ایمان لے آیا۔ بچے نے اس کے لیے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے شفا عطا فرما دی۔

بادشاہ سے مکالمہ: یہ شخص اب بادشاہ کے پاس جا کر اسی طرح بیٹھنے لگا جس طرح پہلے بیٹھا کرتا تھا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: اے فلاں! تمھاری نظر کس نے ٹھیک کی ہے؟ اس نے جواب دیا: میرے رب نے۔ بادشاہ نے پوچھا: میں نے ٹھیک کی ہے؟ اس نے کہا: نہیں، بلکہ اس نے جو میرا بھی رب ہے اور تیرا بھی رب ہے۔ بادشاہ نے پوچھا: کیا میرے علاوہ تیرا کوئی اور بھی رب ہے؟ اس نے جواب دیا: ہاں، میرا اور تیرا رب اللہ ہے۔ اس کے بعد بادشاہ اسے سزا دیتا رہا حتی کہ اس نے بچے کے بارے میں بتا دیا۔ بادشاہ نے بچے کو بلایا اور کہا: بیٹا! اب تمھارا جادو اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ تم نے مادر زاد اندھے پن، پھلبہری اور دوسری بیماریوں کا علاج کر کے بیماروں کو شفا دینی شروع کر دی ہے۔ بچے نے جواب دیا: میں کسی کو شفا نہیں دیتا، شفا دینا تو صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ بادشاہ نے کہا: میرا کام ہے! بچے نے جواب دیا: نہیں۔ بادشاہ نے پوچھا: کیا میرے سوا تیرا کوئی اور بھی رب ہے؟ بچے نے جواب دیا: ہاں، میرا اور تیرا رب تو اللہ ہے۔ اس پر بادشاہ اسے پکڑ کر سخت تکلیفیں دیتا رہا یہاں تک کہ بچے نے راہب کے بارے میں بتا دیا۔

راہب پر ظلم و ستم: اب راہب کو لایا گیا۔ تب بادشاہ نے اس سے کہا کہ اپنے دین سے باز آ جاؤ تو اس نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے اس کے سر پر آرا رکھ کر اسے دو ٹکڑے کر دیا، پھر بادشاہ کے ہم نشین کو لایا گیا، اس سے بھی کہا گیا کہ اپنے اس دین کو چھوڑ دو۔ اس نے انکار کر دیا تو بادشاہ نے اس کے سر پر آرا رکھ کر اسے بھی چیر دیا حتی کہ اس کے جسم کے دو حصے ہو کر زمین پر گر گئے۔

پہاڑ پر دُعا: اب اس نے اس بچے سے کہا کہ تم بھی اپنے دین کو ترک کر دو۔ اس نے بھی انکار کیا تو بادشاہ نے اسے ایک جماعت کے سپرد کر کے ایک پہاڑ کی طرف بھیج دیا اور کہا کہ جب تم اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جاؤ تو (اس بچے سے پوچھو کہ کیا تو اپنا دین چھوڑتا ہے) اگر یہ اپنا دین چھوڑ دے تو بہتر ورنہ اسے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرا دو۔ وہ اسے لے گئے اور جب اسے لے کر پہاڑ کی چوٹی پر چڑھے تو بچے نے دعا کی: اَللّٰهُمَّ! اكْفِنِيهِمْ بِمَا شِئْتَ ”اے اللہ! تو ان کے مقابلے میں، جیسے تو چاہے، میرے لیے کافی ہو جا۔“ اس سے پہاڑ لرزنے لگا اور وہ سب کے سب نیچے گر گئے (اور مر گئے)۔

سمندر میں نصرتِ الٰہی: بچہ صحیح سلامت واپس آ گیا حتی کہ وہ بادشاہ کے دربار میں داخل ہوا۔ بادشاہ نے پوچھا: تیرے ساتھیوں نے کیا کیا؟ (کیا انھوں نے تجھے پہاڑ کی چوٹی سے نہیں گرایا؟) بچے نے جواب دیا

کہ ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ میرے لیے کافی ہوگیا۔ بادشاہ نے اسے ایک اور جماعت کے ساتھ ایک طویل وعریض کشتی پر سوار کرایا اور کہا کہ جب تم اسے لے کر سمندر کے درمیان پہنچ جاؤ تو (اس سے پوچھنا) اگر یہ اپنے دین سے باز آجائے تو ٹھیک ورنہ اسے سمندر میں غرق کر دینا۔ جب وہ اسے لے کر سمندر میں داخل ہوئے تو بچے نے پھر وہی دعا کی: ''اے اللہ! تو ان کے مقابلے میں، جیسے تو چاہے، میرے لیے کافی ہوجا۔'' چنانچہ وہ سب کے سب غرق ہو گئے مگر بچہ محفوظ رہا۔

بِسْمِ اللّٰهِ کے تیر سے شہادت: بچہ صحیح سلامت واپس آ گیا اور بادشاہ کے دربار میں جا پہنچا۔ بادشاہ نے پوچھا: تیرے ساتھیوں نے کیا کیا؟ (کیا انھوں نے تجھے سمندر میں نہیں پھینکا؟) بچے نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے مقابلے میں میرے لیے کافی ہوگیا، پھر اس نے بادشاہ سے کہا کہ تو مجھے اس وقت تک قتل نہیں کر سکتا جب تک تو وہ کام نہ کرلے جس کا میں تجھے حکم دوں۔ اگر تو نے وہ کام کیا، تب تو مجھے قتل کر سکتا ہے ورنہ تُو مجھے قتل نہیں کر سکتا۔ بادشاہ نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ بچے نے جواب دیا کہ سب لوگوں کو ایک کھلے میدان میں جمع کر، پھر مجھے ایک درخت کے تنے کے ساتھ لٹکا اور میرے ہی ترکش سے ایک تیر نکال اور پھر تیر کو کمان میں رکھ کر یہ پڑھ کر مجھے تیر مار: بِاسْمِ اللّٰهِ رَبِّ الْغُلَامِ ''بچے کے رب، اللہ کے نام سے۔'' اگر تو نے ایسا کیا تو یقیناً تو مجھے قتل کر سکتا ہے۔ بادشاہ نے ایسا ہی کیا، تیر کمان کے درمیان رکھا، پھر بچے کی طرف پھینکا اور کہا: بِاسْمِ اللّٰهِ رَبِّ الْغُلَامِ تیر بچے کی کنپٹی پر لگا، اس نے اپنا ہاتھ اس جگہ رکھا جہاں اسے تیر لگا تھا، پھر وہ فوت ہوگیا۔

مومن خندقوں کی آگ میں کود گئے: لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو بے ساختہ پکار اٹھے کہ ہم اس بچے کے رب پر ایمان لے آئے۔ ہم اس بچے کے رب پر ایمان لائے۔ ہم اس بچے کے رب پر ایمان لائے۔ بادشاہ سے کہا گیا: دیکھ وہی ہوا جس سے تُو ڈرتا تھا۔ اب تو سب لوگ اللہ پر ایمان لے آئے ہیں۔ اس پر بادشاہ نے حکم دیا اور تمام گلیوں کے دہانوں پر خندقیں کھودی گئیں اور ان میں آگ بھڑکا دی گئی، بادشاہ نے کہا کہ جو اس دین سے باز آجائے، اسے چھوڑ دو ورنہ خندق کی آگ میں پھینک دو۔ لوگوں نے دوڑتے ہوئے ایک دوسرے سے آگے بڑھ کر ان خندقوں میں چھلانگیں لگانی شروع کردیں۔ ایک عورت اپنے شیر خوار بچے کے ساتھ آئی۔ وہ آگ میں چھلانگ لگانے سے جھجکی تو بچہ فوراً بول اٹھا: اماں! صبر کر، تُو یقیناً حق پر ہے۔''[1]

ابن اسحاق رحمہ اللہ نے ''سیرت'' میں اس قصے کو ایک دوسرے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس قصے کو بیان کرنے کے بعد ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ بچے کے قتل کے بعد اہل نجران نے بچے کا دین، یعنی دین نصرانیت قبول کرلیا (جو اس

[1] صحیح مسلم: 3005، مسند أحمد: 6/16-18.

وقت تحریف اور شرک کی آمیزش سے پاک تھا)، پھر ذونواس اپنے لشکر سمیت ان کے پاس آیا اور اس نے انھیں دعوت دی کہ یہودیت قبول کرلو یا پھر قتل ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ تو ان لوگوں نے یہودیت قبول کرنے کے بجائے قتل ہونے کو ترجیح دی جس پر اس نے انھیں آگ میں جلایا اور تلوار سے ان کا قتل عام اور مثلہ کیا حتی کہ بیس ہزار کے قریب انسان قتل ہوئے، چنانچہ ذونواس اور اس کے لشکر کے بارے ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائی ہیں:

﴿ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ ﴾ (البروج 85:4-9)

''خندقوں والے ہلاک کیے گئے، (ان خندقوں میں) ایندھن والی آگ تھی، جبکہ وہ ان (کے کناروں) پر بیٹھے تھے اور وہ جو کچھ اہل ایمان کے ساتھ کر رہے تھے، اسے دیکھ رہے تھے۔ اور انھوں نے ان (مومنوں) سے اس کے سوا کسی چیز کا بدلہ نہیں لیا کہ وہ اللہ پر ایمان لائے تھے جو بڑا زبردست، نہایت قابل تعریف ہے، وہ ذات کہ اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہی ہر چیز کو دیکھنے والا ہے۔''[1]

ابن اسحاق، ابن ہشام رحمہ اللہ اور دیگر مؤرخین نے اس بادشاہ کا نام ذونواس قرار دیا ہے اور اصحاب الاخدود کی شہادت کا سبب یہودیت قبول کرنے سے انکار بتایا ہے۔ لیکن صحیح حدیث کی روشنی میں ان کی بات درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ ذونواس یہودی تھا اور اصحاب الاخدود کو شہید کرنے والا بادشاہ مشرک تھا جو اپنے رب ہونے کا دعویدار تھا۔ نجران کے لوگوں میں اب تک وہ جگہ معروف ہے جہاں اصحاب الاخدود کا واقعہ پیش آیا تھا۔

[1] السيرة لابن إسحاق 1/36،37، السيرة لابن هشام 1/34-36.



2

حیرہ (عراق) کی لخمی بادشاہت

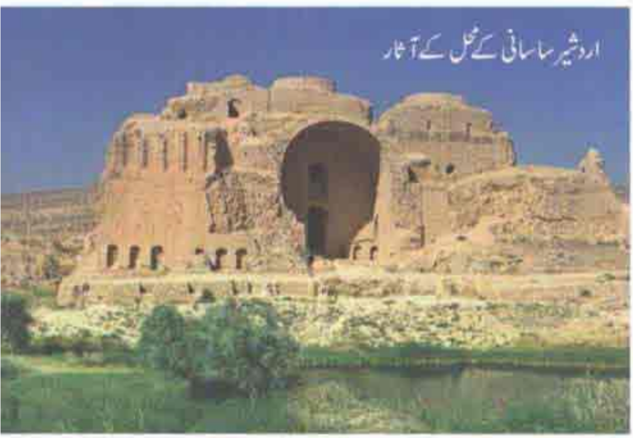
عراق پر ایرانی، یونانی اور ساسانی تسلّط

عراق اور اس کے نواحی علاقوں پر ہخامنشی بادشاہ کوروش کبیر (سائرس یا ذوالقرنین) کے زمانے (557 ق م تا 529 ق م) ہی سے اہلِ فارس کی حکمرانی چلی آرہی تھی یہاں تک کہ 330 ق م میں سکندر مقدونی نے دارا سوم کو شکست دے کر فارسیوں کی طاقت توڑ دی جس کے نتیجے میں ہخامنشی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔

323 ق م میں بابل میں سکندر اعظم کی وفات پر اس کی ایشیائی میراث سلوکیوں کے قبضے میں آئی۔ اس یونانی سلطنت کا بانی سکندر اعظم کا جرنیل سلوکس تھا۔ انھوں نے اپنا دارالحکومت سلوکیہ دجلہ کے مغربی کنارے آباد کیا۔ پھر 171 ق م سے 226ء تک شمالی ایران کے پار تھی وہاں حکمران رہے۔ اس دوران میں قحطانی قبائل نے ترکِ وطن کر کے عراق کے ایک بہت بڑے شاداب سرحدی علاقے میں بودوباش اختیار کی، پھر عدنانی تارکینِ وطن (مُضر، ربیعہ اور بنوبکر) کا ریلا آیا اور انھوں نے لڑبھڑ کر جزیرہ فراتیہ (الجزیرہ) کے ایک حصے کو اپنا مسکن بنالیا۔



سلوکی عہد کا سکہ



اردشیر ساسانی کے محل کے آثار

226ء میں اردشیر نے ایران میں ساسانی حکومت کی داغ بیل ڈالی اور اپنے ملک کی سرحد پر آباد عربوں کو زیر کیا تو قبیلہ قضاعہ نے ملکِ شام کی راہ لی، جبکہ حیرہ اور اَنبار کے عرب باشندوں نے باجگزار بننا گوارا کیا۔[1] اَنبار بغداد کے مغرب میں دریائے فرات کے کنارے 55 کلومیٹر کے فاصلے پر ایک شہر ہے۔ اسی شہر میں بخت نصر نے بنی اسرائیل کے قیدی رکھے

[1] محاضرات تاریخ الأمم الإسلامية: 31,30/1.

تھے۔ ان دنوں عراق کا مغربی صوبہ انبار کہلاتا ہے۔ [1]

اردشیر سوم، نوشیرواں (خسرو اوّل)، ہرمز چہارم اور خسرو پرویز (خسرو ثانی) ساسانیوں کے مشہور حکمران تھے۔ (''خُسرَوْ'' کو عربی میں ''کسریٰ'' کہتے ہیں۔) ان کا دارالحکومت مدائن سلوکیہ (سلوقیہ) کے بالمقابل دجلہ کے مشرقی کنارے آباد تھا۔ نبی ﷺ نوشیرواں عادل (م:579ء) کے عہد میں پیدا ہوئے۔



اردشیر سوم کے سکے

حیرہ کی باجگزار بادشاہت

اَردشیر اول کے عہد میں حیرہ، بادیۃ العراق (صحرائے سماوہ) اور الجزیرہ کے ربیعی اور مُضَری قبائل پر جذیمۃ الوضاح کی حکمرانی تھی۔ دراصل اَردشیر نے محسوس کر لیا تھا کہ عرب باشندوں پر براہِ راست حکومت کرنا اور انھیں سرحد پر لوٹ مار سے باز رکھنا ممکن نہیں، لہٰذا اس نے انھی میں سے جذیمہ کو حکمران بنا دیا تاکہ بوقت ضرورت رومیوں کے خلاف ان سے مدد لی جا سکے، چنانچہ شاہانِ حیرہ کے پاس فارسی فوج کی ایک یونٹ ہمیشہ رہا کرتی تھی جس سے بادیہ نشین عرب باغیوں کی سرکوبی کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

حیرہ کے لخمی حکمران

268ء میں جذیمہ فوت ہوگیا اور عَمرو بن عدی بن نصر لخمی اس کا جانشین ہوا۔ یہ شاپور ساسانی کا ہم عصر تھا۔ اس کے بعد قباد بن فیروز کے عہد تک حیرہ پر لخمیوں کی مسلسل حکمرانی رہی۔ قباد کے عہد میں مُزدَک کا ظہور ہوا جو اباحیت کا علمبردار تھا۔ قباد اور اس کی بہت سی رعایا نے مُزدَک کی ہمنوائی کی۔ قباد نے حیرہ کے بادشاہ منذر بن ماء السماء کو پیغام بھیجا کہ تم بھی یہی مذہب اختیار کر لو۔ منذر بڑا غیرت مند تھا، انکار کر بیٹھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قباد نے اس کو معزول کر کے اس کی جگہ مزدکی دعوت کے ایک پیروکار حارث بن عمرو بن حجر کندی کو حیرہ کی حکمرانی سونپ دی۔

قباد کے بعد فارس کی باگ ڈور کسریٰ نوشیرواں کے ہاتھ آئی۔ اسے مزدکیّت سے سخت نفرت تھی۔ اس نے مُزدَک اور اس کے ہمنواؤں کی ایک بڑی تعداد کو قتل کروا دیا اور منذر کو دوبارہ حیرہ کا حکمران بنا دیا۔

جنگ ذی قار میں عربوں کی فتح

مُنذر بن ماء السماء کے بعد نعمان بن منذر (م:15 قبل ہجرت/608ء) کے عہد تک حیرہ کی حکمرانی اسی کی نسل

[1] معجم البلدان، مادة: أنبار، المنجد في الأعلام، ص:72.

میں رہی، پھر زید بن عدی بن زید عبادی نے کسریٰ (خسرو پرویز) سے نُعمان بن منذر کی ایک جھوٹی شکایت کی جس پر کسریٰ بھڑک اٹھا اور نعمان کو اپنے پاس طلب کیا۔ نعمان چپکے سے بنُوشیبان کے سردار ہانی بن مسعود کے پاس پہنچا اور اپنے اہل وعیال اور مال و دولت کو اس کی امانت میں دے کر کسریٰ کے پاس گیا۔ کسریٰ نے اسے قید کر دیا اور وہ قید ہی میں فوت ہو گیا۔ عدی ہی وہ شخص ہے جس نے کسریٰ کے دیوان شاہی میں عربی تحریروں کا آغاز کیا تھا۔

ادھر کسریٰ نے نعمان کو قید کرنے کے بعد اس کی جگہ ایاس بن قَبیصہ طائی کو حیرہ کا حکمران بنایا اور اسے حکم دیا کہ ہانی بن مسعود سے نعمان کی امانت طلب کرے۔ ہانی غیرت مند تھا، اس نے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ اعلانِ جنگ بھی کر دیا۔ پھر کیا تھا، ایاس اپنے جلو میں کسریٰ کے لاؤ لشکر اور مرزبانوں کی جماعت لے کر روانہ ہوا اور ذی قار کے میدان میں فریقین کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں بنُو شَیبان کو فتح حاصل ہوئی اور فارسیوں نے شرمناک شکست کھائی۔ یہ پہلا موقع تھا جب عرب نے عجم پر فتح حاصل کی تھی۔ یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے تھوڑا عرصہ بعد کا ہے۔ آپ ﷺ کی بعثت حیرہ پر ایاس کی حکمرانی کے آٹھ ماہ بعد ہوئی تھی۔

ایاس کے بعد کسریٰ نے حیرہ پر ایک فارسی حاکم مقرر کیا لیکن 632ء میں لخمیوں کا اقتدار پھر بحال ہو گیا اور مُنذر بن معرور نے باگ ڈور سنبھالی مگر ابھی اسے برسر اقتدار آئے صرف آٹھ ماہ ہوئے تھے کہ عہد صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مجاہدین اسلام کی قیادت کرتے ہوئے حیرہ میں داخل ہو گئے اور لخمی سلطنت ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔[1] پھر دو تین سال کے اندر پورا عراق اسلامی خلافت کا حصہ بن گیا۔

[1] تاریخ الطبري: 609/1، الکامل في التاریخ: 379/1، محاضرات تاریخ الأمم الإسلامیة: 30/1-33، المنجد في الأعلام، ص: 257، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 55/10.

3

شام کی غسانی بادشاہت

جس زمانے میں عرب قبائل کی ہجرت زوروں پر تھی، قبیلہ قضاعہ کی چند شاخیں حدودِ شام میں آکر آباد ہوگئیں۔ ان کا تعلق بنی سَلیح بن حلوان سے تھا اور انھی کی ایک شاخ بنو ضجعم بن سلیح تھی جسے ضَجَاعِمَہ کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ رومیوں نے عرب کے بدوؤں کی لوٹ مار روکنے اور فارسیوں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے ان کے سر پر دیارِ شام کی حکمرانی کا تاج رکھ دیا۔

بُصری الشام کے غسانی حکمران

ضَجَاعِمَہ کا دورِ حکومت پوری دوسری صدی عیسوی پر محیط رہا۔ اس کے بعد آلِ غسان نے بنو ضجعم کو شکست دی تو رومیوں نے انھیں دیارِ شام (موجودہ جنوب مشرقی شام اور اُردن) کے عرب باشندوں کا بادشاہ تسلیم کرلیا۔ آلِ غسان کی حکومت میں تدمر، رقیم (بطراء)، عَمّان، معان وغیرہ شہر آباد تھے۔ اس کا پایہ تخت بُصریٰ (بصری الشام) تھا اور



مکتوب نبی ﷺ بنام ابوشمر غسانی

رومیوں کے آلۂ کار کی حیثیت سے دیارِ شام پر ان کی حکمرانی مسلسل قائم رہی۔ غسّانی، جنھوں نے عموماً عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا، ایران و روم کے معرکوں میں روم کے ساتھ تھے۔ حارث بن جبلہ (متوفی 569ء) نہایت شجاع اور فراخ دل بادشاہ تھا۔ رومیوں نے اس کے جانشین منذر کے سر پر تاج رکھا۔ عہدِ نبوی میں حارث بن

ابوشمر غسانی حکمران تھا۔ وہ غوطہ (دمشق) میں مقیم تھا جب نبی ﷺ کے سفیر شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہ نے اُسے مکتوبِ نبوی پہنچایا۔



وادی یرموک کا ایک منظر

انھی دنوں بلقاء کے حاکم شُرَحْبیل بن عمرو غسانی نے نبی کریم ﷺ کے سفیر حارث بن عمیر ازدی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا جس کے نتیجے میں غزوۂ مؤتہ پیش آیا۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں 15ھ/636ء میں یَرموک کی جنگ پیش آئی اور آلِ غسان کا آخری حکمران جبلہ بن اَیْہَم غسانی (م:20ھ/641ء) حلقہ بگوشِ اسلام ہوگیا۔ اگرچہ اس کا غرورِ حکمرانی اسلامی مساوات کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کرسکا اور وہ عہدِ فاروقی میں مرتد ہوکر شاہِ روم کے پاس چلا گیا۔[1]

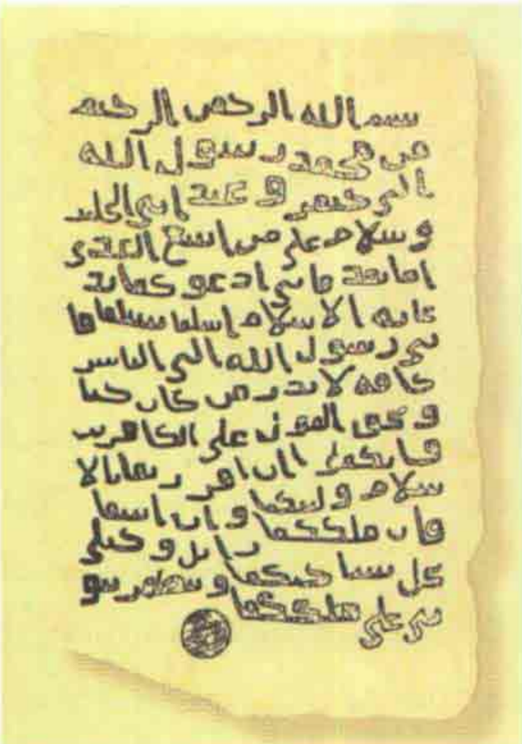
اس کے ارتداد کی تفصیل کچھ اس طرح ہے: ایک حج کے موقع پر جبلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ طواف کر رہا تھا۔ اس دوران میں ایک فزاری شخص کا پاؤں اس کی چادر پر آ گیا۔ اس پر جبلہ نے اسے تھپڑ مار کر اس کی ناک پھوڑ دی۔ فزاری نے عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ امیرالمؤمنین نے جبلہ سے قصاص کا مطالبہ کیا تو وہ بولا: ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں بادشاہ ہوں اور یہ گھٹیا آدمی ہے۔'' عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اسلام مساوات کا سبق دیتا ہے۔'' وہ کہنے لگا: ''میرا تو خیال تھا کہ قبول اسلام کے بعد میرا مقام پہلے سے بلند ہوجائے گا۔'' اس پر جبلہ نے عیسائیت قبول کرنے کی دھمکی دی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ارتداد کی صورت میں تمھیں قتل کر دیا جائے گا۔'' جبلہ نے ایک رات کی مہلت مانگی جو مل گئی مگر وہ اسی رات اپنے لاؤلشکر سمیت فرار ہوکر پہلے شام اور پھر قسطنطنیہ چلا گیا۔ قیصر نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ کچھ عرصہ بعد جبلہ نے اپنے اس فعل پر بہت ندامت ظاہر کی لیکن کفر کی حالت ہی میں وفات پا گیا۔[2]

[1] محاضرات تاريخ الأمم الإسلامية: 35/1، تاریخ ارض القرآن (کامل): 2/62-64. [2] البداية والنهاية: 8/65-69.

4

عُمان کی بادشاہت

نبی ﷺ سے دو تین پشت پہلے بنومستکبر نے عُمان میں ایک وسیع حکومت قائم کرلی تھی جو ساسانی ایرانیوں کے ماتحت تھی۔ یہاں کا حکمران جُلندیٰ بن مستکبر عربی ادبیات میں خاصا مشہور ہے۔ عہدِ نبوی میں جلندیٰ بن مستکبر کے بیٹے جیفر اور عبد مشترکہ طور پر عُمان کے حکمران تھے۔ جیفر بادشاہ تھا اور اس کا چھوٹا بھائی عبد امورِ سلطنت میں اس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ ان کا دارالحکومت صُحار خلیج عُمان کے ساحل پر واقع تھا جو موجودہ دارالحکومت مسقط سے سوا دو سو کلومیٹر شمال مغرب میں ہے۔


بسم الله الرحمن الرحيم
من محمد رسول الله

مکتوب نبی ﷺ بنام جیفر وعبد (شاہان عمان)

شاہانِ عمان آغوشِ اسلام میں

نبیِ کریم ﷺ کی دعوت پر جب عبد اور جیفر نے اسلام قبول کر لیا تو نبیِ کریم ﷺ نے سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو ان کے دربار میں اپنا وکیل مقرر فرمایا۔[1] جلد ہی اہلِ عُمان بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔[2] لقیط بن مالک ازدی ذوالتاج نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ اسے یا اس کے باپ کو یہ خطاب غالبًا کسرائے ایران سے ملا ہو گا۔ یہاں دما کے مقام پر بستجان نامی ایرانی اسوار (فوجی گورنر) رہتا تھا۔ عمان میں ازد کے علاوہ ثمالہ اور حدان نامی قبائل بھی رہتے تھے۔ ان کے نام رسول اللہ ﷺ کا ایک مکتوب بھی ملتا ہے۔

[1] الوثائق السياسية، عدد: 46. [2] موسوعة العالم الإسلامي، ص: 130.

عُمان میں صحار کا میلا یکم رجب کو شروع ہو کر پانچ دن رہتا تھا۔ یہاں بنو مستکبر بکری پر دس فیصد محصول وصول کرتے تھے۔ اس کے بعد دَبا (عمان) کا میلا لگتا تھا۔[1]

بنو امیہ کے عہد میں عُمان کے لوگوں نے خارجی عقائد اختیار کر لیے اور وہ اتنے طاقتور ہو گئے کہ آلِ جلندیٰ نے حجاج بن یوسف ثقفی کے لشکر کو شکست دی۔ بعد میں وہ اموی لشکر سے شکست کھا کر جزیرہ زنجبار (مشرقی افریقہ) کی طرف بھاگ گئے۔[2]

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 14/ 2/ 199۔

[2] Histoire des Arabes, Cl. Huart:2/257-282

5

سلطنت کندہ

نجد میں کندہ کے نام سے ایک عرب حکومت 425ء سے 550ء تک قائم رہی جو مناذرہ، یعنی ملوک حیرہ کی ہمسری کا دعویٰ رکھتی تھی۔ بنوکہلان میں ثور (کندہ) بن عُفیر کی اولاد میں سے حُجر بن عمرو ملقب بہ آکلُ المُرار حمیری بادشاہ حسان بن تبع کا سوتیلا بھائی تھا۔ حسان نے جب اندرونِ عرب لشکر کشی کی اور وہاں متعدد قبائل کو مطیع کر لیا تو حجر بن عمرو کو مفتوحہ قبائل کا حکمران مقرر کر دیا۔ کِندہ ایک عظیم قحطانی قبیلہ ہے جو ثور (کندہ) بن عُفیر بن عدی بن حارث بن مرہ بن اُدَد کی طرف منسوب ہے۔ اسے کِندہ کا لقب اپنے والد کی نافرمانی کی وجہ سے ملا۔ اس کی یہ تین بڑی شاخیں معروف ہوئیں: معاویہ بن کندہ، السَّکون اور سکسک۔[1]



مملکت کندہ کے قدیم قلعے کے آثار

کندہ کے حکمران اور جنگِ کُلاب

حُجر بن عمرو سلطنت کندہ کا بانی ٹھہرا، پھر اس کا بیٹا عمرو بن حُجر جانشین ہوا اور عمرو کے بعد حارث بن عمرو حکمران ہوا جو ساسانی بادشاہ قباد کے زمانے میں کچھ عرصہ حیرہ کا حاکم بھی رہا مگر نوشیرواں عادل کی تخت نشینی (531ء) کے بعد یہ حکومت اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ حارث نے 528ء میں سلطنتِ کندہ اپنے چار بیٹوں حُجر، شُرحبیل، معدی کرب اور سلمہ میں بانٹ دی تھی۔ بنو اسد پر حُجر کی حکومت قائم ہوئی۔ شرحبیل بنو بکر، حنظلہ، عمرو بن تمیم اور رباب کے قبائل کا حاکم ہو گیا۔ سلمہ بنو تغلب اور نمر بن قاسط پر حکومت کرنے لگا اور سعد بن زید مناۃ، بنو قیس اور بنو کنانہ معدی کرب کے زیرِ فرمان آ گئے۔ کچھ عرصہ بعد ان میں جنگ کلاب برپا ہوئی جس میں شرحبیل مارا گیا۔ حُجر نے اس جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ 540ء میں بنو کلب قضاعی نے حارث بن عمرو کو قتل کر دیا۔ بنو اسد عدنانی پر اس کے بیٹے حجر کی حکومت رہی۔ پھر 550ء میں حجر بنو اسد کے ہاتھوں دھوکے سے مارا گیا تو اس کا بیٹا امرؤالقیس فرار ہو گیا اور قیصر سے امداد

[1] معجم قبائل العرب: 998/3، المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 315/3.


جزیرہ نما عرب کی سلطنتیں، قبائل اور مذاہب
بحیرۂ عرب
بحیرۂ روم
بحیرۂ احمر

لینے کے لیے قسطنطنیہ پہنچا مگر قیصر کے رویے سے اسے مایوسی ہوئی۔ آخر کار 560ء میں قیصر نے اسے انگورہ (انقرہ Ankara) میں مروادیا۔ [1] اَنقرہ شہر شمال مغربی اناطولیہ میں واقع ہے۔ 1341ھ/1923ء سے ترکی کا دارالحکومت ہے۔ اس شہر کو پہلے انگورہ (Angora) یا انکوریہ (Ankyra) کہتے تھے۔ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں شاہِ ایران خسرو پرویز نے اسے فتح کیا۔ 33ھ/654ء میں مسلم فاتحین یہاں پہنچے۔ 190ھ/806ء میں ہارون الرشید نے اسے دوبارہ فتح کیا۔ 464ھ/1071ء میں سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے رومی حکمران دیوجانوس رومانوس کو شکست دے کر انقرہ سمیت پورے اناطولیہ کو اسلامی سلطنت میں شامل کرلیا۔ امیر تیمور نے 804ھ/1402ء میں جنگِ انگورہ میں عثمانی سلطان بایزید اوّل یلدرم کو شکست دے کر قید کرلیا تھا۔ [2]

الفاو: کندہ کا دارالحکومت

کندہ کا دارالحکومت الفاو آج کل ''قریہ'' کہلاتا ہے۔ یہ ان قافلوں کی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا جو سبا، معین، قتبان، حضرموت اور حمیر سے شمال مشرق کو جاتے تھے۔ یہ ریاست شمال میں دومۃ الجندل سے جنوب میں الربع الخالی تک پھیلی ہوئی تھی۔ 1972ء میں جامعۃ الریاض کی ایک ٹیم نے الفاو میں کھدائی کا آغاز کیا اور یہاں بازار، محل، معبد اور مکانات کھود نکالے۔ [3] الفاو نجران کے شمال مشرق میں 120 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ [4]

---

[1] تاریخ ابن خلدون: 2/316-320، الکامل لابن الأثیر: 1/316,315، العرب قبل الإسلام: 1/216-218، معجم قبائل العرب: 2/516,515. [2] معجم البلدان، مادۃ: أنقرۃ، المنجد في الأعلام، ص: 78، الموسوعۃ العربیۃ المیسرۃ: 1/248، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 3/450، Oxford English Reference Dictionary. [3] اٹلس سیرت نبوی، ص: 66. [4] المفصل في تاریخ العرب قبل الإسلام: 1/178.



سلطنت کندہ کے دارالحکومت الفاو کے دریافت شدہ کھنڈر

6

تدمر کی عرب سلطنت

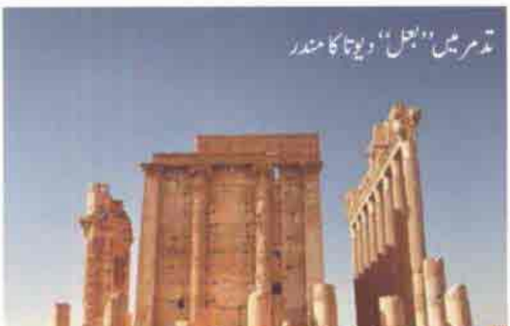
صحرائے شام کے اندر واقع شہر تدمر (Palmyra) عروس الصحراء کہلاتا تھا۔ عربوں میں مشہور تھا کہ تدمر کی تعمیر میں جنوں نے سلیمان علیہ السلام کی مدد کی تھی۔ پہلی صدی عیسوی میں یہاں ایک طاقتور عرب مملکت قائم ہوئی جسے شاہ اذینہ ثانی اور ملکہ زنوبیا (زینب) کے عہد میں عروج حاصل ہوا۔ قیصر جالینوس (Gallienus) کے باجگزار کی حیثیت سے اذینہ (Odenathus) سلطنتِ روم کے تمام مشرقی مقبوضات کا فرمانروا بن گیا اور قیصر نے اسے آگسٹس کا خطاب دیا۔ 67-266ء میں اس کے قتل پر ملکہ زنوبیا نے مصر فتح کر کے سلطنت کو وسیع کیا۔



ملکہ زنوبیا (زینب) کا سکہ

سلطنتِ تدمر اور رومیوں کے ہاتھوں اس کی تباہی

فتح مصر کے کچھ عرصہ بعد تدمر نے رومیوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ 270ء میں زنوبیا نے شکست کھائی اور تدمر نے ہتھیار ڈال دیے لیکن 272ء میں جب اس نے دوبارہ بغاوت کی تو رومی حکمران اورلیان نے اس پر حملہ کیا اور ملکہ زنوبیا کو گرفتار کر کے روم بھیج دیا اور شہر تباہ کر دیا۔ اس کے آثار میں ''بعل'' دیوتا کا مندر مشہور ہے۔ رومی اقتدار کی ساڑھے تین صدیوں میں تدمر میں عیسائیت کو فروغ ملا۔ اس عرصے میں پورے شام میں عیسائیت پھیل گئی۔ عہدِ فاروقی میں شام اسلامی خلافت کا حصہ بن گیا۔[1]



تدمر میں ''بعل'' دیوتا کا مندر

[1] انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم: 65,64/2، اٹلس فتوحات اسلامیہ، ص: 116 و 179 و 186، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 573,572/5.

7

حجاز کی امارت

مکہ میں آبادی کا آغاز سیدنا اسماعیل علیہ السلام سے ہوا تھا۔ آپ نے 137 سال کی عمر پائی [1] اور تاحیات مکہ کے سربراہ اور بیت اللہ کے متولی رہے۔ آپ کے بعد آپ کے دو صاحبزادگان نابت، پھر قیدار (یا قیدار پھر نابت) یکے بعد دیگرے مکہ کے والی ہوئے۔ ان کے بعد ان کے نانا مضاض بن عَمرو جُرہُمی نے زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس طرح مکہ کی سربراہی بنو جرہم کی طرف منتقل ہوگئی۔ [2]

بخت نصر کا عرب پر حملہ


بخت نصر دوم کا سکہ

عراق میں بُخت نصّر کے ظہور سے کچھ پہلے بنو جرہم کی طاقت کمزور پڑ گئی اور مکہ کے افق پر عدنان کا سیاسی ستارہ جگمگانے لگا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ بُخت نصّر نے ذاتِ عرق میں عربوں سے جو معرکہ آرائی کی تھی، اس میں عرب فوج کا کمانڈر جرہمی نہ تھا۔ [3]

پھر بُخت نصّر دوم نے 586 ق م میں دوسرا حملہ کیا تو بنو عدنان یمن بھاگ گئے۔ اس وقت بنو اسرائیل کے نبی یرمیاہ علیہ السلام تھے۔ وہ عدنان کے بیٹے مَعَدّ کو اپنے ساتھ ملکِ شام لے گئے اور جب بُخت نصّر کا زور ختم ہوا اور معد مکہ آئے تو انھوں نے قبیلہ جرہم کے ایک شخص جوشم (جرشم یا جوشن) بن جلہمہ کی لڑکی معانہ سے شادی کی اور اسی کے بطن سے نزار پیدا ہوئے۔ [4]

مکہ پر بنوخزاعہ کا قبضہ

مکہ میں بنو جرہم نے زائرینِ بیت اللہ پر زیادتیاں شروع کر دیں اور خانہ کعبہ کا مال کھانے سے بھی دریغ نہ کیا، چنانچہ جب بنوخزاعہ نے عمرو بن لُحَی کی قیادت میں مَرُّ الظّہران میں پڑاؤ کیا تو انھوں نے حالات سے فائدہ اٹھاتے

[1] کتاب مقدس (پیدائش) 17:25۔ [2] قلب جزیرۃ العرب، ص: 230. ابن ہشام نے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے صرف نابت کی تولیت کا ذکر کیا ہے۔ [3] قلب جزیرۃ العرب، ص: 230. [4] الکامل لابن الأثیر: 207،206/1، الروض الأنف: 33/1.



مَرُّ الظہران کا علاقہ

ہوئے ایک مُضری عدنانی قبیلے (بنوبکر بن عبد مناف بن کنانہ) کو ساتھ لے کر بنو جرہم کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور انھیں مکہ سے نکال کر اقتدار پر خود قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ دوسری صدی عیسوی کے وسط کا ہے۔[1]

بنو جرہم نے چاہِ زم زم پاٹ دیا

بنو جرہم نے مکہ چھوڑتے وقت زمزم کا کنواں پاٹ دیا اور اس میں کئی تاریخی چیزیں دفن کر کے اس کے نشانات بھی مٹا دیے۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ عمرو بن حارث بن مضاض جرہمی[2] نے خانہ کعبہ کے دو ہرن اور اس کے کونے میں لگا ہوا پتھر (حجر اسود) نکال کر زمزم کے کنویں میں دفن کر دیے اور اپنے قبیلے بنو جرہم کو ساتھ لے کر یمن چلا گیا۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ اہلِ فارس پچھلے دور میں خانہ کعبہ کے لیے اموال و جواہرات بھیجتے رہتے تھے۔ ساسان بن بابک نے سونے کے بنے ہوئے دو ہرن، جواہرات، تلواریں اور بہت سا سونا بھیجا تھا۔ عمرو نے یہ سب زمزم کے کنویں میں ڈال دیا تھا۔[3] بنو جرہم کو مکہ سے جلاوطنی اور وہاں کی حکومت سے محروم ہونے کا بڑا قلق تھا، چنانچہ عمرو مذکور نے اسی سلسلے میں یہ اشعار کہے:

كَأَنْ لَمْ يَكُنْ بَيْنَ الْحَجُونِ إِلَى الصَّفَا ۔۔۔ أَنِيسٌ وَّ لَمْ يَسْمُرْ بِمَكَّةَ سَامِرُ

بَلٰى نَحْنُ كُنَّا أَهْلَهَا فَأَزَالَنَا ۔۔۔ صُرُوفُ اللَّيَالِي وَالْجُدُودُ الْعَوَاثِرُ

”لگتا ہے حجون سے صَفَا تک کوئی آشنا تھا ہی نہیں اور نہ کسی قصہ گو نے مکہ کی شبانہ محفلوں میں قصہ گوئی کی۔ کیوں نہیں! یقیناً ہم ہی اس کے باشندے تھے لیکن زمانے کی گردشوں اور ٹوٹی ہوئی قسمتوں نے

[1] قلب جزيرة العرب، ص: 232,231۔ [2] یہ وہ مضاض جرہمی نہیں جس کا ذکر سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے واقعے میں گزر چکا ہے۔
[3] مروج الذهب: 250/1۔

ہمیں اکھاڑ پھینکا۔''[1]

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا زمانہ تقریباً 1800 قبلِ مسیح ہے۔ اس حساب سے مکہ میں قبیلہ جرہم کی حکمرانی لگ بھگ دو ہزار برس رہی۔

مضری قبائل کی امارت میں شرکت

بنوخزاعہ نے مکہ پر قبضہ کرنے کے بعد بنو بکر کو شامل کیے بغیر تنہا اپنی حکمرانی قائم کی، البتہ تین اہم اور امتیازی مناصب ایسے تھے جو مُضری قبائل کے حصے میں آئے:

1 حاجیوں کو عرفات سے مزدلفہ لے جانا اور یوم النفر، یعنی 13 ذی الحجہ کو منیٰ سے روانگی کا پروانہ دینا۔ یہ اعزاز الیاس بن مُضر کے خاندان بنوغوث بن مُرّ کو حاصل تھا جو صوفہ کہلاتے تھے۔ 13 ذی الحجہ کو حاجی کنکریاں نہ مار سکتے تھے جب تک کہ پہلے صوفہ کا ایک مخصوص آدمی کنکریاں نہ مار لیتا۔ پھر حاجی کنکریاں مار کر فارغ ہو جاتے اور منیٰ سے روانگی کا ارادہ کرتے تو صوفہ کے لوگ منیٰ کی واحد گزرگاہ عقبہ کے دونوں جانب گھیرا ڈال کر کھڑے ہو جاتے اور جب تک خود گزر نہ لیتے، کسی کو گزرنے نہ دیتے۔ جب صوفہ ختم ہو گئے تو یہ اعزاز ایک عدنانی خاندان بنوسعد بن زید مناۃ تمیمی کی طرف منتقل ہو گیا۔

2 10 ذی الحجہ کی صبح مزدلفہ سے منیٰ کی جانب افاضہ (روانگی)۔ یہ اعزاز بنوعدوان کو حاصل تھا۔

3 حرام مہینوں کو آگے پیچھے کرنا۔ یہ کام جس کو وہ اعزاز سمجھتے تھے، بنوکنانہ کی ایک شاخ بنوفُقیم بن عدی کے سپرد تھا۔[2]

عدنانی قبائل کا حجاز کے باہر پھیلاؤ

مکہ پر بنوخزاعہ کا اقتدار کوئی تین سو برس قائم رہا[3] اور یہی زمانہ تھا جب عدنانی قبائل مکہ اور حجاز سے نکل کر نجد، اطرافِ عراق اور بحرین وغیرہ میں پھیلے اور مکہ کے اطراف میں صرف قریش کی چند شاخیں باقی رہیں جو خانہ بدوش تھیں۔ یہ بنوکنانہ کے چند متفرق گھرانے تھے مگر مکہ کی حکومت اور بیت اللہ کی تولیت میں ان کا کوئی حصہ نہ تھا یہاں تک کہ قُصی بن کلاب کا ظہور ہوا۔[4]

1 السیرۃ لابن ہشام:115,114/1. 2 السیرۃ لابن ہشام:44/1 و 119-122. 3 معجم البلدان، مادۃ: مکۃ. 4 محاضرات تاریخ الأمم الإسلامیۃ:36/1.

قصی بن کلاب کی مکہ واپسی

قُصی ابھی گود ہی میں تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد ان کی والدہ نے بنوعُذرہ کے ایک شخص ربیعہ بن حرام سے شادی کرلی۔ یہ قبیلہ چونکہ ملک شام کے اطراف میں رہتا تھا، اس لیے قُصی کی والدہ وہیں چلی گئیں اور وہ قُصی کو بھی اپنے ساتھ لے گئیں۔ جب قُصی جوان ہوئے تو مکہ واپس آئے۔ اس وقت مکہ کا والی حُلَیل بن حُبْشِیہ خزاعی تھا۔ قُصی نے اس کی بیٹی حُبّیٰ سے نکاح کے لیے پیغام بھیجا۔ حُلَیل نے منظور کرلیا اور شادی کردی۔ [1]

تولیتِ کعبہ قصی کی تحویل میں



کعبہ کا پرانا تالا اور چابی

جب حُلَیل کا انتقال ہوگیا تو قُصی نے قریش اور کنانہ کے لوگوں کو ہمراہ لیا اور صوفہ کے اختیارات کو چیلنج کرتے ہوئے کہا: تم سے زیادہ ہم اس اعزاز کے حقدار ہیں۔ اس پر صوفہ نے لڑائی چھیڑ دی مگر قُصی نے انھیں مغلوب کرکے ان کا اعزاز چھین لیا۔ یہی موقع تھا جب بنوخزاعہ اور بنوبکر نے قُصی سے دامن کشی اختیار کرلی۔ اس پر قُصی نے انھیں بھی للکارا۔ پھر کیا تھا، سخت جنگ چھڑ گئی اور طرفین کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ اس کے بعد صلح کی آوازیں بلند ہوئیں اور بنوبکر کے ایک شخص یعمر بن عوف کو حَکَم بنایا گیا۔ یعمر نے فیصلہ کیا کہ خزاعہ کے بجائے قُصی خانہ کعبہ کی تولیت اور مکہ کے اقتدار کا زیادہ حقدار ہے، نیز قُصی نے جتنا خون بہایا ہے، سب رائیگاں قرار دے کر میں پاؤں تلے روندتا ہوں، البتہ خزاعہ اور بنوبکر نے جن لوگوں کو قتل کیا ہے، ان کی دِیَت ادا کریں اور خانہ کعبہ کو بلاحیل و حجت قُصی کے حوالے کردیں۔ اسی فیصلے کی وجہ سے یعمر کا لقب شدّاخ پڑ گیا۔ [2] شدّاخ کے معنی ہیں: خون کو رائیگاں قرار دینے والا۔ اس فیصلے کے نتیجے میں قُصی اور قریش کو مکہ کی سیادت حاصل ہوگئی۔ مکہ پر قُصی کے تسلُّط کا یہ واقعہ 440ء کا ہے۔ [3]

قُصی نے مکہ کا بندوبست اس طرح کیا کہ قریش کو اطرافِ مکہ سے بلا کر پورا شہر ان پر تقسیم کردیا اور ہر خاندان کی بودوباش کا ٹھکانا مقرر کردیا، البتہ مہینے آگے پیچھے کرنے والوں کو، نیز آلِ صفوان جمحی، بنوعدوان اور بنومرہ بن

---

1 السیرة لابن ہشام: 118,117/1۔ 2 السیرة لابن ہشام: 124,123/1۔ 3 قلب جزیرة العرب، ص: 232۔

عوف کو ان کے مناصب پر برقرار رکھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ بھی دین ہے جس میں رد وبدل کرنا درست نہیں۔ [1]

دارالندوہ کی تعمیر

قُصی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے حرم کعبہ کے شمال میں دارالندوہ تعمیر کیا۔ اس کا دروازہ مسجد کی طرف تھا۔ دارالندوہ درحقیقت قریش کی پارلیمنٹ تھی جہاں تمام بڑے بڑے اور اہم معاملات کے فیصلے ہوتے تھے۔ قریش پر دارالندوہ کے بڑے احسانات ہیں کیونکہ یہ ان کی وحدت کا ضامن تھا اور یہیں ان کے الجھے ہوئے مسائل بحسن وخوبی طے ہوتے تھے۔ [2]

قُصیؔ کو سربراہی کے حسب ذیل اختیارات حاصل تھے:

1. دارالندوہ کی صدارت، جہاں بڑے بڑے معاملات کے متعلق مشورے ہوتے اور لوگ اپنی لڑکیوں کی شادیاں منعقد کرتے تھے۔
2. لِواء، یعنی جنگ کا پرچم قُصی ہی کے ہاتھوں باندھا جاتا تھا۔
3. حجابہ، یعنی خانہ کعبہ کی پاسبانی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خانہ کعبہ کا دروازہ قصی ہی کھولتے تھے اور وہی خانہ کعبہ کی خدمت اور کلید برداری کا کام انجام دیتے۔
4. سقایہ (پانی پلانا اور کھانا کھلانا)۔ حوض میں حاجیوں کے لیے پانی بھر دیا جاتا اور اس میں کھجور اور کشمش ڈال کر اسے شیریں بنا دیا جاتا۔
5. رِفادہ (حاجیوں کی میزبانی کا انتظام)۔ اس مقصد کے لیے قُصی نے قریش پر ایک خاص رقم عائد کر رکھی تھی۔ اس رقم سے وہ حاجیوں کے لیے کھانا تیار کراتے تھے۔ [3]

اولادِ قصی میں مناصب کی تقسیم

قُصی کا پہلا بیٹا عبدالدار تھا، مگر اس کے بجائے دوسرا بیٹا عبد مناف باپ کی زندگی ہی میں شرف وسیادت کے مقام پر پہنچ گیا تھا، تاہم قُصی نے اپنے سارے مناصب اور اعزازات کی وصیت عبدالدار کے لیے کر دی، یعنی دارالندوہ کی ریاست، خانہ کعبہ کی حجابت، لواء، سِقایہ اور رفادہ سب کچھ اسے دے دیا۔ اس کی وفات کے بعد اس

[1] السيرة لابن هشام: 125/1، محاضرات تاريخ الأمم الإسلامية: 36/1. [2] السيرة لابن هشام: 125,124/1 و 130، محاضرات تاريخ الأمم الإسلامية: 37,36/1. [3] السيرة لابن هشام: 125,124/1.

کے بیٹوں نے کسی نزاع کے بغیر اس کی وصیت پر عمل کیا۔ لیکن جب عبد مناف کی وفات ہوگئی تو اس کے بیٹوں کا ان مناصب کے سلسلے میں اپنے چچیرے بھائیوں، یعنی عبدالدار کی اولاد سے جھگڑا ہوا۔ اس باہمی چشمک کے نتیجے میں قریش دو گروہوں میں بٹ گئے۔ قریب تھا کہ دونوں میں جنگ ہو جاتی لیکن پھر انھوں نے صلح کی آواز بلند کی اور ان مناصب کو باہم تقسیم کر لیا، چنانچہ سقایہ اور رفادہ کے مناصب بنو عبد مناف کو دیے گئے اور دارالندوہ کی سربراہی، لواء اور حجابت بنو عبدالدار کے ہاتھ میں رہی۔ پھر بنو عبد مناف نے اپنے حاصل شدہ مناصب کے لیے قرعہ ڈالا تو قرعہ ہاشم بن عبد مناف کے نام نکلا، لہٰذا ہاشم ہی نے زندگی بھر سقایہ و رفادہ کا انتظام کیا، البتہ جب ہاشم بن عبد مناف کا انتقال ہوگیا تو اُن کے بھائی مُطَّلِب نے ان کی جانشینی کی، مگر مُطَّلِب کے بعد ان کے بھتیجے عبدالمطلب بن ہاشم نے، جو رسول اللہ ﷺ کے دادا تھے، یہ منصب سنبھالا اور ان کے بعد ان کی اولاد ان کی جانشین ہوئی۔ جب اسلام کا دور آیا تو نبی اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اس منصبِ جلیل پر فائز تھے۔[1]

ظہورِ اسلام کے وقت مکہ میں انتظامی عہدے

ظہورِ اسلام کے وقت مکہ کی شہری حکومت میں کل چودہ عہدے تھے جو دس عہدیداروں میں منقسم تھے۔ دس عہدیدار قریش کے دس قبائل سے منتخب ہوئے تھے۔ ان عہدوں کی تقسیم اس طرح تھی:

ا: مذہبی خدمات

1. سقایہ (حاجیوں کے کھانے پینے اور ان کی میزبانی کا انتظام): عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ (بنو ہاشم)
2. رفادہ (حاجیوں کی مالی اعانت کا انتظام): حارث بن عامر (بنو نوفل)
3. عمارہ (خانہ کعبہ کو آباد کرنے کا انتظام): عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ (بنو ہاشم)
4. سدانہ (خانہ کعبہ کی دربانی و کلید برداری): عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ (بنو عبدالدار)
5. ایسار (فال گیری یا قسمت دریافت کرنے کے لیے بتوں کے پاس رکھے گئے تیروں کی تولیت): صفوان بن اُمیہ رضی اللہ عنہ (بنو جمح)
6. اموال مُحَجَّرہ (بتوں کے نذرانوں اور جائدادوں کا انتظام): حارث بن قیس رضی اللہ عنہ (بنو سہم)

[1] السيرة لابن هشام: 1/129- 132و 135-137و 142و 179,178، محاضرات تاريخ الأمم الإسلامية: 1/37.

ب: عدالتی خدمات

7 ندوہ (عدالت اور مشورہ گاہ کا انتظام): عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ (بنو عبدالدار)

8 مشورہ (شوریٰ): یزید بن زمعہ اسدی رضی اللہ عنہ (بنو اسد)

9 اَشناق (دِیَت، جرمانوں کا نظم): ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (بنو تیم)

10 حکومہ (مقدمات کا فیصلہ): حارث بن قیس رضی اللہ عنہ (بنو سہم)

ج: جنگی خدمات

11 عقاب (لواء، یعنی قومی پرچم کی علمبرداری): ابوسفیان رضی اللہ عنہ (بنو امیہ)

12 قبّہ (فوجی کیمپ کا انتظام): خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (بنو مخزوم)

13 اعِنّہ (شہسواروں کی سپہ سالاری): خالد بن ولید رضی اللہ عنہ (بنو مخزوم)

14 سفارت: عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ (بنو عدی) [1]

[1] الرحیق المختوم، ص:41,40، تاریخ ارض القرآن (کامل):80,79/2، الطبقات لابن سعد:1/66-73.

8

عرب سرداریاں

جو عرب قبائل حیرہ کے ارد گرد آباد تھے، انھیں حکومتِ حیرہ کے تابع مانا جاتا تھا۔ جن قبائل نے بادیۃ الشام (صحرائے شام) میں سکونت اختیار کی تھی، انھیں غسانی حکمرانوں کے تابع قرار دیا گیا مگر یہ ماتحتی صرف نام کی تھی، عملاً نہ تھی۔ ان دو مقامات کو چھوڑ کر اندرون عرب آباد قبائل بہر طور آزاد تھے۔

سرداری نظام حکومت کی خصوصیات

عرب قبائل میں سرداری نظام رائج تھا۔ سیاسی وجود و تحفظ کی بنیاد قبائلی وحدت پر مبنی عصبیت اور اپنی سرزمین کی حفاظت و دفاع کے مشترکہ مفادات تھے۔ قبائلی سرداروں کا درجہ اپنی قوم میں بادشاہوں جیسا تھا۔ قبیلہ صلح و جنگ میں بہر حال اپنے سردار کے فیصلے کے تابع ہوتا تھا اور کسی حال میں اس سے سرتابی نہیں کر سکتا تھا۔ بعض سرداروں کا یہ حال تھا کہ اگر وہ بگڑ جاتے تو ہزاروں تلواریں یہ پوچھے بغیر بے نیام ہو جاتیں کہ سردار کے غصے کا سبب کیا ہے۔

چونکہ ایک ہی کنبے کے چچیرے بھائیوں میں سرداری کے لیے کشاکش بھی ہوا کرتی تھی، اس لیے اس کا تقاضا تھا کہ سردار اپنے قبائلی عوام کے ساتھ روا داری برتے، خوب مال خرچ کرے، مہمان نوازی میں پیش پیش رہے، کرم و بُردباری سے کام لے، شجاعت کا عملی مظاہرہ کرے اور غیر تمندانہ اُمور میں اُن کا دفاع کرے تاکہ لوگوں کی نظر میں عموماً اور شعراء کی نظر میں خصوصاً، خوبی و کمالات کا جامع بن جائے (کیونکہ شعراء اس دور میں قبیلے کی زبان ہوا کرتے تھے) اور اس طرح اپنے مدمقابل حضرات سے بلند و بالا درجہ حاصل کر لے۔

سرداروں کے امتیازی حقوق

سرداروں کے کچھ مخصوص اور امتیازی حقوق بھی ہوا کرتے تھے جنھیں ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے:

لَكَ الْمِرْبَاعُ مِنْهَا وَالصَّفَايَا ۔۔۔ وَحُكْمُكَ وَالنَّشِيطَةُ وَالْفُضُولُ

''(اے سردار!) تمھارے لیے مالِ غنیمت کا ایک چوتھائی حصہ ہے، منتخب مال اور وہ مال ہے جس کا تم فیصلہ

کر دو، جو سرِ راہ ہاتھ آ جائے اور جو تقسیم سے بچ رہے۔"

مرباع: مالِ غنیمت کا چوتھائی حصہ مرباع کہلاتا تھا۔

صفی: یہ وہ مال تھا جسے تقسیم سے پہلے ہی سردار اپنے لیے منتخب کر لیتا تھا۔ (صفی کی جمع صفایا ہے۔)

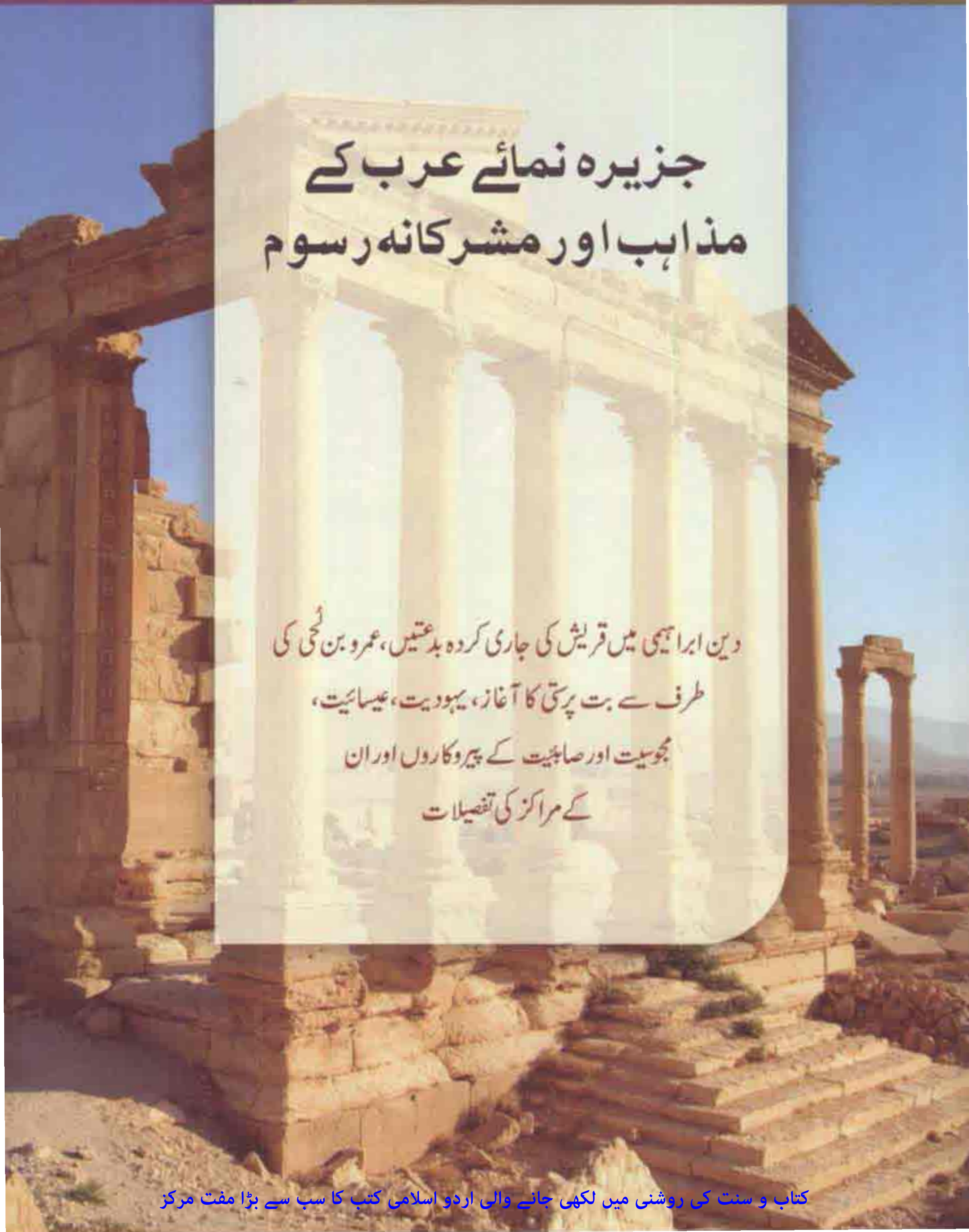
نشیطہ: اس مال کو نشیطہ کہتے تھے جو اصل قوم تک پہنچنے سے پہلے راستے ہی میں سردار کے ہاتھ لگ جائے۔

فضول: یہ وہ مال تھا جو تقسیم کے بعد بچ رہے اور لڑنے والوں کی تعداد پر برابر تقسیم نہ ہو، مثلاً: تقسیم سے بچے ہوئے اونٹ گھوڑے وغیرہ۔

یہ سب اقسام کے مال سردارِ قبیلہ کا حق ہوا کرتے تھے۔ [1]

[1] الروض الأنف: 78/4، الرحيق المختوم، ص: 42

باب 4



جزیرہ نمائے عرب کے مذاہب اور مشرکانہ رسوم

دین ابراہیمی میں قریش کی جاری کردہ بدعتیں، عمرو بن لُحی کی طرف سے بت پرستی کا آغاز، یہودیت، عیسائیت، مجوسیت اور صابئیت کے پیروکاروں اور ان کے مراکز کی تفصیلات

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ

الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ

إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

”اے ہمارے رب! ان لوگوں کے لیے انھی میں سے ایک رسول بھیج، وہ ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کرے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور انھیں پاک کرے، بے شک تو ہی غالب، خوب حکمت والا ہے۔“ (البقرۃ 2:129)

اس باب میں





جزیرہ نمائے عرب میں عمرو بن لُحی کے ذریعے سے رائج ہونے والی بت پرستی، پُوجے جانے والے بتوں اور عرب کے مختلف علاقوں میں اُن کے استھانوں کا تذکرہ ہے، نیز بُت پرستی کی اہم رسوم کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قریش نے دینِ ابراہیمی میں جو بدعات شامل کر دی تھیں ان پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر یہودیت، عیسائیت، مجوسیت اور صابئیت اور ان کے پیروکاروں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ مذاہب جزیرہ نمائے عرب میں کب متعارف ہوئے اور عہدِ نبوی میں ان کے مراکز کہاں کہاں تھے۔





1

عرب میں بُت پرستی

عام باشندگانِ عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ کے نتیجے میں دین ابراہیمی کے پیروکار بن گئے تھے، اس لیے وہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرتے تھے اور توحید پر کاربند تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے خدائی درس و نصیحت کا ایک حصہ بھلا دیا، پھر بھی ان کے اندر توحید اور دین ابراہیمی کے بعض شعائر باقی رہے حتی کہ بنوخزاعہ کا سردار عَمرو بن لُحَی منظر عام پر آیا۔

عربوں میں بُت پرستی کا آغاز

عمرو بن لُحَی نے ملکِ شام کا سفر کیا تو دیکھا کہ وہاں بتوں کی پوجا کی جا رہی تھی۔ اس نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا: ہم ان (بتوں) کے ذریعے سے بارش حاصل کرتے ہیں اور اپنے دشمن کے خلاف مدد طلب کرتے ہیں۔ اس نے کہا: یہ بت مجھے بھی دے دیں۔ انھوں نے عمرو بن لحی کو ایک بت تحفے میں دے دیا، چنانچہ واپسی پر وہ بھی اپنے ساتھ ''ہبل'' بت لے آیا۔ اسے خانہ کعبہ کے اندر نصب کر دیا اور اہلِ مکہ کو اس کی پوجا کی دعوت دی۔ اہل مکہ نے اس پر لبیک کہا۔ اس کے بعد بہت جلد دیگر باشندگانِ حجاز بھی اہلِ مکہ کے نقشِ قدم پر چل پڑے۔[1] اس طرح عرب میں بُت پرستی کا آغاز ہوا۔

ہبل کے علاوہ عرب کے قدیم ترین بتوں میں سے ''مَنَاۃ'' تھا۔ اس کے بعد طائف میں ''لات'' نامی بت وجود میں آیا، پھر وادیِ نخلہ میں ''عُزّیٰ'' کی تنصیب عمل میں آئی۔ یہ چاروں عرب کے سب سے بڑے بُت تھے۔ اس کے بعد حجاز کے ہر خطے میں شرک کی کثرت اور بتوں کی بھرمار ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک جن عَمرو بن لُحَی کے تابع یا اس کا ساتھی تھا، اس نے بتایا کہ قومِ نوح کے بُت ...... وَد، سواع، یغوث، یعوق اور نسر ...... جدہ میں مدفون ہیں۔ اس اطلاع پر عمرو بن لُحَی جدہ گیا اور ان بتوں کو کھود نکالا، پھر انھیں تہامہ لایا اور جب حج کا زمانہ آیا تو انھیں مختلف قبائل کے حوالے کیا۔ یہ قبائل ان بتوں کو اپنے اپنے علاقوں میں لے گئے۔ اس طرح ہر قبیلے میں، پھر ہر گھر

[1] أخبار مكة للأزرقي: 117/1، المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 77/6۔

میں ایک ایک بت ہوگیا۔ پھر مشرکین نے مسجد الحرام کو بھی بتوں سے بھر دیا، چنانچہ جب مکہ فتح کیا گیا تو بیت اللہ کے اندر اور ارد گرد تین سو ساٹھ بت تھے۔ [1]

سرزمین عرب کے بُت

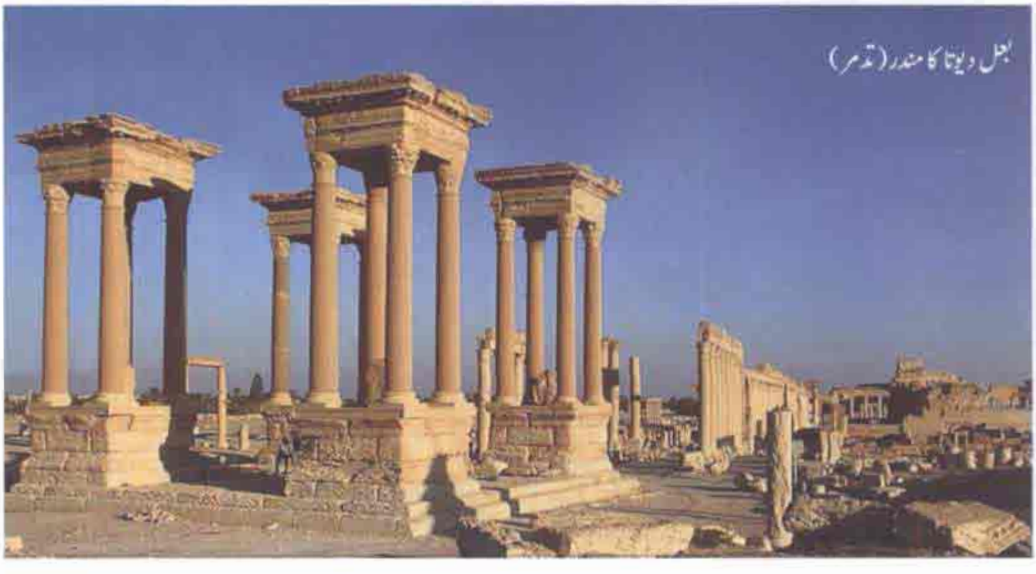
اساف و نائلہ: یہ انسانی شکل کے بت تھے۔ عمرو بن لحی نے انھیں زمزم کے پاس رکھ دیا تھا۔ لوگ ان کا طواف کرتے اور ساتھ قربانی بھی کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اساف نامی مرد اور نائلہ نامی عورت کعبہ میں زنا کے مرتکب ہوئے تھے۔ جب لوگوں نے آ کر انھیں دیکھا تو وہ پتھر بن چکے تھے۔ لوگوں نے انھیں عبرت کے لیے صفا اور مروہ پر رکھ دیا تھا مگر عمرو بن لُحَی نے حرم میں ان کی پوجا شروع کر دی۔ [2]

اُقَیصِر: زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے ایک معبود کا نام تھا۔ قبائل قضاعہ، لَخم، جذام، عاملہ اور غطفان اس کی پوجا کرتے تھے۔ شام کی سطح مرتفع (مشارف) میں اس کا استھان تھا۔ ہشام نے کہا ہے: قضاعہ، لَخم، جذام اور اہلِ شام اس کا حج کرتے تھے اور اس کے پاس سر منڈاتے تھے۔ [3]

الجلسد: یہ حضرموت کے علاقے میں کندہ کا بت تھا۔ اس کے خادم و متولی بنی شُکامہ بن شبیب کندی تھے۔ اس بت کے نام ایک چراگاہ تھی جس میں اس پر چڑھائے جانے والے جانور چرتے تھے۔ اس کی شکل ایک ضخیم انسان کی سی تھی۔

---

[1] أخبار مكة للأزرقي: 121,120/1، إغاثة اللهفان: 269/2. [2] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 6/266-268، إغاثة اللهفان: 264/2. [3] إغاثة اللهفان: 265/2، معجم البلدان، مادة: أقيصر.



بعل دیوتا کا مندر (تدمر)


عرب کے اصنام اور معبودانِ قریش
ود
سواع
یغوث
یعوق
نسر
العزیٰ
اللات
مناۃ
ھبل
ذوالخلصہ
ذوالشریٰ
ذوالکفین
اساف و نائلہ
الجلسد
مصر
سوڈان
حبشہ
نجد
الربع الخالی
یمن
عمان
فارس (ایران)
عراق
جزیرۂ عرب
بحرِ ہند
خلیج فارس
بحیرۂ احمر
0
200
400
600
800
1000
کلومیٹر

اسے سفید پتھر سے تراش کر بنایا گیا تھا۔ [1] دومۃ الجندل کا بادشاہ اکیدر بنو شکامہ ہی سے تھا جسے رسول اللہ ﷺ نے لکھ کر امان دی اور اس نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مرتد ہو کر پھر عیسائی بن گیا تھا۔ [2]

ذوالخلصہ: زمانۂ جاہلیت میں مکہ اور یمن کے درمیان ''تبالہ'' کے مقام پر ذوالخلصہ نامی مکان میں یہ بت نصب تھا۔ قبائل دوس، خثعم اور بجیلہ اس کی پوجا کرتے تھے۔ اسے ''کعبہ یمانیہ یا کعبہ شامیہ'' کہا جاتا تھا۔ جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ نے اسے فتح مکہ کے بعد توڑا۔ [3] رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ دوس قبیلے کی عورتوں کی سرینیں ذوالخلصہ پر حرکت کریں گی۔'' (وہ اس کا طواف کریں گی) [4]



تبالہ کے مقام پر کعبہ یمانیہ کے آثار

ذوالشریٰ: یہ دوس اور ازد قبائل کا دیوتا تھا اور عسیر کے علاقے میں اس کی پوجا ہوتی تھی۔ شریٰ تہامہ میں ایک پہاڑی مقام تھا۔ نبطیوں میں ذوالشریٰ اور حریس دیوتاؤں کا جوڑا تھا۔ ادوم (اردن) کے ایک پہاڑی مقام کا نام بھی ''شریٰ'' تھا اور یہاں بھی خصوصاً پٹرا (بطرا) میں ذوالشریٰ کو پوجا جاتا تھا۔ [5]

ذوالکفین: یہ قبیلہ دوس کے سردار عمرو بن حممہ کا دیوتا تھا۔ حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے بعد نبی اکرم ﷺ کی اجازت سے واپس گئے اور جا کر ذوالکفین کو جلا دیا۔ [6]

سُواع: قرآن مجید کی سورۂ نوح میں وَد، یغوث، یعوق اور نسر نامی بتوں کے ساتھ سُواع کا ذکر کیا گیا ہے، یعنی قوم نوح

[1] نهاية الأرب، ص:281,280، الأعلام: 171/3. [2] تاريخ دمشق الكبير:148/9. [3] صحيح البخاري :2823 و4357، صحيح ابن حبان (ابن بلبان) : 150/15، السيرة لابن هشام:86/1. [4] صحيح البخاري : 7116، صحيح مسلم :2906. [5] اٹلس سیرت نبوی، ص:60، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ:45,44/10. [6] إغاثة اللهفان:265/2، اٹلس سیرت نبوی، ص:60.

ان پانچوں بتوں کو پوجتی تھی۔ عہد اسلام سے پہلے یثرب کے مغرب میں ینبع کے قریب رُہاط کے مقام پر سُواع کی پوجا ہوتی تھی، نیز دومۃ الجندل میں قبیلہ ہُذیل کے لوگ بھی اسے پوجتے تھے۔ سواع کی شکل عورت کی تھی۔ [1]

الضَّیْزَنَان: یہ ''ضَیْزَنٌ'' سے تثنیہ کا صیغہ ہے۔ لغت عرب میں ضیزن مزاحمت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ دو بت تھے جنھیں جذیمہ الابرش یا منذر الاکبر نے حیرہ (عراق) کے دروازے پر نصب کیا تھا تاکہ جو بھی حیرہ میں داخل ہو، انھیں سجدہ کرے اور اس سے مقصود یہ تھا کہ آنے والے کی اطاعت کا امتحان لیا جائے۔ [2]

عائم: علامہ یاقوت لکھتے ہیں: ''کلبی نے کہا ہے کہ ''ازدسراۃ'' کے بت کا نام ''عائم'' تھا۔'' [3]

العُزّٰی: یہ نام أَعَزّٰ کی تانیث اور تفضیل کا صیغہ ہے جبکہ اَعَزُّ بمعنی عزیز اور عُزّٰی بمعنی عزیزہ لیا گیا ہے۔ مکہ سے چند میل دور وادیِ نخلہ میں ببول کا ایک درخت تھا جس کے نیچے عزّٰی کا تھان (آستانہ) تھا۔ عزّٰی کا بت حرم کعبہ میں بھی رکھا ہوا تھا جسے فتح مکہ کے وقت توڑا گیا۔ وادیِ نخلہ میں بنوکنانہ عزّٰی کو پوجتے تھے اور اسے توڑنے کے لیے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھیجا گیا تھا۔ [4]

اَللّات: طائف میں بنوثقیف اس کی عبادت کرتے تھے۔ ''لات'' کے معنی ہیں: ''پانی وغیرہ میں ستو گھولنے والا۔'' یہ ایک شخص تھا جو حاجیوں کو ستو گھول کر پلایا کرتا تھا۔ اس کی وفات کے طویل عرصہ بعد عمرو بن لُحَی کے ایما پر اس کا بت بنا کر اس کی پوجا کی جانے لگی۔ قریش سونے سے پہلے لات اور عزّٰی کی پوجا پاٹ کرتے اور انھی کی قسم کھایا کرتے تھے۔ [5]

لات ایک مربع چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا اور بنومُعَتِّب (یا بنوعتاب) ثقفی اس کے مجاور تھے۔ انھوں نے اس پر ایک عمارت بنا رکھی تھی۔ قریش اور دیگر عرب بھی اس کی تعظیم اور طواف کرتے تھے۔ فتح طائف کے بعد مغیرہ بن شعبہ ثقفی رضی اللہ عنہ نے اسے مسمار کر دیا۔ لات کے استھان (آستانے) کی جگہ اب جامع مسجد طائف کا مینار واقع ہے۔ [6]

مَنات: یہ بت قدیم ترین تھا اور بحیرۂ احمر کے ساحل پر قُدَید کے قریب مُشَلَّل میں نصب تھا۔ [7] لات، منات اور عزّٰی عرب کے سب سے بڑے بت تھے۔ ان تینوں کے نام سورۂ نجم میں آئے ہیں۔ منات کی پوجا کا آغاز بھی عمرو بن لُحَی نے کیا تھا۔ تمام عرب خصوصاً اوس اور خزرج اس کی انتہائی تعظیم کرتے تھے۔ بنوازد اور غسان منات کا حج بھی کرتے تھے۔ اوس اور خزرج حج کے بعد منات کے پاس آکر احرام اتارتے تھے۔ فتح مکہ کے لیے جاتے

---

[1] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام :6/257-259، اٹلس سیرت نبوی، ص:59. [2] تاريخ الطبري :1/440، لسان العرب، مادة : ضزن. [3] إغاثة اللهفان :2/266، معجم البلدان، مادة : عائم. [4] لسان العرب، مادة: عزز، المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام :6/235. [5] مسندأحمد :4/222 و 5/362، تفسير ابن كثير، النجم 53:19، جوامع السيرة لابن حزم، ص :257. [6] السيرة لابن هشام: 4/186، المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام:6/227-229. [7] صحيح البخاري:1643و1790.

ہوئے نبی اکرم ﷺ کے حکم پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اس بت کو منہدم کر دیا۔ [1]

نَسر: حمیر (یمن) کے علاقے میں نجران کے پاس قبیلہ ذی الکلاع کے لوگ اس کی پوجا کرتے تھے۔ آج کل نجران سعودی عرب کا شہر ہے جو سرحدِ یمن کی طرف واقع ہے۔ نسر پرندے (گدھ) کی شکل کا بت تھا۔ [2]

ہُبَل: قریش کے سب سے بڑے دیوتا کا نام ہے۔ ہبل دراصل ہُبَعل (بعل) تھا جسے عربوں نے معرب کر لیا۔ [3]



بعل دیوتا کا مندر (بعلبک، لبنان)

''بعل'' اہلِ شام کا دیوتا تھا۔ اس سے منسوب ''بعلبک'' لبنان کا قدیم شہر ہے۔ ''بعل'' کے لغوی معنی قوت کے ہیں اور مجازاً آقا کے معنی لیے جاتے ہیں۔ اسی لیے قرآن میں ''بعل'' شوہر کے معنی میں استعمالِ ہوا ہے۔ یہ بت قریش کو انسانی مورت کی شکل میں ملا تھا جو سرخ عقیق سے تراشا گیا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ ٹوٹا ہوا تھا، قریش نے وہ سونے کا بنوا کر لگا دیا۔ ''ہبل'' خاص کعبہ میں نصب تھا۔ فال کے پانسے اسی کے آگے ڈالے جاتے تھے۔ قریش جنگوں میں (اُعْلُ هُبَل) ''ہبل کی جے'' کا نعرہ لگاتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے توڑ دیا تھا۔ [4]

وَدّ: یہ بت دومۃ الجندل میں نصب تھا اور بنو کلب اس کی پوجا کرتے تھے۔ قریش بھی اس بت کو پوجتے تھے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسے توڑا تھا۔ [5]

یعوق: یہ بھی ان پانچ بتوں میں شامل تھا جو جدہ میں دفن تھے۔ یعوق کے معنی ہیں: ''مصیبت روکنے والا۔'' اس کی شکل گھوڑے کی تھی۔ یعوق یمن میں ارحب کے مقام پر نصب تھا۔ بنو ہمدان و خولان اس کی پوجا کرتے تھے۔ ارحب صنعاء سے دو راتوں کے فاصلے پر مکہ کی جانب واقع تھا۔ [6]

یغوث: یہ بت اکمۂ مذحج (یمن) میں نصب تھا اور بنو مذحج اور ہمدان اس کی پوجا کرتے تھے۔ قبیلۂ طے کی شاخ انعم، مراد اور بنو غُطیف بھی اسے پوجتے تھے۔ یغوث کے معنی ہیں: ''فریاد کو پہنچنے والا'' اور اس کی شکل شیر کی تھی۔ [7]

[1] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام:249-246/6. [2] المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام:263/6. [3] تاریخ ارض القرآن (کامل):137/2. [4] الرحيق المختوم، ص:45، المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام:253-250/6. [5] الرحيق المختوم، ص: 46، المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام:257-255/6. [6] معجم البلدان، مادة: يعوق، المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام:263,262/6. [7] معجم البلدان، مادة: يغوث، المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام: 262-260/6.

عرب بُت پرستی کے اہم مراسم

اہل جاہلیت کے ہاں بت پرستی کے ایسے خاص طریقے اور مراسم رائج تھے جو زیادہ تر عمرو بن لُحَی کی اختراع تھے۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ عمرو بن لُحَی کی اختراعات دینِ ابراہیمی میں تبدیلی نہیں بلکہ بدعتِ حسنہ ہیں۔ ان کے ہاں رائج بُت پرستی کے چند اہم مراسم درج ذیل ہیں:

1 دورِ جاہلیت کے مشرکین بتوں کے پاس مجاور بن کر بیٹھتے تھے۔ وہ ان کی پناہ ڈھونڈتے، انھیں زور زور سے پکارتے، حاجت روائی و مشکل کشائی کے لیے ان سے التجائیں کرتے اور سمجھتے تھے کہ وہ اللہ سے سفارش کر کے ہماری مراد پوری کرا دیں گے۔

2 وہ بتوں کا حج وطواف کرتے تھے، ان کے سامنے عجز و نیاز سے پیش آتے تھے اور انھیں سجدہ کرتے تھے۔

3 وہ بتوں کے لیے نذرانے اور قربانیاں پیش کرتے تھے اور قربانی کے جانور کبھی بتوں کے آستانوں پر لے جا کر ذبح کرتے اور کبھی کسی بھی جگہ ذبح کر لیتے مگر بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے۔ ذبح کی ان دونوں صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ﴾

''اور (وہ جانور بھی حرام ہیں) جو آستانوں پر ذبح کیے گئے ہوں۔''[1]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ وَلَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ﴾

''اور اُس جانور کا گوشت مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔''[2]

4 بتوں سے تقرب کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مشرکین اپنی صوابدید کے مطابق اپنے کھانے پینے کی چیزوں اور اپنی کھیتی اور چوپاؤں کی پیداوار کا ایک حصہ بتوں کے لیے خاص کر دیتے تھے۔ اس کے ساتھ ایک حصہ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی خاص کر دیتے، پھر مختلف اسباب کی بنا پر اللہ تعالیٰ کا حصہ تو بتوں کی طرف منتقل کر دیتے تھے لیکن بتوں کا حصہ کسی بھی حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف منتقل نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ۗ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴾

[1] المآئدة 3:5. [2] الأنعام 121:6.

''اور انھوں نے اس میں سے اللہ کے لیے ایک حصہ ٹھہرایا جو اس نے کھیتی اور چوپایوں کی شکل میں پیدا کیا، پھر اپنے خیال کے مطابق کہنے لگے: یہ اللہ کے لیے ہے اور یہ ہمارے شرکاء (دیوتاؤں) کے لیے ہے، چنانچہ جو ان کے شرکاء کے لیے ہوتا ہے، وہ تو اللہ تک نہیں پہنچتا (مگر) جو اللہ کے لیے ہوتا ہے، وہ ان کے شرکاء تک پہنچ جاتا ہے۔ کتنا برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔'' [1]

5 بتوں کے تقرب کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مشرکین کھیتی اور چوپائے کے اندر مختلف قسم کی نذریں مانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ﴾

''اور ان مشرکین نے اپنے (جھوٹے) خیال کے مطابق کہا: یہ چوپائے اور کھیتی ممنوع ہیں۔ انھیں بس وہی کھا سکتا ہے جسے ہم چاہیں اور بعض چوپائے ہیں جن کی پشت (پر سواری) حرام کر دی گئی ہے اور کچھ چوپائے ایسے ہیں جن پر وہ لوگ (بوقتِ ذبح) اللہ کا نام نہیں لیتے، یہ سب وہ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہوئے کرتے ہیں۔'' [2]

6 انھی جانوروں میں بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام تھے۔

بحیرہ اور سائبہ: ابن اسحاق کہتے ہیں کہ بحیرہ، سائبہ کی بچی کو کہا جاتا ہے۔ سائبہ اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جس سے دس بار پے دَر پے مادہ بچے پیدا ہوں، درمیان میں کوئی نَر پیدا نہ ہو۔ ایسی اونٹنی کو آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس پر سواری نہیں کی جاتی تھی۔ اس کے بال نہیں کاٹے جاتے تھے اور مہمان کے سوا کوئی اس کا دودھ نہیں پیتا تھا۔ اس کے بعد یہ اونٹنی جو مادہ بچہ جنتی، اس کا کان چیر دیا جاتا اور اسے بھی اس کی ماں کے ساتھ آزاد چھوڑ دیا جاتا۔ اس پر سواری نہ کی جاتی، اس کے بال نہ کاٹے جاتے اور مہمان کے سوا کوئی اس کا دودھ نہ پیتا۔ یہی بحیرہ ہے اور اس کی ماں سائبہ ہے۔

وصیلہ: اُس بکری کو کہا جاتا تھا جو پانچ دفعہ پے در پے دو دو مادہ بچے جنتی (پانچ بار میں دس مادہ بچے پیدا ہوتے)، درمیان میں کوئی نَر پیدا نہ ہوتا۔ اس بکری کو اس لیے وصیلہ کہا جاتا تھا کہ وہ سارے مادہ بچوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیتی تھی۔ اس کے بعد اس بکری سے جو بچے پیدا ہوتے، ان کا گوشت صرف مرد کھا سکتے تھے، عورتیں نہیں کھا سکتی تھیں، البتہ اگر کوئی بچہ مُردہ پیدا ہوتا تو اسے مرد عورت سبھی کھا سکتے تھے۔

حام: اُس نَر اونٹ کو کہتے تھے جس کی جفتی سے پے در پے دس مادہ بچے پیدا ہوتے، درمیان میں کوئی نَر پیدا نہ ہوتا۔

[1] الأنعام 136:6. [2] الأنعام 138:6.

ایسے اونٹ کی پیٹھ محفوظ کر دی جاتی تھی۔ اس پر سواری کی جاتی تھی نہ اس کے بال کاٹے جاتے تھے بلکہ اسے اونٹوں کے ریوڑ میں جفتی کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس کے سوا اس سے کوئی دوسرا فائدہ نہ اٹھایا جاتا تھا۔ دورِ جاہلیت کی بُت پرستی کے ان طریقوں کی تردید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴾ (المآئدۃ 103:5)

"اللہ نے نہ کوئی بحیرہ، نہ کوئی سائبہ، نہ کوئی وصیلہ اور نہ کوئی حام بنایا ہے لیکن جن لوگوں نے کفر کیا، وہ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے۔"

ایک دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓي اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ﴾ (الأنعام 139:6)

"اور ان مشرکین نے کہا کہ ان چوپایوں کے پیٹ میں جو کچھ ہے، وہ خالص ہمارے مَردوں کے لیے ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے، البتہ اگر وہ مردہ ہو تو اس میں (مرد اور عورتیں) سب شریک ہیں۔"[1]

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: "عَمرو بن لُحَی پہلا شخص تھا جس نے بتوں کے نام پر جانور چھوڑے۔" سید التابعین سعید بن مُسَیَّب رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ ان جانوروں کا دودھ ان کے بتوں کے لیے وقف تھا۔[2]

عرب اپنے بتوں کے ساتھ یہ سب کچھ اس غلط عقیدے کے ساتھ کرتے تھے کہ یہ بت انھیں اللہ تعالیٰ کے قریب کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ کے حضور ان کی سفارش کریں گے، چنانچہ قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ مشرکین کہتے تھے:

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾

"ہم ان (بتوں) کی عبادت محض اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کر دیں۔"[3]

﴿ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾

"یہ (بت) اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔"[4]

[1] السیرۃ لابن ھشام: 89/1، الرحیق المختوم، ص: 49,48. [2] صحیح البخاري: 4623. [3] الزمر 3:39. [4] یونس 18:10.

2

عرب میں یہودیت

جزیرہ نمائے عرب میں یہود بھی آباد تھے۔ عرب کی طرف ان کی ہجرت دو بار عمل میں آئی تھی۔ 722 ق م میں شاہِ اشور سارگون دوم نے شمالی فلسطین کی یہودی ریاست ''اسرائیل'' کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو یہود کو ترکِ وطن کرنا پڑا۔ پھر شاہِ بابل بخت نصر دوم کے ہاتھوں 586ق م میں یروشلم کی تباہی، ہیکل سلیمانی کی بربادی اور ایک لاکھ یہودیوں کی عراق جلا وطنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہود کی ایک جماعت فلسطین چھوڑ کر حجاز کے شمالی اطراف میں آبسی۔

یثرب میں یہود کی آمد

جب ٹائٹس (Titus) کی زیرقیادت 70ء میں رومیوں نے فلسطین پر قبضہ کیا اور یروشلم اور ہیکل سلیمانی دوسری مرتبہ برباد ہوئے تو متعدد یہودی قبیلے حجاز بھاگ آئے اور یثرب، خیبر اور تیماء میں اپنی باقاعدہ بستیاں بسا لیں اور قلعے اور گڑھیاں تعمیر کر لیں۔ انھی تارکین وطن یہود کے ذریعے سے عرب باشندوں میں بھی کسی قدر یہودی مذہب کا رواج ہوا۔

ظہورِ اسلام کے وقت یہودی قبائل

ظہورِ اسلام کے وقت مشہور یہودی قبائل یہ تھے: بنونضیر، بنومصطلق، بنوقریظہ اور بنوقینقاع۔ [1] سمہودی نے بیان کیا ہے

[1] قلب جزیرۃ العرب، ص:251.



آثار بنوقریظہ (خیبر)

کہ پہلے اور بعد میں آ کر بسنے والے یہودی قبائل کی تعداد بیس سے زیادہ تھی۔ [1]

یہودیت یمن میں

یہودیت کو یمن میں بھی فروغ حاصل ہوا۔ یہاں اس کے پھیلنے کا سبب تبان (تبع) اسعد ابوکرب تھا۔ ابن ہشام لکھتے ہیں کہ جب تبان اسعد مشرق کی مہم سے فارغ ہو کر واپس یثرب پہنچا تو اس نے بنو قریظہ کے دو یہودی علماء کی فہمائش پر یہودیت قبول کر لی اور پھر انھیں اپنے ساتھ یمن لے گیا اور ان کے ذریعے سے یہودیت کو یمن میں وسعت



یمن میں یہودی بستی بیت باس عبد

اور پھیلاؤ حاصل ہوا۔ ابوکرب کے بعد اس کا بیٹا یوسف ذونواس یمن کا حاکم ہوا تو اس نے یہودیت کے جوش میں نجران کے عیسائیوں پر ہلہ بول دیا اور انھیں مجبور کیا کہ یہودیت قبول کریں، مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ اس پر ذونواس نے خندق کھدوائی اور اس میں آگ جلا کر بوڑھے، بچے، مرد، عورتیں سب بلا تمیز آگ کے الاؤ میں جھونک دیے۔ کہا جاتا ہے کہ اس حادثے کا شکار ہونے والوں کی تعداد بیس سے چالیس ہزار کے درمیان تھی۔ یہ اکتوبر 523ء کا واقعہ ہے۔ قرآنِ مجید نے سورۂ بروج میں اسی واقعے کا ذکر کیا ہے۔ [2]

اصحاب الاخدود کی شہادت کے ذمہ دار بادشاہ کے بارے میں بعض مؤرخین نے اختلاف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ذونواس یہودی تھا جبکہ اصحاب الأخدود کی شہادت کا ذمہ دار مشرک بادشاہ تھا جو اپنے رب ہونے کا دعویدار تھا۔ [3]

دارالسلام کے مینیجنگ ڈائریکٹر مولانا عبدالمالک مجاہد اپنے سفرِ نجران (ستمبر 2011ء) کے مشاہدات میں لکھتے ہیں:

”جب ہم اصحاب الاخدود کے علاقے میں داخل ہوئے تو سامنے مٹیالے رنگ کے پہاڑ نظر آ رہے تھے۔ یہ علاقہ دس مربع کلومیٹر ضرور ہوگا۔ آدھا کلومیٹر سے کچھ زیادہ چلنے کے بعد وہ گھاٹیاں شروع ہو جاتی ہیں

[1] وفاء الوفا للسمهودي: 165/1. [2] السيرة لابن هشام: 1/20-36. [3] دیکھیے: ”یمن کی سلطنتیں“ کے ذیل میں ”اصحاب اخدود“۔

جہاں اصحاب الاخدود کا واقعہ پیش آیا تھا۔ بڑے بڑے پتھروں سے چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے جن میں بعض دیواریں چندفٹ بلند تھیں۔ یہ کٹی پھٹی جگہ تھی۔ بعض اونچی جگہیں ٹیلوں کے مشابہ تھیں۔ کم وبیش ایک کلومیٹر لمبی اور 300 میٹر چوڑی جگہ پر یہ خندقیں کھودی گئی تھیں اور پھر ان کی چھوٹی چھوٹی چار دیواریاں بنائی گئی تھیں کہ ان میں آگ دہکائی جاسکے...... ان کھائیوں کے دائیں جانب ایک بڑا سا دائرہ نما گڑھا نظر آیا جس میں کئی سو افراد بیٹھ کر تماشا دیکھ سکتے تھے۔ غالباً اسی جگہ بادشاہ اور اعیانِ مملکت ان مظلوموں کو شہید ہوتے دیکھ رہے تھے۔''[1]

[1] ماہنامہ 'ضیائے حدیث'' لاہور (ستمبر 2011ء)



اخدود نامی بستی کے قدیم آثار (نجران)

3

عرب میں عیسائیت

بلادِ عرب میں عیسائی مذہب کی آمد حبشی اور رومی قبضہ گیروں اور فاتحین کے ذریعے سے ہوئی۔ یمن پر حبشیوں کا قبضہ پہلی بار 340ء میں ہوا اور 378ء تک برقرار رہا۔ اس دوران میں یمن میں مسیحی مشن کام کرتا رہا۔

نجران میں عیسائیت

یمن پر حبشی تسلط کے زمانے میں ایک مستجاب الدعوات اور صاحب کرامات زاہد جس کا نام فیمیون تھا، نجران پہنچا اور وہاں کے باشندوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کی۔ اہلِ نجران نے اس کی اور اس کے دین کی سچائی کی کچھ ایسی علامات دیکھیں کہ وہ عیسائیت کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ [1]

نجران میں کعبہ مشرفہ (مکہ مکرمہ) کی طرز پر بنائے گئے کلیسا کے آثار ابھی تک ملتے ہیں جسے اہلِ نجران ''کعبہ'' کہتے تھے۔ عرب مشرکین 40 سال اس کی زیارت کو آتے رہے۔ کعبۂ نجران جاہلیت میں شہر نجران سے تقریباً 35 کلومیٹر شمال مشرق میں کوہ تصلال پر بنو عبدالمدان حارثی نے تعمیر کیا تھا۔ یہ ابرہہ اشرم کے صنعاء میں بنائے گئے کعبۂ یمن سے الگ تھا۔

[1] السيرة لابن هشام: 1/31-34.



اہل نجران کے کلیسا کے آثار

یمن میں فروغِ عیسائیت

یمنی حکمرانوں میں سے صرف تُبّع عبدکلیل نے عیسائیت قبول کی تھی۔ باقی تبابعہ اکثر یہودی اور کم تر ستارہ پرست تھے۔ [1]

جب حبشیوں نے 525ء میں دوبارہ یمن پر قبضہ کیا اور اَبْرَہَہ اشرم نے حکومتِ یمن کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ عیسائیت کو فروغ دینے کی کوشش کی، اس نے صنعاء میں ایک کلیسا تعمیر کیا اور کوشش کی کہ اہلِ عرب کو مکہ مکرمہ میں واقع بیت اللہ سے روک کر کلیسائے یمن کا حج کرائے اور بیت اللہ کو ڈھا دے۔ لیکن اس کی اس جرأت پر اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی سزا دی کہ وہ قیامت تک کے لیے عبرت بن گیا۔ [2]

دوسری طرف رومی علاقوں کی ہمسائیگی کے سبب آلِ غسان، بنوتغلب اور بنوطے وغیرہ قبائلِ عرب میں بھی عیسائیت پھیل گئی تھی بلکہ حیرہ کے بعض عرب بادشاہوں نے بھی عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ [3]

---

[1] تاریخ ارض القرآن (کامل): 234/1. [2] دیکھیے: متداول کتب تفاسیر میں سورۂ فیل کی تفسیر اور کتاب ہٰذا کا باب "عام الفیل".
[3] الرحیق المختوم، ص: 53.

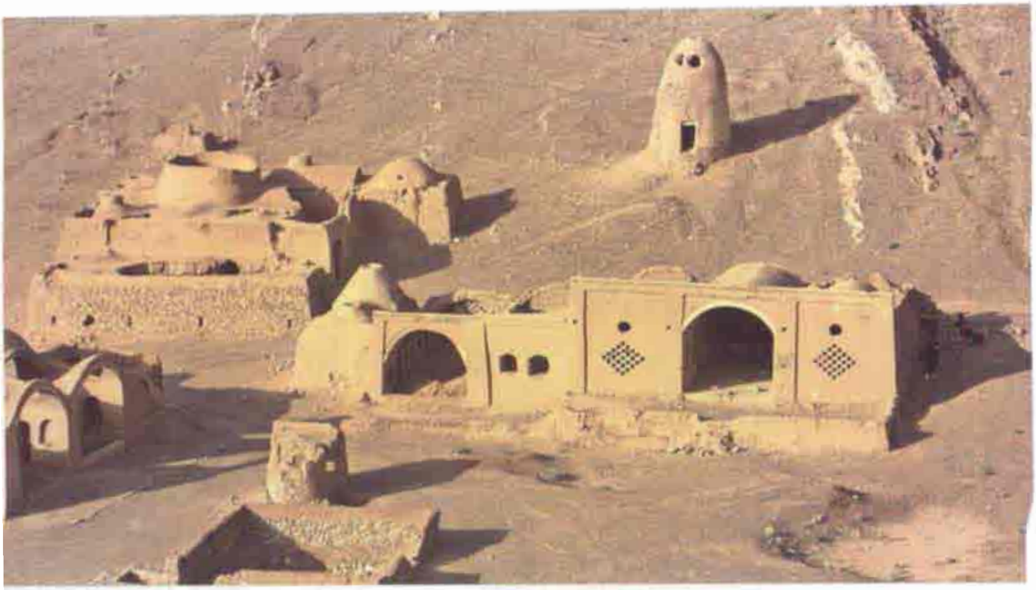


4

عرب میں مجوسیت اور صابئیت

مجوسیت

مجوسی مذہب کو زیادہ تر اہلِ فارس کے ہمسایہ عربوں میں فروغ حاصل ہوا تھا، مثلاً: عراقِ عرب، بحرین (الاحساء)، ہجر اور خلیج عربی کے ساحلی علاقے۔ ان کے علاوہ یمن پر فارسی قبضے کے دوران میں وہاں بھی اِکا دُکا افراد نے مجوسیت قبول کی۔ [1]



وسطی ایران میں مجوسی آتش کدہ

صابئیت

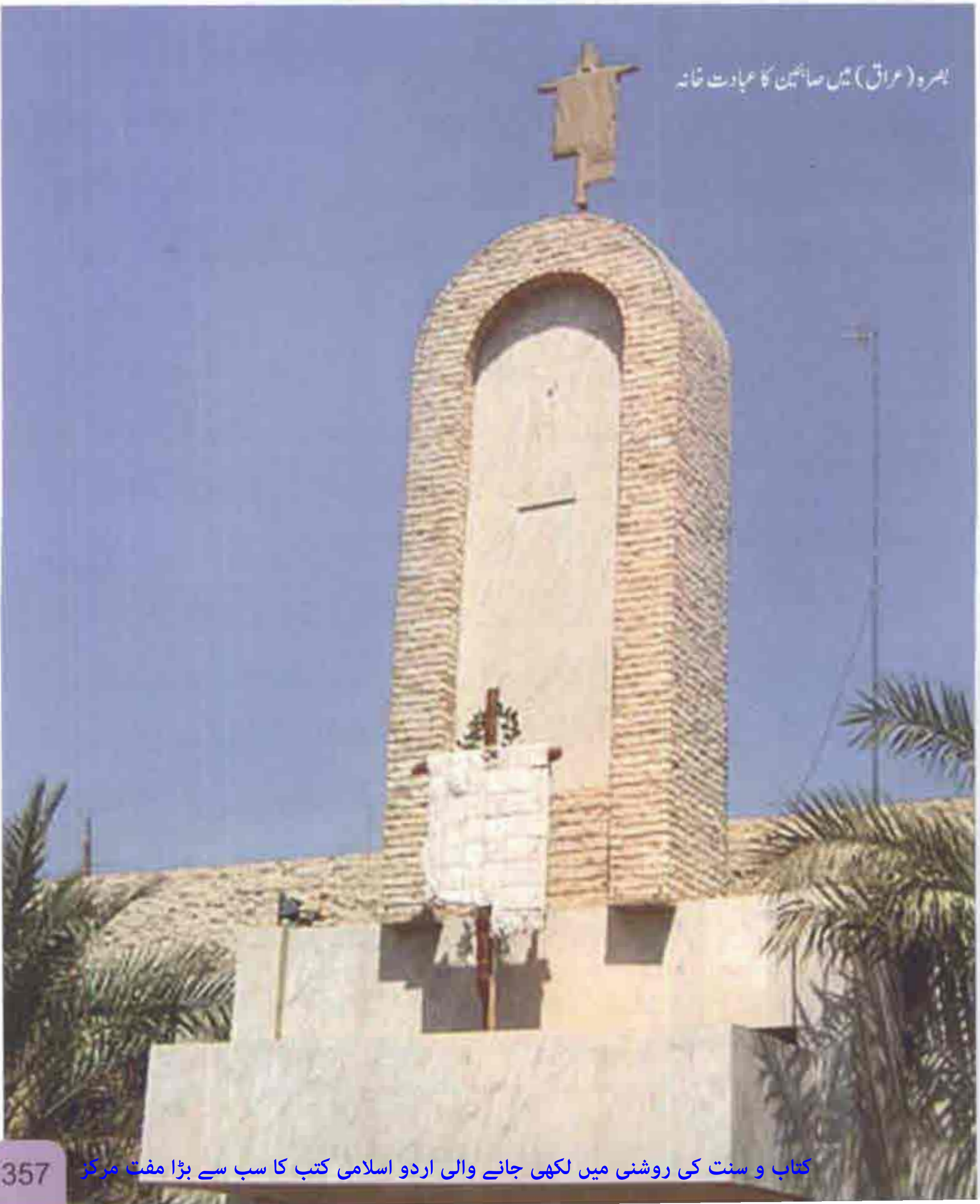
صابئین ستارہ پرست قوم تھی۔ عراق وغیرہ کے آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران میں جو کتبات برآمد ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کلدانی قوم کا مذہب صابئیت تھا۔ دورِ قدیم میں شام و یمن کے بہت

[1] الرحیق المختوم، ص: 54.

سے باشندے بھی اسی مذہب کے پیرُو تھے۔ لیکن جب یہودیت اور پھر عیسائیت کا دور دورہ ہوا تو صابی مذہب مٹتا چلا گیا، تاہم مجوس کے ساتھ خلط ملط ہو کر یا ان کے پڑوس میں عراقِ عرب اور خلیج عربی کے ساحل پر اس مذہب کے کچھ نہ کچھ پیروکار باقی رہے۔[1]

مجوسیت اور صابئیت اور ان کے عقائد کی مزید تفصیل "عرب کی ہمسایہ اقوام، سلطنتیں اور مذاہب" میں ملاحظہ کیجیے۔

[1] تاریخ ارض القرآن (کامل): 2/193-208، الرحیق المختوم، ص: 54.



بصرہ (عراق) میں صابئین کا عبادت خانہ

عرب کی مشرکانہ رسوم وتوہمات

جاہلیت کے عقائد واعمال کے باوجود قریش میں دینِ ابراہیمی کی کچھ باقیات بھی موجود تھیں، انھوں نے یہ دین پورے طور پر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ بیت اللہ کی تعظیم اور اس کا طواف کرتے، حج وعمرہ ادا کرتے اور ہَدی کے جانوروں کی قربانی کرتے تھے، البتہ انھوں نے دینِ ابراہیمی میں بہت سی بدعتیں ایجاد کر کے شامل کر دی تھیں، مثلاً:

حُمس کا خصوصی مقام

قریش کی ایک بدعت یہ تھی کہ وہ کہتے تھے: ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد، حرم کے پاسبان، بیت اللہ کے والی اور مکہ کے باشندے ہیں۔ کوئی شخص ہمارا ہم مرتبہ نہیں اور نہ کسی کے حقوق ہمارے حقوق کے مساوی ہیں ...... اسی بنا پر وہ اپنا نام حُمس (بہادر اور گرم جوش) رکھتے تھے ...... لہٰذا ہمارے شایانِ شان نہیں کہ ہم حدودِ حرم سے باہر جائیں، چنانچہ حج کے دوران میں یہ لوگ عرفات نہیں جاتے تھے اور نہ وہاں سے اِفاضہ کرتے تھے بلکہ مُزْدَلِفہ ہی میں ٹھہر کر وہیں سے افاضہ کر لیتے تھے۔[1] اللہ تعالیٰ نے اس بدعت کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ ﴾ (البقرة 2:199)

''پھر تم لوگ بھی وہیں سے اِفاضہ کرو (لوٹو) جہاں سے سارے لوگ افاضہ کرتے ہیں۔''[2]

حُمس میں ان لوگوں کو بھی شامل کیا جاتا تھا جو حِل (بیرونِ حرم) یا حرم کے عرب باسیوں کی اولاد ہوتی۔ ان کے احکام بھی وہی ہوتے جو قریش مکہ کے ہوتے تھے۔ جو چیزیں قریش کے لیے حلال ہوتیں، ان کے لیے بھی حلال ہوتیں اور جو قریش پر حرام ہوتیں، ان کے لیے بھی حرام ہوتیں۔[3]

حُمس کے لیے حالتِ احرام کی بندشیں

قریش کہتے تھے کہ حُمس کے لیے احرام کی حالت میں پنیر اور گھی بنانا درست نہیں، نیز وہ بال والے گھر (کمبل کے

---

[1] عرفہ کے دن سورج غروب ہونے کے بعد میدانِ عرفات سے مزدلفہ جانا، وہاں مغرب اور عشاء کی نمازیں جمع اور قصر کر کے ادا کرنا، رات مزدلفہ میں بسر کرنا اور صبح فجر کی نماز مزدلفہ ہی میں ادا کرنا، یہ سب اعمال افاضہ کہلاتے ہیں۔ (معجم لغة الفقهاء، ص: 79) [2] السيرة لابن هشام: 199/1، صحيح البخاري: 1665، صحيح مسلم: 1219. [3] السيرة لابن هشام: 199/1.

خیمے) میں داخل ہو سکتے ہیں نہ سایہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اگر سایہ حاصل کرنا ہو تو چمڑے کے خیمے میں حاصل کریں۔ [1]

حج یا عمرہ کرنے والے بیرونی زائرین کا کھانا

وہ کہتے تھے کہ بیرونِ حَرم کے باشندے حج یا عمرہ کرنے آئیں اور وہ اپنے ساتھ حِل سے کھانے پینے کی کوئی چیز لے کر آئیں تو اہل حِل کے لیے اسے کھانا درست نہیں۔ [2]

برہنہ طواف کی قبیح رسم

قریش نے بیرونِ حرم کے باشندوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ حرم میں آنے کے بعد پہلا طواف حُمس سے حاصل کیے ہوئے کپڑوں ہی میں کریں، چنانچہ اگر ان کا کپڑا دستیاب نہ ہوتا تو مرد ننگے طواف کرتے اور عورتیں اپنے کپڑے اتار کر صرف ایک چھوٹا سا کھلا ہوا کرتا پہن لیتیں اور اسی میں طواف کرتیں اور دورانِ طواف یہ شعر پڑھتی تھیں:

اَلْيَوْمَ يَبْدُو بَعْضُهُ أَوْ كُلُّهُ   وَمَا بَدَا مِنْهُ فَلَا أُحِلُّهُ

''آج جسم کا کچھ حصہ برہنہ ہوگا یا سارا لیکن جو برہنہ ہو، میں دوسروں کے لیے اسے حلال نہیں کروں گی۔''

اللہ تعالیٰ نے اس خرافات کے خاتمے کے لیے فرمایا:

﴿ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (الأعراف 31:7)

''اے آدم کے بیٹو! ہر مسجد کے پاس اپنی زینت (ساتر لباس) اختیار کر لیا کرو۔''

بہر حال اگر کوئی عورت یا مرد برتر اور معزز بن کر بیرونِ حرم سے لائے ہوئے اپنے ہی کپڑوں میں طواف کر لیتا تو طواف کے بعد ان کپڑوں کو پھینک دیتا، ان سے نہ خود فائدہ اٹھاتا نہ کوئی اور۔ [3]

حالتِ احرام میں گھر کے عقب سے آنا

قریش حالتِ احرام میں گھر کے اندر دروازے سے داخل نہ ہوتے بلکہ گھر کے پچھواڑے ایک بڑا سا سوراخ بنا لیتے اور اسی سے آتے جاتے اور اپنے اس اُجڈپن کو نیکی سمجھتے۔ قرآن کریم نے اس سے بھی منع فرمایا، فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ (البقرة 189:2)

---

[1] السيرة لابن هشام: 202/1. [2] السيرة لابن هشام: 202/1. [3] السيرة لابن هشام: 203,202/1، صحيح البخاري: 1665.

’’اور نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی پرہیزگاری اختیار کرے اور تم اپنے گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور تم اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔‘‘[1]

یہی شرک، بُت پرستی اور توہمات وخرافات پر مبنی عقیدہ و عمل والا دین اہلِ عرب کا تھا۔

فال گیری اور جوا

مشرکینِ عرب ازلام، یعنی فال کے تیر بھی استعمال کرتے تھے۔ (أَزْلَام، زَلَمْ کی جمع ہے۔ زَلَمْ اُس تیر کو کہتے ہیں جس کے پَر نہ لگے ہوں۔) فال گیری کے لیے استعمال ہونے والے یہ تیر تین قسم کے ہوتے تھے۔ ایک وہ جن پر صرف ’’ہاں‘‘ یا ’’نہیں‘‘ لکھا ہوتا تھا۔ اس قسم کے تیر سفر اور نکاح وغیرہ جیسے کاموں کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ اگر فال میں ’’ہاں‘‘ نکلتا تو مطلوبہ کام کر لیا جاتا، اگر ’’نہیں‘‘ نکلتا تو سال بھر کے لیے ملتوی کر دیا جاتا اور آیندہ سال پھر فال نکالی جاتی۔

فال گیری کے تیروں کی دوسری قسم وہ تھی جن پر پانی، یعنی نیا کنواں کھودنے اور دِیَت وغیرہ کے معاملات درج ہوتے تھے۔ تیسری قسم وہ تھی جن پر یہ درج ہوتا تھا کہ ’’تم میں سے ہے‘‘ یا ’’تمھارے غیر سے ہے‘‘ یا ’’ملحق‘‘ ہے۔ ان تیروں کا مصرف یہ تھا کہ جب کسی کے نسب میں شبہ ہوتا تو اسے ایک سو درہم اور ایک اونٹ سمیت ہُبَل کے پاس لے جاتے۔ اونٹ اور درہم کو تیر والے مُہَنت کے حوالے کرتے۔ وہ تمام تیروں کو ایک ساتھ ملا کر گھماتا، جھنجھوڑتا، پھر ایک تیر نکالتا۔ اب اگر یہ نکلتا کہ ’’تم میں سے ہے۔‘‘ تو وہ ان کے قبیلے کا ایک معزز فرد قرار پاتا اور اگر یہ برآمد ہوتا کہ ’’تمھارے غیر سے ہے‘‘ تو حلیف قرار پاتا اور اگر یہ نکلتا کہ ’’ملحق‘‘ ہے تو ان کے اندر اپنی حیثیت پر برقرار رہتا، نہ قبیلے کا فرد مانا جاتا نہ حلیف۔[2]

اس سے ملتا جلتا ایک رواج مشرکین میں جوا کھیلنے اور جوئے کے تیر استعمال کرنے کا تھا۔ تیر کی نشاندہی پر وہ جوئے کا اُونٹ ذبح کر کے اس کا گوشت بانٹتے تھے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ جوا کھیلنے والے ایک اونٹ ذبح کر کے اسے دس یا اٹھائیس حصوں میں تقسیم کرتے، پھر تیروں سے قرعہ اندازی کرتے۔ کسی تیر پر جیت کا نشان بنا ہوتا اور کوئی تیر بے نشان ہوتا۔ جس کے نام پر جیت کے نشان والا تیر نکلتا، وہ تو کامیاب مانا جاتا اور اپنا حصہ لیتا اور جس کے نام پر بے نشان تیر نکلتا، اسے قیمت دینی پڑتی۔

[1] الرحيق المختوم، ص:52,51. [2] السيرة لابن إسحاق:86,85/1، السيرة لابن هشام:153,152/1، فتح الباري:351/8.

کاہنوں، عرّافوں اور نجومیوں کی خبروں پر ایمان

مشرکینِ عرب کاہنوں، عرّافوں اور نجومیوں کی خبروں پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ کاہن اسے کہتے ہیں جو آنے والے واقعات کی پیش گوئی کرے اور رازہائے سربستہ سے واقفیت کا دعویدار ہو۔ بعض کاہنوں کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ ایک جن ان کے تابع ہے جو انھیں خبریں پہنچاتا رہتا ہے۔ بعض کاہن کہتے تھے کہ انھیں ایسا فہم عطا کیا گیا ہے جس کے ذریعے سے وہ غیب کا پتا لگا لیتے ہیں۔ عرّاف اس بات کے مدعی تھے کہ جو آدمی ان سے کوئی بات پوچھنے آتا ہے، اس کے قول وفعل سے یا اس کی حالت سے، کچھ مقدمات اور اسباب کے ذریعے سے وہ جائے واردات کا پتا لگا لیتے ہیں۔ نجومی اسے کہتے ہیں جو ستاروں پر غور کرکے اور ان کی رفتار و اوقات کا حساب لگا کر پتا لگاتا ہے کہ دنیا میں آیندہ کیا حالات و واقعات پیش آئیں گے۔[1]

اسی طرح ان نجومیوں کی خبروں کو ماننا درحقیقت ستاروں پر ایمان لانا ہے اور ستاروں پر ایمان لانے کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ مشرکینِ عرب نَچھتروں پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم پر فلاں اور فلاں نَچھتر (ستارے کی برکت) سے بارش ہوئی ہے۔[2]

اسلام نے ان کاہنوں اور عرّافوں کے پاس جانے سے سختی سے منع کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ أَتٰى عَرَّافًا فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةٌ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً»

''جو شخص کسی نجومی کے پاس جائے اور اس سے کسی چیز کے بارے میں دریافت کرے تو اس کی چالیس دن تک نماز قبول نہیں ہوتی۔''[3]

اسی طرح مسند احمد میں نبیِ کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ أَتٰى كَاهِنًا أَوْ عَرَّافًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُولُ، فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﷺ»

''جو شخص کسی نجومی یا قیافہ شناس کے پاس آئے اور اس کی بات کی تصدیق کرے تو اس نے گویا محمد ﷺ پر اُتاری گئی شریعت کا انکار کیا۔''[4]

سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَطَيَّرَ أَوْ تُطُيِّرَ لَهُ، أَوْ تَكَهَّنَ أَوْ تُكُهِّنَ لَهُ أَوْ سَحَرَ أَوْ سُحِرَ لَهُ، وَمَنْ أَتٰى كَاهِنًا

[1] مرعاة المفاتيح :248/2. [2] شرح النووي على صحيح مسلم:80,79/2. [3] صحيح مسلم:2230. [4] مسند أحمد: 429/2.

فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُولُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلَى مُحَمَّدٍ ﷺ »

''وہ شخص جو بُرا شگون لے یا اس کے لیے براشگون لیا جائے، کہانت کرے یا اس کے لیے کہانت کی جائے، جادو کرے یا اس کے لیے جادو کیا جائے، وہ ہم میں سے نہیں اور جو شخص کسی کاہن کے پاس آئے اور اس کی بات کی تصدیق کرے تو اس نے گویا محمد ﷺ پر نازل شدہ شریعت کا انکار کیا۔''[1]

بدشگونی کا عقیدہ

مشرکین میں بدشگونی کا بھی رواج تھا۔ اسے عربی میں طِيَرَة کہتے ہیں۔ اس کی صورت یہ تھی کہ مشرکین کسی چڑیا یا ہرن کے پاس جا کر اسے بھگاتے تھے۔ اگر وہ داہنی جانب بھاگتا تو اسے اچھائی اور کامیابی کی علامت سمجھ کر اپنا کام کر گزرتے اور اگر بائیں جانب بھاگتا تو اسے نحوست کی علامت سمجھ کر اپنے کام سے باز رہتے۔ اسی طرح اگر کوئی چڑیا یا جانور راستہ کاٹ دیتا تو اسے بھی منحوس سمجھتے۔

اسی سے ملتی جلتی ایک حرکت یہ بھی تھی کہ مشرکین خرگوش کے ٹخنے کی ہڈی لٹکاتے تھے اور بعض دنوں، مہینوں، جانوروں، گھروں اور عورتوں کو منحوس سمجھتے تھے۔ بیماریوں کی چھوت کے قائل تھے اور رُوح کے اُلّو بن جانے کا عقیدہ رکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے، اسے سکون نہیں ملتا اور اس کی روح اُلّو بن کر بیابانوں میں گردش کرتی رہتی ہے اور ''پیاس، پیاس'' یا ''مجھے پلاؤ، مجھے پلاؤ'' کی صدا لگاتی رہتی ہے۔ جب اس کا بدلہ لے لیا جاتا ہے تو اسے راحت اور سکون مل جاتا ہے۔[2] نبیِ اکرم محمد ﷺ کے لائے ہوئے اسلام نے ان تمام مشرکانہ عقائد اور خرافات کی جڑ کاٹ دی اور اللہ تعالیٰ کا خالص دین دنیا میں جاری و ساری ہو گیا۔

[1] صحيح الترغيب والترهيب للألباني:3041. [2] فتح الباري:323/7 و297/10، الرحيق المختوم، ص:51.

باب 5

جزیرہ نمائے عرب کی معاشرت، تجارت اور ثقافت

زمانۂ جاہلیت میں شادی بیاہ، اختلاط مرد وزن کی متعدد صورتوں، قبائلی تعصبات، تجارتی میلوں اور عربی شعر وادب کے مختلف لہجوں اور ارتقائی مدارج کا جائزہ

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ

”اور یقیناً آپ خُلق عظیم پر (کاربند) ہیں۔“ (القلم 4:68)

اس باب میں

عرب کے معاشرتی حالات، جاہلیت میں نکاح اور اختلاطِ مرد وزن کی مختلف صورتوں کا تذکرہ ہے، نیز قبائلی عصبیت، جاہلیت کے تجارتی میلوں، عربوں کے بعض اعلیٰ اخلاق اور عربی زبان و ادب کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اُمّ الالسنہ عربی کی مختلف ذیلی شاخوں کا جائزہ لیتے ہوئے شمالی و جنوبی عربی کے فرق، عربی زبان کے مختلف ادوار، اس کی ترقی کے اسباب اور عربوں کی فطری خطابت، مختلف لب ولہجہ، خطیب عرب قُس بن ساعِدہ، عرب شعراء کے طبقات کا تعارف اور کندہ کے شہزادے امرؤالقیس کے منتخب اشعار پیش کر کے قارئین کرام کی خدمت میں مرقعِ معلومات تیار کیا گیا ہے۔

1

جزیرہ نمائے عرب کی معاشرت

عرب کے طبقۂ اَشراف میں مرد و عورت کا تعلق خاصا ترقی یافتہ تھا۔ عورت کو بڑی خود مختاری حاصل تھی۔ اس کی بات مانی جاتی تھی اور اس کا اتنا احترام اور تحفظ کیا جاتا تھا کہ اس کی خاطر تلواریں نکل پڑتی تھیں۔ اس کے باوجود بلانزاع مرد ہی خاندان کا سربراہ مانا جاتا تھا اور اس کی بات فیصلہ کن ہوا کرتی تھی۔ اس طبقے میں مرد اور عورت کا تعلق عقدِ نکاح کے ذریعے سے ہوتا تھا اور یہ نکاح عورت کے ولی کی زیرِ نگرانی انجام پاتا تھا۔

جاہلیت میں نکاح کی 4 صورتیں

دوسرے طبقوں میں مرد و عورت کے اختلاط کی اور بھی کئی صورتیں تھیں جنھیں بدکاری و زناکاری کے سوا کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ جاہلیت میں نکاح کی چار صورتیں تھیں۔ ایک تو وہی صورت تھی جو آج بھی لوگوں میں رائج ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کو اس کی زیرِ ولایت لڑکی کے لیے نکاح کا پیغام دیتا، پھر منظوری کے بعد مہر دے کر اس سے نکاح کر لیتا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ عورت جب حیض سے پاک ہوتی تو اس کا شوہر کہتا کہ فلاں شخص کو بلا کر اس سے صحبت کرو۔ شوہر خود اس سے الگ تھلگ رہتا اور اس کے قریب نہ جاتا یہاں تک کہ واضح ہوجاتا کہ جس آدمی سے صحبت کی تھی، اس سے حمل ٹھہر گیا ہے۔ جب حمل واضح ہوجاتا تو اس کے بعد اگر شوہر چاہتا تو اس عورت کے پاس جاتا۔ ایسا اس لیے کیا جاتا تھا کہ لڑکا شریف اور باکمال پیدا ہو۔ اس نکاح کو نکاحِ استبضاع کہا جاتا تھا (اور اسی کو ہندومت میں نیوگ کہتے تھے۔[1])

نکاح کی تیسری صورت یہ تھی کہ دس آدمیوں سے کم کی ایک جماعت اکٹھی ہوتی۔ سب کے سب ایک ہی عورت کے پاس جاتے اور بدکاری کرتے۔ جب وہ عورت حاملہ ہوجاتی اور بچہ پیدا ہوتا تو پیدائش کے چند دن بعد وہ عورت سب کو بلا بھیجتی اور سب کو آنا پڑتا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ کوئی نہ آئے۔ اس کے بعد وہ عورت کہتی کہ آپ لوگوں کا جو

[1] منودھرم شاستر، ص: 212.

معاملہ تھا، وہ تو آپ جانتے ہی ہیں اور اب میرے بطن سے بچہ پیدا ہوا ہے اور اے فلاں! وہ تیرا بیٹا ہے۔ وہ عورت ان میں سے جس کا نام چاہتی، لیتی اور وہ اُس کا لڑکا مان لیا جاتا۔

چوتھا نکاح یہ تھا کہ بہت سے لوگ اکٹھے ہوتے اور کسی عورت کے پاس جاتے۔ وہ اپنے پاس کسی آنے والے کو انکار نہ کرتی۔ یہ رنڈیاں ہوتی تھیں جو اپنے دروازوں پر جھنڈیاں گاڑے رکھتی تھیں تاکہ نشانی کا کام دیں اور جو ان کے پاس جانا چاہے، بے دھڑک چلا جائے۔ جب ایسی عورت حاملہ ہوتی اور بچہ پیدا ہوتا تو سب کے سب اس کے پاس جمع ہوتے اور قیافہ شناس کو بلاتے۔ قیافہ شناس اپنی رائے کے مطابق اس لڑکے کو کسی بھی شخص کے ساتھ ملحق کر دیتا، پھر یہ اسی سے منسوب ہو جاتا اور اسی کا لڑکا کہلاتا، وہ اس سے انکار نہ کر سکتا تھا...... جب اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تو جاہلیت کے سارے نکاح فسخ کر دیے۔ صرف ایک نکاح باقی رہا جو آج بھی رائج ہے۔ [1]

مرد و زن کے میل ملاپ کی دیگر صورتیں

عرب میں مرد و عورت کے ارتباط کی بعض صورتیں ایسی بھی تھیں جو تلوار کی دھار اور نیزے کی نوک پر وجود میں آتی تھیں، یعنی قبائلی جنگوں میں غالب آنے والا قبیلہ مغلوب قبیلے کی عورتوں کو قید کر کے اپنے حرم میں داخل کر لیتا تھا لیکن ایسی عورت سے پیدا ہونے والی اولاد زندگی بھر عار محسوس کرتی تھی۔

زمانۂ جاہلیت میں کسی تحدید کے بغیر متعدد بیویاں رکھنا بھی ایک معروف بات تھی۔ [2] لوگ ایسی دو عورتیں بھی بیک وقت نکاح میں رکھ لیتے تھے جو آپس میں سگی بہنیں ہوتی تھیں۔ باپ کے طلاق دینے یا وفات پانے کے بعد بیٹا اپنی سوتیلی ماں سے بھی نکاح کر لیتا تھا۔ [3] طلاق کا اختیار بھی مرد کو حاصل تھا اور اس کی کوئی حد متعین نہ تھی۔ [4]

زناکاری تمام طبقات میں عروج پر تھی۔ کوئی طبقہ یا انسانوں کی کوئی قسم اس سے مستثنیٰ نہ تھی، البتہ کچھ مرد اور کچھ عورتیں ایسی ضرور تھیں جنھیں اپنی بڑائی کا احساس زنا سے باز رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں آزاد عورتوں کا حال لونڈیوں کے مقابل نسبتاً اچھا تھا۔ اہلِ جاہلیت کی غالب اکثریت اس برائی کی طرف منسوب ہونے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی تھی، چنانچہ سنن ابو داود میں مروی ہے کہ ایک دفعہ ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا: ''اے اللہ کے رسول! فلاں شخص میرا بیٹا ہے۔ میں نے جاہلیت میں اس کی ماں سے زنا کیا تھا۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام میں ایسے دعوے کی گنجائش نہیں۔ جاہلیت کی بات گئی، اب تو لڑکا اسی کا ہوگا جس کی بیوی یا لونڈی سے پیدا ہوا اور زنا کار کے لیے پتھر ہیں۔'' [5]

---

[1] صحيح البخاري: 5127. [2] سنن أبي داود: 2242،2241. [3] السنن الكبرٰى للبيهقي: 163/7. [4] سنن أبي داود: 2195.
[5] سنن أبي داود: 2274.

فتح مکہ کے موقع پر سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور عبد بن زَمْعَہ رضی اللہ عنہ کے درمیان زمعہ کی لونڈی کے بیٹے کے بارے میں جھگڑا ہوا تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سیدنا سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ میرا بھتیجا ہے، میرے بھائی نے مجھ سے اس کے متعلق عہد لیا تھا۔'' عبد بن زمعہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''یہ میرا بھائی ہے، میرے باپ کی لونڈی کا بیٹا ہے اور اسی کے بستر پر پیدا ہوا ہے۔'' نبی ﷺ نے فرمایا: ''اے عبد بن زمعہ! وہ تیرا بھائی ہے...... بچہ اسی کا ہوتا ہے جس کے بستر پر پیدا ہو، البتہ زانی کے لیے پتھر ہیں۔''[1]

لڑکوں پر فخر اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا

جاہلیت میں باپ اور اولاد کا تعلق بھی مختلف نوعیت کا تھا۔ کچھ تو ایسے تھے جو کہتے تھے:

إِنَّمَا أَوْلَادُنَا بَيْنَنَا أَكْبَادُنَا تَمْشِي عَلَى الْأَرْضِ

''ہمارے درمیان ہماری اولاد ہمارے کلیجے ہیں جو روئے زمین پر چلتے پھرتے ہیں۔''

لیکن دوسری طرف کچھ ایسے بھی تھے جو لڑکیوں کی پیدائش کو اپنے لیے باعثِ رسوائی خیال کرتے ہوئے انھیں زندہ دفن کر دیتے تھے۔[2] بعض لوگ اپنے بچوں کو فقر و فاقہ کے ڈر سے مار ڈالتے تھے۔[3] لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سنگ دلی بڑے پیمانے پہ رائج تھی کیونکہ عرب اپنے دشمن سے اپنی حفاظت کے لیے دوسروں کی بہ نسبت کہیں زیادہ اولاد کے محتاج تھے اور اس کا احساس بھی رکھتے تھے۔[4]

قبائلی عصبیت اور جنگیں

عربوں کی قبائلی عصبیت اور قرابت کا تعلق ہی ان کے سماجی نظام کی بنیاد تھا۔ وہ لوگ اس مشہور مثل پر عمل پیرا تھے کہ اُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا ''اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔''[5] اس مثل کے معنی میں ابھی وہ اصلاح نہیں ہوئی تھی جو بعد میں اسلام کے ذریعے سے کی گئی، یعنی ظالم کی مدد یہ ہے کہ اُسے ظلم سے باز رکھا جائے، البتہ شرف و سرداری میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کا جذبہ اکثر قبائل کے درمیان جنگ کا سبب بن جایا کرتا تھا جیسا کہ اوس وخزرج، عبس و ذبیان اور بکر و تغلب وغیرہ کے واقعات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

[1] صحيح البخاري: 2053. [2] النحل 16:58، 59. [3] بني إسرآءيل 17:31. [4] الرحيق المختوم، ص: 57. [5] یہ صرف عربی ضرب المثل نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی زبان اطہر سے ادا ہونے والی ایک حدیث بن چکی ہے، دیکھیے: صحيح البخاري: 2443، 2444.

دین اور خرافات کے آمیزے سے تیار شدہ بعض رسوم و عادات کی بدولت بسا اوقات جنگ کی حدّت و شدّت میں کمی آجاتی تھی اور بعض حالات میں موالات، حلف اور تابعداری کے اصولوں پر مختلف قبائل یکجا ہو جاتے تھے۔ علاوہ ازیں حرمت والے مہینوں میں لڑائی رک جاتی تھی جو کہ حصولِ معاش کے لیے سراپا رحمت ثابت ہوتے تھے۔[1]

[1] صحیح البخاري: 4376، فتح الباري: 114/8، نیز دیکھیے: الرحیق المختوم، ص: 57.

2

جاہلیت کی مشہور منڈیاں اور میلے

دُومۃ الجندل: یہ بازار یکم ربیع الاول سے 15 ربیع الاول تک منعقد ہوتا تھا، پھر نرم پڑ جاتا اور کچھ نہ کچھ آخر ماہ تک جاری رہتا تھا۔ بنو طے، بنو جدیلہ اور بنو کلب اس کے اردگرد رہتے تھے۔

مُشَقَّر: یہ منڈی بحرین (موجودہ الاحساء) میں ہَجر کے قریب لگتی تھی اور جمادی الآخرہ کے شروع سے آخر ماہ تک جاری رہتی تھی۔ اس میں فارس کے لوگ اپنا تجارتی سامان لے کر آتے تھے۔ عبدالقیس اور تمیم کے قبائل اس کے اردگرد مقیم تھے۔

صُحار: یہ منڈی عُمان میں رجب کی پہلی تاریخ سے 5 دن تک لگا کرتی تھی۔

دَبا: یہ منڈی بھی عُمان کے ساحل پر رجب کے آخری دن لگتی تھی۔ اس میں سندھ، ہند، چین اور مشرق و مغرب کے تاجر شریک ہوتے تھے۔

شِحر: یہ منڈی مہرہ (حضرموت) کے علاقے میں اس پہاڑ کے دامن میں منعقد ہوتی تھی جس پر ہود علیہ السلام کی قبر مشہور ہے۔ بنو محارب اس کے اردگرد رہتے تھے۔ یہ نصف شعبان سے شروع ہوتی تھی۔

سُوق عدن: یہ بازار رمضان المبارک کی یکم تاریخ سے شروع ہو کر دس دن تک جاری رہتا تھا۔

سوق صنعاء: یہ بازار نصف رمضان سے مہینے کے اخیر تک جاری رہتا تھا۔

رابیہ: یہ بازار کندہ قبیلے کے علاقے کے قریب حضرموت میں لگتا تھا۔ یہ عکاظ کی منڈی کے عین ساتھ ذوالقعدہ کے نصف سے آخر ماہ تک رہتا تھا۔

عُکاظ: یہ بازار عرفات کے قریب لگتا تھا اور یہ عرب کی سب سے بڑی تجارتی منڈی تھی۔ اس میں قریش، غطفان، ہوازن، بنو اسلم، خزاعہ، عُقل، مصطلق اور دوسرے قبائل شریک ہوتے تھے۔ اس میں شعراء اپنے قصائد سناتے، خطباء تقریریں کرتے، حُکام اپنے فیصلے سناتے اور شیوخ معاہدے کی دفعات طے کرتے تھے۔ یہ میلہ ذوالقعدہ کے نصف سے آخر ماہ تک جاری رہتا تھا۔

ذُوالمجاز: یہ منڈی بھی عکاظ کے قریب ہی لگتی تھی۔ ذوالحجہ کی پہلی تاریخ سے شروع ہو کر یوم تَرویَہ (8 ذوالحجہ) تک جاری رہتی تھی، پھر لوگ منیٰ چلے جاتے تھے۔ ذوالمجاز کے شمال میں مَجِنَّہ کی منڈی بھی لگتی تھی۔

نطاۃ: یہ منڈی خیبر میں لگتی تھی اور یوم عاشوراء (10 محرم) سے آخر محرم الحرام تک جاری رہتی تھی۔

حَجْر: یہ میلہ یمامہ میں عاشوراء سے محرم کے آخر تک لگتا تھا۔[1]



سوق عکاظ کے آثار



خیبر میں قلعہ نطاۃ کے کھنڈر

[1] الأزمنة والأمكنة للمرزوقي: 2/161-170.

3

عربوں کے اچھے اخلاق

یہ بات تو اپنی جگہ مُسلّم ہے کہ اہلِ جاہلیت میں خسیس و رَذِیل عادتیں اور وجدان و شعور اور عقلِ سلیم کے خلاف باتیں پائی جاتی تھیں۔ لیکن ان میں ایسے پسندیدہ اخلاقِ فاضلہ بھی تھے جنھیں دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے، مثلاً:

کرم و سخاوت

اس وصف میں عرب ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے تھے اور اس پر اس طرح فخر کرتے تھے کہ عرب کے آدھے اشعار اسی کی نذر ہوگئے ہیں۔ سخت جاڑے اور بھوک کے زمانے میں کسی کے گھر کوئی مہمان آجاتا اور اس کے پاس اپنی اس ایک اونٹنی کے سوا کچھ نہ ہوتا جو اس کی اور اس کے کنبے کی زندگی کا واحد ذریعہ ہوتی، پھر بھی اس پر سخاوت کا جوش غالب آجاتا اور وہ اٹھ کر اپنے مہمان کے لیے اپنی اونٹنی ذبح کر دیتا۔ عرب معاشرے میں اس کی کئی مثالیں ہیں اور حاتم طائی کی سخاوت تو دنیا میں ضرب المثل ہے۔

عرب اشراف بڑی بڑی دِیَت اور مالی ذمہ داریاں اٹھا لیتے اور اس طرح انسانوں کو بربادی اور خونریزی سے بچا کر دوسرے رئیسوں اور سرداروں پر اظہارِ تفاخر کرتے تھے۔ وہ شراب نوشی پر اس لیے فخر کرتے تھے کہ یہ کرم و سخاوت کو آسان کر دیتی تھی اور نشے کی حالت میں مال لٹانا انسانی طبیعت پر گراں نہیں گزرتا، اسی لیے یہ لوگ انگور کے درخت کو الکرم اور انگور کی شراب کو ”بنت الکرم“ کہتے تھے۔ عنترہ بن عمرو بن شداد عبسی اپنے مُعلّقہ میں کہتا ہے:

فَإِذَا شَرِبْتُ فَإِنَّنِي مُسْتَهْلِكٌ مَالِي، وَعِرْضِي وَافِرٌ لَمْ يُكْلَمِ
وَإِذَا صَحَوْتُ فَمَا أُقَصِّرُ عَنْ نَّدًى وَكَمَا عَلِمْتِ شَمَائِلِي وَ تَكَرُّمِي

”جب میں پی لیتا ہوں تو اپنا مال لٹا ڈالتا ہوں لیکن میری عزت و آبرو محفوظ رہتی ہے اور اس پر کوئی زد نہیں آتی۔ اور جب میں ہوش میں آتا ہوں تب بھی سخاوت میں کوتاہی نہیں کرتا، جیسا کہ (اے محبوبہ!) تجھے میرا اخلاق و کرم معلوم ہے۔“ [1]

[1] السبع المعلقات، معلقة عنترة بن شداد.

وہ جوا کھیلتے تھے تو اسے بھی سخاوت کا ذریعہ سمجھتے تھے کیونکہ انھیں جو نفع حاصل ہوتا یا نفع حاصل کرنے والوں کے حصے سے جو کچھ بچ رہتا، اسے مسکینوں کو دے دیتے تھے۔ اسی لیے قرآنِ پاک نے شراب اور جوئے کے نفع کا انکار نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا: ﴿ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ﴾ ''اور ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے۔''[1]

ایفائے عہد

دورِ جاہلیت کے اخلاقِ فاضلہ میں ایفائے عہد کو دین کی حیثیت حاصل تھی جس پر وہ بہر حال کاربند رہتے تھے اور اس راہ میں اپنی اولاد کا خون اور اپنے گھر بار کی تباہی بھی ہیچ سمجھتے تھے۔ اسے سمجھنے کے لیے ہانی بن مسعود شیبانی، سموأل بن عادیا اور حاجب بن زرارہ کے واقعات کافی ہیں۔[2]

خودداری و عزتِ نفس

اپنی خودداری برقرار رکھنا اور ظلم و جبر برداشت نہ کرنا بھی جاہلیت کے معروف اخلاق میں سے تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی شجاعت و غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ فوراً بھڑک اٹھتے تھے اور ذرا ذرا سی بات پر جس سے ذلت و اہانت کی بو آتی، شمشیر و سنان اٹھا لیتے اور نہایت خون ریز جنگ چھیڑ دیتے۔ انھیں اس راہ میں اپنی جان کی قطعاً پروا نہ رہتی۔

جان پر کھیل کر عزائم کی تکمیل

اہل جاہلیت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ جب وہ کسی کام کو مجد و افتخار کا ذریعہ سمجھ کر انجام دینے پر تُل جاتے تو پھر کوئی رکاوٹ انھیں روک نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر اس کام کو انجام دے ڈالتے تھے۔

حِلم و بُردباری

یہ بھی اہل جاہلیت کے نزدیک قابلِ ستائش خوبی تھی، مگر یہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی شجاعت اور جنگ کے لیے ہمہ وقت آمادگی کی عادت کے سبب کمیاب تھی۔

سچائی اور امانت داری

تمدن کی آلائشوں اور داؤ پیچ سے ناواقفیت اور دوری کا نتیجہ یہ تھا کہ ان میں سچائی اور امانت پائی جاتی تھی۔ وہ

---

1 البقرۃ 2:219. 2 دیکھیے: ''حیرہ (عراق) کی لخمی بادشاہت'' کے زیرِ عنوان، ''جنگ ذی قار میں عربوں کی فتح'' کے تحت ہانی بن مسعود کا واقعہ۔

فریب کاری و بدعہدی سے دور اور متنفر تھے۔

جزیرہ نمائے عرب کو ساری دنیا سے جو جغرافیائی نسبت تھی، اس کے علاوہ یہی وہ قیمتی اخلاق تھے جن کی وجہ سے اہل عرب کو بنی نوع انسان کی قیادت اور رسالتِ عامہ کا بوجھ اُٹھانے کے لیے منتخب کیا گیا کیونکہ یہ اخلاق اگرچہ بعض اوقات شَر وفساد کا سبب بن جاتے تھے اور ان کی وجہ سے المناک حادثات پیش آجاتے تھے لیکن یہ فی نفسہ بڑے قیمتی اخلاق تھے جو تھوڑی سی اصلاح کے بعد انسانی معاشرے کے لیے نہایت مفید بن سکتے تھے اور یہی کام اسلام نے انجام دیا۔[1]

[1] الرحیق المختوم، ص:58-60۔

4

عربی زبان و ادب

زبان و ادب سے مراد وہ ذہنی اور عقلی کارنامے ہیں جو کسی زبان کے بولنے والوں کی نظم و نثر میں درج ہوتے ہیں، یعنی ان کی عقلوں کے افکار و تخیلات اور ان کے بیانات جو نفس کی تہذیب، عقل کی درستی اور زبان کی اصلاح کے کام آتے ہیں۔

عربی زبان ان سامی زبانوں [1] میں سے ایک ہے جو جزیرہ نمائے عرب کی مشہور عربی قوموں کی زبانیں تھیں۔

عربی، سامی زبانوں کی ماں ہے

سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: بنو سام کا اصل مسکن عرب تھا، اس لیے اصل سامی زبان کا نام جو کچھ بھی ہو لیکن جغرافیائی حیثیت سے اس کا نام عربی ہی ہوگا جسے قومی حیثیت سے آرامی کہنا چاہیے۔ چونکہ سامی قبائل میں سب سے پہلا نامور اور ممتاز قبیلہ بنو ارم بن سام تھا جس کا سراغ عرب، عراق اور شام میں ہر جگہ ملتا ہے، اس بنا پر عربی زبان کی پہلی شاخ آرامی ہوگی، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان آرامی عربی تھی جیسا کہ مدرسہ مارونیہ (رومیہ) کا عربی و سریانی کا عیسائی پروفیسر قس جبرئیل فرواحی سریانی سے متعلق اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

''آرامی، عبرانیوں کے پدر اعلیٰ ابراہیم کی زبان ہے۔'' اس بنا پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی آبائی زبان عبرانی نہیں بلکہ آرامی عربی تھی۔ [2] البتہ بنوجرہم کے ساتھ رہتے ہوئے انھوں نے فصیح عربی زبان پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ [3]

یورپی محقق تھیوڈور نولڈیکی کہتا ہے کہ ''آرامی زبان عراق، شام اور عراق عرب میں بولی جاتی تھی بلکہ مصر اور ایران کی زبانوں میں بھی اس کے آثار ملتے ہیں۔''



آرامی زبان کا ایک کتبہ

[1] سامی زبانوں سے مراد وہ زبانیں ہیں جنھیں سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد کے مختلف قبائل بولا کرتے تھے۔ [2] تاریخ ارض القرآن (کامل): 99,98/2۔ [3] فتح الباری: 488/6۔



سبائی کتبہ



حمیری زبان کا کتبہ



حبشی زبان کا کتبہ

سبائی، حمیری اور حبشی جنوبی عرب کی زبانیں تھیں۔ سبائی بہت پہلے مُردہ ہوچکی تھی مگر حمیری اور حبشی ظہورِ اسلام تک بولی جاتی تھیں۔ حمیری اصحاب الاخدود کی زبان تھی جبکہ حبشی اصحاب الفیل کی۔

قرآن مجید میں سبائی حمیری زبان کا ایک لفظ "عَرِم" (بند) سبا کے قصے میں آیا ہے جبکہ حبشی زبان کے کئی الفاظ عرب کے عیسائیوں میں مستعمل تھے، چنانچہ قرآنی عربی میں بھی وہی الفاظ چلے آئے، مثلاً:

نفاق، صحف، برہان، مرج (چراگاہ)، مائدہ (دسترخوان)، مشکاۃ (چراغ)، سورۃ، حواری، استبرق (ریشم)، ورق۔

شمالی وجنوبی عربی میں بعض الفاظ کے معانی کا فرق دیکھیے:

لفظ	شمالی عربی	جنوبی عربی
ذو:	والا (جیسے ذوالحجہ)	بادشاہ (جیسے ذو ریدان)
بیت:	گھر (جیسے بیت اللہ)	قلعہ
حضر:	مستقل آبادی	شہر

نبطی جو اصحاب الحجر کی زبان تھی، وہ قرآنی عربی سے بہت قریب ہے۔ نبطی خط بھی قدیم عربی خط بلکہ کوفی خط سے مشابہ ہے۔ شمالی عرب کے مختلف قبائل میں لہجے، تلفظ اور الفاظ کی حرکات میں اختلاف تھا، مثلاً:

1. بنوتمیم ہمزۂ ابتدا کو عین کر دیتے تھے، جیسے "أسلم" کو "عسلم" اور وہ "گ" بھی بولتے تھے جو عام عربی میں نہیں، جیسے "جبر" کو "گبر"
2. بنوقضاعہ "ی" کو جیم کر دیتے تھے، جیسے "تمیمی" کو "تمیمج"
3. بنوسعد "ع" کو نون بولتے تھے، جیسے "أعطیٰ" کو "أنطیٰ"

4 قریش اور اسد کی زبان میں یائے مضارع پر فتحہ یا ضمہ ہوتا ہے، ان کے علاوہ دیگر قبائل کسرہ دیتے تھے۔ وہ يَفْعَل کو يِفْعَل کہتے تھے۔

5 ربیعہ اور مضر مؤنث میں کافِ خطاب کے بعد ''ش'' بڑھا دیتے تھے، جیسے عَلَيْكِ کی جگہ عَلَيْكِشْ۔[1]

عربی زبان کے مختلف ادوار

ادبِ عربی کی تاریخ پانچ ادوار میں تقسیم ہے:

1 **عصرِ جاہلیت:** اس کی مدت تقریباً 150 برس، یعنی ظہورِ اسلام تک ہے۔

2 **عصرِ صدرِ اسلام** (بنی امیہ کا زمانہ): یہ دور ظہورِ اسلام سے شروع ہو کر دولتِ بنی عباس کے قیام، یعنی 132ھ/749ء پر ختم ہو جاتا ہے۔

3 **عصرِ بنی العباس:** اس کی وسعت سلطنت عباسیہ کے قیام سے تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی، یعنی 656ھ/1258ء تک ہے۔ تاتاری اُن تورانی قوموں میں سے ایک ہیں جو پہلے چین کے شمال میں منگولیا وغیرہ میں سکونت پذیر تھیں اور بعد ازاں چنگیز خانی لشکروں کی صورت میں وسطی و مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ میں پھیل گئیں۔

4 **دُوَلِ ترکیہ کا زمانہ:** یہ دور سقوطِ بغداد سے شروع ہو کر نہضت جدیدہ (تحریکِ جدید) کے آغاز، یعنی 1220ھ/1805ء تک ختم ہوتا ہے۔ دول ترکیہ میں سلاجقہ، مصر و شام کی سلطنتِ ممالیک، ایشیا میں تاتاریوں کی بنا کردہ حکومتیں اور تین قدیم براعظموں (ایشیا، یورپ اور افریقہ) میں پھیلی ہوئی دولت عثمانیہ شامل ہیں۔

5 **نہضتِ جدیدہ:** اس کی ابتدا مصر میں محمد علی پاشا کی حکومت کے قیام (1220ھ/1805ء) سے ہوتی ہے اور یہ ہمارے موجودہ وقت تک محیط ہے۔

عربی زبان کے اوصاف

عربی زبان قدامت میں سب سے بڑھی ہوئی اور اپنے الفاظ و کلمات کے لحاظ سے سب زبانوں سے زیادہ سرمایہ دار ہے۔ یہ زبان بلحاظ گویائی سب سے شیریں، بلحاظ اسلوب سب سے سلیس، تاثیر میں سب سے عجیب اور محسوسات اور دلی جذبات و تاثرات پر محیط ہونے میں سب سے وسیع ہے۔ عربی ایک اُمّی (ان پڑھ) قوم کی زبان ہے جس میں نہ تو یونان جیسی حکمت تھی اور نہ چین جیسی صنعت و حرفت۔ وہ لوگ خود تو دنیا سے ناپید ہو گئے مگر ان کی زبان ہر گروہ کے ساتھ ساتھ چلی اور ہر زمان و مکان کے مناسبِ حال رہی۔ اگر اس کے اندر ایک روحِ عظیم جلوہ گر

[1] تاریخ ارض القرآن (کامل): 103/2.

نہ ہوتی تو ایسا ہرگز نہ ہوتا کہ وہ تو زندہ اور قائم رہی اور اس کی ہمسر زبانیں مٹ گئیں۔

عربی زبان کی ترقی کے اسباب

عربی زبان کی نشو ونما کے لیے ایسے ذرائع اور ترقی و بقا کے ایسے اسباب موجود تھے جو دوسری زبانوں کو بہت کم میسر آسکتے ہیں، مثلاً: اس میں وضع الفاظ اور دلالت علی المعانی کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ کلمات میں تصریف و اشتقاق کی باقاعدگی، مجاز و کنایہ کی گونا گونی اور مترادفات کی بہتات ہے۔ علاوہ ازیں قلب، ابدال اور نحت و تعریب [1] کے قواعد جاری ہیں اور سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم اسی زبان میں نازل ہوا اور سنت نبویہ کے خزانے بھی اسی میں موجود ہیں۔



قرآن مجید کے خوبصورت نسخے کا ایک ورق



سنن ابی داؤد کے قلمی نسخے کا ایک ورق

عدنانی عربی زبان

ائمۂ لغت کی روایت سے جو عربی زبان ہم تک پہنچی ہے اور قرآن حکیم اور احادیث نے جو زبان پیش کی ہے، وہ

[1] قلب: ایک حرف کو دوسرے حرف سے مقدم و مؤخر کرنے کو کہتے ہیں، جیسے: يَئِسَ سے أَيِسَ۔ ابدال: ایک حرف کو دوسرے حرف سے یا ایک حرکت کو دوسری حرکت سے بدلنے کو کہتے ہیں، جیسے: قَوَلَ سے قَالَ اور تَلَقُّوْ سے تَلَقَّ۔ نحت: بعض حروف کم کرکے دو کلموں سے ایک کلمہ بنا لینے کو کہتے ہیں جیسے: بِسْمِ اللّٰهِ سے بَسْمَلَة اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ سے حَمْدَلَة۔ تعریب: کسی غیر عربی لفظ کو عربی الفاظ کی شکل میں منتقل کر لینے کو کہتے ہیں، جیسے: ہندی لفظ کپور سے کافور اور ''کرن پھل'' سے قَرَنْفُلٌ۔

اُن قبائل کی زبانوں کی باہمی آمیزش کا نتیجہ ہے جو جزیرہ نمائے عرب میں سکونت رکھتے تھے۔

عربوں کے مختلف لہجے

امتِ عربیہ کی تشکیل دو بڑے قبیلوں (قحطانی اور عدنانی) کے ملنے سے ہوئی تھی جو مختلف ذیلی قبائل اور گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان قبائل کے لہجے اصول میں تو متحد تھے مگر فروعات میں اختلاف تھا۔ یمن میں حمیری زبان غالب رہی اور اس کے بعد مٹ گئی مگر اس کے بعض الفاظ، جو عدنانی میں شامل ہو گئے تھے، باقی رہ گئے۔
دوسری طرف عدنانی زبان جو بعد میں مُضری زبان میں متشکل ہوئی، اردگرد کی دوسری زبانوں پر غالب آ گئی تھی بلکہ اس نے حمیری پر بھی اس کے وطن میں غلبہ حاصل کر لیا۔

عربوں کی خطابت

عرب کے اکثر لوگ ناخواندہ تھے۔ ان کے اکثر لڑائی جھگڑے سالہا سال جاری رہتے تھے۔ ہر قبیلہ اپنے افراد کو لڑائی پر ابھارنے اور بدلہ لینے پر اکسانے کے لیے خطیب کی خدمات حاصل کرتا تھا۔ لڑائی چھڑنے کو ہوتی تو خطیب باہمی تعلقات کی اصلاح پر خطبہ دیتا اور لڑائی کی ہولناکیوں اور اس کے خطرناک نتائج کا تذکرہ کرتا۔ کبھی خطیب اپنے اپنے قبیلے کے فخر و مباہات اور نسبی برتری کا اظہار کرتے اور ان کے کارناموں کی عظمت بیان کرتے۔
خطبائے عرب میں سے قُس بن ساعدہ ایادی، کعب بن لؤی، ذوالاِصبع حرثان بن محرث، قیس بن خارجہ بن سِنان ذبیانی، خویلد بن عمرو غطفانی اور اکثم بن صیفی بہت مشہور تھے۔ کعب بن لؤی نبی ﷺ کے پردادا تھے۔

خطیبِ عرب قُس بن ساعِدہ ایادی

قُس بن ساعدہ ایادی کو تمام عرب کا خطیب تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ بلاغت، حکمت اور مَوعِظَہ حَسَنہ میں ضرب المثل تھا۔ توحید کا قائل تھا اور حشر ونشر پر ایمان رکھتا تھا۔ عربوں کو بُت پرستی ترک کرنے کی دعوت دیتا، اللہ واحد کی عبادت کی طرف رہنمائی کرتا اور عام مجلسوں اور میلوں میں اس مضمون پر خطبے دیا کرتا تھا۔
کہتے ہیں کہ یہ پہلا شخص ہے جس نے اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور سب سے پہلے خطبے میں أَمَّا بَعْدُ کا استعمال کیا[1] اور یہی پہلا شخص ہے جس نے خطبے کے وقت تلوار یا لاٹھی پر ٹیک لگائی۔ لوگ اس کے پاس اپنے مقدمے لاتے تو وہ اپنی درست رائے اور حکمِ صائب سے صحیح فیصلہ کر دیتا تھا۔

[1] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے أَمَّا بَعْدُ کہنے والے کے بارے میں بہت اختلاف ہے۔ اس ضمن میں یعقوب علیہ السلام، داود علیہ السلام، یعرب بن قحطان، کعب بن لؤی، سحبان بن وائل اور قس بن ساعدہ کے نام لیے جاتے ہیں۔ (فتح الباري: 520/2)

قُس قیصر روم سے ملاقات کے لیے بھی جایا کرتا تھا۔ ایک دن قیصر نے پوچھا: ''افضل ترین عقل کیا ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''انسان کا اپنے آپ کو پہچاننا۔'' قیصر نے پوچھا: ''افضل علم کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''انسان کا اپنے علم کی حد پر ٹھہر جانا۔'' پوچھا: ''بہترین مروت (مردانگی) کیا ہے؟'' کہنے لگا: ''انسان کا اپنی آبرو کو باقی رکھنا۔'' پھر قیصر نے دریافت کیا کہ افضل مال کیا ہے؟ کہنے لگا: ''جس سے حقوق پورے کیے جائیں۔''

نبیِ کریم ﷺ نے بعثت سے پہلے اسے ایک خاکستری رنگ کے اونٹ پر سوار ہوکر بازارِ عُکاظ میں خطبہ دیتے ہوئے سنا تو اس کے حسنِ کلام پر تعجب کیا، اس کی درست رائے کو بہت پسند فرمایا اور اس کی تعریف کی۔ قُس نے بہت لمبی عمر پائی اور بعثت سے تھوڑی مدت پہلے فوت ہوا۔

اس کے الفاظ نہایت جچے تلے اور مہذب اور کلام پُر تاثیر اور حشو و زوائد سے مبرا تھا۔ اس کے سجع [1] میں چھوٹے چھوٹے فواصل ہوتے تھے اور وہ (سجع) اس کے کلام مرسل پر غالب ہوتا تھا۔

احمد بن علی بن احمد بن عبداللہ قلقشندی کی کتاب صبح الاعشیٰ میں اس کا خطبہ بذیل مذکور ہے جو اس نے بازارِ عُکاظ میں دیا تھا:

[أَيُّهَا النَّاسُ! اِسْمَعُوا وَعُوا، مَنْ عَاشَ مَاتَ، وَمَنْ مَّاتَ فَاتَ، وَكُلُّ مَا هُوَ آتٍ آتٍ، لَيْلٌ دَاجٍ وَنَهَارٌ سَاجٍ، وَسَمَاءٌ ذَاتُ أَبْرَاجٍ، وَ نُجُومٌ تَزْهَرُ، وَبِحَارٌ تَزْخَرُ، وَجِبَالٌ مُّرْسَاةٌ، وَأَرْضٌ مُّدْحَاةٌ، وَأَنْهَارٌ مُّجْرَاةٌ، إِنَّ فِي السَّمَاءِ لَخَبَرًا، وَإِنَّ فِي الْأَرْضِ لَعِبَرًا، مَابَالُ النَّاسِ يَذْهَبُونَ وَلَا يَرْجِعُونَ، أَرَضُوا فَأَقَامُوا أَمْ تُرِكُوا فَنَامُوا؟ يُقْسِمُ قُسٌّ بِاللّٰهِ قَسَمًا لَّا إِثْمَ فِيهِ! إِنَّ لِلّٰهِ دِينًا هُوَ أَرْضٰى لَكُمْ وَ أَفْضَلُ مِنْ دِينِكُمُ الَّذِي أَنْتُمْ عَلَيْهِ، إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ مِنَ الْأَمْرِ مُنْكَرًا]

''اے لوگو! سنو اور یاد رکھو۔ جو جیا وہ مر گیا اور جو مر گیا وہ گزر گیا (جا چکا) اور جو کچھ پیش آنے والا ہے، ضرور پیش آئے گا۔ رات تاریک ہے اور دن ساکن۔ آسمان برجوں والا ہے اور ستارے جگمگا رہے ہیں اور سمندر موج زن ہیں۔ پہاڑ اپنی جگہ پر گڑے ہوئے ہیں، زمین بچھی ہوئی ہے اور دریا بہہ رہے ہیں۔ بلاشبہ آسمان (کی پیدائش) میں ایک عظیم الشان خبر (صانعِ عالم کے وجود کی دلیل) ہے اور زمین میں بڑی عبرتیں ہیں۔ لوگوں کا کیا حال ہے کہ جو جاتے ہیں، وہ واپس نہیں آتے۔ کیا انھیں وہ جگہ پسند آگئی، اس لیے وہیں

[1] سجع نثر کی ایسی عبارت آرائی ہے جس میں ہر جملے کے آخری حروف ایک جیسے ہوتے ہیں جس طرح شعر میں قافیہ ہوتا ہے۔ (المعجم الوسیط، مادۃ: سجع، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

ٹھہر گئے ہیں یا انھیں چھوڑ دیا گیا اور وہیں سو گئے ہیں؟ قُس اللہ کی ایسی قسم کھاتا ہے جس میں کوئی گناہ نہیں! بے شک اللہ کا ایک ایسا دین بھی ہے جو تمھارے لیے زیادہ پسندیدہ ہے اور تمھارے اس دین سے جس پر تم قائم ہو، افضل ہے۔ بلاشبہ تم لوگ ایک بہت بُرے امر کے مرتکب ہو رہے ہو۔''

یہ بھی روایت ہے کہ قُس نے اس خطبے کے بعد درج ذیل اشعار بھی پڑھے تھے:

فِي الذَّاهِبِينَ الْأَوَّلِي نَ مِنَ الْقُرُونِ لَنَا بَصَائِرُ

''بلاشبہ ہم سے پہلے جانے والے گروہوں میں ہمارے لیے بڑی بصیرتیں اور عبرتیں ہیں۔''

لَمَّا رَأَيْتُ مَوَارِدًا لِّلْمَوْتِ لَيْسَ لَهَا مَصَادِرُ

''جب میں نے دیکھا کہ موت میں داخل ہونے کے دروازے تو ہیں مگر اُن سے واپسی کے راستے نہیں ملتے۔''

وَرَأَيْتُ قَوْمِي نَحْوَهَا تَمْضِي الْأَكَابِرُ وَالْأَصَاغِرُ

''اور میں نے دیکھا کہ میری قوم کے چھوٹے بڑے موت کی طرف جا رہے ہیں۔''

لَا يَرْجِعُ الْمَاضِي إِلَيَّ وَلَا مِنَ الْبَاقِينَ غَابِرُ

''نہ تو جانے والوں میں سے کوئی میری طرف واپس آتا ہے اور نہ باقی رہنے والوں میں سے کوئی ٹھہرا رہتا ہے۔''[1]

عربی شاعری کا ظہور

عرب فطری طور پر شاعر تھے کیونکہ ان کی بدویانہ زندگی اور بود و باش تربیتِ خیال سے پوری مناسبت رکھتی تھی۔ دوسری قوموں کی نسبت ان کا شعری ذوق بہت اعلیٰ تھا۔ وہ شعر گوئی میں دوسری قوموں پر اس لیے فوقیت لے گئے کہ وہ ان پڑھ تھے اور اپنے کارناموں کو ہمیشہ قائم رکھنے کے لیے شعر گوئی کو انھوں نے اپنے علم اور دانائی کے اظہار کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔

عرب شعراء کے طبقات

زمانے کے لحاظ سے عرب شعراء کے چار طبقے ہیں:

[1] صبح الأعشى: 255/1.

1 طبقۂ جاہلیین: ان سے مراد وہ شعراء ہیں جنھوں نے زمانۂ جاہلیت ہی میں شعر کہے۔
2 طبقۂ مخضرمین: ان سے مراد وہ شعراء ہیں جنھوں نے جاہلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں شعر کہے۔
3 طبقۂ اسلامیین: یہ وہ شعراء ہیں جنھوں نے اسلام میں نشوونما پائی اور اُن کا سلیقۂ عربیت فاسد نہیں ہوا۔ وہ شعرائے بنی اُمیہ ہیں۔
4 طبقۂ مُولّدین یا مُحْدَثین: ان میں وہ شعراء ہیں جن کا ظہور فسادِ عربیت کے وقت ہوا جبکہ عرب عجمیوں کے ساتھ مل جل گئے تھے اگرچہ وہ خود خالص عربی النسل تھے۔ یہ طبقہ عہدِ عباسیہ سے لے کر موجودہ زمانے تک کے شعراء پر مشتمل ہے۔

جاہلی شعراء میں سے یہاں ہم صرف امرؤالقیس کا ذکر کریں گے جو شعرائے جاہلیت کا سردار مانا جاتا ہے۔

امرؤالقیس: کندہ کا شہزادہ

اس کا لقب المَلِکُ الضِّلِّیل (گمراہ بادشاہ)، کنیت ابوالحارث اور نام حُندُج بن حُجر کندی ہے۔ یہ یمن کا معروف شاعر اور جاہلی شعراء کا پیشرو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے آباء واجداد قبیلۂ کندہ کے اشراف وملوک میں سے تھے۔ ماں کا نام فاطمہ بنتِ ربیعہ ہے جو کُلَیب و مُہَلہِل تغلبی کی ہمشیرہ تھی۔ امرؤالقیس کا باپ حُجر بنوکِندہ کا آخری بادشاہ تھا۔

امرؤالقیس نے سرزمین نجد میں بنو اسد کے درمیان پرورش پائی جو اُس کے باپ کی رعایا تھے اور وہی روش اختیار کی جو عموماً بادشاہوں کی عیش پسند اولاد کیا کرتی ہے۔ وہ کھیل کود میں مصروف رہتا۔ شراب نوشی اور حسینوں سے عشق بازی کرتا بلکہ اپنا بیشتر وقت عورتوں کی تشبیب میں گزارتا حتی کہ اس نے صریح فحش گوئی اختیار کرلی، نیز اُن تمام امور سے یکسر اعراض کیا جو حکومت کی اہلیت پیدا کرنے کے لیے ضروری تھے۔ اس کا باپ اُسے لہو ولعب اور عورتوں کی تشبیب سے روکتا مگر جب ان باتوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو اُسے گھر سے نکال دیا۔ وہ باہر نکلا تو کنگلوں نے اُسے گھیر لیا جو عیش وطرب کے دلدادہ تھے۔

وہ ان لوگوں کے ساتھ یمن کے شہر دمون میں شراب نوشی کی محفل میں مصروف تھا کہ اچانک اطلاع ملی، بنو اسد نے بغاوت کرکے اس کے باپ کو قتل کر دیا ہے کیونکہ وہ اُن سے ظالمانہ سلوک کرتا اور وہ لوگ جو خراج اُسے ادا کرتے تھے، اُس کی وصولی میں حدِ اعتدال سے تجاوز کر جاتا تھا۔ امرؤالقیس نے یہ خبر سنی تو اس خیال سے کہ اس کے رفقاء کا عیش مکدر نہ ہو، کسی فوری بے چینی اور اضطراب کا اظہار نہ کیا، پھر کہنے لگا: ''باپ نے میرے لڑکپن میں مجھے ضائع کیا (میری اچھی تربیت نہ کی) اور بڑا ہوا تو اپنے خون کا انتقام مجھ پر لاد دیا۔ آج تو بدمستی سے ہوش نہیں ہوگا

اور کل شراب نوشی سے مستی نہ ہوگی۔ آج شراب نوشی ہوگی اور کل حکومت۔'' بعد ازاں اس نے انتقام لینے کے لیے ساز و سامان جمع کرنا شروع کیا اور مختلف قبائل کی مدد سے بنو اسد پر فوج کشی کر کے بہت سوں کو قتل کر ڈالا لیکن اس سے اس کے انتقام کی پیاس نہ بجھی۔

شاہِ حیرہ مُنذِر کو امرؤالقیس کے خاندان سے دشمنی تھی کیونکہ جب مَنَاذِرہ (شاہانِ حیرہ) اور کسریٰ کیقباد میں اختلاف پیدا ہوا تھا تو امرؤالقیس کے دادا حارث نے کسریٰ کی طرف سے خود حیرہ کا نائب (گورنر) بننے کے لیے شاہانِ مناذرہ کی مخالفت کی تھی۔ اس بنا پر مُنذِر نے قبائل عرب میں سے ایاد، بہراء اور تنوخ کو امرؤالقیس کے خلاف جمع کیا۔ کسریٰ نوشیرواں بن کیقباد نے بھی ایرانی سواروں کا ایک لشکر مُنذر کی مدد کے لیے بھیج دیا۔ امرؤالقیس میں اس کے مقابلے کی طاقت نہ تھی، اس لیے اُس کے ہمراہی مقابلے کی تاب نہ لا کر تتر بتر ہوگئے، پھر وہ یکے بعد دیگرے مختلف قبائل کی پناہ لیتا رہا۔ آخر کار سموأل بن عادیا (م:65 قبل ہجرت/تقریباً 560ء) کے ہاں جا اُترا اور اپنی بیٹی، زرہیں اور دیگر اَوزار اس کے پاس امانت رکھ کر درخواست کی کہ شام میں حارث بن ابی شمر غسانی کے نام خط تحریر کر دیا جائے کہ وہ اُسے قیصر تک پہنچا دے۔ یوں وہ قیصر کے پاس پہنچا اور اپنے دشمنوں کے خلاف مدد کی درخواست کی۔ قیصر نے اس کی مدد کے لیے ایک لشکر تیار کر دیا۔ لیکن ابھی امرؤالقیس اُس لشکر کو لے کر سلطنتِ روم سے روانہ نہیں ہوا تھا کہ قیصر کے دل میں کوئی خیال آ گیا، اُس نے لشکر کو واپس بلا لیا اور امرؤالقیس کے لیے زہر آلود پوشاک بھجوائی۔ امرؤالقیس نے اسے پہنا تو اس کے جسم پر آبلے نمودار ہوگئے اور اس مرض نے شدت اختیار کی جس سے وہ جانبر نہ ہو سکا اور انگورہ (موجودہ انقرہ) پہنچ کر مر گیا اور وہیں دفن ہوا۔

امرؤالقیس کے اشعار: امرؤالقیس جاہلیت کے شعراء میں سے مقدم اور افضل تسلیم کیا جاتا ہے اگرچہ ابوداود ایادی اور امرؤالقیس کے ماموں مُہَلہِل بن ربیعہ جیسے شعراء اس سے بھی پہلے گزرے تھے۔

امرؤالقیس پہلا شخص ہے جس نے اپنے ہمراہیوں کو کھنڈروں پر ٹھہرانے، دیارِ محبوب پر رونے اور عورتوں کو ہرنوں، نیل گایوں اور انڈوں سے تشبیہ دینے کے مضامین کو نہایت عمدگی سے ادا کیا ہے۔ پہلے اسی نے گھوڑے کے وصف میں قَیْدُ الْاَوَابِد کی صفت کو استعمال کیا، تشبیب [1] کو رقت آمیز بنایا اور عمدہ استعارات اور تشبیہات کو اس خوبی سے برتا کہ ظنِ غالب یہی ہے کہ وہ ان میں سے اکثر کا موجد ہے۔

اس کے اشعار میں تشبیب، عہد شباب کی آوارہ مزاجی، جورِ زمانہ کی شکایت اور بوقتِ مصیبت دوستوں کی بے رخی

[1] تشبیب: اس کا مطلب اپنے محبوب یا ممدوح کی تعریف و توصیف اور اس کی عظمت و شان کا اظہار ہے، جیسے قصیدۂ مدحیہ میں ہوتا ہے۔

کا تذکرہ غالب ہے مگر کبھی عورتوں سے متعلق تشبیہات اور ان کی نسبت بات چیت کرنے میں فحش باتیں بھی کہہ جاتا ہے۔ اس کے اشعار سے ذکاوت ونجابت ٹپکتی ہے اور حکومت وسرداری کے تأثرات بھی نظر آتے ہیں، وہ کہتا ہے:

فَظَلَّ الْعَذَارٰی یَرْتَمِینَ بِلَحْمِهَا　　وَشَحْمٍ كَهُدَّابِ الدِّمَقْسِ الْمُفَتَّلِ

''پس وہ کنواری لڑکیاں اس اونٹنی کے گوشت اور اس کی چربی کو جو مضبوط بٹے ہوئے ریشم کے پھندنوں کی طرح تھی، دل لگی کے طور پر ایک دوسری پر پھینکنے لگیں۔''

وَلَوْ أَنَّ مَا أَسْعٰى لِأَدْنٰى مَعِيشَةٍ　　كَفَانِي وَلَمْ أَطْلُبْ قَلِيلٌ مِّنَ الْمَالِ

وَلٰكِنَّمَا أَسْعٰى لِمَجْدٍ مُّؤَثَّلٍ　　وَقَدْ يُدْرِكُ الْمَجْدَ الْمُؤَثَّلَ أَمْثَالِي

''اگر میں معمولی گزر اوقات کے لیے کوشش کرتا تو تھوڑا سا مال بھی مجھے کفایت کر جاتا اور میں (کچھ اور) طلب نہ کرتا۔ لیکن میں تو پائدار بزرگی کے لیے کوشش کر رہا ہوں اور میرے جیسے (باہمت لوگ) پائدار بزرگی حاصل کر بھی لیا کرتے ہیں۔''

امرؤالقیس کے اشعار اگرچہ عبارت کی درشتی، الفاظ کی خشونت اور معانی کی نازیبائی کے لحاظ سے بدویانہ لباس میں ملبوس ہیں مگر بعض دفعہ تمہید کی خوبی، معنی آفرینی، رقت، تغزل، قریب الفہم ہونے اور سہولتِ ماخذ کے اعتبار سے وہ ایسی پوشاک میں جلوہ گر ہوتے ہیں کہ بعد میں آنے والوں کے لیے بہترین نمونہ ہیں۔ وہ اپنی محبوبہ کے وصف میں کہتا ہے:

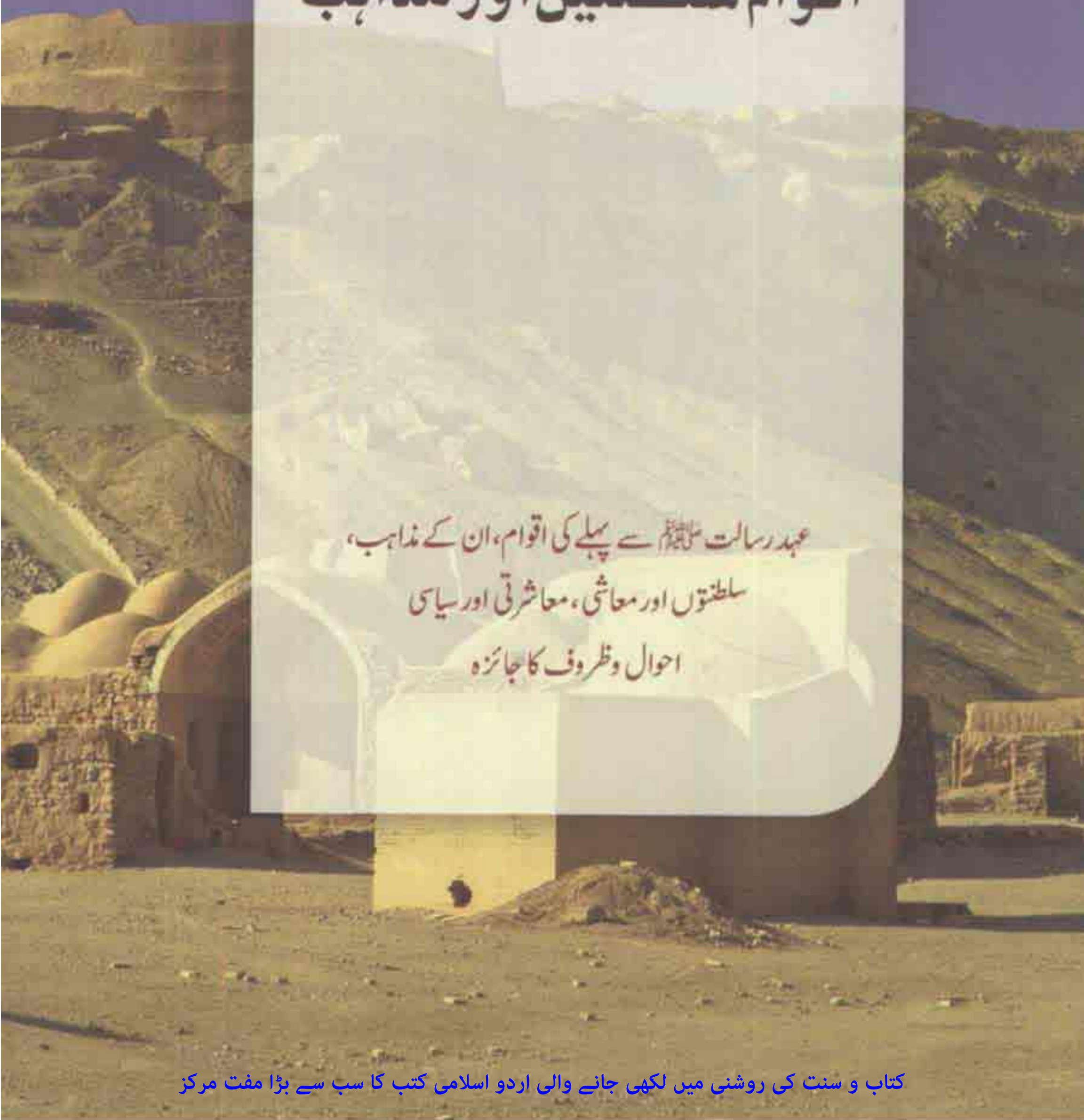
وَإِذْ هِيَ تَمْشِي كَمَشْيِ النَّزِيفِ　　يَصْرَعُهُ　　بِالْكَثِيبِ　　الْبُهُرْ

بَرَهْرَهَةٌ　　رُخْصَةٌ　　رُودَةٌ　　كَخُرْعُوبَةِ　　الْبَانَةِ　　الْمُنْفَطِرِ

''اور جب وہ ایسے شخص کی طرح چل رہی تھی جو زیادہ خون نکلنے سے کمزور ہو گیا ہو، اور سانس پھولنے کی وجہ سے ریت کے ٹیلے پر گرتا پڑتا چلے۔ وہ ملائم جسم والی، نوجوان اور نازک اندام ہے اور درخت بید کی اس ٹہنی کی طرح ہے جو نئی پھوٹی ہو۔''[1]

[1] تاریخ ادب عربی (اردو)، ص: 14-17 و 21 و 42 64-67 و 130-137 مزید دیکھیے: الشعر والشعراء لابن قتيبة، ص: 23-37.

باب 6



عرب کی ہمسایہ اقوام سلطنتیں اور مذاہب

عہد رسالت ﷺ سے پہلے کی اقوام، ان کے مذاہب،
سلطنتوں اور معاشی، معاشرتی اور سیاسی
احوال وظروف کا جائزہ

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ

الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ

الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ

فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ

”وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں
جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔“ (الأعراف 7:157)

اس باب میں

محمد رسول اللہ ﷺ تاریخ انسانی کی وہ عظیم ترین ہستی ہیں جن کے ذریعے سے دنیا میں سب سے بڑی، دور رس، مثبت اور نتیجہ خیز تبدیلی رونما ہوئی۔ آپ ﷺ کی سیرت اور آپ کے مشن کے باقاعدہ مطالعے سے قبل ضروری ہے کہ آپ کے زمانۂ بعثت اور اس سے پہلے کے عالمی حالات پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالی جائے۔ اس کے بغیر تاریخ کے اس اہم ترین دور کے مختلف پہلوؤں کو درست طور پر سمجھنا اور انسانی تہذیب وتمدن کی اس انقلاب آفرین اور بے مثال تبدیلی کا درست ادراک کرنا ممکن نہیں کیونکہ یہ حیات آفریں انقلاب ہے جو عالمگیر تبدیلی کا پیام لے کر آیا اور اِس کی جلوہ گری نے دیکھتے ہی دیکھتے تمام عالم کو خیرہ کردیا۔

اس مقصد کے پیش نظر ہم زیر نظر باب میں اُس دور کی متمدن اقوام، ان کے مذاہب، ان کی سلطنتوں، ان کے معاشرتی و معاشی اور سیاسی حالات کا جائزہ لیں گے تاکہ انقلابِ نبوی کی ضرورت، اہمیت اور ہمہ گیری کا اندازہ کرنے میں آسانی رہے۔

1

سلطنت ایران

آریہ، ایران میں

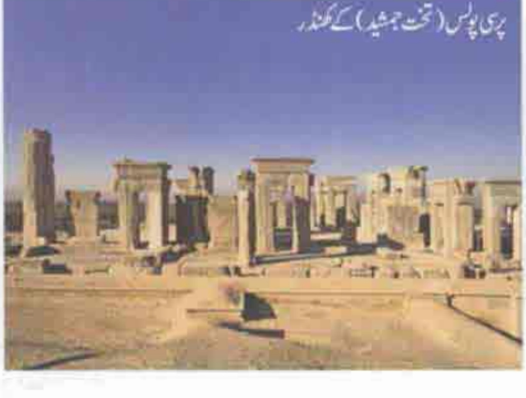
قدیم دنیا کے لوگ دو بڑی نسلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک سامی النسل باشندے تھے جو دجلہ و فرات کی وادی میں بس گئے تھے۔ دوسرے آریائی نسل کے لوگ جن کا سب سے پہلا معلوم مرکز وسط ایشیا تھا۔ وہ تقریباً 5000 ق م میں خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے اور ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتے رہتے تھے، چنانچہ آریائی نسل کے کچھ قبائل بحیرۂ کیپین (قزوین) کے اردگرد بس گئے تھے۔ 2000 ق م کے لگ بھگ یہ دو بڑے گروہوں میں بٹ گئے۔ آریوں کے ایک گروہ نے جنوب اور جنوب مشرق کی طرف ہجرت کی اور اُن ملکوں میں آباد ہوا جو بعد میں ایران اور ہندوستان کہلائے۔ دوسرا گروہ مغرب کی طرف کوچ کر گیا جو یونان، جرمنی اور اٹلی وغیرہ میں آباد ہوا۔ اول الذکر گروہ کے بعض قبائل اُن پہاڑوں اور وادیوں میں آباد ہوئے جو دجلہ و فرات کے مشرق میں تھیں۔ ان کے ملک کا نام ان کے نام کی مناسبت سے ایران رکھا گیا۔[1]

ایران آنے والی آریائی نسل کی جو شاخ مغربی ایران کے سلسلۂ کوہ زاغروس کے وسطی علاقے میڈیا (مادہ) میں آباد ہوئی، وہ لوگ ''ماذ'' (Medes) کہلائے۔ دوسری شاخ کے لوگ صوبہ خراسان سے ہوتے ہوئے جنوبی ایران

[1] قدیم تہذیبیں اور مذاہب، ص: 104.



اکبتانا (ہمدان) کے آثار



پرسی پولس (تخت جمشید) کے کھنڈر

(پارس یا فارس) آئے اور پارسی کہلائے۔ [1]

پارس، فارس اور ایران شہر

ایران کے جنوب مغرب میں ایک ولایت پرسس (Persis) تھی جو اسی نام کے ایک قبیلے سے موسوم تھی۔ مشہور رومی ادیب پلاؤٹس (Plaoutus) نے اپنی ایک تحریر میں 'پرشیا' کا نام استعمال کیا ہے۔ ایران کے لیے استعمال ہونے والا لفظ پارس یا پرشیا یونانی رومی لقب پرسی (Persae) سے مشتق ہے جو قدیم ایران میں ہخامنشی خانوادے کے بادشاہوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

یہ عہدِ قدیم کا پرسس (Persis) یا پارس موجودہ زمانے کا فارس یا ایران ہے۔ لفظ فارِس یا فارُس کا اطلاق مسلمانوں کے زمانے میں اسی خطّے پر ہوتا تھا۔ اسی طرح اَلفُرس کا لفظ جو قدیم عربی ادبیات میں ملتا ہے، ایران کی پوری آبادی کے لیے بولا جاتا تھا۔ یہ لفظ اکثر عربی اصطلاح العجم کے مترادف شمار ہوتا ہے۔

ایران جو آریانہ یا اریانہ (Aryana) سے مشتق ہے، کبھی جنوبی ایران کے لیے، کبھی پورے ایران کے لیے اور ساسانیوں کے زمانے میں ان کی سلطنت کے مرکزی حصے کے لیے استعمال ہوا۔ وہ اپنے آپ کو 'شاہانِ ایران و انیران' کہا کرتے تھے۔ [2]

یاقوت حموی ''ایران شہر'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں: ''بلادِ عراق، فارس، جبال اور خراسان کو مجموعی طور پر ''ایران شہر'' (ملک ایران) کہا جاتا ہے جبکہ اصمعی کے بقول ارضِ عراق ''دلِ ایران شہر'' کہلاتی تھی۔ ان کے خیال کے مطابق عرب اس کے درمیانی لفظ ''ایران'' کو معرب کر کے ''عراق'' کہنے لگے۔ دوسری طرف عہد اسلامی کے اہلِ فارس کا دعویٰ یہ تھا کہ ''ایران'' ارفخشد بن سام بن نوح (علیہ السلام) کا نام تھا، گویا ان کے خیال کے مطابق ''ایران شہر'' کے معنی ہیں ''بلادِ ارفخشد۔'' [3]

اساطیری روایات یہ کہتی ہیں کہ کیومرث کے بیٹے ہوشنگ نے اپنے ملک کا نام 'ایران' رکھا تھا۔ جب اُس کا بیٹا پارس تخت نشین ہوا تو اس کا ملک بھی 'ملکِ پارس' کہلانے لگا۔ عہدِ اسلامی میں شاہنامۂ فردوسی کے ذریعے سے جب قدیم اساطیری روایات دوبارہ لوگوں کے سامنے پیش ہوئیں تو ایران کا نام پھر سے مقبول ہو گیا۔ انشائے ابوالفضل بن ملا مبارک دفتر اوّل میں ''شاہ عباس صفوی (1587ء-1629ء) تخت نشین کشورِ ایران'' کے الفاظ ملتے ہیں، تاہم عرب مؤرخین نے اس کے بعد تک سلطنتِ ایران کو 'مملکتِ فارس' ہی کے نام سے یاد کیا۔ 1935ء

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 635/3. [2] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 627/3. [3] معجم البلدان، مادة: إيران



پہلوی دور کا سکہ

میں سرکاری طور پر موجودہ ملکِ ایران کا نام ایران قرار پایا اور اب یہ عربی سمیت ہر زبان میں ایران کہلاتا ہے۔[1]

سلطنتِ ایران کی وسعت

قدیم ایران کے بادشاہ پارس ابنِ ہوشنگ کے زمانے میں ایرانی سلطنت موجودہ بلوچستان، کیچ، مکران، کرمان، غور، بامیان، کابلستان، سیستان، زابلستان (افغانستان)، خراسان، ماوراءالنہر، رشت، اصفہان، مازندران، استرآباد، گرگان (جرجان)، فارس، لارستان، خوزستان، پنجاب، کردستان، شیروان (آذربائیجان)، بابل، موصل (عراق) اور دیارِ بکر (ترکی) کے علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔[2]

جمشید و افراسیاب اور رستم و سہراب

ایران کی تاریخ کے اساطیری دور کا ایک اہم نام جمشید یا ''جم'' ہے۔ اس کی حکومت کا خاتمہ ضحاک کے ہاتھوں ہوا، پھر آلِ جمشید میں سے فریدون نے کاوہ لوہار کی مدد سے ظالم بادشاہ ضحاک کو شکست دی اور ایران کا اقتدار سنبھالا۔ بعد ازاں سلطنتِ ایران دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔ دریائے جیحون کے کنارے تک منوچہر کی حکومت قائم ہوئی اور جیحون کے پار (ماوراءالنہر) کا علاقہ افراسیاب کو ملا جو توران (ترکستان) کہلایا۔ امکانی طور پر یہ زمانہ 2500 ق م سے 2200 ق م تک محیط تھا۔ بعد میں ایرانی سلطنت گھٹتے گھٹتے مرکزی حصے صوبۂ فارس تک محدود ہوگئی۔ اس کے بعد کیانی بادشاہوں کیقباد، کیکاؤس، کیخسرو، لہراسپ، گشتاسپ اور اسفندیار کا دور آیا۔ زال بن سام کا بیٹا رستم، کیکاؤس کے عہد کا مشہور پہلوان تھا۔ رستم کا بیٹا سہراب دربارِ توران سے وابستہ تھا۔ وہ نادانستگی میں ایران توران جنگ کے دوران میں اپنے باپ کے ہاتھوں مارا گیا۔[3]

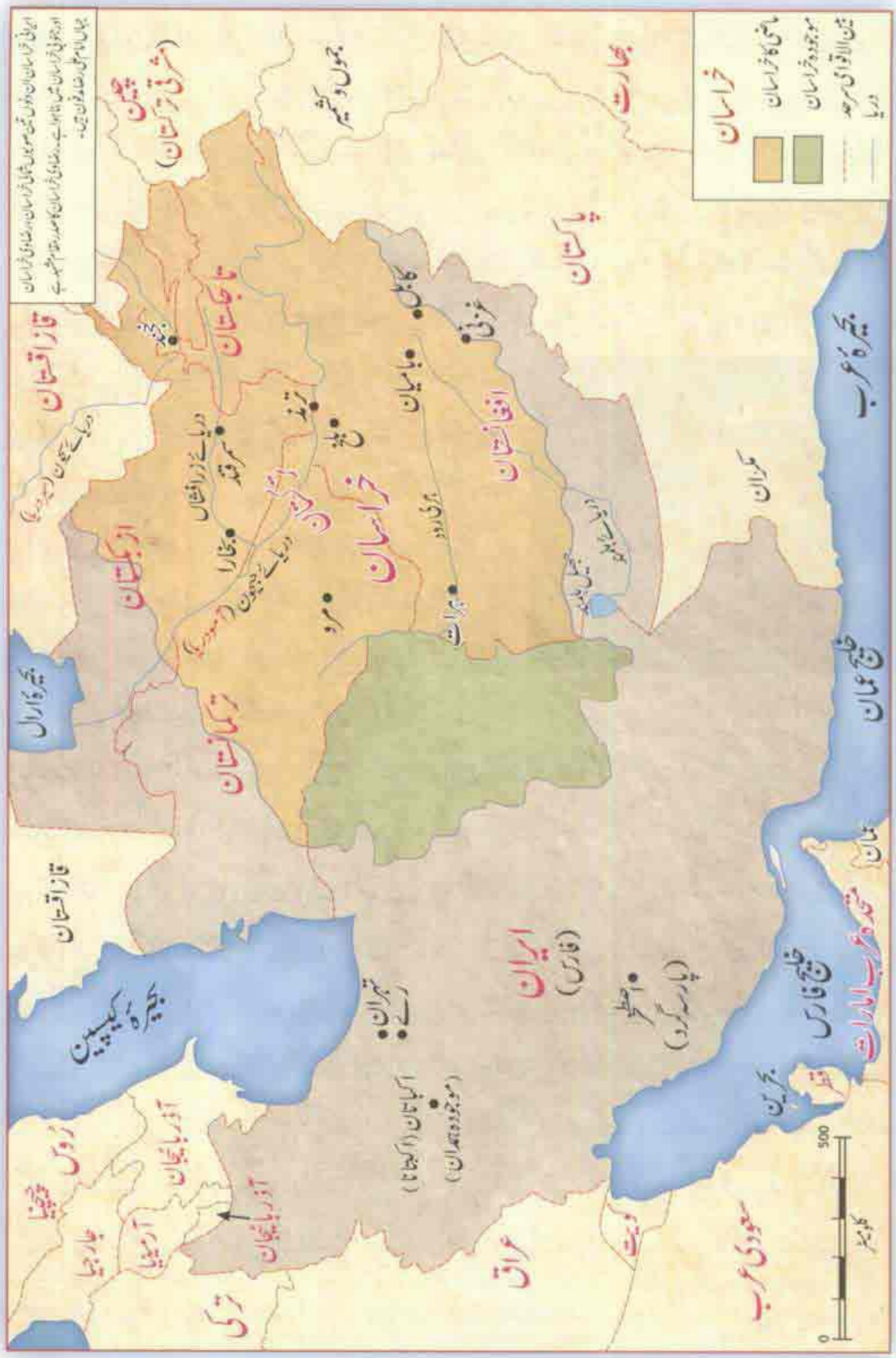


نقش رستم (اصطخر، ایران)

کورش کبیر (سائرس اعظم) یا ذوالقرنین

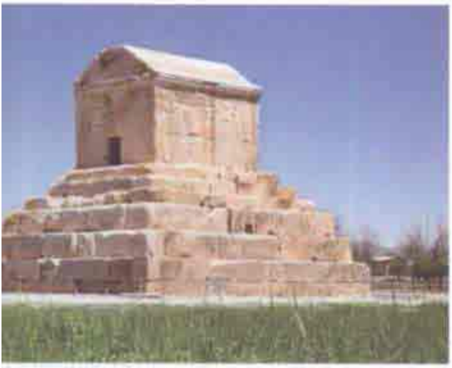
گورش یا کورش پارس کے ہخامنشی (Achaemenid) خاندان کا ایک نوجوان تھا جسے یونانیوں نے سائرس (Cyrus)،

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 628,627/3. [2] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 627/3. [3] حسن اللغات (فارسی)، مادہ: رستم اور سہراب.


خراسان
ماضی کا خراسان
موجودہ خراسان
بین الاقوامی سرحد
دریا
چین (مشرقی ترکستان)
جموں و کشمیر
بھارت
پاکستان
بحیرۂ عرب
خلیج عمان
خلیج فارس
متحدہ عرب امارات
عمان
قطر
بحرین
کویت
سعودی عرب
عراق
ترکی
جارجیا
آرمینیا
آذربائیجان
روس
بحیرۂ کیسپین
بحیرۂ ارال
قازقستان
ازبکستان
تاجکستان
ترکمانستان
افغانستان
ایران (فارس)
تہران
کابل
غزنی
بامیان
ہرات
مرو
بخارا
سمرقند
بلخ
ترمذ

عبرانیوں نے خورس یا کورش اور عربوں نے قوروش (قورش) کے نام سے پکارا۔ قدیم فارسی میں اسے خرس کہا گیا جبکہ جدید فارسی میں کورش کبیر یا کوروش بزرگ لکھا جاتا ہے۔[1]

549 ق م میں فارس کے بادشاہ کورش نے ایران کے شمال مغربی علاقے میڈیا (مادہ) کو فتح کیا اور پورے ایران پر اپنی حکومت قائم کر لی اور ہخامنشی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ سائرس نے 546 ق م میں لیڈیا (ایشیائے کوچک) پر قبضہ کرلیا اور 539 ق م میں اُس کی فوجیں عراق (کالڈیا Chaldea یا کلدانیہ) کے شہر بابل میں فاتحانہ داخل ہوئیں۔ اس کے بعد طلوع اسلام تک عراق سلطنتِ ایران میں شامل رہا۔ عہد حاضر کے مشہور مفسرین مولانا ابوالکلام آزاد اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک سائرس ہی وہ موحّد بادشاہ ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں ذوالقرنین کے نام سے آیا ہے۔ ایرانی آج کل اسے کوروش کبیر لکھتے ہیں۔ کوروش کبیر یا سائرس اعظم نے ان یہودیوں کو فلسطین واپسی کی اجازت دی جنھیں 586 ق م میں بخت نصر ہانک کر عراق لے آیا تھا۔ سائرس کے بعد اُس کے فرزند کمبوجیہ (Cambyses) (529 تا 521 ق م) نے مصر پر فوج کشی کی اور اُسے ایرانی سلطنت میں شامل کرلیا۔



مقبرہ سائرس اعظم (ذوالقرنین)

مولانا ابوالکلام آزاد ''ذوالقرنین'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں: چونکہ فتوحات کی وسعت اور مغرب و مشرق کی حکمرانی کے لحاظ سے سکندر مقدونی کی شخصیت سب سے زیادہ مشہور رہی ہے، اس لیے سورۂ کہف میں مذکور ذوالقرنین کے باب میں متاخرین کی نظریں اس کی طرف اُٹھ گئیں، چنانچہ امام رازی رحمہ اللہ نے بھی سکندر ہی کو ذوالقرنین قرار دیا ہے، حالانکہ کسی اعتبار سے بھی قرآن کا ذوالقرنین سکندر مقدونی نہیں ہوسکتا۔ نہ تو وہ خدا پرست تھا، نہ عادل تھا، نہ مفتوح قوموں کے لیے فیاض تھا اور نہ اس نے کوئی سد (دیوار) بنائی۔ اس کے برعکس صحابہ و سلف سے ﴿قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ﴾ کی تفسیر منقول ہے کہ ذوالقرنین نبی تھا اور متاخرین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ بھی اس تفسیر کی تائید کرتے ہیں۔ جہاں تک کورش یا سائرس کا تعلق ہے، وہ مذہب زردشت کا حکمران، پیغمبر اور ہخامنشی خانوادے کا پہلا تاجدار تھا۔ یونانی مؤرخ زینوفن کے الفاظ میں ''وہ صرف بادشاہ ہی نہ تھا بلکہ انسانوں کا شفیق، مربی اور قوموں کا رحیم باپ بھی تھا۔'' اس نے آشوری اور بابلی بادشاہوں کے تمام مظالم کے اثرات یک قلم

[1] اصحاب کہف اور یاجوج و ماجوج از ابوالکلام آزاد، ص:32، صحیفہ دانیال 1:21، دائرۃ المعارف جوان (فارسی)، ص:369,368.

محو کر دیے۔ اس کے متعلق یسعیاہ علیہ السلام کی کتاب میں ہے کہ خداوند کہتا ہے: ''خورس میرا چرواہا ہے۔'' اور ''وہ میرا مسیح ہے۔'' یرمیاہ علیہ السلام نے پیش گوئی کی تھی کہ وہ بنی اسرائیل کو بابلیوں کے ظلم سے نجات دلائے گا۔

جہاں تک لقب ''ذوالقرنین'' کا تعلق ہے، اصطخر کے کھنڈروں سے سائرس کی جو سنگی تمثال (پتھر کی مورتی) برآمد ہوئی ہے، اس کے دونوں طرف عقاب کی طرح پر نکلے ہوئے ہیں اور سر پر مینڈھے کی طرح دو سینگ ہیں جبکہ دانیال علیہ السلام کے خواب میں بھی دو سینگوں والے مینڈھے کی شکل دکھائی گئی تھی اور اس کی تعبیر جبریل علیہ السلام نے یہ کی تھی کہ دو سینگوں والا مینڈھا مادہ (میڈیا) اور فارس کی بادشاہت ہے جبکہ ''ذوالقرنین'' کے معنی بھی ''دو سینگوں والا'' ہیں۔

قرآنی تصریح کے مطابق ذوالقرنین اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین رکھتا تھا، احکام الٰہی کے مطابق عمل کرتا اور اپنی تمام کامرانیوں کو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم سمجھتا تھا۔ سائرس کا بھی ایسا ہی اعتقاد و عمل تھا۔ قرآن میں مذکورہ ذوالقرنین کی مشرقی اور مغربی مہمات کی طرح سائرس نے بھی مشرقی اور مغربی مہمات سر کیں اور اس کی نسبت ہیروڈوٹس اور زینوفن کی شہادت موجود ہے کہ اس نے منگول نسل کی سیتھین قوم (یاجوج و ماجوج) کے سرحدی حملوں کی روک تھام کی، مگر سکندر کی نسبت کوئی ایسی شہادت موجود نہیں۔ اس سے یہ تاریخی قرینہ پیدا ہوتا ہے کہ سدِّ یاجوج و ماجوج سائرس ہی نے تعمیر کی تھی۔ علاوہ ازیں کاکیشیا (قفقاز) میں ایک دریا کا نام قدیم سے کورش (موجودہ کور Kur) چلا آتا ہے جسے رومی نوشتوں میں سائرس کے نام سے پکارا گیا ہے۔ انھونی جنکنسن (1557ء) سمیت یورپی سیاحوں نے بھی اس دریا کو ''سائرس'' ہی لکھا ہے جبکہ ارمنی نوشتوں میں اس سدّ کا نام پھاک کورائی (کور کا دروازہ) آیا ہے۔ ظاہر ہے ''کور'' دراصل گورش کی بدلی شکل ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کا ذوالقرنین اور گورش (خورس) یا سائرس دراصل ایک ہی شخصیت ہے۔[1]

ہخامنشیوں کا اندازِ حکومت

ذوالقرنین تو موحد اور عادل تھا مگر اس کے جانشینوں میں وہ کردار عنقا تھا۔ ایران کے ان نامور بادشاہوں کے زمانے میں حکومت کرنے کا طریقہ کیسا تھا، اس کا اندازہ ان واقعات سے ہوسکتا ہے جنھیں قدیم مؤرخین نے بطور خاص ذکر کرنا مناسب خیال کیا۔

کمبوجیہ کی دل پر تیراندازی

یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس نے ہخامنشی بادشاہ کمبوجیہ کے متعلق ایک عجیب واقعہ لکھا ہے:

[1] ملخص از اصحاب کہف اور یاجوج و ماجوج.

''کمبوجیہ نے ایک روز اپنے ایک درباری پراکساپس سے پوچھا کہ ایرانی رعایا کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اس نے جواب دیا: سب لوگ جہاں پناہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، البتہ یہ کہتے ہیں کہ جہاں پناہ شراب بہت پیتے ہیں۔ اس پر کمبوجیہ آگ بگولا ہو کر بولا: دیکھو، تمھارا بیٹا سامنے کھڑا ہے۔ اگر میں ایسا تیر ماروں جو اس کے دل میں ترازو ہو جائے تو ایرانیوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہوگا اور اگر میرا نشانہ چوک گیا، تب وہ ٹھیک کہتے ہیں کہ شراب نے میرے حواس مختل کر دیے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے ایک تیر چلّے میں رکھا اور نشانے پر پھینکا۔ پراکساپس کا جوان بیٹا وہیں ڈھیر ہو گیا۔

کمبوجیہ نے حکم دیا کہ اس کا سینہ چاک کیا جائے۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی اور زخم کو جانچا گیا تو معلوم ہوا کہ تیر مقتول کے عین دل میں پیوست تھا۔ یہ دیکھ کر کمبوجیہ باغ باغ ہو گیا اور پراکساپس سے بولا: ''یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایرانیوں کے اپنے حواس بجا نہیں۔'' خوفزدہ پراکساپس نے سنجیدگی سے کہا: ''ایسا بے خطا نشانہ صرف جہاں پناہ کا ہو سکتا ہے۔'' [1]

دارا اول یونان میں



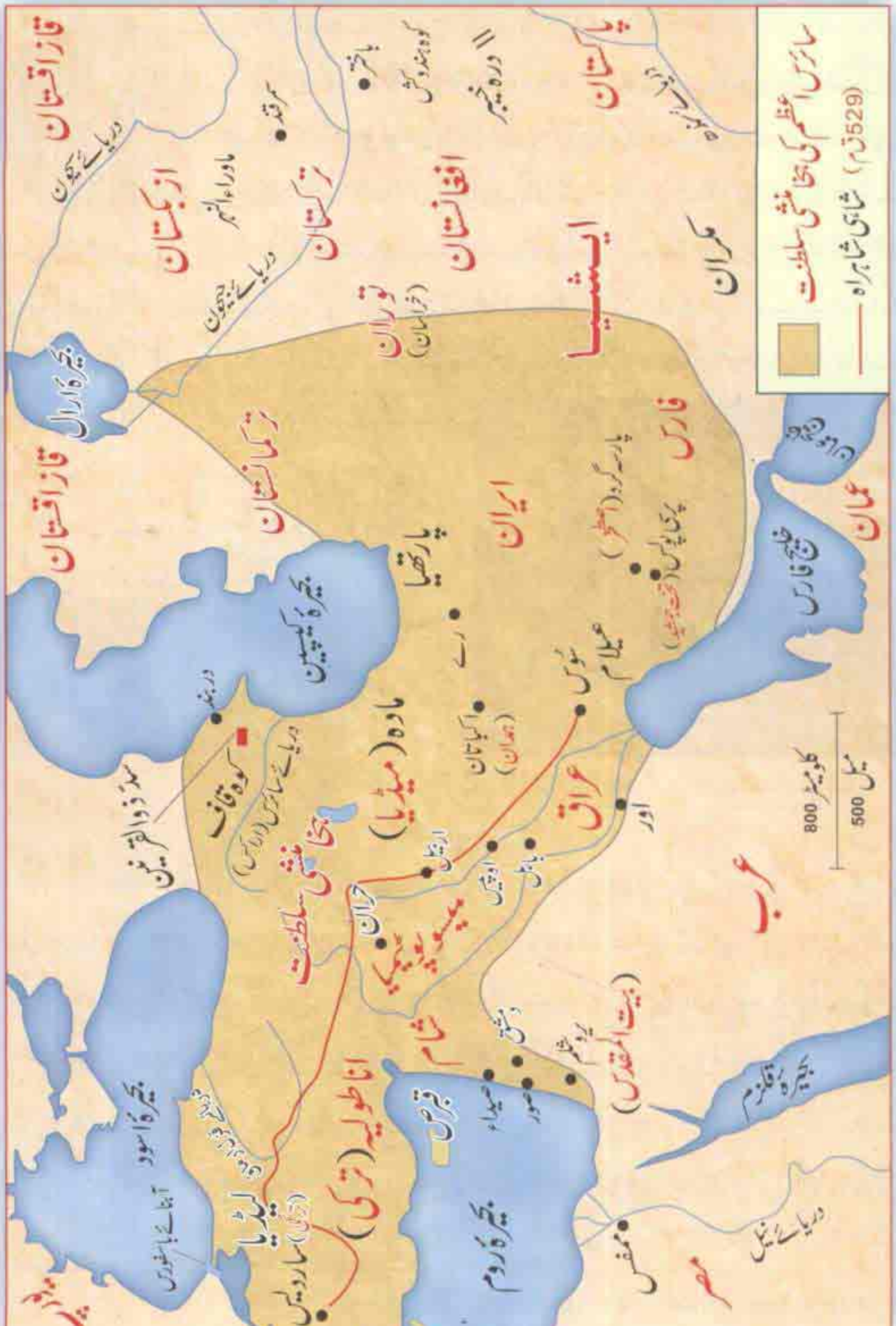
دارا اول کا سکہ

کمبوجیہ کے جانشین داریوش یا دارا اول (Darius I) نے گندھارا (شمالی پنجاب اور سرحد)، سندھ، تھریس، مقدونیہ اور یونان فتح کیے، تاہم کچھ عرصہ بعد جنگ میراتھون (490 ق م) میں یونانیوں سے شکست کھائی۔ داریوش اول کا ایک کارنامہ یہ تھا کہ اس نے دریائے نیل سے بحیرۂ احمر تک ایک نہر کھدوائی۔ یوں بحیرۂ روم سے دریائے نیل کے راستے خلیج فارس تک کشتیاں چلنے لگیں۔ [2] اس کے بعد خشیارشاہ (Xerxes)، اردشیر (Artaxerxes) دراز دست، داریوش دوم، اردشیر دوم، اردشیر سوم اور داریوش سوم حکمران رہے۔

کشتیوں کا عذاب

شاہانِ ایران اپنی توہین و تضحیک پر موت کی سزا دیتے تھے۔ بعض سزائیں نہایت وحشیانہ تھیں، جیسے مجرموں کو دیوار میں زندہ گاڑنا، زندہ کھال کھنچوانا، چومیخہ کرنا وغیرہ۔ ان میں سے کشتیوں کا عذاب سب سے خوفناک تھا۔ اردشیر سوم ہخامنشی کے چھوٹے بھائی کوروش نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ دونوں کی فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ کوروش لڑتا ہوا بادشاہ کے پاس پہنچ گیا اور اس پر حملہ کر دیا لیکن ایک سپاہی مہرداد کے ہاتھوں مارا گیا۔ بادشاہ نے اعلان کیا

[1] روایاتِ تمدنِ قدیم، ص: 178,177۔ [2] دائرۃ المعارف جوان (فارسی)، ص: 371۔


سائرس اعظم کی ہخامنشی سلطنت
شاہی شاہراہ (529ق م)
قازاقستان
ازبکستان
ترکمانستان
افغانستان
پاکستان
ایشیا
ایران
فارس
پارتھیا
تورانان
عمان
عراق
عرب
شام
مصر
عمران
بحیرۂ ارال
بحیرۂ کیسپین
بحیرۂ اسود
بحیرۂ روم
بحیرۂ قلزم
خلیج فارس
قبرص
کوہ قاف
ماوراء النہر
دریائے جیحون
دریائے نیل
سد ذوالقرنین
انا طولیہ (ترکی)
بیت المقدس
سوس
عیلام
اور
800 کلومیٹر
500 میل

کہ اُس نے اپنے ہاتھ سے باغی کو قتل کیا ہے۔

ایک دن مہرداد شراب کے نشے میں بکارنے لگا کہ بادشاہ خواہ مخواہ جوانمرد بنا پھرتا ہے، کوروش کو میں نے قتل کیا تھا۔ اردشیر کو خبر ملی تو اس نے غضبناک ہو کر حکم دیا کہ اس گستاخی پر مہرداد کو کشتیوں کا عذاب دیا جائے، چنانچہ دو کشتیاں اس طرح بنوائی گئیں کہ ایک دوسری پر ٹھیک جفت ہوتی تھی۔ ایک کشتی میں مہرداد کو لٹا کر دوسری اس پر مضبوطی سے جڑ دی گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور منہ کشتی سے باہر رہے۔ پھر اسے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلایا گیا اور ساتھ ہی مسہل بھی دیا گیا۔ اس کے چہرے پر شہد مل دیا گیا جس سے کیڑے مکوڑے اور مکھیاں ہجوم کر آئیں اور اس کے لب و رخسار کو کاٹنے لگیں۔ ادھر مسہل نے اپنا کام کیا تو نچلی کشتی غلاظت سے بھر گئی۔ دن گزرنے کے ساتھ اس میں کرم (کیڑے) پیدا ہو گئے جو مہرداد کی انتڑیوں، دل اور جگر کو چاٹنے لگے۔ وہ بدنصیب سترہ دن اس عذاب میں تڑپتا رہا اور مرگیا۔ [1]


ہخامنشی دارالحکومت تخت جمشید کے کھنڈر

ہخامنشیوں کے دور میں سلطنتِ فارس کا دارالحکومت پرسی پولس (تختِ جمشید) تھا جس کے کھنڈر شیراز کے قریب شمال مشرق میں واقع ہیں۔ اس کے بعد سوس یا شوش (Susa) دارالحکومت بنا۔ ہخامنشی سلطنت اپنے عہد عروج میں 21 صوبوں اور 46 اقوام پر مشتمل تھی۔

ہخامنشی سلطنت کا انجام

داریوش (دارا) سوم آخری ہخامنشی بادشاہ ثابت ہوا۔ اس نے 330 ق م میں یونانی فاتح سکندر اعظم سے شکست کھائی اور مارا گیا۔ سکندر کے بعد ایران اس کے جرنیل سلیوکس (Seleucus) کے تسلط میں آیا۔ وہاں 185 ق م تک سلیوکی (Seleucid) حکومت قائم رہی۔ [2] سلیوکیوں سے حکومت پارتھیوں (اشکانیوں) کے ہاتھ آئی۔ پارتھی سلطنت اپنے عہد عروج میں دریائے سندھ سے دریائے فرات تک پھیلی ہوئی تھی۔ [3]

ایران عہدِ ساسانیاں میں

226ء میں اردشیر بابکان نے اشکانی بادشاہ اردوان کو شکست دے کر ساسانی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اردشیر

[1] روایات تمدن قدیم، ص: 159,158. [2] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 636,635/3.
[3] Oxford English Reference Dictionary.



سکہ شاپور اول

بابکان کے دادا کا نام ساسان تھا اور وہ خود کو ہخامنشی خانوادے سے منسوب کرتا تھا۔ اردشیر کے بیٹے شاپور اول نے 258ء میں ایشیائے کوچک پر چڑھائی کر کے انطاکیہ فتح کیا اور رومی قیصر ولیرین کو ہزاروں یونانیوں سمیت گرفتار کرلیا۔ کیا عبرت انگیز تماشا تھا کہ شاپور ہر بار اپنے گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے قیدی بادشاہ ولیرین کی گردن پر قدم رکھتا تھا۔ ولیرین کی موت پر شاپور نے اس کی کھال کھنچوا کر اس میں بھس بھروایا اور اسے ایران کے سب سے بڑے آتش کدہ میں بطور یادگار رکھوا دیا۔[1] شاپور اول کے بعد ہرمز اول، بہرام اول، بہرام دوم، بہرام سوم، نرسی، ہرمز دوم اور آذر نرسی برسرِ اقتدار رہے۔[2]

شاہانِ ساسانیہ کے اُلوہی دعوے

ساسانی تاجدار اپنے آپ کو پیکرِ الوہیت سمجھتے تھے۔ حاجی آباد کے پہلوی کتبے میں شاپور (اول) ساسانی کے القاب یوں درج ہیں:



حاجی آباد کا پہلوی کتبہ

''پرستارِ ارمزد، پیکرِ الوہیت شاپور شہنشاہ ایران و ماورائے ایران ازنسل آفریدگار، پسر پرستارِ ارمزد، پیکرِ الوہیت ارتخشتر شہنشاہ ایران ازنسل آفریدگار، نبیرۂ پیکرِ الوہیت شاہ بابک۔''[3]

شاہ بابک سے مراد اردشیر بابکان (ارتخشتر) کا باپ بابک ہے جس کا نبیرہ (پوتا) شاپور تھا، اور ''ارمزد'' دراصل ''اہورمزدا'' یعنی خدائے واحد ہے۔ شاپور نے خود کو اور اپنے باپ دادا کو ''پیکرِ اُلوہیت'' اور ''اہورمزدا کے پرستار'' لکھوایا۔

ہرمز دوم کے بیٹے شاپور ثانی (309ء تا 379ء) نے، جو شاپور اعظم کہلاتا تھا، رومیوں سے دوسری جنگ میں دجلہ پار کے وہ تمام صوبے واپس لے لیے جو نرسی کے عہد میں چھن گئے تھے۔ اس نے آرمینیا بھی فتح کرلیا۔ اس کے بعد اردشیر دوم، شاپور سوم، بہرام چہارم اور یزدگرد اول نے حکمرانی کی۔ گورخر (جنگلی گدھا) کے شکار کا شوقین بہرام گور یا بہرام پنجم (420ء تا 440ء) یزدگرد اول کا بیٹا تھا۔ وہ رومیوں سے شکست کھا کر صلح پر مجبور ہوا، تاہم اس نے ماوراء النہر سے حملہ آور قوم سفید ہنوں کو شکست دے کر پیچھے ہٹا دیا۔ پھر یزدگرد دوم، ہرمز سوم، فیروز، بلاش اور قباد

[1] دائرۃ المعارف جوان، ص: 377,376، غلبۂ روم، ص: 30. [2] دائرۃ المعارف جوان، ص: 377. [3] غلبۂ روم، ص: 170.

یکے بعد دیگرے بادشاہ بنے۔ [1] شاہ قباد (487ء تا 531ء) کے عہد میں مزدک کا ظہور ہوا اور 523ء میں مزدکیوں کا قتلِ عام کیا گیا۔

نوشیرواں عادل کا ''عدل''



سکہ نوشیرواں عادل

قباد کے بیٹے خسرو اول یا نوشیرواں عادل (531ء تا 579ء) کا وزیر بزرگ مہر (عربی میں ''بزرجمہر'') بہت اچھا منتظم تھا۔ نوشیرواں کے عہد میں نبی ﷺ کی ولادت ہوئی۔ رومی قیصر جسٹینین کے زمانے میں ایرانیوں سے تین جنگیں ہوئیں۔ نوشیرواں نے سارا شام پامال کر ڈالا اور جسٹینین کے جانشین جسٹن ثانی (565ء-573ء) نے تاوان دے کر صلح کی۔ جندی شاپور (جندی سابور) کا دار العلم نوشیرواں ہی کے عہد کی یادگار تھا۔ [2]

نوشیرواں کا ''عدل'' دنیا میں بہت مشہور ہے، تاہم یہ سارا عدل رعایا کے درمیان ہوتا تھا۔ جب معاملہ بادشاہ اور رعایا کے درمیان ہوتا تو اس عدل کی شکل مختلف ہوتی۔ بعض اوقات وہ رعایا کے اہم افراد اور اہلِ علم کو بلاوجہ قتل کروا دیتا۔ [3]

اس سلسلے میں ایک دلچسپ حکایت بیان کی جاتی ہے: ''بادشاہ نے ایک مجلس مشاورت منعقد کی اور دبیرِ خراج کو حکم دیا کہ لگان کی نئی شرحیں بآوازِ بلند پڑھ کر سنائے۔ جب وہ پڑھ چکا تو خسرو نے تین بار حاضرین سے پوچھا کہ کسی کو اعتراض تو نہیں۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور تعظیم کے ساتھ پوچھنے لگا کہ آیا بادشاہ کا منشا یہ ہے کہ ناپائیدار چیزوں پر دائمی ٹیکس لگائے جو مرورِ ایام سے ناانصافی پر منتج ہوگا۔ اس پر بادشاہ نے گرج کر کہا: اے مردِ ملعون! تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا: میں دبیر (منشی) ہوں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے قلمدانوں سے پیٹ پیٹ کر مار ڈالو۔ اس پر ہر دبیر نے اپنے قلمدان سے اسے مارنا شروع کیا حتی کہ وہ بیچارہ مرگیا۔ اس کے بعد سب نے کہا: عالی جاہ! جتنے ٹیکس آپ نے ہم پر لگائے ہیں، وہ ہمارے نزدیک سب انصاف پر مبنی ہیں۔'' [4]

ہرمز چہارم کے مظالم اور بہرام چوبیں

نوشیرواں کے جانشین ہرمز چہارم کے عہد میں رعایا کے درمیان ہونے والا عدلِ نوشیروانی خواب و خیال ہوگیا۔

---

[1] دائرۃ المعارف جوان، ص: 377. [2] المنجد في الأعلام، ص: 159، انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم: 130/2، غلبۂ روم، ص: 93.
[3] تاریخ ابن خلدون: 205/2. [4] نبی رحمت ﷺ، ص: 65.


سکہ ہرمز چہارم

بادشاہ ظلم پر اُتر آیا۔ شکایت کرنے والوں کو باغی قرار دے کر اُن کی گردنیں اڑا دی جاتیں، چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں 13 ہزار ناکردہ گناہوں کی گردنیں تیغۂ جلاّد کی نذر ہوگئیں۔ اس پر بابل، سوس اور کرمان کے صوبوں میں لوگوں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر رومیوں نے ایران کے مغربی صوبوں پر حملے شروع کر دیے۔ دوسری طرف چار لاکھ ترکوں کے لشکرِ عظیم نے یورش کی جسے ایرانی سپہ سالار بہرام چوبین کے 12 ہزار سورماؤں نے درۂ مازندران میں شکستِ فاش دی مگر جب اسی بہرام چوبین [1] نے رُودِارس (دریائے اراس Araks) کے کنارے رومیوں سے شکست کھائی تو بادشاہ نے اسے زنانہ لباس پہن کر ہاتھ میں چرخہ لیے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اس تذلیل پر بہرام نے بغاوت کردی، ہرمز کے قاصد کو ہاتھی کے پاؤں تلے کچلوا دیا اور خود ہرمز کو اس کے محل میں گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ [2]

خسرو ثانی (خسرو پرویز) کی حکمرانی

ہرمز چہارم کے قتل کے بعد اس کا بڑا بیٹا خسرو پرویز، یعنی خسرو ثانی (589ء تا 628ء) تخت نشین ہوا مگر جلد ہی بہرام سے شکست کھا کر اسے دشمن رومیوں کے ہاں پناہ لینی پڑی۔ قیصر ماریس نے دونوں سلطنتوں میں قیام امن کے امکان کے پیش نظر کسریٰ (خسرو) کی درخواست پر ایک فوج اس کے ساتھ کردی جس کی مدد سے اس نے کھویا ہوا اقتدار حاصل کرلیا۔ بہرام شکست کھا کر ترکستان کی طرف فرار ہوگیا۔ اس کرم فرمائی پر خسرو پرویز، ماریس کو از رہِ احترام باپ کہہ کر پکارتا تھا، چنانچہ جب فوکاس نامی غاصب جرنیل نے رومی تخت پر قبضہ کر کے قیصر ماریس اور اس کی آل اولاد کو وحشیانہ طریقوں سے قتل کر دیا تو خسرو پرویز نے روم کے خلاف وہ جنگ چھیڑ دی جس کا سلسلہ بیس برس تک چلتا رہا۔ یہ جنگ آخر کار ایرانیوں کی شکست پر منتج ہوئی۔

خسرو پرویز کا اعلانِ خدائی

پادشاہانِ ساسانیہ خود کو عام انسانوں سے بالاتر سمجھتے تھے۔ بادشاہ آسمانی خداؤں کی نسل سے تسلیم کیا جاتا تھا۔ خسرو پرویز اپنے نام کے ساتھ حسب ذیل القاب لکھتا تھا:

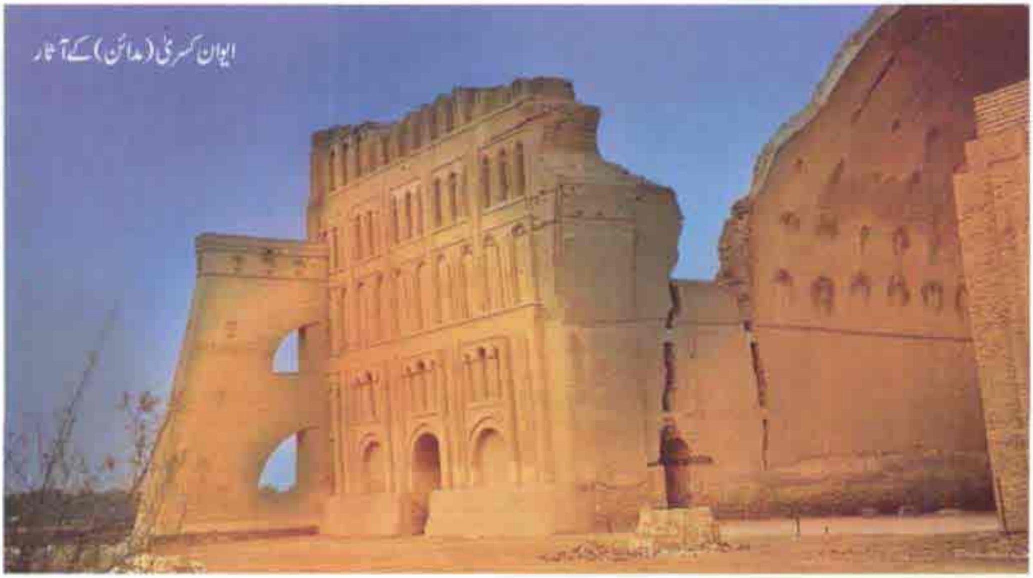
[1] بہرام دبلا پتلا ہونے کے باعث چوبین (لکڑی جیسا) کہلاتا تھا۔ (حسن اللغات) [2] غلبۂ روم، ص: 97-104.

"خداؤں میں انسانِ غیر فانی اور انسانوں میں خدائے لاثانی، اس کے نام کا بول بالا، آفتاب کے ساتھ طلوع ہونے والا، شب کی آنکھوں کا اجالا۔" [1]

ساسانی دربار کے عجوبے

ملک کی تمام دولت اور آمدنی کے تمام وسائل ساسانی بادشاہوں کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ مدائن میں ایوانِ کسریٰ، بہارِ کسریٰ (وہ قالین جس پر موسم بہار میں شاہانِ ایران شراب نوشی کیا کرتے تھے)، تاجِ کسریٰ اور دربار سے وابستہ خدم و حشم، بیویوں اور لونڈیوں، خدمت گار لڑکوں، باورچیوں اور خانساماؤں، پرندوں اور درندوں کے سدھانے والوں اور سامانِ شکار اور شاہی ظروف کی افسانوی تفصیلات و جزئیات حیرت انگیز ہیں۔ [2] جب اسلامی فتوحات کے نتیجے میں ایران کا آخری تاجدار یزدگرد اپنے دارالحکومت مدائن سے فرار ہوا تو اس حالت میں بھی اس کے ساتھ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار مغنی اور ایک ہزار چیتوں کے منتظم تھے اور شکروں کی دیکھ بھال کرنے والے ایک ہزار ماہروں اور خدم و حشم اور مصاحبین کی ایک بڑی تعداد تھی۔ اتنے بڑے لاؤ لشکر کے باوجود وہ محسوس کرتا تھا کہ مصاحبین و ملازمین کی تعداد اور تعیش و تفریح کے سامان کی کمی کے باعث اس کی حالت انتہائی قابلِ رحم ہے۔ [3]

[1] ایران بعہدِ ساسانیان، ص: 339. متکبر بادشاہ خسرو پرویز نے رسول اللہ ﷺ کا مکتوب گرامی وصول کرنے کے بعد توہین رسالت کا ارتکاب کیا اور عبرتناک انجام کو پہنچا۔ تفصیلات "شاہانِ عالم کو دعوتِ اسلام" کے باب میں ملاحظہ کیجیے۔ [2] تاریخ الطبری: 4/178. [3] تاریخ ایران، ص: 498.



قدیم ایران کے مذاہب وعقائد

ایران میں ''سچے رسول''

ایران کی معلوم تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ وہاں بھی اللہ تعالیٰ ہمیشہ توحید کا پرچار کرنے والوں کو مبعوث فرماتا رہا۔ اُن کے ذریعے سے اپنی حجت قائم کرتا رہا۔ قدیم ایران کی مذہبی کتابوں میں اللہ کے اِن برگزیدہ بندوں کو 'وخشور' یا 'شت وخشور' کہا گیا ہے۔ اس کے معنی 'رسول' یا 'سچا رسول' کے ہیں۔

ایرانیوں کے ہاں مروجہ روایات کے مطابق مہ ابد، آزر ابد، جے افرام اور جے ابد اوّلیں وخشور تھے۔ یہ عہدِ جمشید سے بہت پہلے ہوئے۔ مہ ابد نے اپنی قوم میں توحیدِ الٰہی کا پرچار کیا تھا لیکن تیرہ پشتوں کے بعد لوگ پھر گمراہ ہوگئے۔

کیومرث اور اس کے بعد ہوشنگ بھی اپنے زمانے کے 'وخشور' یا رسول بیان کیے جاتے ہیں۔ بعض مؤرخین کیومرث کو نوح علیہ السلام کی اولاد میں بتاتے ہیں۔ ہوشنگ کی ایک الہامی کتاب کا نام 'جاوداں خرد' تھا۔ خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں حسن بن سہل نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ ہوشنگ کے عہد میں ان کی تبلیغ سے عدل وانصاف اپنی معراج کو پہنچ گیا، چنانچہ لوگوں نے اُس کا لقب 'پیش داد' یعنی 'عادل اوّل' رکھ دیا تھا۔ یوں ہوشنگ سے پیش دادوں کے خاندان کا آغاز ہوا مگر منکرینِ توحید دیووں (بڑے شیاطین) نے ہوشنگ کو اللہ کی عبادت کے دوران میں پتھر برسا کر شہید کر دیا۔[1]

آتش پرستی اور مجوسیت

اولادِ آدم نے آگ کب اور کہاں دریافت کی، اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ شاید کرۂ ارض پر جگہ جگہ معدنی تیل (پٹرولیم) اور گیس کے علاقوں میں جو آگ بھڑکتی تھی، سب سے پہلے انسان نے اسی سے کام لیا ہو یا پھر چقماق پتھر (Flint) کی رگڑ سے پہلی بار آگ حاصل کی ہو۔ چقماق ایک سخت خاکستری پتھر ہے جو تقریباً خالص سلیکا (سلیکون ڈائی آکسائڈ) پر مشتمل ہوتا ہے اور چاک یا کیلشیم کاربونیٹ کے اندر گٹھلوں یا پٹیوں کی شکل میں پایا

[1] قدیم مذہبی تاریخ، ص:99,98.


مجوسیوں کا آتش کدہ

جاتا ہے۔[1] قدیم دور کے انسان پتھر کے علاوہ خاص قسم کی لکڑی کو باہم رگڑ کر بھی آگ جلا لیتے تھے۔ آج بھی جنگلوں میں رہنے والے بعض قبائل آگ حاصل کرنے کے لیے یہ طریقہ استعمال کرتے ہیں۔

ایران میں آگ کو پوجنے کی روایت قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ شاہنامۂ ایران کے مصنف فردوسی لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے آگ کا ظہور ہوشنگ کے زمانے میں ہوا جو دو پتھروں کے اتفاقاً رگڑ کھانے سے پیدا ہوگئی تھی۔ ہوشنگ نے آگ کی دریافت پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ جس دن آگ دریافت ہوئی، اُسے ایرانی قوم کا خاص تہوار 'جشن سدہ' قرار دے دیا گیا۔ نیک طینت ہوشنگ کے بعد ان کی لائی ہوئی ہدایت تحریف کا شکار ہوگئی اور بتدریج یہ تہوار آتش پرستی میں تبدیل ہوگیا۔ اس طرح ایران میں آتش پرستی کا آغاز ہوا۔

آگ کی دریافت اور آتش پرستی کے آغاز کے بارے میں تو فردوسی کا بیان قابل اعتماد نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسانی معاشرے کی طرح ایران میں بھی پیغمبروں کی سچی تعلیمات تحریف کا شکار ہوئیں اور شرک نے توحید کی جگہ لی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے:

''اہل فارس کا نبی وفات پا گیا تو ابلیس نے اُن کو مجوسیّت لکھ دی۔''[2]

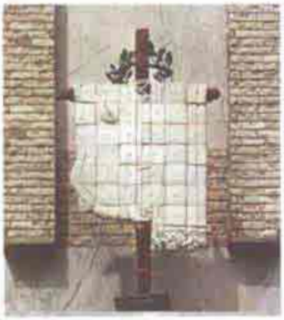
قدیم ایرانی مجوسیوں کے ہاں ایک خدا کا تصور موجود نہ تھا۔ وہ خیر کو روشنی اور شر کو تاریکی خیال کرتے تھے، اس لیے آگ کو روشنی کا سرچشمہ جانتے ہوئے، یزداں (مجوسیوں کے ہاں خیر کا دیوتا، زرتشتیوں کا فرشتہ) کی قربت حاصل کرنے کے لیے، قابلِ پرستش سمجھا گیا اور آتش پرستی کو مذہب کا جزوِ اعظم بنایا گیا جس کے پیروکار (مجوس) کہلائے۔

ہوشنگ کے بعد طہمورث دیو بند ایران کا بادشاہ ہوا۔ اس کے زمانے میں ایک نامعلوم مہلک وبا پھیل گئی۔ بزرگوں اور عزیزوں کے مرنے کے بعد لوگ ان کی تصویریں اور مورتیں یادگار کے طور پر رکھنے لگے۔ یہیں سے قدیم ایران کے مذہب میں بت پرستی شامل ہوئی۔

جمشید کی جھوٹی خدائی اور مظالم

جمشید نے اپنی بادشاہت کی ابتدا میں بتوں کا صفایا کیا لیکن پھر وہ خود گمراہ ہوگیا اور غرور میں آکر اپنے آپ کو

[1] آکسفورڈ انگلش ریفرنس ڈکشنری۔ [2] سنن أبي داود:3042.


صابئین کا معبد

زمین کا خدا کہنے لگا۔ اس نے پرستش کے لیے اپنے بت بنوائے اور رعایا میں تقسیم کر دیے۔ جو لوگ جمشید کی عبادت سے انکار کرتے، اُن پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے۔ بہت سوں کو آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔

جمشید سے ایرانی بادشاہت چھیننے والا ضحاک بھی ظالم اور مشرک تھا۔ فردوسی نے اسے شیطان کا چیلا اور جادو پرست لکھا ہے۔ ایرانیوں میں ستاروں کی پوجا بھی ضحاک ہی کے دورِ حکومت میں شروع ہوئی۔ صابئین، یعنی ستارہ پرست سات ستاروں یا سیاروں کی مورتیاں بنا کر اپنے معبدوں میں رکھتے تھے۔ یہ معبد یا ''پیکرستان شیداں'' کیوان (زحل)، ہُرمُز (مشتری)، بہرام (مریخ)، آفتاب، ناہید (زہرہ)، تیر (عطارد) اور چاند کی عبادت کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔[1]

کوروش کبیر کا مذہب توحید

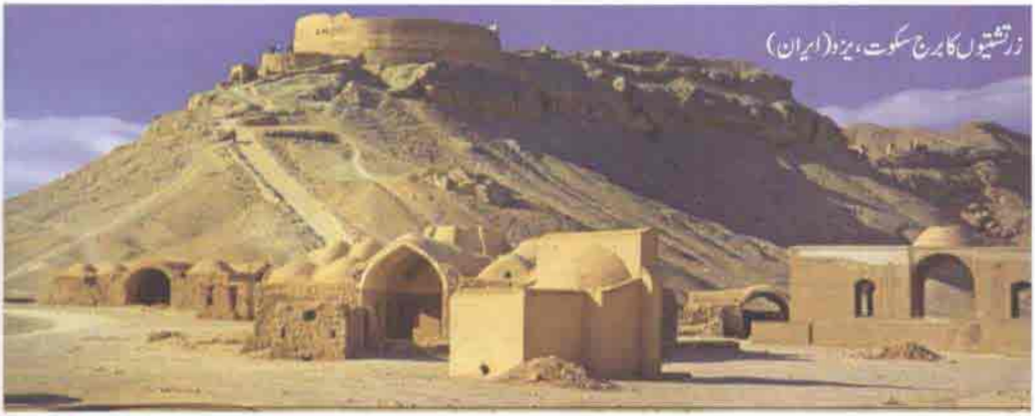
ہخامنشی سلطنت کے بانی کوروش کبیر (سائرس اعظم یا ذوالقرنین) نے تخت پر بیٹھ کر ایک بار پھر توحید کو رواج دیا۔ اسے ایرانی اس عہد کا 'شت وخشور' کہتے ہیں۔ ایران میں ذوالقرنین کے مذہبِ توحید کا اثر ایک ڈیڑھ صدی تک رہا۔ اس کے بعد اردشیر دوم کے دورِ حکومت (404-359 ق م) میں ایرانی دوبارہ باطل پرستی میں مبتلا ہو گئے۔

زرتشت: مصلح یا رسول؟

مذہبی مصلح زرتشت یا زردشت 660 ق م کے لگ بھگ علاقہ مادہ (شمال مغربی ایران) کے شہر ارمیا میں پیدا ہوا تھا۔ زرتشت کے لغوی معنی ہیں ''خدا پرست''۔ پروفیسر جیکسن کے بقول وہ مادیوں کے ایک قبیلے میگی (مجوس) کا فرد تھا۔ وہ 583 ق م میں فوت ہوا یا بروایتِ مجوس اسے برق و رعد میں آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ زرتشت نے معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور توحید پر مبنی ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی جو اس کے نام پر زرتشتیت (فارسی میں 'زردشتی' اور انگریزی میں Zoroastrianism) کہلاتا ہے لیکن شدید تحریفات کا شکار ہو چکا ہے۔ اس مذہب کو باختر (شمالی افغانستان) میں خاصا فروغ ملا۔ شاہ دارا گشتاسپ اس پر ایمان لے آیا اور آہستہ آہستہ یہ مذہب سارے ملک میں پھیل گیا۔ شہرستانی لکھتا ہے: ''زردشت جب تیس سال کا ہوا تو خدا نے اسے نبوت دی اور تمام مخلوق کے لیے رسول قرار دیا۔''

زردشت نے قدیم دیوتاؤں کی پوجا سے منع کیا اور اہورمزدا (آقائے دانش) کی عبادت کی دعوت دی۔ اس زمانے میں ایران میں متھرا پرستی کا اس قدر اثر تھا کہ زرتشت کو دس برس چھپ چھپا کر متھرا پرستی اور بیل کی قربانی

[1] روایات تمدن قدیم، ص: 162.



کی مخالفت کرنی پڑی۔ قدیم ہند اور ایران میں مترا یا متھرا روشنی کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ زرتشت سے پہلے ایرانی مجوسیوں کے ہاں متھرا سورج دیوتا کہلاتا تھا اور اسے حلف برداری اور قانونی معاہدے طے کرتے وقت گواہ بنایا جاتا، نیز اس کے لیے بیل کی قربانی دی جاتی۔[1]

ہخامنشی بادشاہ اردشیر دوم کا دور آتے آتے دینِ زرتشت میں تحریف کر دی گئی تھی اور اس میں متھرا پرستی شامل کر دی گئی تھی، چنانچہ پرسی پولس (ایرانی نام: تختِ جمشید) میں واقع اردشیر کے محل کی شمالی دیوار پر یہ عبارت کندہ ہے:


اردشیر دوم کے محل کا کتبہ

''اہورمزدا اور خدائے متھرا میرے نام کو، اس ملک کو اور میرے کارہائے نمایاں کو رہتی دنیا تک باقی رکھے۔''[2]

خدائے واحد اَہُورَمَزدا

قدیم مجوسیّت (Magianism) ایک مشرکانہ مذہب تھا۔ اس میں جن خداؤں کی پرستش کی جاتی رہی، اُن میں ایک اَن دیکھے خدا کو مرکزی حیثیت حاصل تھی جو خدائے اعلیٰ تھا۔ وہ 'اہورمزدا' یا 'اَہُورا مَزدا' کہلاتا تھا۔ نبی و مصلح زرتشت نے بھی باقی سب خداؤں کو چھوڑ کر صرف اسی خدائے واحد اہورمزدا کی پرستش کا احیا کیا تھا۔ گات ہا جو زرتشت کے حمدیہ گیتوں کا مجموعہ ہے اور جس کے متعلق خیال ہے کہ وہ زرتشت کا کلام ہے، اُس کے مطابق اہورَ مزدا ہی آسمان و زمین کا خالق ہے۔ وہ نور و ظلمت کے الٹ پھیر کا سرچشمہ ہے، یعنی نور کو ظلمت اور ظلمت کو نور میں بدلتا ہے۔ وہی مقتدرِ اعلیٰ، قانون ساز اور فطرت کا مرکزی نقطہ ہے۔ کُل دنیا کا منصف اور اصولِ اخلاق کا بانی بھی وہی

[1] Encyclopedia of World Religions, p:742.

[2] ہزارہ ہائے گمشدہ: 330/1.

ہے۔[1] اہورمزدا کو'اورمزدْ (Ormazd)'، 'ہرمُزدْ' اور 'ہُرمُز' بھی کہا جاتا ہے۔[2]

یزداں: نیکی کا خدا

فارسی میں یزداں 'یزدْ' کی جمع ہے جس کے معنی 'فرشتہ' یا 'خدا' کے ہیں لیکن 'یزداں' بطور مفرد 'خدا' یا 'نیکی کا خدا' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔[3] 'ایزدْ' بھی 'خدا' یا 'فرشتہ' کے معنی دیتا ہے۔ یہ فرشتوں کی اُس مخصوص جماعت کا سربراہ قرار دیا جاتا ہے جسے 'اہورا مزدا' نے دنیا کا نظام چلانے اور اہرمن (شیطان) کی افواج کا مقابلہ کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ یزداں اور اہرمن دو دیوتاؤں کا عقیدہ ثنویّت (دُوئی) کہلاتا ہے۔

اہرمن: بدی کا دیوتا

اہرمن (AHRIMAN) کو قدیم ایران میں بدی کے دیوتا کی حیثیت سے جانا اور پوجا جاتا تھا۔ زرتشتیوں کا دوئی پرست مکتبۂ فکر اسے 'روحِ خبیثہ' کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ قدیم ایرانیوں کے نزدیک اُس کے غیظ و غضب سے بچاؤ کا صرف ایک طریقہ تھا کہ اُس کی پوجا کی جائے۔

زرتشت نے اہرمن کو شیاطین (DEMONS) کا سردار قرار دیا تھا۔ اہرمن کا اَوستائی نام اَنگرامَینیو (ANGRA MAINYU) ہے۔ اس کے معنی ہیں: ''تباہ کن بھوت۔'' زرتشتیوں کا خیال ہے کہ اہورامزدا قیامت کے روز اہرمن کا خاتمہ کردے گا۔

حدیث قدریہ کی روشنی میں مجوسی ثنویت کا جائزہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

''قدریہ (تقدیر کے منکر) اس اُمت کے مجوسی ہیں۔ اگر بیمار ہو جائیں تو ان کی عیادت کو مت جاؤ اور اگر مر جائیں تو ان کے جنازے میں شریک نہ ہو۔''

مولانا عمر فاروق سعیدی رحمہ اللہ اس حدیث (4691) کی ذیل میں فوائد و مسائل کے عنوان سے لکھتے ہیں: مجوس دو معبودوں (خداؤں) کے قائل ہیں۔ ایک خالقِ خیر جسے وہ یزداں کہتے ہیں اور دوسرا خالقِ شر جسے وہ اہرمن کا نام دیتے ہیں۔ اسی طرح تقدیر کے منکر خیر کو اللہ کی اور شر کو غیر اللہ کی تخلیق سمجھتے ہیں، حالانکہ خلق اور ایجاد میں اللہ عزوجل

[1] Encyclopedia of World Religions, P: 1165.

[2] المعجم الوسیط، مادۃ: ہرمز۔ [3] فرہنگ فارسی، مادۃ: ایزد.

کا کوئی شریک نہیں اور نہ کوئی اس پر غالب ہے۔

اس نے اپنی حکمت کے تحت شر اور شیطان کو پیدا کیا ہے اور انسان اللہ کی مشیت کے تحت ہی سب کچھ کرتا ہے۔ مشیت اور ارادے کے معنی ہمیشہ رضامندی نہیں ہوتے، اس لیے کہ مشیت اور رضامندی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے، وہ یقیناً مشیت الٰہی ہی سے ہوتا ہے، اس کے بغیر اچھا یا برا کوئی کام بھی نہیں ہوتا لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ کام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ بھی ہو۔ اللہ تعالیٰ کو تو صرف وہی کام پسند ہیں جن کے کرنے کا اس نے حکم دیا ہے، باقی کام ناپسندیدہ ہیں، گو ہوتے وہ بھی اس کی مشیت ہی سے ہیں۔[1]

جشنِ مہرگان یا مہرجان

قدیم ایران میں موسمِ خزاں کے سولہویں دن متھرا کا جشن منایا جاتا تھا۔ اس جشن کو مہرگان یا متھرا گان کہا جاتا ہے۔ مہرگان کا مطلب 'مہر (متھرا) کا مہینہ' ہے۔ عید نوروز کے بعد ایرانیوں کے ہاں یہ سب سے بڑا جشن تھا۔ غلے کی کاشت اور مویشی بانی سے فارغ ہو کر ایرانی اس مہینے میں آرام کرتے اور متھرا کے لیے قربانی دیتے تھے۔ قربانی کے ساتھ بڑے پیمانے پر سوم بوٹی کا نشہ آور رس بھی پیا جاتا تھا۔

مہرگان کو عربی میں مہرجان کہتے ہیں۔ آج کل ہر قسم کے میلے اور جشن کے لیے عربی میں 'مہرجان' ہی کا لفظ مروّج ہے۔

زہرہ، ناہید اور اناہیتا

قدیم ایرانیوں کے ہاں اناہیتی دریاؤں، سمندروں اور ہریالی و شادابی کی دیوی تھی، چنانچہ اس کے معبد میں انار، سرسبز ڈالیاں اور گائے کی بچھڑیاں پیش کی جاتیں۔ اناہیتی سامی النسل اقوام کی دیوی عشتار کے مشابہ تھی۔ زرتشت نے اہورمزدا کے سوا تمام خداؤں کو ناقابلِ پرستش قرار دیا، تاہم، دستیاب معلومات کے مطابق، انھوں نے اناہیتی کو اہورمزدا کا فرشتہ بتایا۔ اگر زرتشت سچے پیغمبر تھے تو غالباً ان کا نام لینے والوں نے ان کے تصورِ میکائیل پر اناہیتا کا نام چسپاں کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردشیر دوم کے عہد (404-359 ق م) میں اناہیتی کی پرستش کا ازسرِ نو آغاز ہوا اور سلطنت میں ہر کہیں اس کی مورتیاں نظر آنے لگیں۔

بنی ساسان کے کتبوں میں اَناہیتی کو 'اناہید بانو' اور 'اردوی سور بانو' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ میڈیا (مادہ) کے

[1] سنن ابو داود (اردو) دار السلام: 4/561.

شہر اکباتان (Ecbatana موجودہ ہمدان) میں واقع اناہیتی کا معبد کسی زمانے میں دنیا کا سب سے عظیم الشان معبد تھا۔ سونے چاندی کی اینٹوں سے مزین یہ معبد سکندر مقدونی اور سلیوکی بادشاہوں نے مسخر کرکے تاراج کر دیا۔

کوہ قاف، آذربائیجان، افغانستان، وسطی ایشیا اور ایران کے مختلف علاقوں میں بیسیوں پل، قلعے اور عمارتیں ''دختر'' کے نام سے منسوب ہیں، مثلاً: پُلِ دختر، قلعۂ دختر، دیزِ دختر اور آبِ دختر۔ 'دختر' دراصل اُناہیتی ہی کا قدیم لقب ہے۔

سروش اور بہرام

زرتشتیوں کے نزدیک 'سروش' (SRAOSHA) ایک فرشتہ ہے۔ 'اہورامزدا' کا کلام سن کر لوگوں تک پہنچانا اُس کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔ اُن کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سروش کی حاضری کے بغیر کوئی مذہبی رسم پوری نہیں ہوتی۔

قدیم ایران کا دیوتا بہرام فتح کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ بہرام کا ہندی ہم مثل جنگ کا دیوتا 'اندر' (INDAR) ہے۔ بہرام کے نام پر روشن کی جانے والی آگ کو مقدس ترین سمجھا جاتا تھا جو ان کے نزدیک سولہ قسم کے شعلوں کا مجموعہ ہوتی تھی۔ ساسانیوں کے پانچ بادشاہوں نے اپنے لیے بہرام کا نام اختیار کیا۔ دیومالائی خرافات کے مطابق بہرام وقتاً فوقتاً ریچھ، شکاری پرندے، بیل، اونٹ اور طلائی تلوار کے حامل نوجوان جنگجو کا بہروپ بھرتا ہے۔ قدیم ایرانیوں نے مہینے کا بیسواں دن بہرام کے نام منسوب کر رکھا تھا۔

مانی اور مانویت

مانی 215ء میں بابل میں پیدا ہوا۔ وہ ایرانی نژاد تھا اور ابتدائے عمر میں زرتشت کے مذہب کا ایک پیشوا تھا۔ اس نے قدیم مجوسیت، بُدھ مت اور عیسائیت میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور ایک ایسا مذہب مرتب کیا جسے اسی کے نام پر مانویت کہا جاتا ہے۔ اس مذہب کی اصل بنیاد زرتشت سے پہلے کی ثنویت پر رکھی گئی ہے۔



مذہب مانویت کا پرانا مخطوط

یعقوبی اس کی تعلیمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''مانی ابن حماد، شاپور اول بن اردشیر ساسانی کے عہد میں ظاہر ہوا۔ اس نے شاپور کے (زرتشتی) مذہب کو باطل ٹھہرایا اور اسے اپنی تعلیم ثنویت کی طرف بلایا۔ مانی کہتا تھا کہ کائنات میں متصرف ازلی و ابدی دو عناصر ہیں: نور اور

ظلمت۔ خالق بھی دو ہیں: خالقِ خیر (یزداں) اور خالقِ شر (اہرمن)۔" [1]

مانی نے بدھ مت اور دیگر مذاہب کی رہبانیت کے زیرِ اثر تجرد، ترکِ دنیا اور نسل کُشی کی ترغیب دی تا کہ نہ اولاد پیدا ہو اور نہ شر پھیل سکے۔ اس رہبانیت کے خلاف ردِ عمل پیدا ہوا اور زرتشتی، جو اکثریت میں تھے، اُس کے دشمن بن گئے۔ زردشت نے توالد و تکاثر کی دعوت دی تھی۔ مانویہ دن میں چار دفعہ نماز پڑھتے تھے۔ بُت پرستی کے قائل نہیں تھے۔ جھوٹ، لالچ، قتل، زنا، چوری، سحر اور ریاکاری سے منع کرتے تھے اور مہینے میں سات روزے رکھتے تھے۔ مانی نے اپنی کتابوں کے لیے ایک نیا رسم الخط ایجاد کیا۔ وہ اپنی کتابیں، جن میں شاپورکاں (شاپور کے نام پر) مشہور ہوئی، سونے چاندی کے حروف میں لکھتا تھا اور جلد بندی میں بھی سونا استعمال کرتا تھا۔ جب اس کی کتابیں جلائی گئیں تو سونا چاندی ان میں سے پگھل پگھل کر گرتے تھے۔ مانی ایک عظیم مصور بھی تھا۔ وسطی ایشیا کے اویغور ترکوں نے بھی مانویت اختیار کر لی اور بہت عرصہ اس پر قائم رہے۔

مانی کی دعوت پر اگرچہ بادشاہ شاپور اول نے اس کا مذہب قبول کر لیا تھا لیکن موبدِ موبداں (آتش پرستوں کا سب سے بڑا رہنما) کے سامنے مانی کی کچھ پیش نہ گئی۔ موبد کی مخالفت سے بچنے کے لیے مانی ہندوستان چلا آیا۔ یہاں سے لوٹنے پر شاہ بہرام اول نے اسے اذیت ناک طریقے سے قتل کرادیا۔ اس نے مانویہ کا استیصال تو کر دیا لیکن ان کے عقائد صدیوں تک دوسرے مذاہب پر اثر انداز ہوتے رہے۔ عیسائی راہبوں اور مسلمان صوفیوں کے عقائد پر بھی مانویہ کی فاقہ کشی اور ترکِ علائق کی تعلیم کا اثر ہوا۔ بعد کے معروف شعراء ابوالعتاہیہ، ابوالعلا معرّی اور عمر خیام مانی کی قنوطیت سے متاثر ہوئے۔ [2] بنوامیہ اور بنوعباس کے زمانے میں کئی اشخاص ایسے تھے جو بظاہر اسلام کا دم بھرتے تھے لیکن باطن میں مانوی تھے۔ مانویہ کو زندیق کہا جاتا تھا۔ صاحب الفہرست کے مطابق جعد بن درہم، بشار بن برد اور ابنِ الزیّات مانوی تھے۔ مانویہ کا کھوج لگانے کے لیے خلیفہ منصور نے ایک محکمہ قائم کر رکھا تھا جس کے سربراہ کا لقب صاحب الزنادقہ ہوتا تھا۔ [3]

مزدک اور مزدکیت

مزدک کا ظہور شاہ قباد ساسانی (487ء-531ء) کے عہدِ حکومت میں ہوا۔ قباد شروع شروع میں اس کے افکار کا قائل ہوگیا لیکن موبدوں اور اپنے بیٹے نوشیرواں کی شدید مخالفت کے باعث اس نے مزدک کا مذہب جلد ترک کر دیا۔ مزدک کے خیال میں ہر برے کام کا باعث حسد، غصہ یا لالچ ہے اور یہی تین رذائل ایسے ہیں جنھوں نے خدا

[1] روایات تمدن قدیم، ص: 169. [2] روایات تمدن قدیم، ص: 171. [3] روایات تمدن قدیم، ص: 171، 172.

کی مرضی اور حکم کے خلاف مساواتِ انسانی کا خاتمہ کر دیا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ انسان کو لالچ، حسد اور غصے سے نجات دلانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے جن چیزوں کی ضرورت ہے، وہ سب انسانوں کی مشترکہ ملکیت قرار دی جائیں اور سب میں برابر تقسیم ہوں، ان میں ہر قسم کی املاک تقسیم کر دی جائیں۔ اس کے ساتھ اس نے افلاطون کے مانند اشتراکِ نسواں کی بھی دعوت دی۔ اس کی دعوت نے جلد ہی قوت پکڑ لی اور حالت یہ ہوگئی کہ لوگ جس کے گھر میں چاہتے بے تکلف گھس جاتے اور اس کے مال و اسباب اور عورتوں پر قبضہ کر لیتے۔[1] رہبانیت کا عنصر مزدک کے مذہب میں بھی موجود تھا۔

شاہ قباد کا اپنا بیٹا خسرو (نوشیرواں) مزدک کی تعلیم کو مملکت اور معاشرے کے لیے تباہ کن سمجھتا تھا اور مزدک کی اشتراکیت اور اباحتِ نسواں کا سخت مخالف تھا۔ جب وہ جوان ہو کر با اثر بن گیا تو اس کے اصرار پر شاہ قباد نے مزدکیت کے استیصال کا بیڑا اٹھایا اور مزدکیوں کا قتلِ عام کروایا۔ نوشیرواں نے مزدک کو زندہ دفن کرادیا اور مزدکی مذہب کی حکماً ممانعت کردی۔ نوشیرواں نے اپنے بیٹے نوش زاد کو قید میں ڈال دیا کیونکہ وہ عقیدۂ تثلیث کی طرف مائل تھا مگر شہزادہ قید سے نکل بھاگا اور پھر فوج سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ اسی دینی خدمت پر موبدوں نے خسرو کو نوشین رواں (غیر فانی روح) کا لقب بخشا تھا جو بتدریج ''نوشیرواں'' میں ڈھل گیا۔

نظام الملک طوسی اپنی کتاب ''سیاست نامہ'' میں لکھتا ہے:

''مزدک کی تعلیمات بعدازاں بہت سے اسلامی فرقوں میں بھی نفوذ کر گئیں۔ مقنّع (م163ھ)، بابک (م224ھ) اور محمد بن علی شلمغانی (322ھ)، جنھوں نے دورِ عباسیہ میں علمِ بغاوت بلند کیا تھا، مزدک کی طرح اشتراکیتِ املاک اور اباحتِ نسواں کے داعی تھے۔'' باطنیہ میں بھی مزدکیت موجود ہے۔[2] انیسویں صدی عیسوی میں جرمن یہودی کارل مارکس نے مزدک کی طرح اشتراکِ املاک پر مبنی نظریۂ اشتمالیت (Communism) پیش کیا جس کے عبوری مرحلے کو اشتراکیت (Socialism) کا نام دیا گیا۔ اسی لیے علامہ اقبال نے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں کارل مارکس کو ابلیس کے ایک مشیر کی زبانی ''روحِ مزدک کا بروز'' قرار دیا ہے اور پھر خود ابلیس کی زبانی اشتراکیت (مزدکیت) کے بارے میں کہلوایا ہے ع

مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے[3]

---

[1] نبی رحمت ﷺ، ص:48. [2] روایات تمدن قدیم، ص:173,172. [3] کلیات اقبال (ارمغان حجاز)، ص:654-656.


ایران
عراق
ترکمانستان
افغانستان
آذربائیجان
بحیرۂ خزر
خلیج عمان
پاکستان

ایران میں آفتاب پرستی

دنیا کے باقی ادیان کی طرح زرتشت کے نام سے موسوم ہونے والے دین میں بھی عقیدے اور عمل کی وہ ساری بدعتیں شامل ہوتی گئیں جن کے خلاف زرتشت نے علم اٹھایا تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، ایرانی مذہب میں آفتاب پرستی بھی شامل ہوگئی تھی۔ سورج انھیں روشنی اور حرارت کا سب سے بڑا منبع نظر آتا تھا، اسی بنیاد پر اس کی پوجا ہونے لگی۔

''ایران بعہدِ ساسانیان'' کا مصنف آرتھر کرسٹین سین لکھتا ہے:

''سرکاری ملازمین کے لیے لازمی تھا کہ وہ دن میں چار بار سورج کی پوجا کریں۔ چاند، آگ اور پانی کی پوجا اس کے علاوہ تھی۔ سونے جاگنے، نہانے، جنیو پہننے، کھانے پینے، چھینکنے، حجامت بنوانے، ناخن ترشوانے، قضائے حاجت اور شمع جلانے، غرض ہر کام کے لیے الگ الگ دعائیں تھیں اور ان کا اہتمام کرنا ضروری تھا۔ ان کو یہ احکام دیے گئے کہ آتش کدوں کی آگ کسی وقت بجھنے نہ پائے اور آگ اور پانی ایک دوسرے سے نہ ملیں، دھات کو زنگ نہ لگے، اس لیے کہ معدنیات بھی ان کی نگاہوں میں مقدس تھیں۔''[1]

ایران کے آخری بادشاہ یزدگرد نے ایک مرتبہ سورج کی قسم کھاتے ہوئے یہ جملہ کہا تھا کہ ''میں سورج کی قسم کھاتا ہوں جو سب سے بڑا معبود ہے۔'' اس نے ان عیسائیوں کو جو عیسائیت سے توبہ کر چکے تھے، اس کا پابند کیا تھا کہ وہ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے سورج کی پوجا کیا کریں۔[2]



زرتشتی معبد پر بنی ہوئی علامت

[1] ایران بعہدِ ساسانیان، ص: 155۔ [2] ایران بعہدِ ساسانیان، ص: 187,186۔

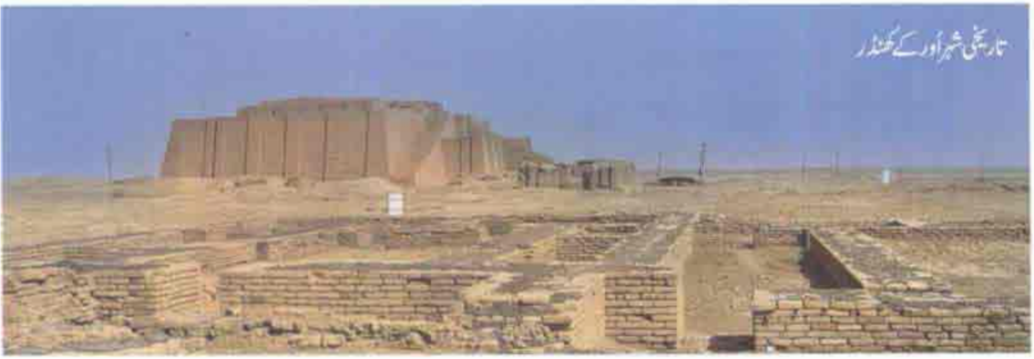
2

عراق (بابل ونینویٰ)

عراق کی وسعت

میسوپوٹیمیا (بلادِ رافدَین یا مابین النہرین یا الجزیرہ) یعنی عراق کا میدان سطح مرتفع آرمینیا کی جنوبی ڈھلانوں (جنوب مشرقی ترکی) سے خلیج فارس تک تقریباً چھ سو میل کی لمبائی میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب تاریخی شہر ''اُور'' یا ''اُر'' خلیج کے قریب واقع تھا۔ ہزاروں سال دجلہ وفرات کی سیلابی مٹی جمع ہوتے رہنے کی بنا پر جنوب میں ساحلِ خلیج ساٹھ میل پیچھے ہٹ گیا ہے۔ شرقاً غرباً عراق کی وسعت کوہ زاغروس (ایران) اور بادیۂ شام کے درمیان ہے۔

زمانۂ قدیم میں یہ میدان تمدنی اعتبار سے بڑی قوموں کا وطن تھا۔ یہ دو حصوں میں منقسم تھا: شمالی حصے میں اشور واقع تھا اور جنوبی حصے میں بابل آباد تھا۔ اشور کے شہروں میں نینویٰ، خورس آباد اور اربیلا (موجودہ اربیل) بطور خاص نمایاں تھے، جبکہ بابل کے شہروں میں سے خود بابل، کش، اکاد اور انتہائی جنوبی حصے میں ''اُور'' قابل ذکر تھے۔ اشور کے شہر دریائے دجلہ کے کنارے واقع تھے اور بابل کے شہر دریائے فرات کے کنارے یا اس کے قریب تھے۔



تاریخی شہر اُور کے کھنڈر

حضرت نوح علیہ السلام اور طوفانِ عظیم

عہدِ قدیم میں حضرت شیث بن آدم علیہما السلام کی آٹھویں نسل میں حضرت نوح علیہ السلام موجودہ کوفہ (عراق) کے آس پاس آباد قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جو ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر نامی بتوں کی پجاری تھی۔ آپ نے



ارارات کی چوٹی (ترکی)

ساڑھے نو سو سال رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیا مگر قوم بُت پرستی سے باز نہ آئی۔ تب اللہ تعالیٰ نے اس سرکش قوم کو ایک عظیم سیلاب میں غرق کر دیا۔ حضرت نوح علیہ السلام اور تقریباً چالیس مومنوں کی جماعت اس کشتی میں محفوظ رہی جو انھوں نے حکمِ الٰہی سے تیار کی تھی اور انھی سے نسل انسانی کا سلسلہ آگے چلا۔ طوفان میں خود نوح علیہ السلام کا نافرمان بیٹا کنعان بھی غرق ہو گیا۔ کشتی نوح کوہِ جودی پر اتری تھی جو ترکی اور آرمینیا کی سرحد پر پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلہ ارارط (ارارات) کی ایک چوٹی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی تک اس جگہ ایک معبد اور ہیکل موجود تھا جسے کشتی کا معبد کہا جاتا تھا۔ [1]

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نوح علیہ السلام کا کافر بیٹا کنعان طوفانِ عظیم میں غرق ہو گیا تھا، لہٰذا اس کی کوئی نسل نہیں چلی، البتہ کنعان بن سام یا کنعان بن حام بن نوح کی نسل آگے چلی۔ اس کی طرف منسوب اقوام میں شام (فلسطین) کے جابر حکمران شامل ہیں۔ بائبل میں اس کا تذکرہ بکثرت ملتا ہے۔ [2]

تاریخی آثار کے مطابق پتھر اور پیتل کے دور کے آخر میں دجلہ و فرات کے درمیانی علاقے (بلاد الرافدین یا میسوپوٹیمیا) کو عظیم طوفان نے آلیا تھا۔ اس دور کے آثار جرمو (نزد سلیمانیہ)، تل حَسُّونہ (جنوبِ موصل)، تل العبید (نزد ''اُور'')، اوروک (ورکاء)، شروباک (فارہ) اور بابل کے مشرق میں جمدۂ نصر (نزد کیش) میں ملتے ہیں۔ جرمو کے آثار کا زمانہ ماہرین نے 6500 ق م بتایا ہے جبکہ تل حسونہ کا زمانہ 5750 ق م بتایا جاتا ہے۔ [3] قوم نوح کے آثار انھی میں ہو سکتے ہیں۔

سمیری، اکادی اور اموری حکومتیں

مسیح علیہ السلام سے تقریباً چار ہزار سال قبل عراق کے جنوبی حصے میں سمیری اور شمالی حصے میں اکادی آباد تھے جنھیں عام طور پر سامی سمجھا جاتا ہے۔ تیسری ہزاری قبل مسیح میں شمالی شام سے اموری بابل وارد ہوئے اور 1900 ق م کے لگ بھگ پہلی اموری حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ 1600 ق م کے آس پاس حتیوں (Hittites) نے بابل پر یورش کی، پھر کسیوں

[1] قصص القرآن: 1/63-85. [2] معجم البلدان، مادة: كنعان، سبائك الذهب، ص: 30، الجمهرة لابن حزم، ص: 463، کتاب مقدس (پیدائش) 10:6-20، وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا. [3] اطلس القرآن (اردو)، ص: 45.

(Kassites) نے اسے فتح کر لیا۔ 1100 ق م کے قریب آرامیوں نے ملک کو پامال کیا اور دریائے فرات کے ساتھ ساتھ پورے علاقے پر قابض ہوگئے۔ یہ بھی سامی النسل تھے۔

وقت کے پیمانوں اور رسم الخط کی ایجاد

سمیریوں میں پہلے شش گانہ عددی نظام رائج تھا، مثلاً: گنتی میں درجن وغیرہ یا آج کل کے حساب کے مطابق دن کے چوبیس گھنٹے اور گھنٹے کے ساٹھ منٹ، منٹ کے ساٹھ سیکنڈ۔ اس کے ساتھ بہت جلد دہ گانہ (اعشاری) نظام شامل کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح ابتدا میں سمیریوں کے ہاں تصویری رسم الخط رائج تھا، پھر انھوں نے پیکانی (میخی) رسم الخط ایجاد کیا جو مٹی کی تختیوں پر کندہ کرنے کے لیے بہت موزوں تھا۔

حمورابی اور دنیا کا پہلا دستور



شاہ حمورابی کا ایک کتبہ

بابل کی اموری سلطنت کا چھٹا بادشاہ حمورابی (لگ بھگ 1800 ق م) تھا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ حمورابی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہم عصر تھا۔ اس نے پورے عراق کو مسخر کیا اور قوانین کا ایک مجموعہ مرتب کیا جسے دنیا کا پہلا دستور کہا جاتا ہے۔ اس نے جو قوانین بنائے، رومی سلطنت کے زمانے تک ان کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ [1] بلکہ رومیوں نے بھی بنیادی طور پر حمورابی ہی کے مجموعۂ قوانین سے استفادہ کیا۔

ابراہیم علیہ السلام اور نمرود

امام ابن جریر طبری نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے جہاں یہ مروج قول نقل کیا کہ وہ ارض سواد (جنوبی عراق) میں بابل کے مقام پر پیدا ہوئے تھے، وہاں بعض محقق علماء کا یہ قول بھی نقل کیا کہ آپ کی پیدائش سواد میں کوثیٰ کے مقام پر ہوئی۔ اس وقت بابل کا بادشاہ نمرود بن کوش (یا نمرود بن کنعان بن کوش) بن سام بن نوح تھا۔ جبکہ بعض دیگر علماء کا خیال ہے کہ ''نمرود'' لقب تھا اور بادشاہ کا اصل نام ذرہی بن طہماسفان تھا۔ [2] بائبل میں بھی اسے نمرود کہا گیا ہے۔ (سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ عنوان ''عرب مستعربہ'' میں ملاحظہ کیجیے)

[1] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 2/42-46. [2] تاریخ الطبري: 1/162،163.

شمالی عراق میں اشوری سلطنت (نینویٰ)

اٹھارویں صدی ق م میں نینویٰ (موجودہ موصل کے قریب) میں اشوری بادشاہت قائم ہوئی۔ دسویں صدی ق م میں ان کی سلطنت عراق اور شام کے علاقوں میں پھیلنی شروع ہوئی۔ ''اشور'' ان کے قومی دیوتا کا نام تھا جس کی یہ پرستش کرتے تھے۔ بعد میں یہ لوگ عشتار (اشتر) دیوی کی پوجا بھی کرنے لگے۔ اشوریہ کے عروج کا پہلا دور 933 ق م میں شروع ہوا۔ شاہِ اشور نصرپال ثانی نے بحیرۂ روم تک کے علاقے فتح کر لیے۔ اسی کے عہد میں قلعے توڑنے والی منجنیق اور محاصروں میں کام دینے والے آلات استعمال ہونے لگے۔ دوسرا بڑا اشوری بادشاہ شلمنسر دوم تھا۔ اس نے بحیرۂ روم کے ساحل پر واقع دو شہروں صور، صیداء اور یہودی ریاست اسرائیل سے خراج لیا۔ شلمنسر سوم (911 تا 891 ق م) نے جنگ قرقار میں شاہِ اسرائیل احاب اور شاہِ دمشق حدادایزر سے شکست کھائی۔[1]



شلمنسر دوم اشوری کا کتبہ

یونس (علیہ السلام) کی بعثت اور قوم کی توبہ

اشوری قوم کی ہدایت کے لیے حضرت یونس علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ یونس علیہ السلام کا زمانہ 860 تا 784 ق م بتایا جاتا ہے۔ اشوریوں کا مرکز نینویٰ 60 میل کی مسافت پر محیط دائروی شکل میں پھیلا ہوا تھا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے ایک مدت تک اپنی قوم کو پیغامِ حق سنایا اور توحید کی طرف بلایا لیکن قوم مسلسل اللہ کی نافرمانی و سرکشی کی راہ پر گامزن رہی۔ مایوس ہو کر یونس علیہ السلام نے ان کے لیے عذابِ الٰہی کی بددعا کی اور خفگی کے عالم میں وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ شام سے ہو کر آپ یافا پہنچے اور ایک کشتی میں سوار ہوئے جو راستے میں طوفانی موجوں میں گھر گئی اور قریب تھا کہ لہروں کی نذر ہو جائے۔ کشتی والوں نے قرعہ نکالا تو وہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام نکلا اور تین بار ایسا ہی ہوا۔ آخر حضرت یونس علیہ السلام نے سمندر میں چھلانگ لگا دی اور ایک بڑی مچھلی (غالباً وہیل) نے آپ کو نگل لیا۔ غم اور ندامت کے مارے آپ نے مچھلی کے پیٹ ہی میں اللہ کے سامنے فریاد کی:

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾ (الأنبیآء 87:21)

[1] History of the World, P:52، انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم: 48,47/2.



"تیرے سوا کوئی معبود برحق نہیں، تو پاک ہے۔ بے شک میں ظالموں میں سے ہوں۔"

اللہ تعالیٰ کے حکم سے مچھلی نے آپ کو ایک صاف جگہ اگل دیا۔ وہاں ایک بیل دار پودے کے سائے میں آپ کو پناہ اور کھانا ملا، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ اب قوم کے پاس جائیں اور ان کی رہنمائی کریں۔ اس دوران میں قومِ یونس نے عذاب کے آثار دیکھے تو میدان میں نکل کر گڑگڑائے، اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور شرک و بت پرستی سے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ یہ واحد قوم تھی جسے عذاب دکھائے جانے کے بعد بخش دیا گیا۔[1]

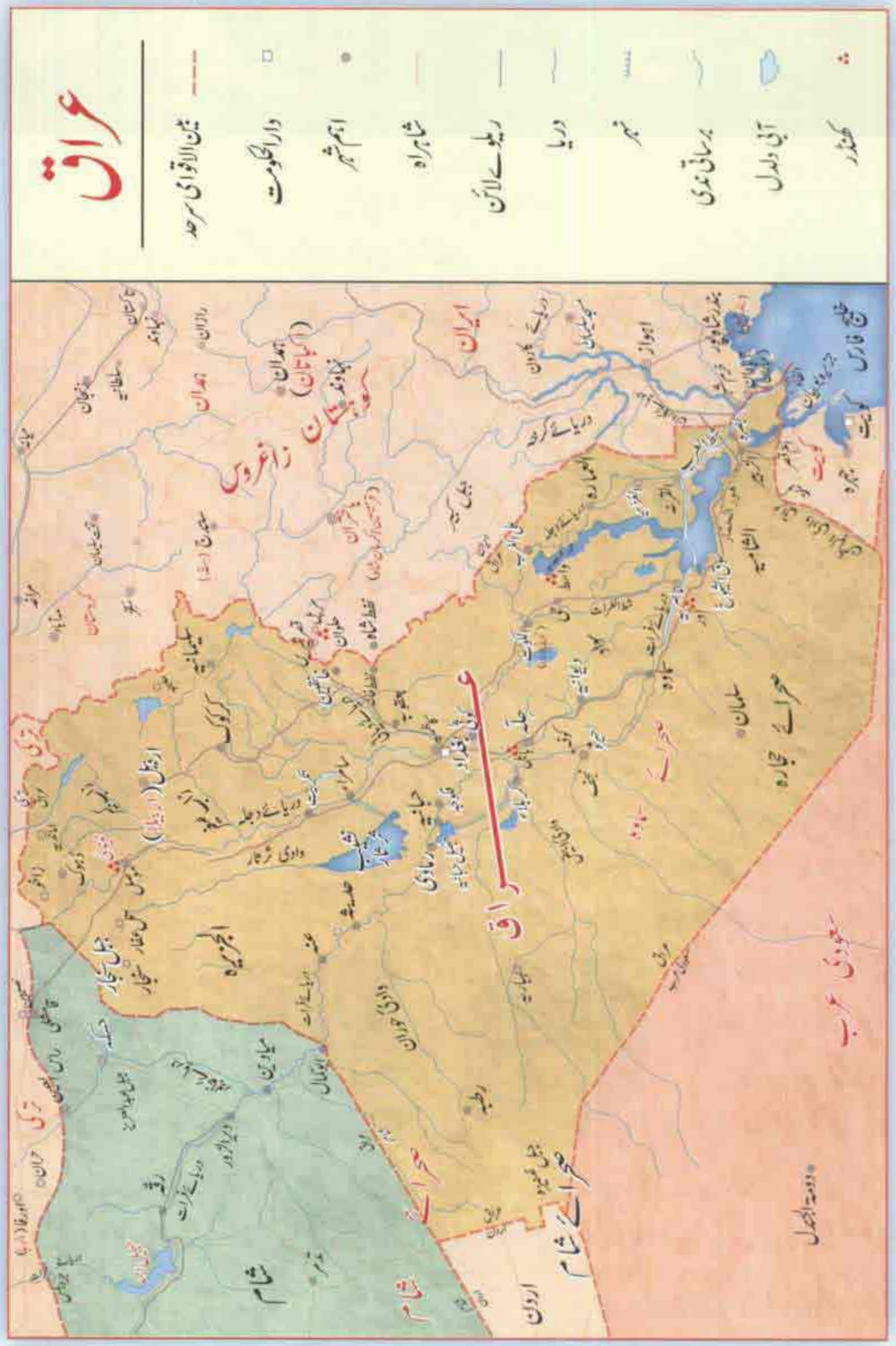
اشوریوں کا بابل پر قبضہ

745 ق م میں اشوریوں کی عظمت کا نیا دور شروع ہوا۔ تغلت پلسر سوم نے شام اور آرمینیا فتح کر لیے اور بابل کو اشوری سلطنت میں ضم کیا۔ سارگون (سرجون) دوم (721 تا 704 ق م) کے بیٹے سنحارب (704 تا 681 ق م) نے 689 ق م میں بابل کو تاخت و تاراج کیا۔ سنحارب کو اس کے بیٹے اسرحدون نے قتل کر کے خود تخت سنبھالا۔ اس نے بابل کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اشور بنی پال (668 تا 627 ق م) اشوریہ کا آخری بڑا بادشاہ تھا۔ اس کے بعد بابل نے بغاوت کر دی اور 612 ق م میں بابل اور مادہ (ایران) کی فوجوں نے مل کر نینویٰ اور دیگر اشوری شہروں کو تاراج کر ڈالا۔[2]

---

[1] اطلس القرآن (اردو)، ص: 184-186.

[2] History of the World, P:57,58.



عراق
بین الاقوامی سرحد
دارالحکومت
اہم شہر
شاہراہ
ریلوے لائن
دریا
نہر
برساتی ندی
آبی دلدل
کھنڈر
ایران
ترکی
شام
اردن
سعودی عرب
کویت
خلیج فارس



بابل شہر کے کھنڈر

عراق پر بخت نصر، سکندر اعظم اور ساسانیوں کا تسلط

729ق م سے 625 ق م تک بابل اشوری سلطنت کا حصہ بنا رہا۔ اس کے بعد کلدانی آرامی بابل میں برسرِاقتدار آئے اور پھر پورے عراق پر چھاگئے۔ ان کا مشہور بادشاہ بخت نصر دوم 605 ق م سے561ق م تک حکمران رہا۔ اس نے586ق م میں ہیکل سلیمانی (بیت المقدس) کو تباہ کر دیا اور مصریوں کو شکست دی۔ بنی اسرائیل کی سلطنتِ یہودیہ کو بابلی سلطنت میں ضم کرلیا اور ایک لاکھ یہودیوں کو گرفتار کر کے بابل لے آیا۔ اس نے بابل کے اردگرد عالیشان فصیلیں بنائیں اور عمارتیں تعمیر کرائیں۔ بابل میں بخت نصر کے بلندی پر لگائے ہوئے معلّق باغات قدیم دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتے ہیں۔

539ق م میں ایران کے حکمران سائرس (ذوالقرنین) نے بابل سمیت پورے عراق کو فتح کیا اور پھر دوصدیوں تک یہ ملک ایرانیوں ہی کے قبضے میں رہا حتی کہ 332ق م میں سکندر اعظم مقدونی (یونانی) نے بابل فتح کر کے اسے اپنی سلطنت کا مرکز بنالیا۔ سکندر کے بعد اس کی ایشیائی میراث یونانی سلیوکیوں کے قبضے میں آئی۔ ان کے بعد 171ق م سے 226ء تک ایرانی پارتھی عراق پر حکمران رہے۔ بعد ازاں ایران کے ساسانی بادشاہ اس پر قابض ہوگئے۔ آخر کار37-636ء میں عرب مسلمانوں نے عراق فتح کرلیا۔



عباسی دور کے سکّے کے دو رُخ

صابئیت یا ستارہ پرستی

ستارہ پرستی شرک کی قدیم ترین صورتوں میں سے ایک ہے۔ ستارہ پرستوں کو صابی (جمع صابئین) کہا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں عراق میں یہی مشرکانہ مذہب رائج تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور توحید کی دعوت دی جو کامیاب رہی لیکن یہ فرقہ مٹا نہیں، کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا۔



معبد صابئیت (عراق)

صابی ابتدا میں ایران، عراق اور جنوبی ترکی میں پھیلے ہوئے تھے۔ ترکی میں ان کا مرکز حران تھا جسے قدماء "کاریا" یا "کرہی" (Carrhe) کہتے تھے۔ [1] ان کی زبان سریانی تھی۔ اس فرقے کا آغاز بعض علماء کے نزدیک بابل سے ہوا جہاں انھوں نے اسرائیلی جادوئی رسوم، ایرانی تقویم اور مندوی (Mandaic) زبان کے لیے ایرانی الفاظ اخذ کیے۔ دیگر اہلِ علم کہتے ہیں کہ ان کی ابتدا شام و فلسطین سے ہوئی جیسا کہ اس فرقے کی کتاب حاران گویتا (Haran Gawaitha) میں لکھا ہے کہ پہلی صدی عیسوی کے مندوی صابی علماء (Nasoreans) نے فلسطین سے الجزیرہ (میسوپوٹیمیا) کی طرف خروج کیا۔ ان کی مذہبی تحریروں میں عہد نامہ عتیق کا رنگ ہے اور ان کے اخلاق اور شادی بیاہ کے سخت ضابطے یہودی نوعیت کے ہیں۔ [2]

عہد اسلام میں صابیوں (Sabians) کے دو مختلف فرقے تھے:

1. مَندَیا (Mandaeans) یا مندویون (مغتسلہ) جو صُبّوہ (سُبّہ Subbas) بھی کہلاتے تھے۔ یہ عراق کا ایک ایسا فرقہ تھا جس کے عقائد اور اعمال کی بنیاد خاصی حد تک یہودی و عیسائی مذہبی تصورات پر تھی۔ وہ رسم اصطباغ کے بھی پابند تھے۔
2. صابئہ حران، یعنی قدیم صابی عقائد کا حامل وہ مشرک فرقہ جو عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح نہیں مانتے تھے اور یوحنا اصطباغی (یحییٰ علیہ السلام) کی حُرمت کے قائل تھے۔ یہ فرقہ اپنے عقائد اور ان ذہین فضلاء کی وجہ سے جو اس میں پیدا ہوئے، عرصے تک باقی رہا۔ ان فاضل لوگوں میں ممتاز مہندس، ہیئت دان اور فلسفی ثابت بن قرہ، طبیب اور ماہر فلکیات

[1] جغرافیہ خلافت مشرقی، ص: 103(130).

[2] Encyclopedia of World Religions, p:688.


مجوسیوں اور صابیوں کے مقامات
مجوس (زرتشتیوں) کے مراکز
صابیوں کے مراکز
بازنطینی سلطنت (رومی)
ایشیائے کوچک
لیڈیا (ترکی)
بحیرۂ اسود
دربند
باکو
بحیرۂ روم
قبرص
صور
دمشق
القدس
شام
غسانی سلطنت
رقہ
حران
الجزیرہ
آذربائیجان
بغداد
طیسفون (مدائن)
بابل
حیرہ
نہاوند
میڈیا (ایران)
سوس
اصفہان
فارس
شیراز
یزد
کرمان
ساسانی سلطنت
خراسان
طوس
بلخ (آتش کدہ نوبہار)
ہرات
افغانستان
کابل
سجستان
بلوچستان
موجودہ پاکستان
ہندوستان
مکران
خلیج فارس
خلیج عمان
بحیرۂ عرب
بحر ہند
بمبئی (ممبئی)
مصر
سینا
طیبہ (الاقصر)
صحرائے نوبیہ
حبشہ
تبوک
دومۃ الجندل
النفود الکبیر
تیماء
الاحساء
بحرین
ہجر
مدینہ منورہ
حجاز
نجد
یمامہ
مکہ مکرمہ
طائف
جزیرہ نمائے عرب
صحار
مسقط
عمان
الربع الخالی
حضرموت
عسیر
1200
900
600
300
0
کلومیٹر

سنان بن ثابت، ابواسحاق بن ہلال، البتانی اور ابوجعفر خازن جیسے لوگ نمایاں ہیں۔

259ھ/872ء میں ثابت بن قرہ کا اپنے ہم مذہبوں سے اختلاف ہوگیا، چنانچہ اسے حران کی صابی جماعت سے خارج کر دیا گیا۔ وہ بغداد آ گیا جہاں اس نے صابئیت کی ایک اور شاخ قائم کر لی۔ کچھ عرصے بعد خلیفہ قاہر باللہ کے عہد حکومت میں ثابت کے بیٹے سنان نے اسلام قبول کرلیا۔ تقریباً 364ھ/975ء میں خلیفہ مطیع للہ اور خلیفہ طائع للہ کے کاتب ابواسحاق بن ہلال صابی نے حران، رقہ اور دیار مضر میں رہنے والے ہم مذہبوں کے حق میں ایک فرمان جاری کرالیا جس کی رو سے اس کے بغدادی ہم مذہبوں سمیت تمام صابئین کو اہل ذمہ میں شمار کرلیا گیا۔

گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں بغداد اور حران میں بہت سے صابی موجود تھے مگر 424ھ/1033ء تک حران میں صرف ایک چاند کا معبد باقی رہ گیا تھا جو ایک قلعے کی شکل میں تھا۔ اسی سال اس معبد پر مصری فاطمیوں نے قبضہ کرلیا۔ گیارہویں صدی عیسوی کے وسط کے بعد حران میں صابیوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا، گو اس صدی کے آخر تک وہ بغداد میں پائے جاتے تھے۔

شہرستانی کے بیان کے مطابق، تمام صابئین تین نمازیں پڑھتے تھے۔ کسی میت کو چھونے کے بعد وہ اپنے آپ کو غسل کے ذریعے سے پاک کرتے تھے۔ سور، کتے، نیز پنجے والے پرندوں اور کبوتر کا گوشت ان کے ہاں حرام تھا۔ ختنے کی رسم موجود نہ تھی۔ طلاق صرف قاضی کے حکم سے واقع ہوتی اور ایک آدمی کے نکاح میں دو عورتیں نہیں ہوسکتی تھیں۔ [1]

سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''صابئین کے نام سے قدیم زمانے میں دو گروہ مشہور تھے۔ ایک حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیرو جو بالائی عراق، یعنی الجزیرہ کے علاقے میں اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیروی میں اصطباغ کے طریقے پر عمل کرتے تھے۔ دوسرے ستارہ پرست لوگ جو اپنے دین کو حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہما السلام کی طرف منسوب کرتے تھے اور عناصر پر سیاروں اور ستاروں کی فرماں روائی کے قائل تھے۔ ان کا مرکز حران تھا اور عراق کے مختلف حصوں میں ان کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ دوسرا گروہ اپنے فلسفہ و سائنس اور فن وطب کے کمالات کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوا اور وہ غالباً نزول قرآن کے زمانے میں اس نام سے موسوم نہ تھا۔'' [2]



صابئین کا قدیم مخطوط

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 12/3-6. [2] تفہیم القرآن، الحج 22:17.

3

شام اور لبنان

شام بشمول لبنان و فلسطین اور مصر ماضی قدیم میں فرعونی، یونانی اور رومی تہذیبوں کے خطے تھے ۔ اور یہاں اصنام پرستی کی مختلف شکلیں رائج تھیں۔ یہیں آج سے تقریباً سوا تین ہزار سال پہلے یہودیت نے جنم لیا اور یہیں دو ہزار سال قبل عیسائیت پروان چڑھی۔ اس حوالے سے ہم یہاں ان ممالک کی تاریخ و تہذیب اور مذاہب کی تفصیل بیان کر رہے ہیں ۔

شام وسیع معنی میں اس علاقے کو کہا جاتا تھا جو کوہ طارس (جنوبی ترکی) کے جنوب میں مشرقی بحیرۂ روم اور دریائے فرات کے درمیان واقع ہے لیکن بعد میں یہ نام مذکورہ علاقے کے صرف شمال مشرقی حصے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ فنیقیہ (لبنان)، فلسطین اور اردن کو اس سے الگ کر دیا گیا۔ قدیم شام کے مشہور شہر یہ تھے: دمشق، ارپد (تل ارنود)، حلب، انطاکیہ، قادس (Kadesh)، حماۃ اور تدمر (Palmyra)۔ [1] دمشق دنیا کے قدیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔

آج کا شام

موجودہ عرب جمہوریہ سوریہ (شام) بحیرۂ روم، لبنان، ترکی، فلسطین، اردن اور عراق میں گھرا ہوا ہے۔ اس کا دارالحکومت دمشق ہے۔ موجودہ شام 13 صوبوں میں منقسم ہے: دمشق، حلب، حماۃ، حمص، لاذقیہ (Latakia)، اِدلب، حسکہ، دیرالزور، درعا، سُویداء، طرطوس، رقہ اور قُنَیطرہ۔ جنوبی شام میں حوران کی سطح مرتفع ہے۔ اُردو میں ماضی کے ملک شام کو آج بھی ''شام'' ہی لکھا جاتا ہے۔ یاد رہے موجودہ شام میں الجزیرہ کا مغربی حصہ بھی شامل ہے

[1] انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم: 64/2.



دمشق شہر کا ایک منظر


شام و لبنان
عراق
اردن
دارالحکومت
ریلوے لائن
نہر
بین الاقوامی سرحد
شاہراہ
اہم شہر
دریا
موسمی ندی

جو ابو کمال (برلبِ فرات) سے لے کر دجلہ کے کنارے عین دیوار اور مغرب میں جرابلس (کرکمیش) تک واقع ہے۔

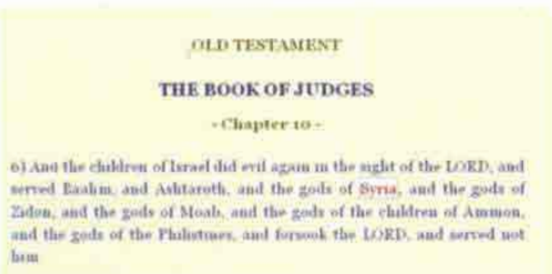
شام، ارام (آرام) اور سُوریہ

معروف محقق ڈاکٹر سید رضوان علی واسطی لکھتے ہیں: ''جنگ عظیم اول کے بعد سے اس ملک کا سرکاری نام سُوریہ ہے۔ قدیم عرب تواریخ اور جاہلی عرب شعراء کے اشعار میں اس کا نام شام ہے۔ یاقوت لکھتے ہیں: مؤرخین کے مطابق یہ نام (شام) حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے سام کے نام پر ہے۔ (انگریزی تورات میں سام کا نام Shem آیا ہے)۔[1]

ایک روایت کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کی سلطنت کے شمالی حصے میں 9 اسرائیلی اسباط کی جو حکومت قائم ہوئی، اس کا نام شامین تھا۔ اسلام سے قبل عرب تجار نے ''شامین'' کو مختصر کر کے ''شام'' کر دیا۔

ماضی کے ''شام'' میں وہ سارا علاقہ شامل تھا جو جنوبی ترکی اور دریائے فرات سے لے کر غزہ کے مغرب میں العریش تک اور بحیرۂ روم سے جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں جبل طے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ترکی کے سرحدی شہر مصیصہ، طرسوس، اضنہ (Adana) اور انطاکیہ وغیرہ بھی شامل تھے۔ بعض مفسرین نے سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت کے الفاظ: ﴿بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ﴾ سے سارا ملک شام بشمول فلسطین مراد لیا ہے۔ سورۂ قریش کی آیت: ﴿رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ﴾ میں رحلتِ صَیف (گرمائی کوچ) کی تفسیر بھی ملک شام کی طرف سفر سے کی گئی ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث کے الفاظ «اَللّٰهُمَّ! بَارِكْ لَنَا فِي شَامِنَا» ''اے اللہ! ہمارے شام میں برکت عطا فرما''[2] میں گویا فتحِ شام کی خوشخبری موجود ہے۔

''سوریہ'' شام کا قدیم یونانی نام ہے جس کی تصدیق انجیل لوقا سے بھی ہوتی ہے۔ اس کا ایک اور قدیم نام ''ارام'' (یا ''اِرم'') تھا جو دراصل سام بن نوح کے ایک بیٹے کا نام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں اردو بائبل کے عہد نامہ قدیم میں لفظ ''ارام'' آیا ہے، وہاں انگلش بائبل میں Syria (سیریا) کا لفظ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو مترجمین کے سامنے یونانی بائبل بھی تھی جس سے انگریزی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ اسی لیے انجیل لوقا (اردو بائبل) میں شام کا اصل یونانی نام ''سوریہ'' باقی رکھا گیا ہے۔[3]


OLD TESTAMENT

THE BOOK OF JUDGES

- Chapter 10 -

6) And the children of Israel did evil again in the sight of the LORD, and served Baalim, and Ashtaroth, and the gods of Syria, and the gods of Zidon, and the gods of Moab, and the gods of the children of Ammon, and the gods of the Philistines, and forsook the LORD, and served not him

انگریزی بائبل میں شام (سیریا) کا ذکر

[1] NIV Study Bible, P:19.

[2] صحيح البخاري: 1037. [3] اٹلس فتوحات اسلامیہ، ص: 179.

یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ ''یہ خناصرہ (نواح حلب) اور سَلَمیہ (نواح حمص) کے مابین ایک علاقہ ہے۔'' جب مسلمان دیار شام کو فتح کرتے ہوئے قنسرین پہنچ گئے تو انطاکیہ میں مقیم قیصر ہرقل نے حسرت سے کہا تھا: ''اے سوریہ (شام)! تجھے الوداع کہنے والے کا سلام، جسے اُمید نہیں کہ وہ کبھی لوٹ کر تیرے ہاں آئے گا۔''[1]

1950ء میں دمشق کے جنوب مشرق میں تل الصالحیہ کے مقام پر جو کھدائی ہوئی، اس سے یہاں چار ہزار سال قبل مسیح کے ایک شہری مرکز کا انکشاف ہوا ہے۔ تل الامرنہ کے کتبوں میں دمشق کا نام دمشکا (Dimashka) درج ہے جبکہ فرعونِ مصر رعمسیس سوم کے کتبے میں یہ نام درمسک (Darmesek) کی شکل میں ملتا ہے۔[2]

ابلا اور فنیقیہ

4000 ق م کے لگ بھگ شام کے شمالی ساحل پر ایک تجارت پیشہ قوم نے اغاریت نامی شہر بسایا۔ پھر تقریباً 3000 ق م میں ببلوس (موجودہ جبل) اور ابلا (شمال مغربی شام) کے شہر آباد ہوئے۔ ابلا (Ebla) کے کھنڈروں سے 15 ہزار سے زائد مٹی کی تختیاں برآمد ہوئی ہیں جن پر کندہ میخی رسم الخط کی تحریروں سے اس عہد کے واقعات معلوم ہوتے ہیں۔[3] 1500 ق م کے لگ بھگ لبنان کے ساحل پر صور (Tyre)، صیداء (Sidon) اور طرابلس (Tripoli) جیسے شہر بسائے گئے اور اس خطے کا نام فنیقیہ (Phoenicia) پڑ گیا۔ یہ نام ایک یونانی لفظ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں ارغوانی (Purple) کیونکہ یہاں کے لوگ ایک مہنگے طریقے سے کپڑوں کو ارغوانی رنگ دیتے تھے۔ یوں تاریخ میں یہ قوم فنیقی (Phoenician) مشہور ہوئی۔ فنیقی بعل دیوتا کی پوجا کرتے تھے۔ دسویں صدی ق م میں ابی بعل کا فرزند حیرام فنیقیہ کا بادشاہ تھا۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام بحیرۂ روم کی تجارت کے لیے ایک بیڑا تیار کرانا چاہتے تھے تو حیرام نے انھیں تعمیر کا سامان اور اچھے کاریگر مہیا کیے تھے۔[4]



قدیم شامی شہر ابلا سے برآمد شدہ مٹی کی تختی

1000 ق م کے بعد فنیقیوں نے شمالی افریقہ جا کر نئے شہر آباد کیے، مثلاً: ٹریپولی یا طرابلس (لیبیا) جس کا نام انھوں نے شام کے مشہور شہر کے نام پر رکھا۔ ان کا آباد کیا ہوا دوسرا مشہور شہر قرطاجہ یا قرطاجنہ (Carthage) تھا جس کی بنیاد 814 ق م میں رکھی گئی۔ قرطاجنہ کے کھنڈر تیونس میں واقع ہیں۔ فنیقیوں نے جب شمالی افریقہ سے

[1] معجم البلدان، مادة: سورية. [2] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 398/9. [3] وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا. [4] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 62/2.



قرطاجنہ (تیونس) کے کھنڈر

آگے بڑھ کر اسپین کے مشرقی ساحل پر قبضہ کیا تو وہاں بھی ایک قرطاجنہ یا کارٹاہینا (Cartagena) بسایا جس کے نام سے کولمبیا (جنوبی امریکہ) میں ہسپانویوں کا آباد کردہ ایک شہر بھی موجود ہے۔ [1]

دمشق کی آرامی حکومت

شام میں سب سے پہلے سامی النسل آرامیوں کی آبادی کا نشان ملتا ہے۔ مختلف اوقات میں یہاں اکادی، اہل اُر، حمورابی اور فراعنۂ مصر قابض رہے۔ فرعون تھتموسس سوم نے پندرھویں صدی ق م میں دمشق فتح کیا تھا۔ یہ شہر 1450 ق م سے لے کر ایک سو سال مصریوں کے تسلط میں رہا، پھر اس پر حتیوں نے قبضہ کر لیا۔ ان کے بعد پھر مصری قابض رہے۔ دسویں صدی ق م میں اس شہر کو داود علیہ السلام نے فتح کیا۔ اس کے بعد یہ شہر ایک مضبوط آرامی سلطنت کا مرکز بنا جو 732ء تک قائم رہی۔ بائبل کی کتاب سلاطین 2 میں لکھا ہے کہ حضرت الیسع (الیشع) علیہ السلام کے کہنے پر شاہ آرام کے سپہ سالار نعمان ابرص نے دریائے اردن میں سات غوطے لگائے تو کوڑھ سے نجات پائی۔

اشوریوں سے رومیوں تک

732 قبل مسیح میں اشوریوں نے آرامیوں کو شکست دے کر شام فتح کر لیا اور دمشق کا معبد اور محل لوٹ لیا۔ چھٹی صدی ق م کے اوائل میں کلدانی حکمران بخت نصر نے شام پر یورش کی۔ 539 ق م میں شاہ فارس کوروش کبیر (ذوالقرنین) نے اس پر قبضہ کر لیا۔ 332 ق م میں سکندر اعظم نے شام پر تسلط جمایا اور اس کے بعد (اس کے یونانی جانشین) بطلیموس (Ptolemy) اور اینٹی گونس یکے بعد دیگرے دمشق کے مالک بنے، پھر یونانی سلیوکیوں نے اس پر قبضہ کر کے دمشق کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ 64 ق م میں جب رومی سپہ سالار پومپی نے شام کو رومی سلطنت میں شامل کیا تو صوبائی دارالحکومت انطاکیہ ٹھہرا۔

[1] Philips Illustrated Atlas: p.55,144.

4

مصر اور وادیِ نیل

مصر شمالاً جنوباً وادیٔ نیل کے اس حصے پر مشتمل ہے جو بحیرۂ روم میں نیل کے ڈیلٹا سے اسوان اور وادی حلفا (سودان) تک پھیلا ہوا ہے۔ مشرق میں مصر بحیرۂ احمر (قلزم) کے ساحل تک ہے اور مغرب میں اس کی حدود لیبیا تک وسیع ہیں۔ شمال مشرق میں صحرائے سیناء بھی مصر میں شامل ہے۔ قدیم مصری زبان میں اس علاقے کو کیمٹ کہتے تھے جس کے معنی ہیں ''سیاہی مائل زمین''۔ وادی کی پوری لمبائی ساڑھے پانچ سو میل ہے۔ جنوب میں اس کی چوڑائی کا اوسط بارہ میل کے قریب ہے۔ ابتدا میں وادی کے دو حصے تھے: ایک ڈیلٹا، یعنی مصر زیریں، دوسرا اصل وادی، یعنی مصر بالا یا مصر صعید۔ بادشاہ مینس کے زمانے سے پہلے دونوں حصوں میں دو جداگانہ سلطنتیں قائم تھیں۔ ہیروڈوٹس نے مصر کو ''عطیۂ نیل'' قرار دیا ہے۔

قدیم فراعنہ اور اہرامِ مصر

مصر قدیم میں شمسی سال 365 دن کا مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے اجرا کی اغلب تاریخ 2781 ق م ہے۔ تحریر کا کام تصویروں سے لیا جاتا تھا، پھر کچھ نشانات مقرر ہوگئے۔ ہیروغلفی اور شکستہ خط کا دستور ابتدائی زمانے سے چلا آتا تھا۔ قدیم بادشاہی کے دور (2900 تا 2100 ق م) میں فرعون کو خدا مانا جاتا تھا، زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی۔ فرعون ''پراؤ'' (Per-o) یعنی خانوادۂ اعظم سے مرکب ہے۔ اولیں فرعونوں کے معماروں نے بڑے بڑے اہرام، شاندار ستونوں والے محل اور مندر تعمیر کرنے شروع کیے۔[1] جیزہ میں فرعون خوفو کا ہرم سب سے بڑا ہے۔ یہ 486 فٹ

[1] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 2/35-37.



جیزہ (مصر) میں فراعنہ کے اہرام


مصر اور دریائے نیل
بین الاقوامی سرحد
اہم شہر
دارالحکومت
شاہراہ
پہاڑی چوٹی
ریلوے لائن
دریا
نہر
کلومیٹر 0 40 80 120 160 200
بحیرۂ روم
فلسطین
اردن
سعودی عرب
مصر
مغربی صحرا
وادی جدید
سوڈان
بحیرۂ احمر
جزیرہ نمائے سیناء
میدان تیہ
قاہرہ
اسکندریہ
بیت المقدس
عمان
غزہ
العریش
بور سعید
دمیاط
رشید
طنطا
اسماعیلیہ
جبل طور
مدین
عقبہ
اسیوط
سوہاج
قنا
الاقصر
اسنا
ادفو
اسوان
کوم امبو
بحیرۂ ناصر
راس بناس
مرسی علم
قصیر
سفاجہ
غردقہ
راس محمد
العالمین
نخلستان بحریہ
نخلستان فرافرہ
نخلستان داخلہ
نخلستان خارجہ
باریس
منیا
بنی سویف
الفیوم
برکہ قارون

(148 میٹر) اونچا اور تقریباً 23 لاکھ حجری سلوں سے بنا ہوا ہے۔[1] بادشاہوں کی نعشوں کو خاص مسالے لگا کر اہرام میں دفن کیا جاتا تھا اور ان کے مقبروں میں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ زندگی کے دیگر لوازمات بھی رکھے جاتے تھے۔ مصریوں کے خیال کے مطابق موت کے بعد روح کا ایک نیا سفر شروع ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اجسام کو محفوظ کر کے اور زندگی کے لوازمات ساتھ رکھ کر وہ اس روحانی سفر میں جسم کو بھی ساتھ دینے کے قابل بنا رہے ہیں۔

مصری دیوتا اور آفتاب پرستی

ابتدائی زمانے میں ہر شہر کا اپنا دیوتا تھا اور ان میں سے اکثر کی شکلیں مختلف جانوروں کی سی تھیں۔ چند اہم دیوتاؤں کے نام تاہ، اتوم، ہورس، آمون (عمون) اور رِع تھے۔ ہورس مصر کا شاہی دیوتا تھا، اس کی شکل عقاب کی تھی۔ پہلے اُسے آسمانوں کا دیوتا مانا جاتا تھا، پھر سورج دیوتا کہنے لگے۔ مصر میں آفتاب پرستی کا آغاز ہیلیو پولس سے ہوا۔ یونانی زبان میں ہیلیو پولس کے لفظی معنی بھی ''شہرِ آفتاب'' کے ہیں۔ اسی شہر کے مذہبی پیشواؤں نے مصر میں پہلا مذہبی نظام تیار کیا اور دیوتا رع (Re) کی پرستش کو سرکاری مذہب بنا دیا۔

درمیانی شاہی خاندان (2100 تا 1580 ق م)

مصری حکمرانوں کے بارہویں خاندان کے بادشاہوں نے نوبیا (سوڈان) کو فتح کیا اور فلسطین پر بھی یورش کی۔ چودھویں خاندان کے زمانے میں باہر سے حملے شروع ہوئے اور 1650 ق م کے لگ بھگ مصر پر ان لوگوں نے قبضہ کر لیا جو تاریخ میں ہکسوس (Hyksos) یا چرواہے بادشاہ کے نام سے مشہور ہیں۔ عرب مؤرخ ان کے لیے عمالیق کا نام استعمال کرتے ہیں۔ یہ سامی نسل سے تھے اور فلسطین و شام سے مصر پہنچے تھے۔ یہی لوگ سب سے پہلے مصر میں گھوڑے لے کر گئے۔



ہکسوس بادشاہ اپوفیس کی مہر

مصر میں یوسف علیہ السلام اور بنی اسرائیل کا اقتدار

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے یعقوب علیہ السلام کنعان (فلسطین) میں رہتے تھے۔ ان کے بارہ فرزندوں میں سے یوسف علیہ السلام باپ کے بہت چہیتے تھے۔ ان کے سوتیلے بھائیوں نے حسد میں مبتلا ہو کر سیدنا یوسف علیہ السلام کو ایک کنویں میں پھینک دیا۔ وہاں سے گزرنے والے ایک قافلے نے انھیں کنویں سے نکالا اور مصر لے جا کر بیچ دیا۔ یوں یوسف علیہ السلام کو ہکسوس بادشاہ اپوفیس کے عہد میں مصر کے دارالحکومت افاریس (تانیس) میں فروخت کیا گیا۔ افاریس آج کل

[1] History of the World, P:37.



صان الحجر (افاریس) کے کھنڈر (مصر)

صان الحجر کہلاتا ہے جو کہ بحیرۂ منزلہ (بحیرۂ تانیس) کے قریب واقع ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کو ''عزیز'' (فوطیفار) نے خریدا تھا جو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق شاہی خزانے کا افسر تھا۔ فوطیفار کی بیوی زلیخا کی طرف سے یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو معاملہ ہوا، اس کے نتیجے میں انھیں نو دس برس قید بھگتنی پڑی۔ آپ خوابوں کی تعبیر کا علم رکھتے تھے، چنانچہ آپ نے دو قیدیوں کے خوابوں کی بالکل صحیح تعبیر بتائی۔ ان میں سے ایک جو رہا ہوا، اس نے برسوں بعد جیل میں آکر آپ سے بادشاہ کے ایک خواب کی تعبیر پوچھی۔ آپ نے جو تعبیر بتائی اسے سن کر بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کو دربار میں بلا بھیجا اور انھیں نائبِ شاہ یا نائب السلطنت (رومی اصطلاح میں ڈکٹیٹر) مقرر کر دیا جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے خود کو ملکی خزانوں پر مامور کیے جانے کا تقاضا کیا تھا۔

سورۂ یوسف میں ان کے لیے ''مَلِک'' (بادشاہ) اور ''عزیز'' (صاحبِ اقتدار) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے شاہی خواب کی اپنی دی گئی تعبیر کے مطابق آنے والے قحط کے زمانے میں رعایا کو غلہ فراہم کرنے کے بہترین انتظامات کیے حتی کہ ان کے علّاتی (پدری) بھائی ملک کنعان سے غلہ لینے کی غرض سے آنے والے قافلے کے ساتھ مصر آئے۔ دوسری بار وہ یوسف علیہ السلام کے سگے بھائی بنیامین کو بھی ساتھ لائے جنھیں یوسف علیہ السلام نے تدبیر سے اپنے پاس ٹھہرا لیا۔

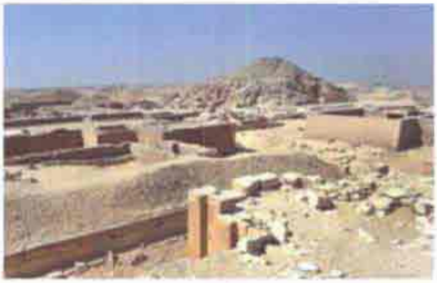
جب آپ کے بھائی تیسری بار غلے کے لیے آئے تو یوسف علیہ السلام نے ان کے سامنے اپنی شخصیت کا انکشاف کیا اور وہ برسرِ اقتدار بھائی کو دیکھ کر اپنے سابقہ رویے پر نادم ہوئے۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد اور بھائیوں کو بھی مصر بلا لیا۔ آل یعقوب (بنی اسرائیل) جشن کے علاقے میں بلبیس (موجودہ سفط الحنۃ) کے مقام پر آباد ہوئے۔ یوں بنی اسرائیل کو سیدنا یوسف علیہ السلام کی وجہ سے مصر میں اقتدار ملا اور ان کے بعد بھی ہکسوس دور میں اقتدار عملاً بنی اسرائیل کے ہاتھ میں رہا۔[1] سترہویں شاہی خاندان کے زمانے میں ہکسوس کے خلاف رزم و پیکار کا سلسلہ شروع ہوا اور 1532 ق م میں انھیں مصر سے نکال دیا گیا۔[2]

[1] اطلس القرآن (اردو)، ص: 116-119، تفہیم القرآن، یوسف 12:87، قصص القرآن: 1/224.

[2] Oxford English Reference Dictionary.

جدید شاہی خاندان (1580 تا 332 ق م)

اخناتون (1375 تا 1358 ق م) اٹھارویں شاہی خاندان کا بادشاہ تھا۔ اس زمانے میں فلسطین، شام اور فنیقیہ کے شہر مصریوں کے قبضے سے نکلنے لگے۔ اخناتون کے بعد یکے بعد دیگرے اس کے دو داماد تخت نشین ہوئے۔ ان میں سے توتنخ آمون خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وادیِ شاہاں سے اس کی لاش کے علاوہ مقبرے کی ہر شے 1922ء میں محفوظ نکل آئی اور وہ تمام اشیاء قاہرہ کے مصری عجائب خانے میں موجود ہیں۔ [1]



مصر کا قدیم دارالحکومت تل الامرنہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دو فرعون

جب ہکسوس بادشاہوں کا دورِ حکومت ختم ہوگیا تو اہل مصر (قبطی) بنی اسرائیل کو اجنبی سمجھتے ہوئے ان پر ظلم کرنے لگے اور انھیں غلام بنالیا۔ ایک عجیب واقعہ فرعون رعمسیس ثانی کے عہد میں پیش آیا جس کا دارالحکومت طیبہ (Thebes) تھا۔ نجومیوں نے اسے بتایا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تمھاری سلطنت کے خاتمے کا باعث بنے گا۔ اس خدشے کے پیش نظر فرعون نے بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے لڑکے قتل کروانے شروع کر دیے مگر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں معجزانہ طور پر بچا لیا اور بالآخر انھوں نے فرعون ہی کے محل میں پرورش پائی۔

جب موسیٰ علیہ السلام جوان ہوئے تو انھیں اپنے ہم قوم بنی اسرائیل کے آلام و مصائب دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا تھا، چنانچہ ایک روز ان کے ہاتھوں ایک قبطی مارا گیا جو بنی اسرائیل کے ایک فرد کو پیٹ رہا تھا۔ اس قبطی کے قتل کی خبر جب دربار فرعون تک پہنچی تو امراء نے موسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کا مشورہ دیا، تاہم وہ پیشگی اطلاع ملنے پر مصر سے نکل آئے اور مدین کی راہ لی۔

مشہور روایت کے مطابق ان دنوں مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔ موسیٰ علیہ السلام ان کی خدمت میں دس سال رہے اور شعیب علیہ السلام نے اپنی ایک بیٹی ان سے بیاہ دی۔ آٹھ یا دس سال بعد جب وہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ مصر کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں سردی کے باعث آگ لینے یا راستہ دریافت کرنے کی غرض

[1] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 2/38-40.



کوہ طور جہاں موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز کیا گیا

سے کوہ طور پر گئے۔ وہاں انھیں نبوت سے سرفراز کیا گیا اور فرعون کے پاس جا کر اللہ کا پیغام پہنچانے کا حکم ملا۔ موسیٰ علیہ السلام کی خواہش پر اُن کے بھائی ہارون علیہ السلام کو ان کا معاون بنایا گیا۔ اس دوران میں رعمسیس ثانی فوت ہو چکا تھا اور اس کا بیٹا منفتاح ممفس میں حکمران تھا، وہ اپنے آپ کو خدا کہلواتا تھا۔

بنی اسرائیل کا مصر سے خروج

موسیٰ اور ہارون علیہما السلام نے فرعون منفتاح کو اللہ کا پیغام پہنچایا جس میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو آزاد کردے مگر وہ بدستور اپنی خدائی کے زعم اور تکبر میں مبتلا رہا۔ بنی اسرائیل پر بدستور مظالم ڈھائے جاتے رہے۔ ایک رات اللہ کے حکم سے سیدنا موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے چل پڑے۔ فرعون کو پتا چلا تو وہ لشکر لے کر تعاقب میں روانہ ہوا، راستے میں پانی (بحیرۂ قلزم) حائل تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل تو پانی کے بحرِ زخار کو پار کر گئے مگر فرعون اور اس کے لشکری اس میں غرق ہوگئے۔ یہ واقعہ 1224 ق م میں پیش آیا۔ فرعونیوں کی غرقابی جس مقام پر ہوئی، آج کل اُسے بحیرات مرّہ کہا جاتا ہے جن میں سے نہر سویز گزاری گئی ہے۔[1]



نہر سویز اور بحیرۂ قلزم کا فضائی منظر جہاں فرعون غرق ہوا

(بنی اسرائیل اور موسیٰ علیہ السلام کے بقیہ احوال ''فلسطین اور یہودیت'' کے ضمن میں ملاحظہ کیجیے۔)

مصر پر ایرانی اور یونانی تسلط

526ق م میں ہخامنشی بادشاہ کمبوجیہ نے مصر پر یلغار کی اور اسے سلطنتِ ایران میں شامل کر لیا۔ دو سو برس بعد اسکندر اعظم شاہ ایران دارا سوم کو اناطولیہ میں شکست دینے کے بعد ساحلِ شام اور فلسطین کو فتح کرتا ہوا مصر کی طرف بڑھا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ مصریوں کو ایرانیوں کے پنجے سے آزاد کرانے آیا ہے۔

مصر پر اسکندر کا قبضہ ہوگیا تو مصری پروہتوں نے اسے آمون (عمون) دیوتا کا بیٹا اور فراعنہ کا وارث قرار دے

[1] اطلس القرآن، ص:139-142.

دیا۔ اسکندر نے اپنے ایک مہندس (انجینئر) قراطیس سے ساحل بحر پر اپنے نام سے ایک شہر اسکندریہ تعمیر کرایا اور مصر میں اقلیونیدس کو اپنا نائب مقرر کیا اور خود ایشیا کی تسخیر کے لیے روانہ ہو گیا۔ [1]

مصر کے بطلیموسی حکمران

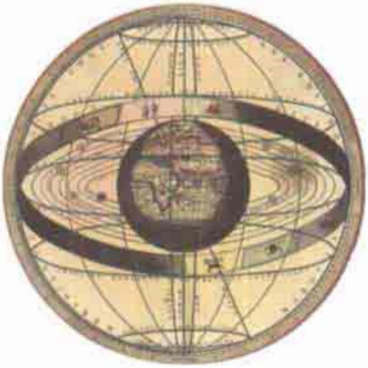
بطلیموسی خاندان کی بنیاد 305 ق م میں بطلیموس اول یونانی نے رکھی تھی جسے سکندر اعظم نے بابل کا گورنر مقرر کیا تھا۔ بطلیموس دوم (285 تا 246 ق م) نے قدیم مصری فرعونوں کی طرح بہن بھائی کی شادی کو رواج دیا۔ دراصل اسے اپنی بہن سے بہت محبت تھی اور وہ اسے ہر حال میں اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اس خاندان کی ہر لڑکی کی شادی حکمران بھائی سے ہوتی رہی۔ بطلیموس سیزدہم اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا جس کی شادی اس کی بہن قلوپطرا سے ہوئی تھی۔ یہ شادی رومی حکمران جولیس سیزر نے کرائی تھی جو مصر پر قابض ہو چکا تھا۔ 44 ق م میں سیزر مارا گیا تو قلوپطرا نے اپنے شوہر کو قتل کرا دیا اور خود مختار حکمران (47 تا 30 ق م) بن گئی۔ جب جولیس سیزر کے جانشین آگسٹس سیزر نے مصر پر حملہ کیا تو قلوپطرا نے اپنے آپ کو زہریلے سانپ سے ڈسوا کر موت کو گلے لگا لیا اور مصر رومی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔ [2]



بطلیموس دوم کا سکہ

بطلیموس: ماہر فلکیات اور جغرافیہ دان

اسکندریہ کا مشہور ہیئت دان و جغرافیہ نویس بطلیموس (Ptolemy) دوسری صدی عیسوی میں پیدا ہوا۔ اس نے تمام دنیائے معلوم کا ایک نقشہ تیار کیا اور پھر اس کی تشریح و تفصیل کے لیے ایک کتاب Geography (جغرافیہ) لکھی۔ سب سے پہلے اسی نے دنیا کو طول بلد اور عرض بلد میں منقسم کیا اور ان کے ذریعے سے مقامات کا تعین کیا۔ علم فلکیات پر اس کی کتاب کا عربی ترجمہ المجسطی (Almagest) کے نام سے مشہور ہے جس میں 1022 ستاروں اور سیاروں کے مقامات اور ان کی پیمائشیں دی گئی ہیں۔ [3]



بطلیموس کا بنایا ہوا نقشہ

[1] تاریخ و تہذیب عالم، ص: 46، تاریخ مصر، ص: 37. [2] انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم: 107،106/2. [3] تاریخ ارض القرآن (کامل): 30،29/1؛...... Oxford English Reference Dictionary,p:166

سارا پیس دیوتا کا شہر

عہد موسوی سے رومی دور تک مصر میں جن دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی تھی، ان میں اوسیرس اور اس کی بیوی آئسیس کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ علاوہ ازیں سارا پیس نامی دیوتا کا عظیم الشان مندر دارالحکومت اسکندریہ میں واقع تھا۔ سارا پیس کا قوی ہیکل بُت سونے، چاندی اور مختلف دھاتوں کی بہت سی تختیوں کو جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ وہ بالکل مشتری کے بُت کے مانند تھا سوائے اس کے کہ اس کے سر پر ایک ٹوکری یا پیمانہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں بہت بڑا تین دُم کا سانپ تھا جس کے سر بھی تین تھے، یعنی کتے، شیر اور بھیڑیے کے سر۔ مصری سارا پیس کو زمین کا خدا سمجھ کر پوجتے تھے حتی کہ لوگ اسکندریہ کو اس کے نام پر "سارا پیس کا شہر" کہنے لگے تھے۔

مصر میں عیسائیت کا جبری نفاذ

جب عیسائیت نے تثلیثی صورت اختیار کرلی، اس وقت سے مصر میں اس مذہب کے عقائد پھیلنے لگے تھے۔ بت پرست رومی حکمران ڈیوکلیٹن کے عہد میں جہاں سلطنت کے اور حصوں میں تثلیثی عیسائیوں پر ظلم ہوتا تھا، وہاں مصر میں بھی اس عقیدے والوں کو داروگیر کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ شاہی حکم سے ہزاروں مصری عیسائی قتل کر دیے گئے، تاہم جب عیسائیت سلطنت روم (بازنطینی سلطنت) کا سرکاری مذہب قرار پایا تو قیصر تھیوڈوسیس اول نے تمام رومی رعایا کو تثلیثی مذہب اختیار کرنے کا حکم دے دیا اور بت اور بت خانے تباہ کیے جانے لگے۔ اسکندریہ کا آرچ بشپ تھیوفلس اپنے معتقدین کی فوج لے کر مندر سارا پیس پر چڑھ دوڑا۔ اس مذہبی خانہ جنگی میں طرفین کے سینکڑوں افراد مارے گئے اور



تھیوڈوسیس اول کا سکہ

مندر کو آگ لگا دی گئی جس کے ساتھ ہی اسکندریہ کی عظیم الشان لائبریری جل کر خاک ہوگئی۔ اس کتب خانے کی تباہی کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپا جاتا ہے مگر عیسائی مؤرخ ایڈورڈ گبن نے کیتھولک عیسائیوں کے ہاتھوں اسکندریہ کی بیش قیمت لائبریری کے لوٹے جانے اور تباہی کا حال بیان کرتے ہوئے اپنا غصہ ظاہر کیا ہے۔[1] علوم وفنون کی ماہر ہپاتیا زہرہ جبیں کو مریم کے بُت کے سامنے عیسائیوں نے لاٹھیوں سے مار ڈالا۔[2] اس کے بعد دیگر تثلیثی فرقوں کی باری آئی۔

ان دنوں مصر کی قبطی آبادی کا مذہب زیادہ تر یعقوبی تثلیثی عقیدے پر مبنی تھا جو رومن کیتھولک عقیدے کے خلاف

[1] قدیم مذہبی تاریخ، ص:78,77. [2] تاریخ مصر از مفتی حکیم انتظام اللہ شہابی، ص:39.

سمجھا جاتا تھا۔ اس تھوڑے اختلاف کی بنا پر قیصر جسٹینین کے عہد میں صرف اسکندریہ میں دو لاکھ یعقوبی عیسائی قتل کرڈالے گئے۔ جو مصری رومن کیتھولک عقیدہ نہیں مانتے تھے، بعض اوقات انھیں سمندر میں ڈبو دیا جاتا تھا۔ [1]

[1] قدیم مذہبی تاریخ، ص:79,78.



قبطی مندر سارا پیس (اسکندریہ) کے کھنڈر

فلسطین اور یہودیت

قدیم فلسطین جغرافیائی تقسیم کے لحاظ سے شام کا جنوب مغربی حصہ تھا جو عرض میں بحیرۂ روم سے بادیۂ شام تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ طول میں کوہ حرمون (جبل الشیخ) سے بحیرۂ لوط (بحیرۂ مردار) کے جنوب میں بئر سبع تک تھا۔ اس کا نام فلسطین اس لیے پڑا کہ یہاں وہ لوگ رہتے تھے جنھیں ہیروڈوٹس نے ''فلستی'' (فلسطینی) قرار دیا۔ عبرانی زبان میں دریائے اردن کے مغرب میں واقع سرزمین کا نام کنعان (فلسطین) ہے۔

جغرافیائی طور پر قدیم فلسطین چار مختلف خطوں میں بٹا ہوا تھا: پہلا وہ میدانی علاقہ ہے جو ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ سطح مرتفع کی پٹی کے مغرب میں واقع ہے۔ دوسرا حصہ اس مغربی سطح مرتفع پر مشتمل ہے جس کے شمال میں جبال الجلیل (گلیل) یا طبریہ اور جنوب میں کوہستان افرائیم (جبال نابلس) اور کوہستان یہودیہ (جبال الخلیل) واقع ہیں۔



جبال الجلیل اور شہر طبریہ



کوہستان افرائیم



کوہستان یہودیہ

تیسرا حصہ دریائے اردن کی وادی ہے۔ بعض مقامات پر یہ وادی سطح سمندر سے سوفٹ نیچی ہے۔ اس کے جنوب میں بحیرۂ مردار سطح سمندر سے 1200 فٹ نیچے ہے۔ اب یہ تینوں حصے جدید جغرافیائی تقسیم میں فلسطین کہلاتے ہیں۔ چوتھا حصہ دریائے اردن کی مشرقی سطح مرتفع ہے جس میں دریائے یرموک، یبوق (زرقاء) اور ارنون (موجب) وغیرہ بہتے ہیں۔ اس حصے میں آرامی، بنی عمون اور موابی آباد تھے۔ بعد میں اس کے بعض حصوں میں بنی اسرائیل کے کچھ قبیلے بھی بس گئے، مثلاً: روبن، جد اور قبیلۂ منسا (منشے یا منسے) کا ایک حصہ۔

فلسطین کے اولین آبادکار

فلسطین میں سامی زبانیں بولنے والے قبیلوں کی آمد کا سلسلہ زمانۂ قدیم ہی سے شروع ہو چکا تھا۔2000 ق م میں اموری یہاں وارد ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام 1800 ق م میں اپنے وطن سے نکل آنے کے بعد یہاں پہنچے۔ ان کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کے بڑے بیٹے عیسو کی اولاد یہیں آباد ہوئی۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بیٹے کچھ عرصہ یہاں رہنے کے بعد مصر میں جا آباد ہوئے۔ مصر سے واپسی کے بعد وہ بھی عیسو بن اسحاق علیہ السلام سے اپنی رشتہ داری کی بنا پر ان کے ساتھ رہنے لگے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ ساری اولاد جو فلسطین میں مقیم رہی، عبری کہلائی۔ اس دوران میں تیرہویں صدی ق م میں فلستی یا فلسطینی اس علاقے میں آن آباد ہوئے تھے۔ بائبل میں عبرانی لوگوں کے لیے لفظ ''عبری'' استعمال ہوا ہے۔[1] ''عبر'' یا ''عابر'' کے معنی عبرانی میں ''پار کے علاقے'' کے ہیں۔ اس نام سے عبرانیوں کو شاید اس لیے پکارا گیا کہ وہ دریائے فرات کے پار کے علاقے سے آئے تھے یا اس لیے کہ وہ عابر کی اولاد تھے۔ عابر، سلح (شالخ) کا بیٹا اور سیم (سام) کا پوتا تھا۔ یہ فلج اور یقطان کا باپ تھا۔[2]

عہد نامۂ قدیم کے مطابق عبریوں میں وہ تمام قومیں شریک ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہونے کی دعویدار ہیں، مثلاً: اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام کے دونوں بیٹوں اسرائیل (یعقوب) اور عیسو (ادوم[3]) کی اولاد، نیز حضرت لوط علیہ السلام کے بیٹوں موآب اور عمون کی اولاد۔ آل ادوم اور آل لوط بحیرۂ مردار کے جنوب میں آباد ہوئے۔ آرامیوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بھائی ناحور کی اولاد ہیں۔ سامیوں کے علاوہ جو دوسرے گروہ فلسطین پر حملہ آور ہوئے، وہ یا تو حوری ہیں جو ادومیوں سے پیشتر سرزمین ادوم پر قابض تھے یا حتی (Hittites) اور فلسطینی۔[4]

کنعان (فلسطین) میں بت پرستی

کنعان میں اس دور میں جو زبان رائج تھی، وہ عبرانی کہلائی۔ یہ سامی بول چال کی شمال مغربی شکل تھی جو فنقی، موابی اور اموری بول چال سے مشابہ تھی۔ اس ملک کی تہذیب پر بابلی تہذیب کا اثر سب سے زیادہ پڑا۔ مصر سے تعویذ، منتر اور بعض مذہبی اعمال یہاں پہنچ گئے۔ ہر علاقے کا ایک الگ بت تھا جسے ''بعل'' کہتے تھے۔ اسے کسی

[1] کتاب مقدس (پیدائش)14:39. [2] کتاب مقدس (پیدائش) 25،24:10. [3] عیسو کا نام ''ادوم'' (لال) اس لیے پڑا کہ جب وہ جنگل سے تھکا ہوا آیا تو اس نے اپنے بھائی یعقوب سے وہ لال لال چیز جو وہ پکا رہا تھا، مانگی۔ (پیدائش 30:25) [4] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 51/2.

پہاڑی پر اونچی جگہ رکھ لیا جاتا تھا۔ عمارت کوئی نہ بنائی جاتی، البتہ آس پاس کے مقام کو بہت مقدس مانا جاتا۔ ایک دیوی کی پوجا بھی کی جاتی تھی جس کا نام عستارات (عشتار) تھا۔ آخری برنجی دور (2100 ق م تا 1500 ق م) میں فلسطین پر مصر کے چرواہے بادشاہ (ہکسوس) حکومت کرتے رہے۔ ابتدائی آہنی دور (1200 ق م تا 900 ق م) میں اسرائیلیوں نے کوہستان افرائیم پر قبضہ کرلیا۔ فلستی جو بنی اسرائیل سے پہلے یہاں آباد تھے، ساحلی علاقے پر قابض رہے جہاں انھوں نے پانچ شہری سلطنتیں منظم کرلیں، یعنی عسقلان (Ashkelon)، اشدود، عقرون (Ekron)، جات (Gath) اور غزہ۔[1]



سلطنتِ عسقلان کے قدیم آثار



سلطنتِ عقرون کا قدیم کتبہ



سلطنتِ جات کے کھنڈر

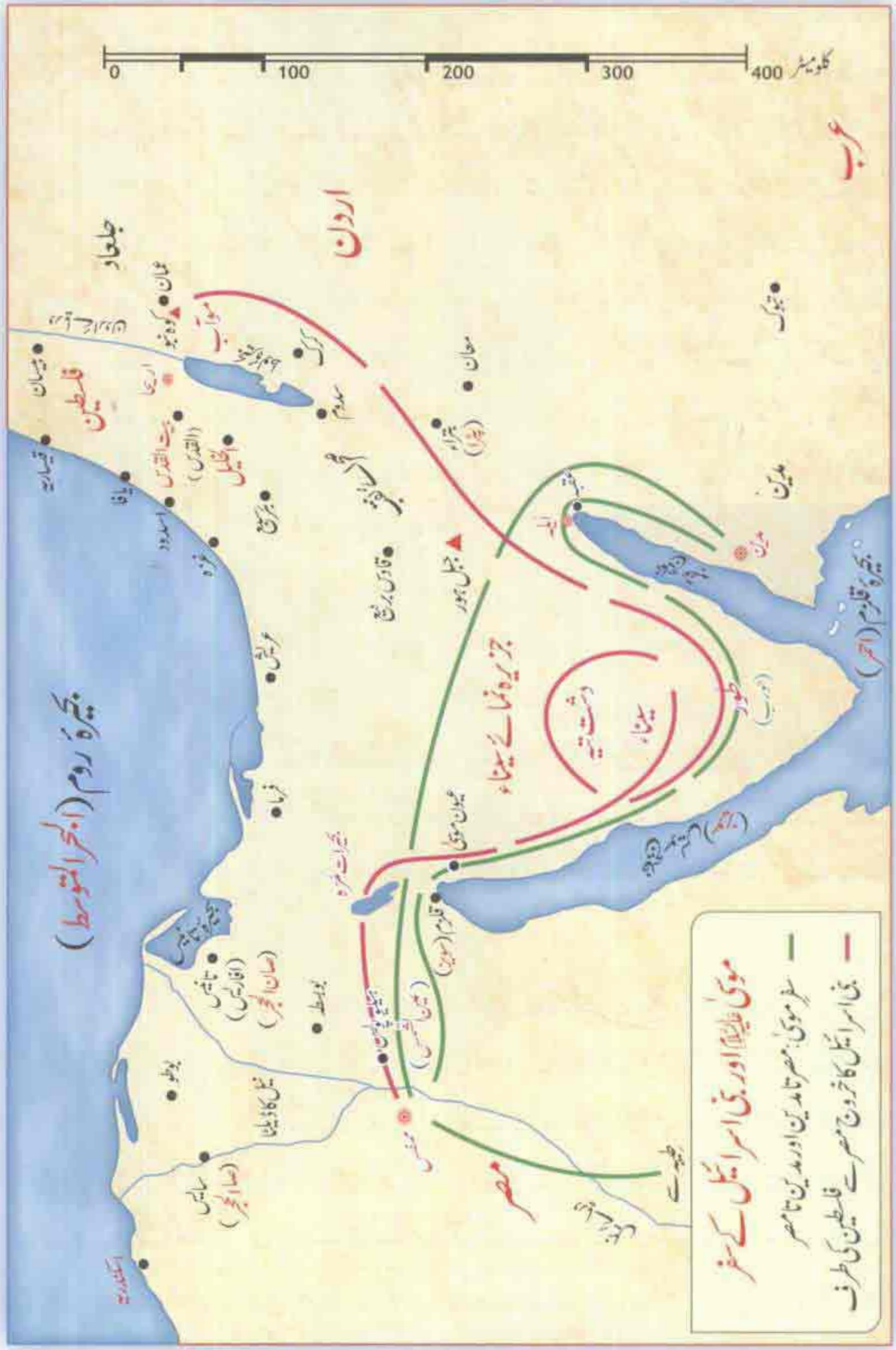
بنی اسرائیل کی دشت نوردی اور یہودیت کی تشکیل

تیرھویں صدی ق م میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسرائیلیوں کو اہل مصر کی غلامی سے نجات دلائی تھی اور آپ کی تبلیغ سے وہ یہوواہ (اللہ) کی پرستش کرنے لگے تھے، یعنی توحید کے قائل ہوگئے تھے۔

مصر سے فلسطین جاتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جزیرہ نمائے سینا میں کوہ طور (حورب) پر چالیس راتوں کا میقات پورا کیا۔ ذاتِ الٰہی کو دیکھنے کی خواہش پر انھیں تجلیِ ذات کے اثرات کا مشاہدہ کرایا گیا اور پھر تختیوں کی شکل میں تورات عطا کی گئی۔ اس دوران میں بنی اسرائیل نے میدانِ راحہ میں سامری کے فریب میں آکر بچھڑے کی پوجا شروع کر دی تھی اور حضرت ہارون علیہ السلام کے روکنے سے بھی نہ رُکے۔ ان کے لیے اس ارتداد کی توبہ کا طریقہ یہ تجویز ہوا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں قتل ہوں۔ اسرائیلی روایات کے مطابق شرک نہ کرنے والوں نے اپنے قریبی عزیزوں کو قتل کیا۔[2] اس طرح تورات کے مطابق ستر ہزار بنی اسرائیل قتل ہوئے۔

بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ حورب سے روانہ ہو کر قادس (قادیش) برنیع پہنچے۔ وہاں انھوں نے کنعانیوں کے ناقابلِ تسخیر ہونے کی باتیں سنیں تو ارض مقدس فلسطین میں داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ

[1] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 52/2. [2] تفسیر ابن کثیر، البقرۃ 2:54.


0
100
200
300
400 کلومیٹر
اردن
عرب
مصر

نے ان کے لیے سزا مقرر کر دی کہ وہ چالیس برس دشتِ تیہ (بیابانِ سین) میں بھٹکتے پھریں گے۔ [1] تیہ کی دشت نوردی کے دوران میں بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لیے بارہ چشمے جاری ہوئے اور وہیں ان پر من وسلویٰ نازل ہوا۔ بارہ قبیلے یہ تھے: شمعون، یہودہ، روبین، بنیامین، دان، افرائیم، جاد، منسے، یساکر، زبلون، آشیر اور نفتالی۔ ان میں سے افرائیم اور منسے حضرت یوسف علیہ السلام کے دو بیٹوں کے ناموں سے منسوب تھے جبکہ باقی یوسف علیہ السلام کے دس بھائیوں کے ناموں سے منسوب ہوئے۔ یوسف علیہ السلام کے بھائی لاوی کی اولاد ان بارہ قبائل میں شمار نہ ہوئی کیونکہ انھیں شہادت کے مسکن (الواحِ تورات) کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ [2] بعض مفسرین کے نزدیک دشتِ تیہ ہی میں بنی اسرائیل کے متکبر اور مالدار شخص قارون کے اپنے خزانوں سمیت دھنس جانے کا واقعہ پیش آیا۔ [3] اسی زمانے میں کوہِ ہور کے پاس حضرت ہارون علیہ السلام نے 123 برس کی عمر میں وفات پائی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل ایلہ (موجودہ ایلات) اور عصیون جابر (موجودہ عقبہ) سے ہو کر موآب (اردن) میں جا خیمہ زن ہوئے جو اریحا (فلسطین) کے بالمقابل ہے۔



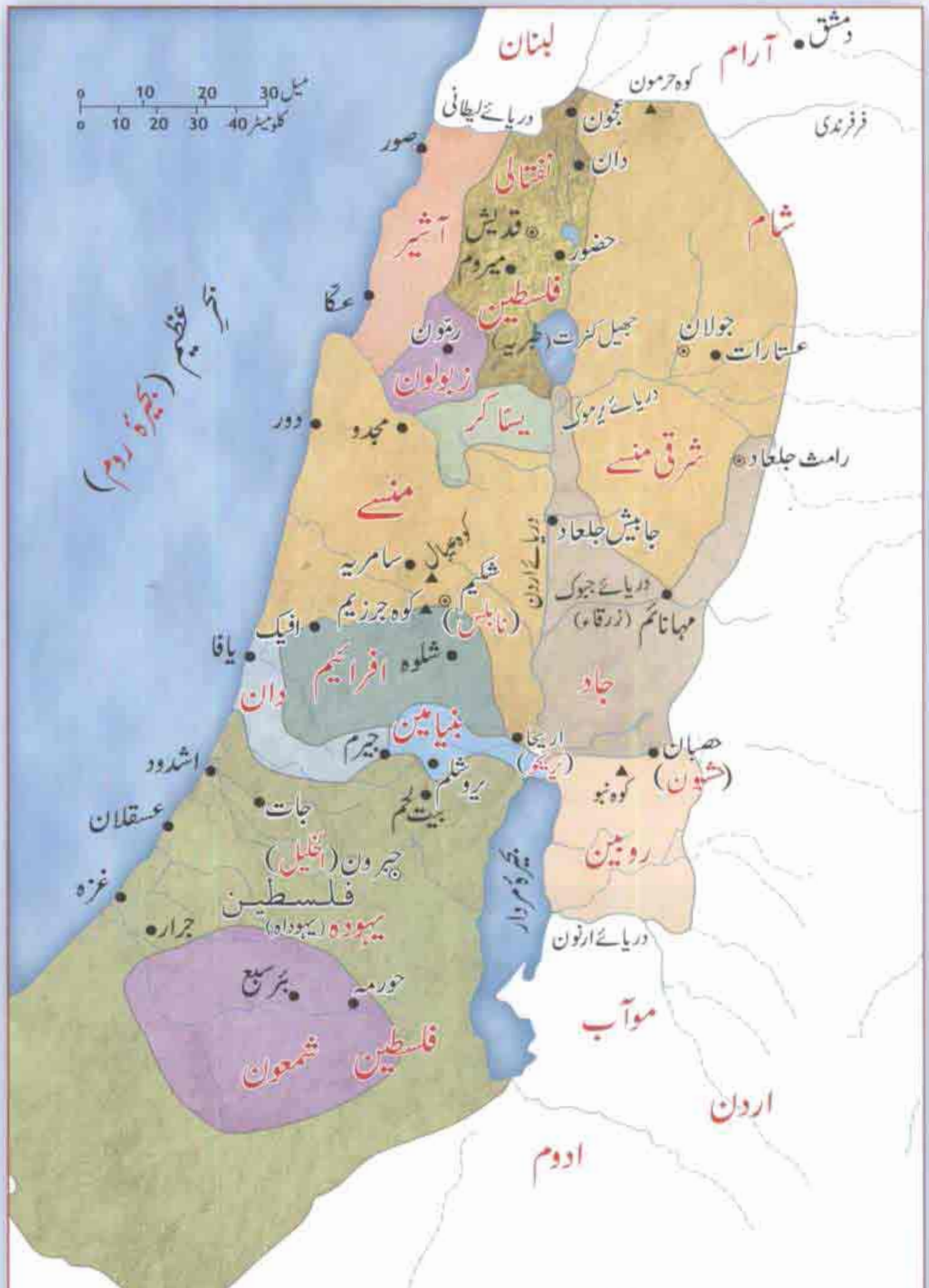
موآب (اردن) کے پہاڑ

حضرت موسیٰ علیہ السلام تیہ کی دشت نوردی، ادوم کے پہاڑوں اور موآب کے میدانوں میں مسلسل تبلیغ دین کا فریضہ ادا کرتے آئے تھے، نیز تورات نازل ہو چکی تھی۔ اب داعیِ اجل کو لبیک کہنے کا وقت آپہنچا تھا۔ عہد نامۂ قدیم میں لکھا ہے: ”خداوند کے بندے موسیٰ (علیہ السلام) نے موآب کے ملک میں کوہ نبو کے اوپر پسگہ کی چوٹی پر وفات پائی اور بیت فغور کے مقابل دفن ہوئے۔ وفات کے وقت وہ 120 برس کے تھے۔“ [4]

فلسطین پر بنی اسرائیل کا تسلط

بارہویں صدی ق م کے وسط میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع (یشوع) علیہ السلام بنی اسرائیل کے قائد و رہنما بنے۔ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے فرزند افرائیم کی اولاد سے تھے۔ انھی کی زیر قیادت فلسطین کی تسخیر شروع ہوئی اور اس کے مختلف حصوں میں اسرائیلی قبیلوں کو آباد کرنے کا آغاز ہوا۔ اس عہد کو عہد نامۂ قدیم میں قاضیوں (اختیار رکھنے اور فیصلے کرنے والے رہنماؤں) کا عہد قرار دیا گیا ہے۔ اسی عہد میں فلستیوں سے بنی اسرائیل کی لڑائیاں ہوئیں یہاں تک کہ فلستی ان سے تابوت سکینہ بھی چھین کر لے گئے جس میں کتاب مقدس کی تختیاں اور

[1] المآئدة 5:21-26. [2] کتاب مقدس (گنتی) 1:53. [3] تفسیر الطبري، القصص 28:81، قصص القرآن: 1/427، اطلس القرآن (اردو)، ص: 145. [4] کتاب مقدس (استثنا) 34:1 و 5-7. اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتب موسیٰ علیہ السلام کے بعد لکھی گئیں۔



بارہ اسرائیلی قبائل کی حدودِ سکونت

پیغمبروں کے تبرکات رکھے تھے۔ اس زمانے میں حضرت سیموئیل (شمویل) علیہ السلام نبی تھے۔

اسرائیلیوں نے ان سے کہہ کر اپنے لیے بادشاہ کا انتظام کرایا تاکہ پوری قوت یکجا ہو جائے، چنانچہ طالوت کو یہودیوں کا بادشاہ بنایا گیا اور انھوں نے فلستیوں کو شکست دے کر تابوت سکینہ واپس لیا۔ فلستیوں کا مشہور پہلوان جالوت (Goliath) تھا جسے حضرت داوٗد علیہ السلام نے قتل کیا۔ [1]

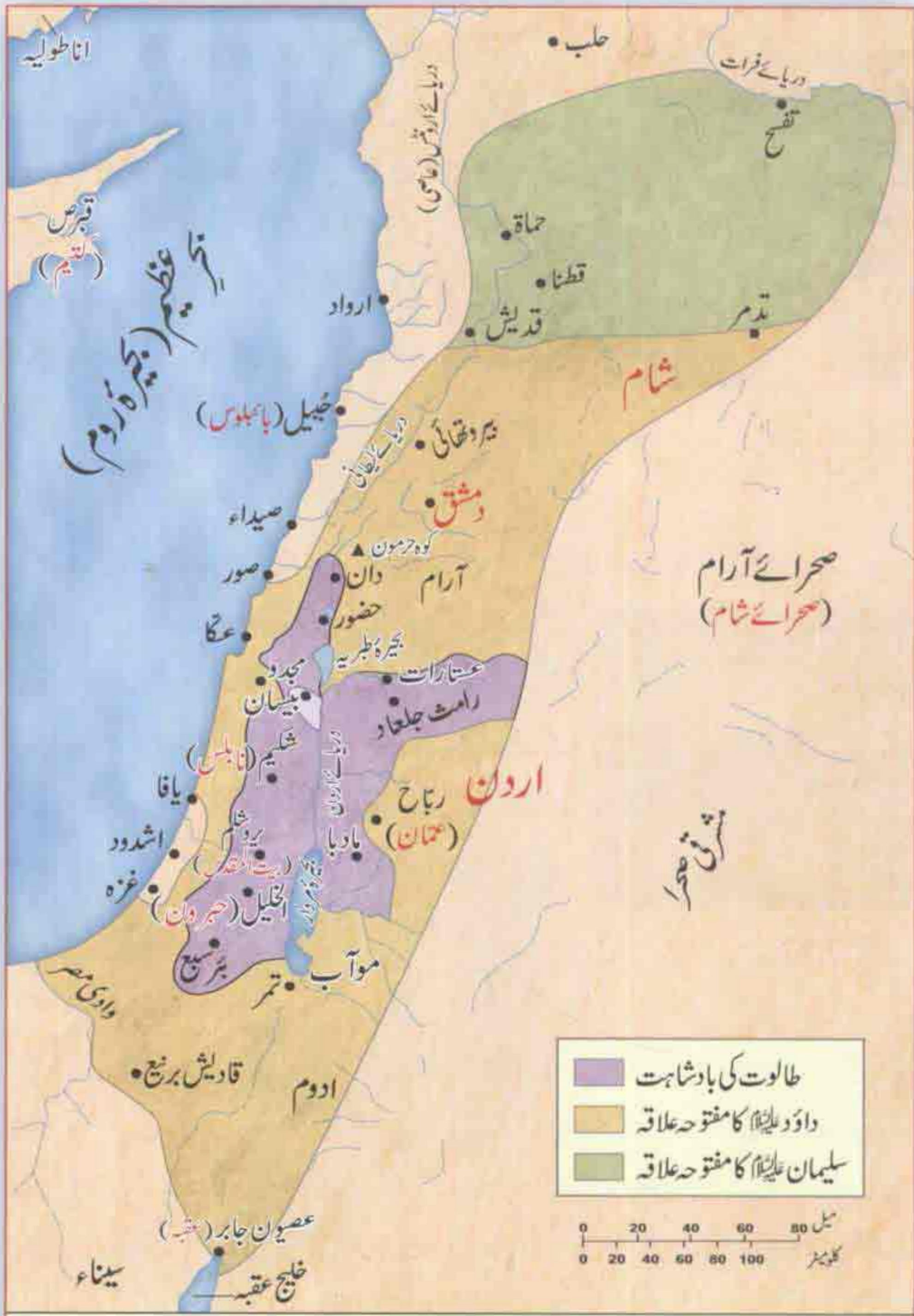
حضرت داوٗد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی بادشاہت

1013 ق م میں طالوت کا انتقال ہوا تو ان کے بعد سات سال تک ان کا بیٹا دریائے اردن کے مشرقی علاقے میں حکمران رہا جبکہ یہودیہ کی حکومت حضرت داوٗد علیہ السلام کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے یروشلم کو فتح کیا اور اسے اپنی سلطنت کا مرکز بنایا۔ تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے اس علاقے میں بسنے والے شورش پسند فلستیوں اور دوسرے سرکش قبیلوں کو مسخر کر لیا۔ داوٗد علیہ السلام نے 40 سال حکومت کرنے کے بعد 973 ق م میں 100 سال کی عمر میں وفات پائی۔ [2] ان کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام (973 تا 933 ق م) بادشاہ ہوئے۔ انھوں نے یروشلم میں ہیکل تعمیر کرایا اور دیگر بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں۔ اسرائیلی روایت کے مطابق بیت المقدس اور ہیکل کی تعمیر میں سات سال لگے۔ اس عہد میں فلسطین کی خوش حالی و فارغ البالی درجۂ کمال پر پہنچ گئی۔

[1] البقرة 2:247-251. [2] انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم: 2/56. نیو انٹرنیشنل ورژن (NIV) سٹڈی بائبل (Old Testament Chronolog) میں طالوت اور داوٗد علیہ السلام کے سالِ وفات علی الترتیب 1010 ق م اور 970 ق م دیے گئے ہیں۔



بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کا ایک منظر



داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی بادشاہت

حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھوں میں لوہا ڈھل جاتا تھا۔ سلیمان علیہ السلام کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ وہ چرند پرند کی بولیاں سمجھ لیتے تھے۔ سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا بھی مسخر کر دی گئی تھی، نیز انسانوں اور حیوانوں کے علاوہ جن بھی ان کے تابع فرمان تھے۔ سلیمان علیہ السلام اور سبا کی ملکہ (بلقیس) کا واقعہ قرآن میں مذکور ہے۔ بلقیس آفتاب پرستی سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور سلیمان علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئی۔ سورۂ نمل میں جس وادیِ نمل (چیونٹیوں کی وادی) کا ذکر آیا ہے، وہ فلسطین میں عسقلان کے نزدیک بتائی جاتی ہے۔ [1]



وادیِ نمل (عسقلان)

یہود کی دو سلطنتیں: یہودیہ اور اسرائیل

حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ان کا فرزند رحبعام مسند نشین ہوا لیکن شمالی سمت کے اسرائیلی قبیلوں نے یربعام کو اپنا بادشاہ بنالیا۔ یوں سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی۔ تاریخ میں جنوب میں واقع پہلی سلطنت کو یہودیہ اور شمال میں واقع دوسری سلطنت کو اسرائیل کہتے ہیں۔ یہودیہ کا دارالحکومت یروشلم تھا۔ اس کے دیگر شہروں میں حبرون (الخلیل)، بیت لحم، بئر سبع اور قادس برنیع شامل تھے۔ شمال میں سلطنت اسرائیل کا دارالحکومت سامریہ تھا اور یریحو (اریحا)، بیسان، نابلس، قدیش، حسبان اور رباح (عمان) مشہور شہر تھے۔

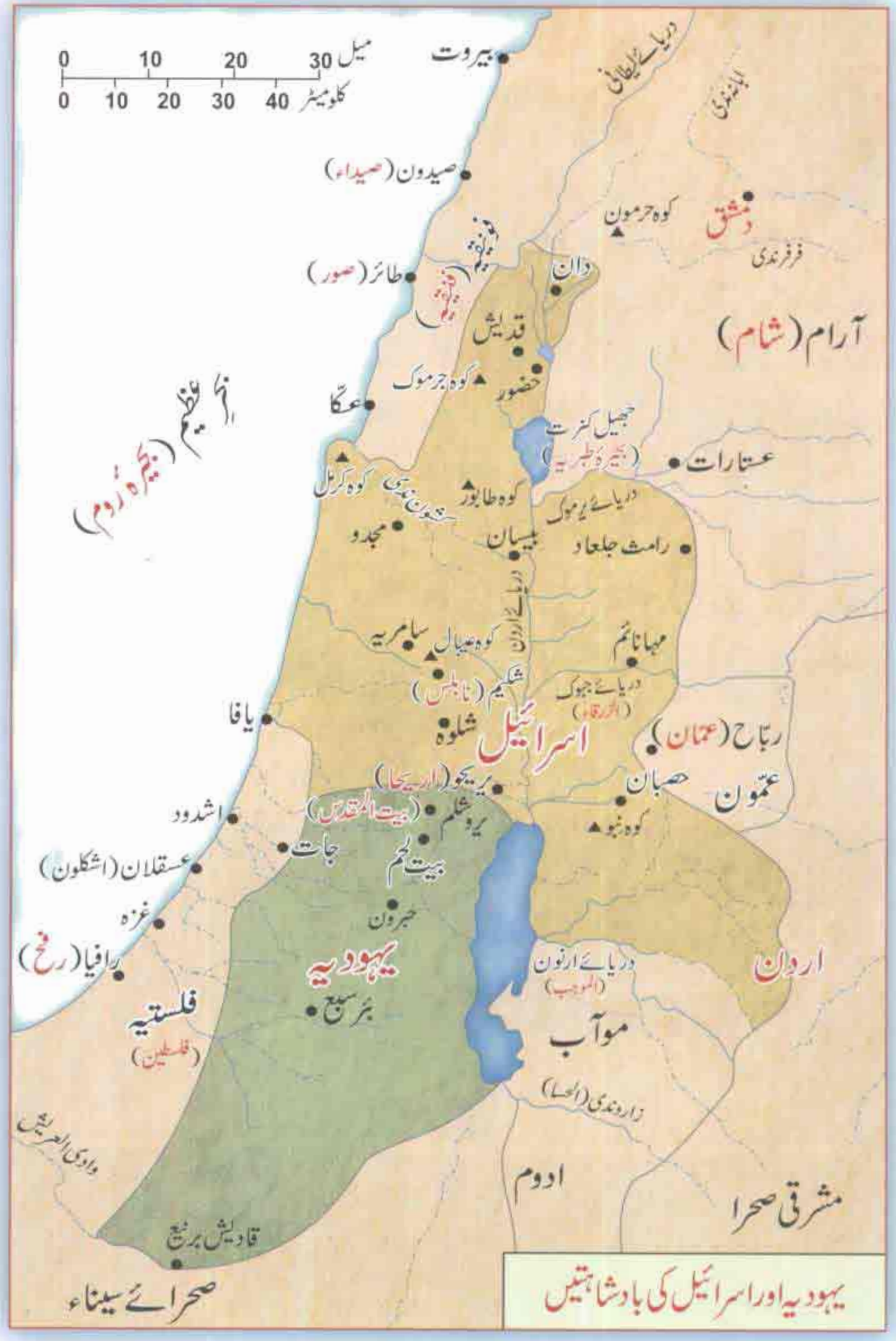


سامریہ شہر کے کھنڈر

اشوریوں کے ہاتھوں اسرائیل کا خاتمہ

یربعام بن سلیمان نے شکیم کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا، پھر سامریہ مرکز بن گیا۔ کچھ عرصہ سلطنت اسرائیل اشوریہ کے بادشاہ شلمنسر کی باجگزار رہی۔ اسرائیلی بادشاہ ہوسیع نے 732 ق م میں خراج ادا کرنے سے انکار کیا تو اُسے تخت سے اتار دیا گیا۔ سرجون دوم اشوری نے 725 تا 722 ق م سامریہ کا محاصرہ کر کے اسے مسخر کر لیا۔ اس نے سترہ سال میں 27290 یہودیوں کو نینویٰ اور اکباتان (ہمدان) کی طرف جلا وطن کیا اور یوں اسرائیلی سلطنت ختم ہوگئی۔ [2] سامریہ، بعد ازاں اسلامی دور میں، سبسطیہ کہلایا۔

[1] اطلس القرآن (اردو)، ص: 170-174۔ [2] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 57/2۔



میل 30 20 10 0
کلومیٹر 40 30 20 10 0
بیروت
صیدون (صیداء)
طائر (صور)
عکا
دمشق
کوہ حرمون
آرام (شام)
دان
قدیش
حضور
کوہ جرموک
جھیل کنرت
(بحیرۂ طبریہ)
عستارات
کوہ کرمل
کوہ طابور
دریائے یرموک
مجدو
بیسان
رامث جلعاد
دریائے اردن
سامریہ
کوہ عیبال
مہانائم
شکیم (نابلس)
دریائے جبوک
(الزرقاء)
یافا
شلوہ
اسرائیل
رباح (عمان)
عمون
یریحو (اریحا)
حسبان
اشدود
یروشلم
(بیت المقدس)
کوہ نبو
جات
عسقلان (اشکلون)
بیت لحم
حبرون
غزہ
رافیا (رفح)
یہودیہ
دریائے ارنون
(الموجب)
اردن
فلستیہ
(فلسطین)
بئر سبع
موآب
زاروندی (الحسا)
وادی العریش
ادوم
مشرقی صحرا
قادیش برنیع
صحرائے سیناء
بحیرۂ روم
یہودیہ اور اسرائیل کی بادشاہتیں

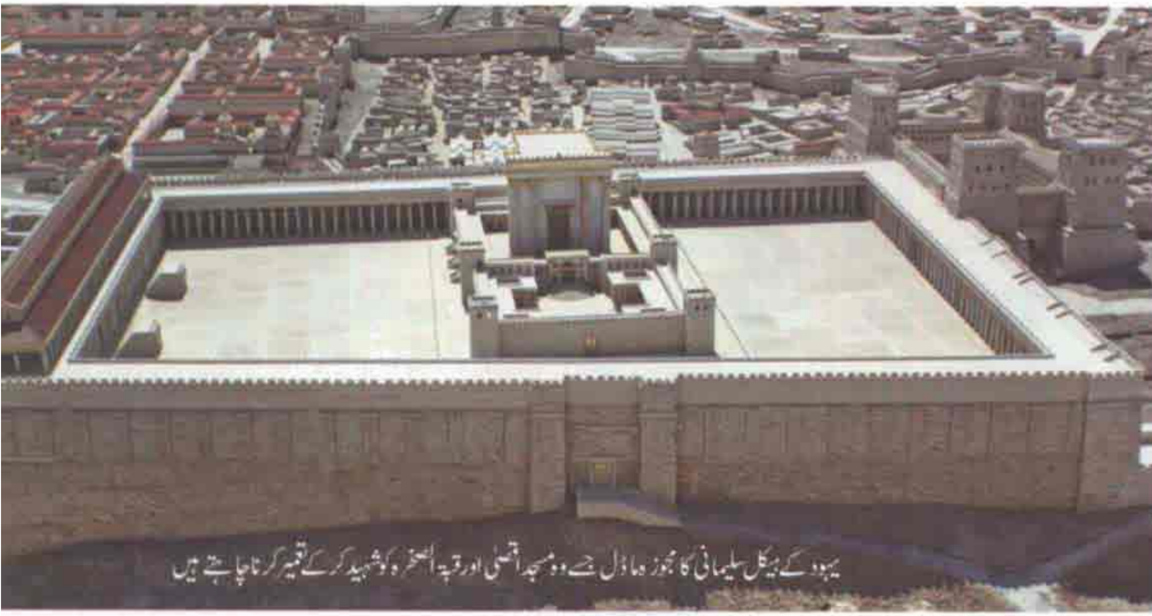
بخت نصر کا حملہ اور ہیکل سلیمانی کی پہلی تباہی

سلطنت یہودیہ 930 ق م سے 586 ق م تک قائم رہی۔ اس پر 735 ق م میں اشوریہ کے بادشاہ تغلت پلسر نے حملہ کیا۔ یوسیع [1] نبی نے مذہبی احیا کا کام انجام دیا اور ہیکل کو پوری سلطنت میں مرکزی حیثیت دے دی۔ 609 ق م میں یوسیع فرعونِ مصر کے خلاف جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ بابل کا حکمران بخت نصر دوم تین مرتبہ فلسطین پر حملہ آور ہوا۔ 597 ق م میں وہ جن یہودی پیشواؤں کو اپنے ساتھ بابل لے گیا، ان میں حزقی ایل نبی بھی تھے۔ صدقیاہ سلطنت یہودیہ کا آخری بادشاہ تھا۔ یرمیاہ نبی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ بخت نصر کی مخالفت نہ کی جائے۔ صدقیاہ نے اس مشورے پر عمل نہ کیا، چنانچہ بخت نصر نے 586 ق م میں یروشلم کو تباہ اور ہیکل سلیمانی کو مسمار کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی سلطنت یہودیہ بھی ختم ہوگئی۔ [2] بخت نصر ایک لاکھ یہودیوں کو غلام بنا کر عراق لے گیا تھا۔

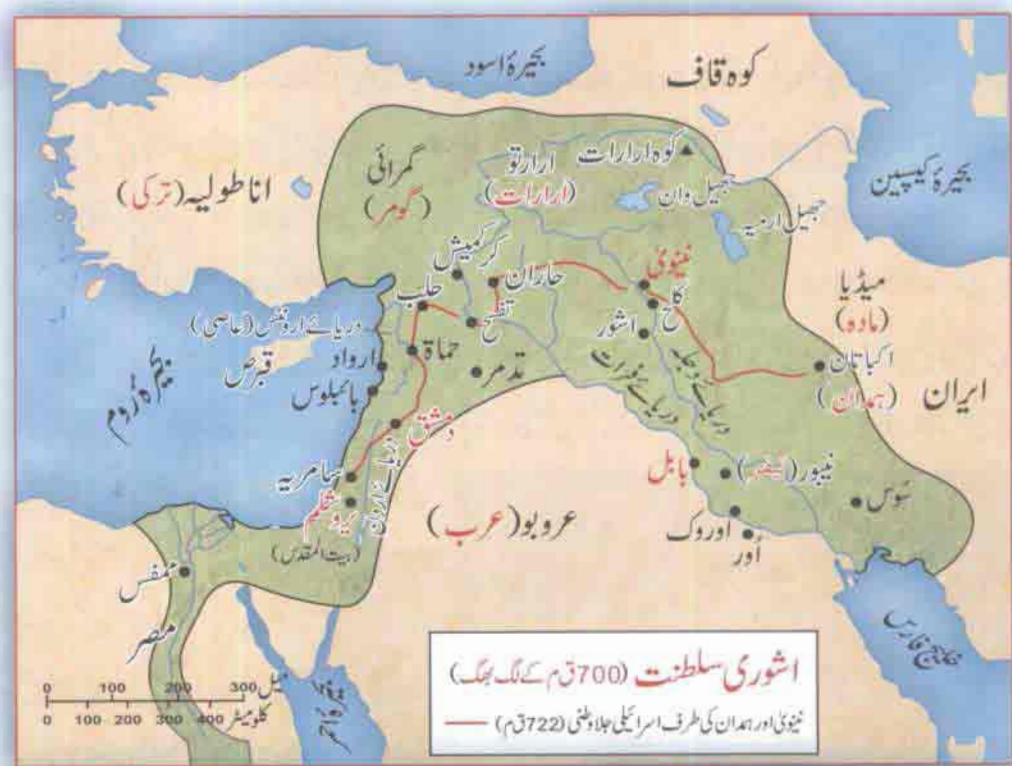
بابل سے یہود کی واپسی اور ہیکل کی تعمیر ثانی

538 ق م میں سائرس (ذوالقرنین) نے یروشلم پر قبضہ کر کے یہودیوں کو ازسرِنو ہیکل تعمیر کرنے کی اجازت دے دی، چنانچہ نحمیاہ نبی نے 537 ق م میں ہیکل کی تعمیرِ ثانی کے علاوہ یروشلم کی فصیلیں بنوائیں اور شرعی قانون نافذ کیے۔

[1] قاموس الکتاب میں یوسیع نبی کا نام ہوسیع، ہوشع یا ہوشیع دیا گیا ہے۔ یہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ کا پہلا نام تھا، موسیٰ علیہ السلام نے بدل کر یشوع (عربی میں یوشع) کر دیا۔ (قاموس الکتاب، ص:1085) [2] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم:2/57.



یہود کے ہیکل سلیمانی کا مجوزہ ماڈل جسے وہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو شہید کر کے تعمیر کرنا چاہتے ہیں



بحیرۂ اسود
کوہ قاف
کوہ ارارات
ارارتو (ارارات)
گمرائی (گومر)
اناطولیہ (ترکی)
بحیرۂ کیسپین
جھیل وان
جھیل ارمیہ
کرکمیش
حاران
نینوی
حلب
کلخ
اشور
میڈیا (مادہ)
دریائے ارونتس (عاصی)
ارواد
حماۃ
تدمر
قبرص
بحیرۂ روم
بائبلوس
اکباتان (ہمدان)
ایران
دمشق
دریائے فرات
دریائے دجلہ
سامریہ
بابل
نیبور
سوس
یروشلم (بیت المقدس)
عروبو (عرب)
اوروک
اُور
ممفس
مصر
خلیج فارس
میل 0 100 200 300
کلومیٹر 0 100 200 300 400
اشوری سلطنت (700ق م کے لگ بھگ)
نینوی اور ہمدان کی طرف اسرائیلی جلاوطنی (722ق م)



بحیرۂ اسود
کوہ قاف
ارارتو (ارارات)
جھیل وان
اناطولیہ (ترکی)
بحیرۂ کیسپین
جھیل ارمیہ
کرکمیش
حلب
حاران
نینوی
اربیلا
اشور
میڈیا (مادہ)
دریائے ارونتس (عاصی)
ارواد
حماۃ
تدمر
قبرص
بائبلوس
بحیرۂ روم
اکباتان (اکبتانا)
بیستون
ایران
دمشق
دریائے فرات
دریائے دجلہ
بابل
نیبور
سوس
یروشلم (بیت المقدس)
اوروک
اُور
ممفس
مصر
خلیج فارس
میل 0 100 200 300
کلومیٹر 0 100 200 300 400
سلطنت بخت نصر (600ق م کے لگ بھگ)
مغربی اسرائیل: یہودیہ سے بابل کی قید تک (586، 597، 605ق م)
جلاوطن یہودیوں کی بابل سے فلسطین واپسی (537ق م)
عزیر علیہ السلام (458ق م) اور نحمیاہ (445ق م) کے زیر قیادت واپسی

538 ق م سے 332 ق م تک یہودی ایرانی حکومت کے ماتحت رہے۔ دو سو برس کے ایرانی اقتدار کے بعد 332 ق م میں سکندر اعظم فلسطین میں وارد ہوا اور اس کے بعد یہ بطلیموسی بادشاہوں کے تسلط میں رہا، پھر 198 تا 168 ق م ان پر یونانی سلیوکی مسلط رہے۔ اس کے بعد یہودا مکابی کی قیادت میں یہود نے لڑ کر آزادی حاصل کر لی۔[1]

رومیوں کے زیر نگیں ہیرودیس کی بادشاہی

63 ق م میں فلسطین رومیوں کے زیر اثر آ گیا اور 395ء تک ان کے ماتحت رہا۔ 37 ق م میں یہودی سردار ہیرودیس نے رومی حکومت سے یہودیہ کی حکومت کا پروانہ حاصل کیا۔ وہ ہیرود اعظم کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے یروشلم میں ہیکل سلیمانی کی عمارت از سرنو بنوائی اور قیصر آگسٹس کے لیے سامریہ میں ایک ہیکل (معبد) تعمیر کرایا۔ اسی کے عہد میں حضرت مسیح علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ہیرودیس کے بعد سلطنت اس کے بیٹوں میں تقسیم ہو گئی۔ ہیرود اعظم کے جانشین ہیرودیس ارخلاؤس نے 4 ق م تا 6ء حکومت کی۔



سامریہ میں قیصر آگسٹس کے معبد کے آثار

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت

ہیرود اعظم کے سب سے چھوٹے بیٹے ہیرودیس انتپاس کو گلیل اور پریہ (شرق اردن) کے علاقے ملے تھے۔ اس نے نباتی (نبطی) بادشاہ ارتاس کی بیٹی سے شادی کی، پھر اپنے سوتیلے بھائی ہیرودیس فلپس کی بیوی ہیرودیاس سے شادی کرنے کے لیے اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ یوحنا اصطباغی (یحییٰ علیہ السلام) نے اس کی دوسری شادی ناجائز قرار دی کیونکہ ہیرودیاس اس کی غیر منکوحہ بیوی تھی۔ اس پر یوحنا، انتپاس کے غضب کا شکار ہوئے اور ان کا سر قلم کر دیا گیا۔ اس کے برعکس یہودی مؤرخ یوسیفس یوحنا کی شہادت کو ہیرودیس کے حسد کا نتیجہ بتاتا ہے کیونکہ وہ عوام میں بڑے ہر دلعزیز تھے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بیت المقدس میں صخرہ پر ذبح کیا گیا اور ان کا سر کاٹ کر دمشق لے جایا گیا۔ دمشق کی ''مسجد اموی'' میں ان کا مدفن موجود ہے۔[2]

[1] تلخیص از انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم: 49/2-58. [2] قاموس الکتاب، ص: 1090-1162، اطلس القرآن، ص: 200.

ہیکل سلیمانی کی دوسری تباہی اور یہود کی جلاوطنی

66ء میں یہودیوں نے رومیوں کے خلاف سرکشی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ 70ء میں رومی جرنیل ٹائٹس نے یلغار کر کے یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو تباہ کر دیا۔ 132ء میں یہودیوں نے پھر ایک بار رومی حکمران ہیڈرین کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ رومیوں نے ہیکل سلیمانی کی جگہ مشتری دیوتا (جوپیٹر) کا مندر بنا دیا تھا۔ ہیڈرین نے بغاوت فرو کر کے یہودیوں کو فلسطین سے جلاوطن کر دیا۔[1] اب کوئی یہودی سال بھر میں ایک مرتبہ کے سوا یروشلم (بیت المقدس) کے اندر نہ جا سکتا تھا۔ اس طرح یہودیوں کی اٹھارہ صدیوں سے زائد عرصے پر محیط مستقل جلاوطنی (Diaspora) کا آغاز ہوا۔



مسجد اقصیٰ کی جنوبی دیوار کے نیچے رومی دور کے دوہرے دروازے (ہلدہ) کے آثار جس میں بعد میں اینٹیں چن دی گئیں۔ ''ہلدہ'' کے لینٹر کے پاس ہی شاہ ہیڈرین کے جانشین انٹونیئس کے نام کی ایک سل نصب ہے جو بت پرست رومیوں کے تعمیر کردہ مشتری مندر کی باقیات میں سے ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے مسجد اقصیٰ مشتری مندر کے کھنڈر پر تعمیر کی جسے چوتھی صدی عیسوی میں مسیحی رومیوں نے گرا دیا تھا۔

[1] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 59,58/2۔



فلسطین مسیح علیہ السلام کے زمانے میں

یہودیت اور جیوئش بائبل کی تالیف

حزقیل نبی کا صحیفہ

انبیائے بنی اسرائیل میں سے حزقیل (Ezekiel) نبی ان یہودیوں میں شامل تھے جنھیں بخت نصر نے 597 ق م میں بابل کی طرف جلاوطن کر دیا تھا۔[1] حزقیل (حزقی ایل) نے انبیاء کی تعلیمات کو پیش نظر رکھ کر ایک کتاب تیار کی جس میں عقیدہ و عبادات کی تمام تفصیلات درج تھیں۔ یہ یہودیت کا مستقل آغاز تھا۔ اہل کتاب کے نزدیک حزقیل خود بھی نبی تھے لیکن انھوں نے یہ کتاب دوسرے انبیاء کے الہامی صحیفوں سے مرتب کی۔ اس میں وہ قانون بھی شامل کیا جو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا تھا اور جو کتاب استثنا میں بیان ہوا ہے۔[2]



حزقیل نبی کی بائبل کا قدیم نسخہ

یہود اور بنی اسرائیل

یعقوب علیہ السلام کی اولاد ان کے لقب اسرائیل کی نسبت سے بنی اسرائیل کہلاتی تھی، چنانچہ عہد عتیق کی کتب میں یرمیاہ نبی کے زمانے سے پہلے ان کے لیے ''یہودی'' یا ''یہود'' کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے۔ ابتدا میں یہود سے مراد وہ لوگ تھے جو قبیلہ یہوداہ یا جنوبی ریاست (یہودیہ) سے تعلق رکھتے تھے لیکن بعد میں اس کا اطلاق عبرانی نسل کے تمام لوگوں پر ہونے لگا جو بابل کی اسیری (605-537 ق م) سے واپس آئے تھے اگرچہ زیادہ تر اسیر عبرانی یہودیہ سے بابل لے جائے گئے تھے۔ بالآخر یہ اصطلاح تمام دنیا میں عبرانی نسل کے لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگی۔ حزقیاہ بادشاہ (724-695 ق م) کے زمانے سے یہودیہ کی زبان بھی یہودی کہلانے لگی تھی۔[3]

[1] قاموس الکتاب، ص: 323. [2] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 53/2. [3] قاموس الکتاب، ص: 1187.

یہود اور بُت پرستی

عقیدۂ توحید جو دینِ ابراہیمی کی بنیاد تھی اور جس کی وصیت حضرت ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام نے اپنے بیٹوں کو کی تھی، ان کی اولاد بعد میں اس پر قائم نہ رہ سکی۔ یہودیوں نے اپنی پڑوسی قوموں کے اثر سے یا غالب و فاتح قوموں کے دباؤ سے ان کے بہت سے عقائد قبول کر لیے اور ان کی بہت سی مُشرکانہ اور جاہلی روایات اختیار کر لیں۔ اس کا اعتراف بعض منصف مزاج یہودی مؤرخین خود کرتے ہیں۔ ''جیوئش انسائیکلوپیڈیا'' کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

> ''بت پرستی کے خلاف نبیوں کا غیظ وغضب یہ ظاہر کرتا ہے کہ دیوتاؤں کی پرستش اسرائیلی عوام کے دلوں میں گھر کر چکی تھی اور بابل کی جلاوطنی سے واپس آنے کے وقت تک پوری طرح اس کا استیصال نہیں ہوا تھا۔ توہم پرستی اور سحر کے ذریعہ بہت سے مشرکانہ خیالات اور رسوم دوبارہ عوام نے قبول کر لیے تھے۔ تالمود سے بھی اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ بُت پرستی میں یہود کے لیے بڑی جاذبیت اور کشش تھی۔''[1]

بابل کی تالمود جو یہودیوں میں حد درجہ مقدس سمجھی جاتی ہے اور جسے بعض اوقات تورات پر بھی ترجیح دی گئی ہے، چھٹی صدی عیسوی میں یہودیوں میں رائج اور مقبول تھی۔ یہ کتاب یہود کی بدزبانی، خدا کے حضور جسارت و گستاخی اور حقائق و مُسلّمات اور دین وعقل کے ساتھ تمسخر کے ایسے عجیب وغریب نمونوں سے بھری ہوئی ہے جنھیں دیکھ کر اس صدی میں یہودی معاشرے کی ذہنی پستی اور مذہبی ذوق کے بگاڑ کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔[2] تالمود یہودیوں کے مذہب اور آداب کی تعلیم کی کتاب ہے۔ اس کی تفسیر وتشریح علماء (حاخامات) کرتے رہے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں: المشنہ (المشنا) اور جمارا (جمارہ)۔ المشنہ نص کا درجہ رکھتی ہے جبکہ جمارا اس کی تفسیر ہے۔[3]

بائبل اور تالمود کی تالیف وترتیب

بائبل کے عہدنامہ قدیم کی کتابت اور تہذیب وترتیب 1150 ق م سے شروع ہوئی اور 130 ق م تک تمام صحیفے اس میں شامل کر لیے گئے۔ موجودہ تورات کی پانچ کتابیں پہلی مرتبہ 400 ق م کے آس پاس مرتب ہوئیں۔ اس کے بعد تاریخی اسفار (کتاب یوشع، کتاب قضاۃ، کتاب سیموئیل نبی اور سلاطین) کو بھی مذہبی تالیفات قرار دیا گیا۔ حضرت طالوت اور حضرت داؤد علیہ السلام کے سوانح حیات کے ابتدائی حصے سیموئیل کی کتابوں سے لیے گئے اور ان

---

[1] Jewish Encyclopedia, Vol.xii, pp: 568, 569.

[2] دیکھیے: ''یہودی تالمود کی روشنی میں'' از ڈاکٹر بلنگ اور اس کا عربی ترجمہ ''الكنز المرصود في قواعد التلمود'' از ڈاکٹر یوسف حنا۔

[3] الموسوعة العربية الميسرة: 543/1.


تالمود کے صفحات کا عکس


عہد نامہ قدیم کا ایک نسخہ


کتاب دانیال کا ایک ورق

کی تاریخِ تالیف 950 ق م ہے۔ بنی اسرائیل کے بڑے بڑے انبیاء کا دور 750 ق م سے 550 ق م تک ہے۔ یہ عاموس، ہوسیع، یسعیاہ، میکاہ، یرمیاہ اور حزقی ایل کا دور ہے۔ ان کے صحیفوں، نیز بعض دوسرے صحیفوں کو 200 ق م کے لگ بھگ تورات میں شامل کیا گیا۔ دانیال نبی کی کتاب 164 ق م میں شامل ہوئی۔ زبور، کتاب امثال اور کتاب ایوب (Job) 586 ق م میں مرتب ہوئیں۔

عہد نامۂ قدیم کے باقی حصوں کا تعلق ایرانی اور یونانی اقتدار کے زمانے سے ہے۔ بعض کتابوں کو یہودی خود اسفارِ مُحرّفہ کہتے ہیں، یعنی ان کے آسمانی ہونے میں شبہ ظاہر کرتے ہیں۔ ان کتابوں کا تعلق 180 ق م سے ہے۔ یہودیوں کی فقہی کتاب تالمود کی ترتیب 500ء کے آس پاس عمل میں آئی۔ یہودیوں کی قانونی کتاب مِشناہ 200ء کے قریب جمع ہوئی۔

اسرائیلی ادبیات

یہودیوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے 600ء تک متعدد مذہبی کتابیں وحیِ الٰہی سے نازل ہوئیں یا قوتِ انسانی سے ترتیب پائیں۔ ان ادبیاتِ اسرائیلیہ کا مجموعہ تورات، کتبیم، نبیّم، ترگوم، مدراش اور تالمود سے عبارت ہے۔ تورات ایک عبری لفظ ہے جس کے معنی شریعت اور قانون کے ہیں۔ اس نام کا اطلاق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پانچ کتابوں پر ہوتا ہے، یعنی سِفر[1] تکوین (در ذکر ابتدائے کائنات، آدم وحواء، نوح، ابراہیم، اسحاق، اسماعیل، یعقوب، یوسف)، سِفر خروج (موسیٰ، فرعون، بنی اسرائیل کا ذکر اور قانون)، سِفر الاحبار (شریعت و قانون، حلال وحرام)، سِفر العدد (مصر سے خروج کے وقت بنی اسرائیل کی تعداد وغزواتِ موسیٰ وبعض احکام شریعت)، سِفر الاستثناء (قوانین و احکام شریعت)۔

[1] سِفر: عربی میں اَلسِّفْرُ کے معنی کتاب یا تورات کے اجزاء میں سے ایک جز ہیں۔ اس کی جمع اسفار ہے۔ (القاموس الوحید، مادۃ: سفر)

نبیّیم عبرانی میں نبی کی جمع ہے، عربی قاعدہ سے نبیّین کہنا چاہیے۔ نبیّیم انبیائے بنی اسرائیل کے کلام و مواعظ و مراثی کا مجموعہ ہے جن میں بہت سی تاریخی باتیں بھی ضمناً مذکور ہیں۔ سفر یوشع و سفر القضاۃ و سفر سموال و سفر الایام [1] و سفر الملوک میں صرف تاریخی واقعات ہیں۔ اکثر تورات کا اطلاق تورات اور نبیّیم دونوں پر ہوتا ہے اور ان میں سے بعض کو کتبیم بھی کہتے ہیں۔


ترگوم کا ایک صفحہ

ترگوم یا ترجوم کا معنی ترجمہ و بیان ہے۔ یہ آرامی زبان میں تورات و نبیّیم کی تفسیر و توضیح ہے جو ربیّوں (ائمۂ یہود) نے انبیاء کی زبانی یادداشتوں اور روایات کو بنیاد بنا کر مرتب کی۔ اس کی تصنیف کا زمانہ 600 ق م سے 100ء تک کا ہے۔

مدراش مختلف انبیاء اور علماء کی باتیں اور خطبے وغیرہ ہیں۔ ان کا درجہ ہمارے ہاں کی احادیث اور آثار کا ہے۔ لفظ مدراس (مدراش) اور عربی کا لفظ ''درس'' ایک ہی چیز ہے جس کے معنی تعلیم و تدریس کے ہیں۔

تالمود یا تلمود اسرائیلی فقہ ہے جس کی بنیاد سابقہ کتب پر ہے اور جس کی ترتیب ابواب پر قائم کی گئی ہے۔ لفظ تلمود عربی میں تلمیذ ہے جس کے معنی ''تعلیم و علم'' کے ہیں۔ یروشلم کی تباہی کے بعد تالمود کے نسخے پانچویں صدی عیسوی میں یہودی تعلیمات کے مراکز طبریہ اور بابل میں مرتب ہوئے۔ [2]

یہود کے ہاں یہ تمام کتابیں مستند ہیں۔ نصاریٰ صرف تورات، کتبیم اور نبیّیم کو تسلیم کرتے ہیں اور ان ہی کے مجموعہ کو وہ عہد نامۂ عتیق کہتے ہیں۔ اسلام میں جو اسرائیلیات کا سرمایہ ہے، وہ زیادہ تر ترگوم، مدراش اور تالمود سے ماخوذ ہے۔ [3]

[1] سفر سموال: یہ دراصل شمویل (سموئیل Samuel) نبی سے منسوب کتاب ہے اور ''سفر الایام'' یا ''تواریخ'' اصل میں روزنامچہ (Chronicles) ہے۔ [2] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 59/2. [3] تاریخ ارض القرآن (کامل): 27,26/1.

عیسیٰ علیہ السلام اور عیسائیت

عیسائیوں کے ہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت کا بنیادی ماخذ 'نیا عہد نامہ' ہے۔ یہ اناجیل اربعہ، رسولوں (حواریوں) کے اعمال، کتاب مکاشفہ اور حواریوں اور ان کے ساتھیوں کے تبلیغی خطوط کا مجموعہ ہے۔ ان کتابوں میں جو حالات مذکور ہیں، وہ ہر اعتبار سے ناکافی اور انتہائی تشنہ ہیں۔ نئے عہد نامے کی کتابیں بنیادی معلومات کے اعتبار سے باہم مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عیسائی سیرت نگاروں کے لیے سب سے مشکل امر یہ تھا کہ وہ ان کتابوں میں بیان کردہ متضاد باتوں میں سے کس کو کس بنا پر ترجیح دیں اور کس کو کس بنیاد پر مسترد کریں۔ معروف اسلامی سکالر اور محقق پروفیسر ساجد میر حفظہ اللہ نے اپنی کتاب ''عیسائیت'' کے دوسرے باب میں عیسائیوں کے ہاں معیاری سمجھے جانے والے مقبول مصادر کو بنیاد بنا کر ''حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور عیسائیت'' کا جو تعارف مرتب کیا ہے، علمی اور تحقیقی اعتبار سے انتہائی وقیع ہے۔ عیسائیوں کے نقطۂ نظر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مختصر سیرت اس سے بہتر انداز میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ ذیل میں جو معلومات پیش کی گئی ہیں، ان کا بنیادی ماخذ ان کی کتاب کا دوسرا باب ہے۔



عہد نامہ جدید کا قدیم نسخہ

یسوع، یشوع یا یوشع (Jesus, Jeshua, Joshua) کا معنی ہے: ''یہوواہ نجات ہے۔'' (Jehovah is Salvation)۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا ہی مُنجی یا نجات دہندہ ہے۔[1] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اصل نام یشوع (Jeshua or Joshua) تھا۔ وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب بنی اسرائیل صدیوں سے اشوریوں (Assyrians) اور اہل بابل کی لائی ہوئی تباہی، جنگوں اور جلاوطنی کا شکار تھے۔ عام خیال یہ ہے کہ مسیح علیہ السلام سن 1ء میں پیدا ہوئے لیکن جب لوگوں کو بتایا جاتا ہے کہ مسیح اس سے چار یا پانچ سال پہلے پیدا ہوئے تو انھیں تعجب ہوتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عیسوی کیلنڈر چھٹی صدی عیسوی میں مرتب کیا گیا۔ راہب ڈایونیسیس اکسی گوس نے 562ء

[1] ڈیوس (Davis) کی ڈکشنری آف بائبل، لندن، 1972ء، ص: 402,401.

میں حساب لگا کر سنِ عیسوی کا اعلان کیا۔ اس نے مسیح کی پیدائش رومی کیلنڈر کے سال 754 میں رکھی۔ لیکن ہیرودیس اعظم جس نے بیت لحم کے معصوم بچوں کا قتلِ عام کیا تھا، رومی سال 750 میں فوت ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسیح کی پیدائش 750 سے کم از کم چند ماہ پہلے ہوئی ہوگی۔ غالباً وہ رومی سن 749 کے شروع میں پیدا ہوئے تھے، یعنی 5 ق م کے آخر میں۔ [1]

تاریخ کے اس مشکل ترین دور میں یہودی ایک مُنجی اور مسیحا کے منتظر تھے جو انھیں غلامی اور جور وستم سے نجات دلا کر ان کی قومی عزت کو بحال کرے اور ان کی معیشت و معاشرت کو سربلندی عطا کرے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ آنے والا اللہ تعالیٰ کی خصوصی برکت کا حامل ہوگا۔ اسی لیے اسے ''مسیح'' عبرانی میں ''مسیحا'' (Messiah)، یعنی ''مسح کیا ہوا'' (Anointed)، آرامی زبان میں مشیحا (Meshiah) اور یونانی میں کرائسٹس یا خرستس (Christ) کہا گیا۔ یہودیوں میں دستور تھا کہ وہ اپنے بادشاہ اور خاص مذہبی رہنما کے سر پر 'مقدس تیل' لگاتے تھے۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی کہ اسے خدا نے ان کی رہنمائی کے لیے چنا ہے۔ [2]

عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے کہ اصل پیدائش سن عیسوی کے آغاز سے کتنے سال قبل ہوئی۔ مختلف اقوال کے مطابق آپ کی پیدائش 8 تا 4 قبل مسیح کے کسی سال میں ہوئی۔ [3] انجیل لوقا کے مطابق یہودیہ (Judea) کے بادشاہ ہیرودیس (Herod) کے زمانہ میں ''جبریل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل (Galilee) کے ایک شہر میں، جس کا نام ناصرہ (Nazereth) تھا، ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نامی سے ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا۔'' [4]

فرشتہ نے بقول متی، یوسف کو [5] اور بقول لوقا، مریم کو [6] بغیر باپ کے پیدا ہونے والے ایک مبارک بیٹے کی خوشخبری دی اور وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ ہوئیں۔ [7] ان دنوں قیصر آگسٹس (Augustus) کی طرف سے مردم شماری کا حکم جاری ہوا۔ اس سلسلے میں یوسف اور مریم نے ناصرہ سے بیت لحم کی بستی کا سفر کیا اور سیدنا عیسیٰ وہیں پیدا ہوئے۔ [8] متی کے بیان کے مطابق کچھ ستارہ شناس مجوسی (Magi) مسیح کی تعظیم کرنے کے لیے آئے

---

[1] قاموس الکتاب، ص: 912.

[2] In Search of Historic Jesus, By L. Roddy And C.E. Sellier, New York, p:3 [3] Jesus In His Time , p:104.

[4] کتاب مقدس (لوقا) 1:5،1:26-28. ''مریم'' کے معنی نیک خاتون یا خدا کی پسندیدہ ہیں۔ (Jesus In His Time, p:104) [5] کتاب مقدس (متی) 1:20،21. [6] کتاب مقدس (لوقا) 1:30،31. [7] کتاب مقدس (متی) 1:20. [8] کتاب مقدس (لوقا) 2:1-7.

بیت لحم (فلسطین) کا ایک منظر



جب کہ وہ ابھی چھوٹے بچے تھے۔ ان سے یہ سن کر کہ ''یہودیوں کا بادشاہ'' پیدا ہوا ہے، ہیرودیس بادشاہ متنبہ ہوا اور بچے کی ٹوہ میں لگا۔ مگر جب مجوسی اسے کچھ بتائے بغیر چلے گئے تو اس نے بیت لحم اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں دو برس اور اس سے چھوٹی عمر کے بچوں کو قتل کروا دیا۔ لیکن یوسف اور مریم خواب میں ملنے والے ایک اشارے کے پیش نظر پہلے ہی بھاگ کر مصر جا چکے تھے، جہاں وہ ہیرودیس کے مرنے تک مقیم رہے۔ [1]

ولادتِ مسیح اور قرآن

مسلمان حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام کا انتہائی احترام کرتے ہیں۔ وہ انھیں ان اولوالعزم انبیائے کرام میں شمار کرتے ہیں جو بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے۔

قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ وہ کنواری مریم (Mary یا Maria) کے بطن سے پیدا ہوئے۔ قرآن کی ایک پوری سورت مریم کے نام سے موسوم ہے جس میں ان کے اور عیسیٰ علیہ السلام کے کچھ حالات بیان ہوئے ہیں۔ قرآن ایک اور سورت آل عمران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

﴿ إِذْ قَالَتِ الْمَلَٰٓئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِينَ ۝ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ ۗ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝ ﴾

''جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ تمھیں اپنی طرف سے ایک کلمے کی خوشخبری دیتا ہے، اس کا نام مسیح، عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ وہ دنیا اور آخرت میں بڑے مرتبے والا اور اللہ کے قریبی بندوں میں سے ہو گا۔ اور وہ ماں کی گود میں اور بڑی عمر میں بھی لوگوں سے کلام کرے گا اور نیکو کاروں میں سے ہوگا۔ مریم نے

[1] کتاب مقدس (متی) 2:6-18.

کہا: اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، حالانکہ مجھے کسی شخص نے چھوا تک نہیں۔ فرشتے نے کہا: اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے لیے صرف یہ کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔'' [1]

اسلامی عقیدے کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام بالکل اسی طرح اللہ کے حکم سے معجزاتی طور پر بغیر باپ کے پیدا ہوئے جس طرح حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے بغیر ماں اور باپ کے مٹی سے پیدا کیا تھا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝﴾

''بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے۔ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا: ہو جا، تو وہ ہو گیا۔ [2]

مسیح علیہ السلام کی تعلیم و تبلیغ

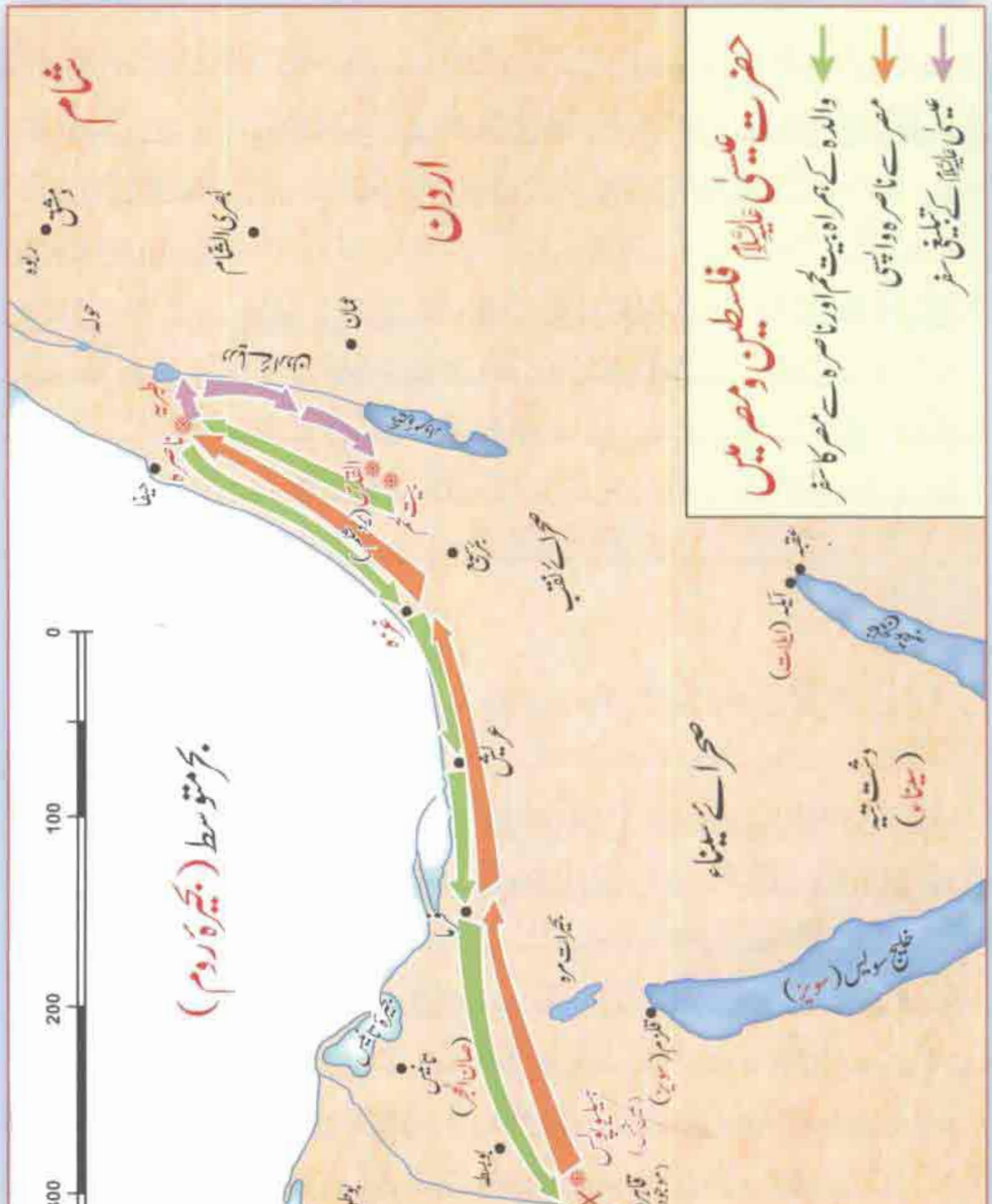
مسیح علیہ السلام نے تقریباً تیس برس کی عمر میں یوحنا اصطباغی (یحییٰ علیہ السلام) سے بپتسمہ لے کر تعلیم و تبلیغ شروع کی اور بقول لوقا، اس وقت مسیح پر ایک کبوتر کی شکل میں روح القدس کا جسمانی طور پر نزول ہوا۔ [3] اس کے بعد مسیح نے چالیس دن تک جسمانی اور روحانی ریاضت کی اور بیابان کی تنہائی میں شیطان نے انھیں آزمایا۔ اس آزمائش میں آپ ثابت قدم اور خداوند کے وفادار رہے۔ [4]



گلیل کا علاقہ اور جھیل طبریہ

اس کے بعد مسیح نے گلیل کے علاقے کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جہاں وہ یہودی عبادت خانوں میں گھوم پھر کر تعلیم و تبلیغ میں مصروف رہے۔ [5] گلیل کی بستی ناصرہ کے علاوہ اسی علاقے کا ایک دوسرا شہر کفرنحوم (Capernaum) بھی ان کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ وہ گلیل کے مختلف عبادت خانوں میں تبلیغ و منادی کرتے رہے۔ [6]

[1] آل عمرٰن 3:45-47۔ [2] آل عمرٰن 3:59۔ [3] کتاب مقدس (لوقا) 3:21,22۔ [4] کتاب مقدس (متی) 4:1-11، کتاب مقدس (مرقس) 1:12,13، کتاب مقدس (لوقا) 4:1-13۔ [5] کتاب مقدس (لوقا) 4:14-16۔ [6] کتاب مقدس (مرقس) 1:21، کتاب مقدس (متی) 4:23، کتاب مقدس (لوقا) 4:21-44۔


حضرت عیسیٰ علیہ السلام فلسطین و مصر میں
والدہ کے ہمراہ بیت لحم اور ناصرہ سے مصر کا سفر
مصر سے ناصرہ واپسی
عیسیٰ علیہ السلام کے تبلیغی سفر
شام
اردن
بحر متوسط (بحیرۂ روم)
صحرائے سیناء
صحرائے نقب
خلیج سویس (سویز)
مصر
دمشق
عمان
غزہ
حیفا
ناصرہ
بیت لحم
الاسکندریہ
قاہرہ
0
100
200
300
400
کلومیٹر

عیسیٰ علیہ السلام اور عقیدۂ توحید

تمام پیغمبروں کے مشن کی بنیاد عقیدۂ توحید ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی یہی مشن تھا۔ وہ اس مشن میں کوئی تبدیلی کرنے نہیں آئے تھے۔ انھوں نے عقیدۂ توحید پر مبنی اسی پیغمبرانہ مشن کی توثیق و تجدید کی۔ [1]

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ ۖ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴾

"اور ہم نے ان (پیغمبروں) کے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا جو اپنے سے پہلے کی کتاب (یعنی) توریت کی تصدیق کرنے والے تھے۔ اور ہم نے انھیں انجیل عطا فرمائی جس میں نور اور ہدایت تھی اور وہ اپنے سے پہلے کی کتاب توریت کی تصدیق کرتی تھی اور ہدایت اور نصیحت تھی متقی لوگوں کے لیے۔" [2]

بعثتِ مسیح اور معجزات

لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے پیغام کا قائل کرنے کے لیے، فریضۂ نبوت ادا کرتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کئی معجزے دکھائے۔ قرآن مجید میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا:

﴿ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُم مِّنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ ﴾

"بے شک میں تمھارے پاس تمھارے رب کی نشانی لے کر آیا ہوں۔ بے شک میں تمھارے لیے گارے سے پرندے کی شکل بناتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو اللہ کے حکم سے وہ (واقعی) پرندہ بن جاتا ہے اور میں اللہ کے حکم سے پیدائشی اندھے اور برص (پھلبہری) والے کو اچھا کرتا ہوں اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں اور میں تمھیں بتاتا ہوں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو۔" [3]

بائبل اور معجزاتِ مسیح

معجزاتِ مسیح کے حوالے سے بائبل کہتی ہے: انھوں نے بیماروں کو شفا دینے، بدروحوں اور شیاطین کو بیمار جسموں سے نکالنے، کوڑھ اور فالج وغیرہ کو ٹھیک کرنے، اندھوں کو بینائی اور گونگوں کو گویائی دینے کے معجزات بھی دکھائے۔ [4]

---

[1] آل عمرٰن 3:50. [2] المآئدۃ 5:46,47. [3] آل عمرٰن 3:49. [4] کتاب مقدس (لوقا) 4:40، 41، 5:12، 13، 5:18-25.

س سے ان کی شہرت پھیل گئی اور لوگوں کی ایک ''بڑی بھیڑ ان کے پیچھے ہولی۔'' مسیح نے اپنے پیروکاروں میں سے بارہ خاص شاگرد (حواری) چنے [1] جبکہ عیسائی لٹریچر میں انھیں ''مسیح کے رسول'' کہا گیا ہے۔ [2] مسیح کے بارہ حواریوں کے نام یہ ہیں: شمعون (پطرس یا پیٹر) اور اس کا بھائی اندریاس، یعقوب، یوحنا (John)، فلپس، برتلمائی (بارتھولومیو)، متی (میتھیو)، توما (تھامس)، یعقوب بن حلفئی، شمعون زیلوتیس، یعقوب کا بھائی یہوداہ اور یہوداہ اسکریوتی۔ متی اور مرقس میں یعقوب کے بھائی یہوداہ کے بجائے تدّی کو رسول بتایا گیا ہے۔ [3]

ان معجزات سے یہودیوں نے سمجھ لیا کہ جس نجات دہندہ کا انھیں انتظار تھا، وہ یہی ہیں، اس لیے انھوں نے مسیح کو بادشاہ بنانا چاہا مگر آپ صرف ''آسمانی'' یعنی روحانی رہنما تھے، اس لیے آپ نے انکار کیا۔ یہود نے مسیح علیہ السلام کے ذریعے سے اپنی دنیاوی توقعات پوری نہ ہونے اور ان کے روحانی مواعظ سے تنگ آکر ان کو سنگسار کرنے کی کوشش کی، [4] پھر وہ ان کے قتل کے مشورے کرنے لگے۔ [5] اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے خاص شاگردوں کے ساتھ جنگل کے قریب جا بسے۔

حواری کی ''غداری'' اور مسیح کی گرفتاری

عیسائیوں کے ہاں رائج نئے عہد نامے کے مطابق یہودی مذہبی رہنماؤں نے حکم جاری کیا کہ ''اگر کسی کو معلوم ہو کہ وہ (عیسیٰ علیہ السلام) کہاں ہے، تو وہ اطلاع دے تاکہ اسے پکڑ لیں۔'' [6] اس اعلان کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کے بارہ خاص شاگردوں میں سے ایک یہوداہ اسکریوتی (Judas Iscariot) (اسلام لانے والے اہل کتاب کے مطابق یودس زکریا یوحنا) نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پکڑوانے کے لیے تیس روپے لیے اور موقع کی تلاش میں رہا۔ [7] ایک روز یہوداہ (یودس) یہود کے مذہبی رہنماؤں کے فرستادوں اور سپاہیوں کو لے کر آیا اور انھیں گرفتار کروا دیا۔ ''اس پر سب شاگرد اسے (مسیح علیہ السلام کو) چھوڑ کر بھاگ گئے۔'' [8]

گرفتاری کے بعد مسیح کو الگ الگ مذہبی رہنماؤں [9] اور پھر ان کی نمائندہ مجلس [10] (Sanhedrin) کے سامنے پیش کیا گیا۔ مذہبی رہنماؤں نے آپ کو سزائے موت دلوانے کے لیے رومی حاکم پُنطیُس پیلاطُس کے حوالے کر دیا۔ [11] رومی حاکم سزا دینے میں متامل تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ انھوں نے اس کو حسد سے پکڑوایا ہے۔ [12] مگر

[1] آل عمرٰن 3:52، الصف 61:14. [2] کتاب مقدس (متی) 10:1-4، لوقا 6:13-16. [3] کتاب مقدس (متی) 10:2-4، کتاب مقدس (مرقس) 3:16-19، کتاب مقدس (لوقا) 6:13-16. [4] کتاب مقدس (یوحنا) 10:30. [5] کتاب مقدس (یوحنا) 11:47-53. [6] کتاب مقدس (یوحنا) 11: 57. [7] کتاب مقدس (متی) 26:14-16، کتاب مقدس (لوقا) 22:3-6. [8] کتاب مقدس (متی) 26:47-56، کتاب مقدس (لوقا) 22:54. [9] کتاب مقدس (یوحنا) 18:13 و 24، کتاب مقدس (لوقا) 22:54. [10] کتاب مقدس (لوقا) 22:66. [11] کتاب مقدس (متی) 27:2. [12] کتاب مقدس (متی) 27:18.

اسے بھڑکانے کے لیے مذہبی رہنماؤں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر الزام لگایا کہ وہ لوگوں کو سرکاری ٹیکس دینے سے منع کرتے اور خود کو بادشاہ قرار دیتے ہیں۔ [1]

لوگ مسیح کو سزا دلوانے پر مُصر رہے اور انھوں نے پیلاطس کی اس تجویز کو بھی قبول نہیں کیا کہ عید فصح کے احترام میں کسی قیدی کو چھوڑنے کے دستور کے مطابق مسیح کو چھوڑ دیا جائے۔ [2] حتیٰ کہ انھوں نے ایک قاتل اور باغی برابا (Barabba) کو عید کی خوشی میں چھوڑنا منظور کر لیا مگر مسیح کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔ [3]

ایلی ایلی لما شبقتنی؟

بالآخر پیلاطس نے مسیح کو صلیب دینے کے لیے سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ [4] چنانچہ آپ کو گلگتا (Golgotha لفظی معنی: کھوپڑی کی جگہ) لے جایا گیا اور بقول اناجیل، طرح طرح کی اذیتیں اور طعنے دے کر مصلوب کر دیا گیا۔ [5]

"اور یسوع نے بڑی آواز سے چلاتے ہوئے ایلی ایلی لما شبقتنی یعنی اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ کہتے ہوئے جان دے دی۔" [6]



گلگتا کی پہاڑی

قرآن کا سچا بیان

قرآن مجید نے مسیح کو صلیب دیے جانے کی سختی سے تردید کرتے ہوئے فرمایا ہے: ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ "اور انھوں نے اسے (مسیح کو) نہ قتل کیا اور نہ سولی دی اور لیکن ان کے لیے اس (مسیح) کا شبیہ بنا دیا گیا۔" [7] نیز فرمایا: ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ﴾ "بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھا لیا۔" [8]

سینٹ پال اور مسیحی الٰہیات

بطور مذہب موجودہ مسیحیت کی ابتدائی تشکیل یہودی النسل سینٹ پال (پولوس، م: 64ء) نے انجام دی۔ "سو عظیم

---

1 کتاب مقدس (لوقا) 2:23. 2 کتاب مقدس (یوحنا) 40,39:18. 3 کتاب مقدس (لوقا) 19,18:23، کتاب مقدس (یوحنا) 40:18.
4 کتاب مقدس (لوقا) 25:23، کتاب مقدس (متی) 26:27. 5 کتاب مقدس (متی) 27:32-44، کتاب مقدس (مرقس) 15:16-26، کتاب مقدس (لوقا) 23:26-38، کتاب مقدس (یوحنا) 19:1-24. 6 کتاب مقدس (متی) 46:27، کتاب مقدس (مرقس) 34:15.
7 النسآء 157:4. 8 النسآء 158:4، مزید تفصیل شہادت القرآن (مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی) اور عیسائیت: تجزیہ و مطالعہ (پروفیسر ساجد میر) میں ملاحظہ کریں۔

آدمی" (THE 100) کا مصنف مائیکل ہارٹ لکھتا ہے:

"یسوع (عیسیٰ علیہ السلام) جوانی ہی میں چل بسے۔ ان کی وفات کے وقت ان کے چند پیروکار (حواری) ان کے پاس تھے لیکن مسیحی الٰہیات کو وضع کرنے کا کام بنیادی طور پر سینٹ پال نے سرانجام دیا۔ یسوع نے ایک روحانی پیغام دیا۔ پال نے اس میں یسوع کی پوجا پاٹ کا اضافہ کر دیا۔ سینٹ پال ہی عہد نامہ جدید کے ایک بڑے حصے کا مصنف ہے۔"[1]

15 صدیوں کے بعد عقیدۂ تثلیث کا راز فاش

عیسائیت اپنے دورِ اول ہی میں انتہا پسندوں کی تحریف، جاہلوں کی تاویل اور رومی نصرانیوں کی بت پرستی کا شکار ہوگئی تھی۔

ایک عیسائی فاضل لکھتا ہے:

"یہ عقیدہ کہ خدائے واحد تین اقانیم سے مرکب ہے، عیسائی دنیا کی پوری زندگی اور افکار میں چوتھی صدی کے آخر ہی میں سرایت کر چکا تھا اور طویل عرصے تک سرکاری اور تسلیم شدہ عقیدے کی حیثیت سے، جس کو پوری مسیحی دنیا مانتی تھی، باقی رہا یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں راز فاش ہوا کہ یہ عقیدہ مسلسل بدلتا رہا اور آخر کار اس نے موجودہ (تثلیث کی) شکل اختیار کر لی۔"[2]

سورج دیوتا کے تہوار کا نام کرسمس

عیسائیت میں پُرانے مشرکانہ عقائد کس طرح شامل کر لیے گئے، اس کی مثال بیان کرتے ہوئے عیسائی مؤرخ جیمز ہیوسٹن بیکسٹر رقمطراز ہے:

"بت پرستی (عیسائیت میں) جذب کر لی گئی۔ تقریباً سب ہی کچھ جو بت پرستی میں تھا، عیسائیت کے نام سے چلتا رہا۔ جن لوگوں کو اپنے دیوتاؤں اور مشاہیر سے ہاتھ دھونے پڑے تھے، انھوں نے غیر شعوری طور پر کسی شہید کو پُرانے دیوتاؤں کے اوصاف سے متصف کر کے کسی مقامی مُجسّمے کو اس کا نام دے دیا اور اس طرح کافرانہ مسلک اور دیومالا ان مقامی شُہداء کے نام منتقل ہوگئی۔ ان اولیاء نے ایک جانب تو آریوسی عقائد کی بنا پر انسان اور خدا کے درمیان شانِ ایزدی رکھنے والے انسانوں کی شکل اختیار کر لی اور دوسری

[1] سو عظیم آدمی، ص: 37.

[2] New Catholic Encyclopedia, Vol:14,1967.

جانب یہ قرونِ وسطیٰ کے تقدس اور پارسائی کے نشان بن گئے۔ بت پرستانہ تیوہار قبول کر کے ان کے نام بدل دیے گئے یہاں تک کہ 400ء تک پہنچتے پہنچتے سورج دیوتا کے قدیم تیوہار نے مسیح کے یوم پیدائش کی شکل اختیار کر لی۔"[1]

بائبل کے 40 مصنفین

مسیحی بائبل عیسائیوں کی مقدس کتاب ہے۔ لفظ بائبل (Bible) یونانی زبان کے لفظ ببلوس (Bublos) یا بائبلوس (Biblus) سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کتابوں کا مجموعہ۔ ابتدا میں بائبل دو زبانوں میں لکھی گئی: عبرانی (Hebrew) اور یونانی (Greek) میں۔



یونانی زبان میں بائبل کا قدیم نسخہ



عبرانی بائبل

بائبل کو تقریباً 1600 سال کے عرصے میں 40 مصنفین نے مرتب کیا۔ ان افراد کا تعلق دنیا کے مختلف حصوں سے تھا۔ آخری مصنف پہلے مصنف کی وفات کے 1450 برس بعد پیدا ہوا تھا۔ کیتھولک چرچ کے نزدیک بائبل 72 کتابوں کا مجموعہ ہے جبکہ پروٹسٹنٹ چرچ اسے 66 کتابوں پر مشتمل مانتا ہے اور اسے دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، یعنی عہد نامہ قدیم (Old Testament) اور عہد نامہ جدید (New Testament)۔ کیتھولک چرچ کے نزدیک عہد نامہ قدیم میں 45 اور عہد نامہ جدید میں 27 کتابیں ہیں، جبکہ پروٹسٹنٹ چرچ عہد نامہ قدیم کو 39 اور عہد نامہ جدید کو 27 کتابوں کا مجموعہ مانتا ہے۔ عہد نامہ قدیم کی پہلی پانچ کتابیں تورات (Torah) کہلاتی ہیں۔ پرانا عہد نامہ عبرانی زبان میں لکھا گیا تھا جس میں کتاب دانی ایل (دانیال) اور کتاب عزرا (عُزیر) کے کچھ حصے آرامی زبان میں تھے۔ نیا عہد نامہ مکمل طور پر یونانی زبان میں لکھا گیا۔ 420ء میں کیتھولک چرچ کو کچھ صحیفے ملے جنھیں وقت کے پوپ کے فرمان کے مطابق محفوظ کر لیا گیا مگر اس سے پہلے ان کا ترجمہ عبرانی اور یونانی سے لاطینی زبان (Latin) میں کیا گیا۔ پوپ کا یہ حکم بھی تھا کہ آج کے بعد ان قدیم صحیفوں کو ہاتھ نہیں لگایا جائے گا،

[1] Rev. James Houston Baxter, The History of Christianity in The Light of Modern Knowledge (Glasgow.1929), P: 407.

چنانچہ اس فرمان کے مطابق آج تک کوئی انھیں چھو نہیں سکا۔ [1]

قدیم بائبل کے تین نسخے

اس وقت قدیم ترین بائبل کے تین نسخے موجود ہیں:

1. نسخہ ویٹیکن: یہ چوتھی صدی عیسوی کا نسخہ ہے اور روم (اٹلی) میں محفوظ ہے۔
2. سینائی نسخہ: یہ بھی چوتھی صدی عیسوی کا نسخہ ہے اور سینٹ پیٹرز برگ (روس) میں محفوظ ہے۔
3. نسخہ اسکندریہ: یہ پانچویں صدی عیسوی میں مرتب ہوا اور لندن میں محفوظ ہے۔


ویٹی کن بائبل


سینائی بائبل کا نسخہ


نسخۂ اسکندریہ

عہد نامہ جدید کی کتب 50ء کے بعد لکھی گئیں۔ متی، مرقس، لوقا اور یوحنا چاروں 50ء تا 115ء کے دور میں لکھی گئیں۔ مقدس برنباس (حواری) نے بھی ایک انجیل لکھی جو 55ء کے زمانے کی ہے۔ [2]

پاپائے روم

پہلی صدی عیسوی میں حوارِیِ مسیح پطرس (Peter) اور بانیِ عیسائیت پولوس (سینٹ پال) روم میں قتل ہوئے تھے، لہٰذا آگے چل کر روم کلیسائی نظام کا مرکز بن گیا۔ یہاں پطرس (سینٹ پیٹر) کے نام سے گرجا کیتھولک مسیحیت کا مقدس مقام ہے۔ عیسائیوں کے بڑے پادری [3] اُسقف (Bishop) کہلاتے تھے۔ 341ء میں پوری مسیحی دنیا کے اندر پانچ بڑے اُسقف تھے۔ یہ روم، قسطنطنیہ، یروشلم، انطاکیہ اور اسکندریہ کے اُسقف تھے۔ 425ء تک انھیں پاپا کہا جاتا تھا۔ بعد میں روم کے بشپ کو خاص طور پر ''پاپا'' یا ''پوپ'' کہا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ روم کا کلیسا مغرب کا واحد بڑا مذہبی مرکز ٹھہرا۔ تب روم کے اُسقفوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم لوگ پطرس رسول اور

1 اسلام کی سچائی اور سائنس کے اعترافات، ص:324،323۔ 2 بائبل کی تاریخ (انگریزی) از پادری برکت مسیح۔ 3 لفظ ''پادری'' پرتگالی زبان سے برصغیر میں متعارف ہوا۔ اس کے معنی وہی ہیں جو فادر (Father) کے ہیں۔

پولوس رسول کے مقبروں کے مجاور ہیں۔ متی کی انجیل کے بعض کلمات سے یہ مطلب نکالا گیا کہ پطرس رسول کو حضرت مسیح علیہ السلام نے کلیسائی نظام کی بنیاد قرار دیا تھا، چنانچہ روم کے اسقفوں نے دعویٰ کیا کہ وہ پطرس رسول کے وارث ہیں۔ اس نظریے کو پہلے پہل پوپ سیلسٹائن اول (422ء تا 432ء) نے رواج عام دیا۔ یوں روم کا اسقف فائق و برتر مذہبی پیشوا (پوپ) بن گیا۔[1]

بائبل کے متعلق اسلامی عقیدہ

بائبل میں تحریف ہو چکی ہے اور اس میں مختلف مقامات پر تضاد پایا جاتا ہے۔ یہ بات خود عیسائی تسلیم کرتے ہیں۔ بائبل کے متعلق مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام پر ایک آسمانی کتاب نازل کی تھی جو انجیل کہلاتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ آج اس کے بعض اجزاء عیسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ الوہی تعلیمات کی صورت میں عہد نامہ جدید میں شامل ہوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان اس بائبل پر ایمان رکھتے ہیں جو آج ہمارے سامنے ہے کیونکہ یہ اصل کتب کا مجموعہ نہیں جو اللہ نے نازل کی تھیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے ان میں ترمیمات، تحریفات اور اضافے کر ڈالے۔ یہ بات اس کمیٹی نے بھی تسلیم کی جو بائبل مقدس (ترمیم شدہ معیاری ایڈیشن) پر نظر ثانی کے لیے قائم کی گئی تھی۔ یہ کمیٹی 32 علماء پر مشتمل تھی جو اس کے رکن تھے۔ انھوں نے تعاون کرنے والے فرقوں کے پچاس نمائندوں پر مشتمل مشاورتی بورڈ کے تاثرات اور مشورے اپنی رپورٹ میں شامل کیے۔ کمیٹی نے بائبل مقدس کے مقدمے میں کہا: ''بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ متن میں سے کچھ حصے حذف کر دیے گئے ہیں لیکن کسی نسخے میں بھی حذف شدہ حصے قابل اطمینان طور پر بحال نہیں کیے گئے۔ اصل متن کی انتہائی امکانی تشکیل جدید کے لیے فاضل علماء نے جو بہترین قیاس پیش کیے ہیں، اب ہمیں انھی پر اکتفا کرنا ہے۔'' کمیٹی نے مقدمے میں یہ بھی لکھا: ''عبارات کا اضافہ کیا گیا ہے جن سے قدیم مستند نسخوں میں اہم تبدیلیوں، اضافوں اور تحریفات کا پتہ چلتا ہے۔''[2]

اس بائبل کی بنیاد پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی تعلیمات کے بارے میں جو کچھ سامنے آتا ہے، اس کا ایک نقش آپ کے سامنے ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسلمان اللہ کا سچا نبی مانتے ہیں۔ تمام انبیاء کی نبوت اور حقانیت ان کے ایمان کا حصہ ہے۔ اسلام حقیقت میں اس دین کی سچی اور مکمل صورت ہے جو تمام انبیائے کرام کے ذریعے سے بھیجا گیا۔ قرآن میں ہدایت و حکمت کے نمونوں کے طور پر جن انبیاء کا تذکرہ ہے، ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی شامل ہیں۔ احادیث میں واضح کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دین اسلام کی مکمل ترین صورت کے ساتھ وابستگی اور اس کی

[1] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 152/2. [2] اسلام کی سچائی اور سائنس کے اعترافات، ص: 324-326.

گواہی کے لیے تمام انبیائے کرام کی نمائندگی کریں گے۔ اللہ کے دین کی فیصلہ کن فتح کے آخری مرحلے میں وہ اسی طرح آسمانوں سے زمین پر نازل ہوں گے جس طرح آسمانوں پر اٹھائے گئے تھے، دین اسلام پر عمل کریں گے اور اس سے وابستہ تمام لوگوں کے لیے عدل کرنے والے حَکَم ہوں گے۔ قرآن مجید، احادیث رسول اور مستند آثارِ صحابہ کے ذریعے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات مبارکہ کا جو نقش سامنے آتا ہے، وہ عیسائی مآخذ کی بنیاد پر مرتب ہونے والے نقش سے کہیں زیادہ خوبصورت، دل کش اور مؤثر ہے۔ اس نقش کے ذریعے سے جہاں عیسائیوں میں رائج سیرتِ عیسیٰ کے بعض پہلوؤں کی تصدیق ہوتی ہے وہاں بعض پہلوؤں خصوصاً خدا یا خدا کا بیٹا ہونے، مصلوب ہونے، اللہ تعالیٰ کے سامنے شکایت کرنے اور حواریوں کی غداری کا سامنا کرنے جیسے متعدد پہلوؤں کی تردید ہوتی ہے اور سیرتِ عیسیٰ کے صحیح پہلو سامنے آتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا تعلق انتہائی عالی مرتبت اور بابرکت گھرانے 'آلِ عمران' سے تھا۔ یہ گھرانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے چنیدہ اور برگزیدہ تھا۔ حضرت عمران کی اہلیہ، مریم کی والدہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی طلبگار رہتی تھیں۔ [1] وہ انبیائے کرام اور صالحین سے محبت رکھتی تھیں اور انھوں نے اپنے بچوں کے نام انبیاء اور ان کے گھر والوں کے ناموں پر رکھے تھے۔ [2]

ایک بار انھوں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا کہ وہ اپنے پیٹ کا بچہ (دنیا کے کاموں سے) آزاد کر کے اس کی نذر کریں گی اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس نذر کو قبول فرمائے۔ جب انھوں نے ایک بچی کو جنم دیا تو کہنے لگیں: ''اے میرے رب! میں نے (تو) ایک بچی کو جنم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ زیادہ اچھی طرح جانتا تھا کہ انھوں نے کس کو جنم دیا ہے اور کوئی لڑکا (اس) لڑکی جیسا نہ تھا۔ (وہ کہنے لگیں:) میں نے اس کا نام مریم رکھا اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود (کے شر) سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی (بچی) کو اچھے طریقے سے قبول کر لیا اور اسے اچھی طرح پروان چڑھایا۔'' [3]

عبادت گاہ میں عبادت کرنے والوں کا اس بات پر جھگڑا ہوا کہ مریم بنت عمران (علیہا السلام) کی کفالت کون کرے گا۔ انھوں نے اس بات کے لیے کہ کون مریم (علیہا السلام) کا کفیل ہوگا، اپنے قلموں کے ذریعے سے قرعہ اندازی کی۔ [4] بالآخر ان کی کفالت حضرت زکریا علیہ السلام کے حصے میں آئی۔ [5]

یہ ایسی بابرکت اور برگزیدہ بچی تھیں کہ زکریا جب بھی اس گوشے میں جاتے جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتی

---

[1] آل عمرٰن 3:33. [2] صحیح مسلم: 2135، مسند أحمد: 4/252. [3] آل عمرٰن 3:33-37. [4] آل عمرٰن 3:44.
[5] آل عمرٰن 3:37.

تھیں تو ہمیشہ ان کے ہاں (اعلیٰ اور نایاب) رزق موجود پاتے۔ انھوں نے جب (بھی) پوچھا: مریم! یہ آپ کے پاس کہاں سے آیا تو وہ کہتیں: یہ اللہ کے ہاں سے آیا ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے (موسموں اور مقداروں کے) حساب کے بغیر رزق دیتا ہے۔ اسی کو دیکھ کر زکریا علیہ السلام نے شدید بڑھاپے اور اپنی بیوی کے بانجھ پن کے باوجود اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اولاد کی دعا کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں فرشتوں کے ذریعے سے یحییٰ (علیہ السلام) کی خوش خبری سنائی جو سردار، پاکباز اور صالحین میں سے نبی ہوگا۔ [1]

اس بچی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ عظیم سے اتنی اچھی طرح قبول فرمایا کہ اسے اپنی ضرورتوں کے لیے کفالت کرنے والوں کا محتاج نہ بنایا بلکہ اس کے برعکس وہ ان کے لیے نرالی برکت اور بے پناہ سعادت کا سبب بنیں۔

اللہ تعالیٰ اس بچی کی پرورش اس طرح کر رہا تھا کہ ان کے پاس فرشتوں کو بھیجتا جو انھیں بتاتے کہ وہ ایک عام بچی نہیں ہیں۔ انھیں اللہ نے بہت بڑے مقصد کے لیے چنا ہے، پاک کیا ہے اور سارے جہانوں کی عورتوں پر فضیلت دی ہے۔ فرشتے انھیں اس بات کی تعلیم دیتے کہ وہ اپنے رب کی فرماں برداری کریں، سجدے کریں اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کریں۔ [2]

فرشتوں نے انھیں (براہِ راست) اللہ کے حکم (سے پیدا ہونے والے بچے) کی خوشخبری دی جس کا نام المسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا جو دنیا میں وجاہت والا، آخرت میں مقربین میں سے ہوگا۔ لوگوں سے باتیں کرے گا جب گود میں ہوگا اور جب پوری عمر کا ہوگا، صالحین میں سے ہوگا۔ [3]

پھر اللہ کی طرف سے ایسے سخت ترین امتحان کا مرحلہ آگیا، اس سے زیادہ اذیت ناک اور کڑا امتحان ایک انتہائی معزز خاندان کی حیادار اور پروردگار عالم کی خصوصی نگہداشت میں عبادت الٰہی کے اعلیٰ ترین ذوق کے ساتھ پرورش پانے والی بچی کے لیے اور کوئی نہ ہوسکتا تھا جس کی رگ رگ میں برائی کے خلاف نفرت بھری ہوئی تھی۔

وہ ایک دن اپنی رہائش گاہ سے مشرق کی جانب گئیں اور لوگوں کی نظروں سے حجاب میں ہوئیں تو اللہ نے ان کی طرف اپنے فرشتے روح القدس کو بھیجا جنھوں نے ہوبہو ایک انسان کی شکل اختیار کر لی۔ وہ کہنے لگیں: اگر تم اللہ کا خوف رکھنے والے ہو تو میں تم سے اللہ کی حفاظت میں آتی ہوں (انھیں پتہ تھا کہ ایک متقی اللہ کی حفاظت کا کلمہ سن کر ہی اللہ سے ڈر جائے گا)۔ انھوں نے کہا: میں تو بس تیرے رب کا قاصد ہوں (اس لیے آیا ہوں) تاکہ تمھیں ایک پاکیزہ بیٹا عطا کروں۔ وہ بولیں: میرے لیے بیٹا کہاں سے ہوگا؟ مجھے تو کسی انسان نے کبھی چھوا تک نہیں اور نہ میں کبھی گناہ کرنے والی رہی۔ اس (روح القدس) نے کہا: ایسے ہوگا، تیرے رب نے کہا کہ یہ مجھ پر آسان ہے۔ [4]

[1] آل عمرٰن 3:37-39. [2] آل عمرٰن [illegible]

روح القدس (جبریل) نے مزید کہا: اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے: ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔ [1]

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت مریم کو بتایا گیا کہ ہم اسے انسانوں کے لیے ایک عظیم نشانی بنائیں گے۔ وہ ہماری طرف سے (سراپا) مہر ورحمت ہوگا اور اس سب کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

''مریم (ایک پھونک کے ذریعے سے) حاملہ ہوگئیں اور اپنے اس حمل کے ساتھ دور کی جگہ پر چلی گئیں۔ پھر بچہ جننے کا درد انھیں کھجور کے ایک تنے کے پاس لے آیا۔ وہ کہنے لگیں: کاش! میں اس سے پہلے مرجاتی اور بھولی بسری ہو جاتی۔ پھر اس (فرشتے) نے نشیب کی طرف سے اسے آواز دی کہ غم نہ کرو، تمھارے رب نے (تو) تمھارے نیچے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے اور کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ، تم پر پکی کھجوریں گریں گی۔ پس کھاؤ اور پیو اور آنکھیں ٹھنڈی رکھو، پھر اگر انسانوں میں سے کسی کو دیکھو تو کہنا: میں نے رب رحمٰن (کی رضا) کے لیے ایک روزہ مانا ہے، اس لیے آج میں کسی انسان سے کلام نہ کروں گی۔'' [2]

حضرت مسیح پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحانی حفاظت کے لیے ان کے گرد ایک حجاب قائم کر دیا۔ صحیحین میں ہے: ''جو بھی بچہ پیدا ہوتا ہے، شیطان اس کے پہلو میں انگلی چبھوتا ہے تو وہ بچہ رونا شروع کر دیتا ہے سوائے مریم اور ان کے بیٹے کے۔ وہ (شیطان) عیسیٰ علیہ السلام کو انگلی چبھونے لگا تو حجاب میں چبھوئی (عیسیٰ علیہ السلام تک نہ پہنچ سکی)۔'' [3]

معراج کے دوران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں عیسیٰ علیہ السلام کا حلیہ بیان کیا:

«رَبْعَةٌ أَحْمَرُ كَأَنَّمَا خَرَجَ مِنْ دِيمَاسٍ»

''(عیسیٰ علیہ السلام) درمیانے قد والے اور سرخ وسفید تھے جیسے ابھی ابھی غسل خانے سے باہر آئے ہوں۔'' [4]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں (طواف کرتے ہوئے) بیت اللہ کے قریب بھی دکھائے گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں آپ کا حلیہ بیان فرمایا: ''گندمی رنگ کے مرد، جتنا کوئی خوبصورت ترین گندمی انسان نظروں میں آسکتا ہے، زلفیں کندھوں کے درمیان لٹکتی ہوئی، بال سیدھے سنورے ہوئے، سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ آپ نے اپنے دونوں ہاتھ دو آدمیوں کے کندھوں پر رکھے ہوئے تھے۔'' [5]

حضرت مریم فرشتوں کے ذریعے سے اپنے بچے کی وجاہت و برکت کا پہلے سن چکی تھیں، اب پینے کے لیے چشمہ

[1] آل عمرٰن 3:47. [2] مریم 19:21-26. [3] صحيح البخاري: 3286، 3431، صحيح مسلم: 2366. [4] صحيح البخاري: 3437، صحيح مسلم: 168. [5] صحيح البخاري: 3440، صحيح مسلم: 169.

پھوٹا، کھانے کا انتظام ہوا اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ کسی بھی انسان کے سامنے وضاحت پیش کرنے کی بھی آپ کو ضرورت نہیں تو ہمت بندھی اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ طاقت اور یقین کے ساتھ قوم کا سامنا کرنے کو تیار ہوگئیں۔ اس بیان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اس شک وشبہ میں ڈالنے والی بات کی بھی تردید کر دی کہ یوسف نجار کسی بھی مرحلے میں حضرت مریم کے ساتھ تھا۔ مریم حمل سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش تک اور پیدائش کے بعد قوم کا سامنا کرنے تک اکیلی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود مریم علیہا السلام کی نصرت کی اور ان کے شیر خوار بچے کے ذریعے سے ان کی پاکبازی، عظمت اور صداقت کی گواہی دلوائی۔

پھر حضرت مریم اس (بچے) کو اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس لائیں۔ لوگوں نے کہا: اے مریم! تو ایک دہشت زدہ کرنے والی چیز لے آئی ہے۔ اے ہارون (جیسے نیک انسان) کی بہن! نہ تمھارا باپ برائی کرنے والا آدمی تھا نہ تمھاری ماں بدکار تھی! تب انھوں نے اس (بچے) کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا: ہم اس سے کیونکر بات کریں جو گود میں چھوٹا سا بچہ ہے! اس پر وہ بول پڑا: یقیناً میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا کی اور مجھے نبی بنایا۔ میں جہاں بھی ہوں مجھے برکت والا بنایا اور مجھے زندگی بھر نماز اور زکاۃ کی ادائیگی کی تاکید کی۔ میں اپنی والدہ سے حسنِ سلوک کرنے والا ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے جبر کرنے والا بدبخت نہیں بنایا۔ اور سلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا، جس دن مروں اور جس دن کھڑا ہوں جی کر۔ یہ ہے مریم کا بیٹا عیسیٰ، (اس کے بارے میں یہی ہے) سچی بات جس میں تم جھگڑتے ہو۔ اللہ کے شایانِ شان نہیں کہ وہ کوئی بیٹا بنائے۔ وہ تو جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے: ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ اللہ ہی میرا رب ہے اور وہی تمھارا رب ہے۔ عبادت اسی کی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ (انھوں نے ان سے کہا:) میں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بہت بڑی نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمھارے لیے مٹی سے پرندے جیسی ایک صورت بناتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ اور میں اللہ کے حکم سے اندھے اور برص والے کو اچھا کر دیتا ہوں اور مُردوں کو زندہ کر دیتا ہوں اور تمھیں بتاتا ہوں جو تم اپنے گھروں میں کھاتے ہو اور جو بچا کر رکھتے ہو۔ اس میں تمھارے لیے بہت بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو۔ اور میں سچائی واضح کرنے والا ہوں تورات کی جو مجھ سے پہلے کی ہے اور اس لیے کہ میں تمھارے لیے بعض وہ چیزیں حلال

[1] مریم 19:27-35.

کروں جو تم پر حرام کر دی گئیں اور میں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے بڑی نشانی لے کر آیا ہوں، اس لیے اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ میری پیروی کرو، بے شک اللہ ہی میرا اور تمھارا پروردگار ہے۔ اسی کی بندگی کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔ [1]

یہودی برخود غلط، سرکش اور متکبر لوگ تھے۔ حضرت مریم علیہا السلام کی صدیقیت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت اور ان کے اعجاز کے متعدد مظاہرے دیکھنے کے باوجود کفر پر ڈٹے رہے۔ وہ مریم علیہا السلام پر بدترین الزام لگا کر اس پر مُصر تھے۔ بنی اسرائیل حضرت مریم کی طرف سے یہ بات ماننے کو تیار نہ ہوتے تھے کہ انھیں عیسیٰ کا حمل ایک پھونک سے ٹھہرا تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بڑے ہو کر انھیں دکھایا کہ اللہ کا حکم ہو تو جیتی جاگتی عورت تو کجا، ایک پھونک کے ذریعے سے مٹی کا معمولی سا مجسمہ زندہ اور اڑنے والا پرندہ بن جاتا ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کے حوالے سے اور بھی بہت سے کام، مثلاً: اندھے کو بینا کرنا، کوڑھی کو تندرست کرنا حتی کہ مردوں کو زندہ کر دینا، محض اللہ کے حکم سے کرنے شروع کر دیے۔ وہ سرتاپا اللہ کی نشانی اور اللہ کا حکم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہودیوں کے لیے عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے انکار کرنے اور مریم صدیقہ کے دامن پر الزام لگانے کی کوئی گنجائش باقی نہ چھوڑی۔ اب عیسیٰ علیہ السلام پہ ایمان نہ لانے والے یہودی اور ان سے اتفاق کرنے والے محض ہٹ دھرمی، سرکشی اور انکار پر قائم رہے۔ حجت تمام ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے ذریعے سے مسلمانوں کو واضح طور پر بتایا کہ اللہ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم کی سی ہے۔ اس نے آدم کو مٹی سے بنایا، پھر کہا: ہو جا تو وہ ہو گیا۔ [2]

جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی طرف سے کفر و انکار محسوس کیا تو کہا: کون ہیں جو اللہ کی راہ میں میرے مددگار ہوں گے؟ حواریوں نے کہا: ہم ہیں اللہ کی مدد کرنے والے، ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ (انھوں نے کہا:) اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے اس (کتاب) پر جو تو نے نازل کی اور ہم نے اتباع کی رسول کی، اس لیے ہمیں (سچائی کی) گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ [3]

اللہ ہی نے حواریوں کے دل میں ڈالا کہ وہ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے رسول پر ایمان لائیں، انھوں نے کہا: ہم ایمان لے آئے۔ [4]

یہ حواری بڑے مرتبے کے لوگ تھے۔ ''جب حواریوں نے کہا: اے عیسیٰ! کیا تمھارا رب یہ بھی کر سکتا ہے کہ آسمان سے ہمارے اوپر ایک بھرا ہوا دستر خوان اتارے تو حضرت عیسیٰ نے یہ جواب دیا کہ اگر ایمان رکھنے والے ہو تو اللہ سے ڈرو (تم نے یہ کیسا سوال کیا اور کیا مطالبہ کیا!) انھوں نے کہا: ہم چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں

[1] آل عمرٰن 3:49-51. [2] آل عمرٰن 3:59. [3] آل عمرٰن 3:52،53. [4] المآئدۃ 5:111.

اور ہمیں (ایمان سے آگے) اطمینان قلب حاصل ہو اور ہم جان لیں کہ آپ نے ہمیں سچ بتایا اور ہم اس (سچ) پر گواہ بن جائیں۔"[1] بنیادی طور پر یہ اطمینان قلب کے حصول کی خواہش تھی جو ایمان کے بعد اس بات کے مشاہدے سے (بھی) حاصل ہوتا ہے کہ اللہ کی قدرت کس طریقے سے بروئے کار آتی ہے۔ اسی طرح سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بھی یہ دیکھنا چاہا تھا کہ مردوں کو دوبارہ زندگی کس طرح ملتی ہے۔

"عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے میرے اللہ! اے ہم سب کے پالنے والے! تو آسمان سے ہم پر ایک دسترخوان اتار دے کہ وہ ہمارے پہلوں اور پچھلوں کے لیے عید ہو جائے اور تیری طرف سے ایک بہت بڑی نشانی اور ہمیں (ایسی نرالی) روزی (بھی) دے اور تو ہی بہترین رزق دینے والا ہے۔ اللہ نے فرمایا: میں اسے تم پر اتاروں گا، پھر اس کے بعد تم میں سے جو بھی انکار (سرکشی) کرے گا تو میں اس کو ایسا عذاب دوں گا جو سب جہانوں میں سے کسی (اور) کو نہ دوں گا۔[2]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام، ان کی والدہ اور ان کے لائے ہوئے پیغامِ ہدایت کے حوالے سے خود نصاریٰ کے ہاں جو غلط روایات رائج ہیں، وہ کسی طور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے خاندان کے شایانِ شان نہیں۔ ان روایات سے حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشن کا مرتبہ اصل سے کہیں کم نظر آتا ہے۔ صحیح اسلامی مراجع سے ان تمام روایات کی نفی ہوتی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابدی پیغام کے صحیح خدوخال سامنے آتے ہیں اور حضرت عیسیٰ اور ان کے خاندان کی پیغمبرانہ عظمت نمایاں ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کے بارے میں نہ صرف نصاریٰ بلکہ مسلمان مفسرین کے ہاں جو روایات مروج ہیں اور جو اسلام لانے والے عیسائی علماء ہی کے ذریعے سے تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں شامل ہوئی ہیں، ان حواریّین کے شایانِ شان نہیں۔ ان روایات سے حواریّین کے کردار کی یہ تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ وہ غدار اور بزدل تھے۔ ایک حواری یہوداہ اسکریوتی (عربی مراجع کے مطابق "یودس زکریا یوحنا") نے غداری کی۔ اس کے نتیجے میں اس کی شکل عیسیٰ علیہ السلام کی شکل جیسی ہوگئی اور عیسائی روایات کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ جی اٹھنے کے بعد اسی کو پکڑ کر قتل کر دیا گیا لیکن اسلام نے ان حواریوں کے بارے میں مشہور کی جانے والی غلط روایات کے جھوٹ کی بھی قلعی کھول دی۔ قرآن نے جہاں یہ کہا کہ حواریّین کا ایمان لانا اللہ کی توفیق سے تھا، وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے گواہی، جو وہ قیامت کے روز دنیا میں اپنی پہلی زندگی کے دوران میں ان کے توحید پر قائم رہنے کے بارے میں دیں گے، ان الفاظ میں ذکر کر دی:

﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ﴾ "اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا۔"[3]

[1] المآئدۃ 5:112-113۔ [2] المآئدۃ 5: 114-115 [3] المائدہ 5:117۔

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ (م:327ھ) اوران سے اخذ کرتے ہوئے ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی اپنی تفسیر میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے اور اس موقع پر حواریین، خصوصاً ایک حواری کے عظیم الشان کردار، قربانی اور جاں نثاری کے بارے میں صحیح سند کے ساتھ اِس امت کے حبر ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول نقل کیا ہے۔ یہ قول رائج اسرائیلی روایات کے بالکل برعکس ہے۔ اس سے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما چونکہ یہ خبر اپنی طرف سے نہیں دے سکتے تھے، اس لیے انھوں نے غالباً یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوگی۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جب اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھانا چاہا تو آپ اپنے ساتھیوں (اصحاب) کے پاس تشریف لائے، مکان میں اس وقت بارہ حواری تھے۔ حضرت عیسیٰ اس چشمے کے اندر سے نکل کر آئے جو گھر میں آتا تھا۔ آپ کے سر سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: بلاشبہ تم میں سے ایک ایسا ہے جو مجھ پر ایمان لانے کے بعد بارہ دفعہ انکار (کفر) کرے گا۔ آپ نے پوچھا: تم میں سے کس پر میری مشابہت طاری کی جائے جس کے بعد وہ میری جگہ قتل ہو اور (جنت میں) میرے ساتھ میرے درجے میں آجائے؟ اس پر سب سے کم عمر حواری کھڑا ہوگیا۔ آپ نے فرمایا: تم بیٹھ جاؤ۔ آپ نے پھر ان کے سامنے بات دہرائی۔ وہی نوجوان کھڑا ہوا اور کہا: میں۔ تب آپ نے فرمایا: وہ تمھی ہو۔ اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مشابہت طاری ہوگئی۔ حضرت عیسیٰ کمرے کے ایک روشن دان کے راستے آسمان کی طرف اٹھالیے گئے۔ تب آپ کے متلاشی یہودی پہنچ گئے۔ انھوں نے حضرت عیسیٰ کے ہم شکل کو پکڑ لیا، پھر اسے قتل کر کے صلیب پر لٹکا دیا۔ ان میں سے ایک نے آپ پر ایمان لانے کے بعد بارہ مرتبہ کفر کیا۔ آپ کے بعد لوگ تین فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔ ایک فرقے نے کہا: اللہ ہمارے درمیان رہا جب تک چاہا، پھر آسمان کی طرف بلند ہوگیا۔ یہ یعقوبی ہیں۔ ایک فرقے نے کہا: بیٹا ہمارے درمیان رہا جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا، پھر اس نے اسے اٹھالیا، یہ نسطوری ہیں۔ اور ایک فرقے نے کہا: اللہ کا بندہ اور رسول ہم میں رہا جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا، پھر اسے اللہ تعالیٰ ہی نے اٹھالیا۔ یہ مسلم تھے۔ کافر فرقوں نے مسلمانوں کے خلاف متحد ہوکر انھیں ختم کر دیا۔ اس کے بعد اسلام مٹا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔[1]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ابن ابی حاتم سے یہ روایت نقل کرنے کے بعد کہا: اس کی سند سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما تک صحیح ہے۔[2]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی طرح ایک اولوالعزم پیغمبر تھے جس طرح ان سے پہلے گزر چکے۔ ان کی والدہ ''صِدّیقہ'' تھیں۔[3] عیسیٰ علیہ السلام نے ہمیشہ سچ بولا، سچ کو اپنایا اور سچ پر عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی کتاب انجیل نازل فرمائی جو

[1] تفسیر ابن أبي حاتم، النسآء 157:4. [2] تفسیر ابن کثیر، النسآء 157:4. [3] المآئدۃ 75:5.

اب اپنی زبان اور اصل شکل میں موجود نہیں۔ اس کے بجائے مدتوں بعد کے کئی لوگوں کی لکھی ہوئی اناجیل ہیں۔ ان میں بھی، خود نصاریٰ کے اعترافات کے مطابق، مختلف ادوار میں لفظی اور معنوی تبدیلیاں کی جاتی رہیں۔ یہی حال تورات اور زبور کا ہے۔ یہی وہ تحریفات ہیں جو قرآن مجید میں اہل کتاب کی طرف منسوب ہوئیں:

﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾

''یہودیوں میں سے کچھ لوگ الفاظ کو ان کے موقع محل سے پھیر دیتے ہیں۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو دانا اور حکیم بنایا تھا۔ ان کی دعوت اور تربیت کا طریقہ انتہائی حکیمانہ تھا۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعا روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک آدمی کو چوری کرتے دیکھا تو فرمایا: ''اے فلاں! تو نے چوری کی؟'' اس نے کہا: ''نہیں، اللہ کی قسم! میں نے چوری نہیں کی۔'' فرمایا: ''میں اللہ پر ایمان لایا، اپنی آنکھ کو جھٹلا دیا۔''[2]

آپ نے جو کہا، اس سے اسے اللہ تعالیٰ کا مقام سمجھایا۔ جھوٹی قسم کھانے والے کو ایسی ہی تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ انداز میں تواضع ایسی تھی کہ سننے والے کے دل پر اثر نہ ہونا مشکل تھا۔

ابن کثیر رحمہ اللہ نے امام ابن عساکر رحمہ اللہ کے حوالے سے حضرت عکرمہ رحمہ اللہ سے روایت نقل کی کہ عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے: ''سچے موتی خنزیر کی طرف مت پھینکو، خنزیر ان موتیوں سے کچھ نہ کرے گا اور دانائی اسے عطا نہ کرو جو اس کا طلبگار نہ ہو کیونکہ دانائی موتیوں سے بہتر ہے اور جو اس کا طلبگار نہیں وہ خنزیر سے بدتر ہے۔''[3]

ان کا یہ فرمان بھی منقول ہے: ''اے علمائے سوء! تم نے دنیا کو سر کے اوپر کر دیا اور آخرت کو پاؤں کے نیچے۔ تمھارا کہا شفا ہے لیکن تمھارا عمل بیماری ہے۔ تمھاری مثال دفلی کے (خوشنما زہریلے) درخت کی ہے، جو دیکھے خوش ہو جائے اور جو کھالے مر جائے۔''

وہب بن منبہ رحمہ اللہ کے حوالے سے عیسیٰ علیہ السلام کا یہ فرمان بھی منقول ہے: ''اے علمائے سوء! تم نے جنت کے دروازوں پر دھرنا دیا ہوا ہے، نہ خود اندر داخل ہوتے ہو نہ مسکینوں کو اندر داخل ہونے دیتے ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین شخص وہ عالم ہے جو اپنے علم کے ذریعے سے دنیا کا طلبگار ہے۔''[4]

انھی سے منقول ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی ایک قبر کے کنارے کھڑے تھے۔ میت کو قبر میں اتارا جا رہا تھا تو انھوں نے قبر کے اندھیرے، اس کی وحشت اور اس کی تنگی پر باتیں شروع کر دیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے

[1] النسآء 4:46. [2] مسند أحمد 2/383. [3] عیسیٰ علیہ السلام کے اسی قول سے انگریزی کی کہاوت To cast pearls before swine (ناقدرے کو خزانہ دینا) بنی ہے۔ [4] الدر المنثور، آل عمران 3:48.

فرمایا: ”تم اس سے زیادہ تنگ جگہ رحمِ مادر میں تھے۔ جب اللہ فراخ کرنا چاہے تو فراخ کر دیتا ہے۔“[1]

رفعِ عیسیٰ علیہ السلام

یہودی اپنی سازشوں کے ذریعے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کرنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ پھانسی کی موت دلوا کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں کمی کریں اور جو کچھ جھوٹے الزامات انھوں نے حضرت عیسیٰ پر لگائے تھے، پھانسی کی سزا کے ذریعے سے لوگوں کو ان کے سچ ہونے کا تاثر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودیوں نے اپنے مکر و فریب کا جال پھیلایا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو توڑنے کے لیے دوسرا انتظام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا:

﴿يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝﴾

”اے عیسیٰ! میں تمھیں پورا پورا لینے والا، تمھیں اپنی طرف اٹھانے والا، تمھیں ان (کے شر) سے پاک کرنے والا ہوں جنھوں نے اللہ سے کفر کیا اور تمھارے ماننے والوں کو قیامت تک کافروں سے بلند کرنے والا ہوں۔ اس کے بعد تم سب کا لوٹنا میری طرف ہوگا اور میں ہی تمھارے درمیان ان معاملات کا فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔“[2]

اللہ نے یہ بھی فرمایا:

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِىْ شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۝﴾

”حالانکہ انھوں نے نہ انھیں قتل کیا اور نہ انھیں سولی پر چڑھایا بلکہ ان لوگوں کے لیے اس (مسیح) کا شبیہ بنا دیا گیا۔ اور بے شک جنھوں نے عیسیٰ کے بارے میں اختلاف کیا، وہ ضرور ان کے متعلق شک میں ہیں۔ ان لوگوں کے پاس ان کے بارے میں کوئی علم نہیں سوائے گمان کی پیروی کے اور انھوں نے یقیناً انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انھیں اپنی طرف اٹھالیا اور اللہ بڑا زبردست بہت حکمت والا ہے۔ اور اہل کتاب میں سے کوئی بھی ایسا نہ بچے گا جو عیسیٰ پر ان کی موت سے پہلے ایمان نہ لے آئے اور قیامت کے دن وہ ان سب پر گواہ ہوں گے۔“[3]

[1] الدر المنثور، آل عمرٰن 48:3. [2] آل عمرٰن 55:3. [3] النسآء 4:157-159.

نزولِ مسیح

حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانوں پر ہیں۔ امت محمدیہ کے آخری دور میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ زمین پر بھیجے گا۔ ان کے نزول کا وقت صبح کی نماز کا ہوگا۔ دمشق کی جامع مسجد (اموی) میں تکبیر کہی جاچکی ہوگی کہ وہ اتر کر اگلی صف میں تشریف لے آئیں گے۔ مسلمانوں کا امام تکریماً عرض کرے گا: اے روح اللہ! آئیں، نماز پڑھائیں۔ وہ فرمائیں گے: نہیں! بلکہ تم ایک دوسرے پر امیر ہو۔ یہ وہ اعزاز ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عطا کیا ہے۔ [1]

ان کے نزول کے بعد دل سے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو ماننے والے اہل کتاب ان پر ایمان لائیں گے۔ وہ انھیں امت محمدیہ کا حصہ بنانے کے لیے خنزیر کے قتل، صلیبوں کو توڑنے اور اپنے ساتھ ایمان لانے والوں سے جزیہ ختم کرنے کا حکم دیں گے۔ دجال جو اپنے دجل وفریب کے ذریعے سے جھوٹا مسیح بنا ہوا ہوگا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام باب لُد پر اس کو جہنم واصل کریں گے۔ لُد (Lydda) بیت المقدس کے مغرب میں ساحلی شہر تل ابیب یافو سے رام اللہ جانے والی شاہراہ پر فلسطین کا اہم شہر ہے جہاں اسرائیل نے ایک بڑا فضائی اڈا قائم کر رکھا ہے۔ [2] حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسلامی شریعت کے مطابق شادی کریں گے، ان کی اولاد ہوگی۔ امت کے عادل ترین سب سے بڑے جج ہوں گے اور یاجوج و ماجوج کے فتنۂ عظمیٰ سے بچنے کے لیے مسلمانوں کی قیادت فرمائیں گے۔

[1] صحیح مسلم: 156۔ [2] اٹلس فتوحات اسلامیہ، ص: 169 و 189۔



اموی مسجد (دمشق) کا سفید مینار

5

یونان کی سلطنت وحکمت اور اصنام پرستی

یونان ''آئیونین'' یا آئیونیا'' سے معرب ہے۔ یونانی دیوی آئیو (Io) کے نام پر آئیونین قوم اور علاقہ آئیونیا (Ionia) کے نام پڑے۔ آئیونین قوم جس علاقے میں آباد ہوئی، اس میں جنوب مشرقی یونان (Greece) کی ریاست اٹیکا (Attica)، جزائر ایجین، ایشیائے کوچک کا مغربی ساحلی علاقہ ''آئیونیا'' اور یونان کے مغربی ساحل پر بحیرۂ آئیونین میں واقع جزائر شامل تھے۔ [1] آج بھی شمال مغربی یونان میں ایک شہر کا نام آئیونینا ہے۔

جنوب مشرقی یورپ کا ملک یونان جزیرہ نمائے بلقان کا جنوب کی طرف بڑھا ہوا حصہ ہے۔ اس کے مشرق میں بحیرۂ ایجہ (ایجین) اسے ایشیائے کوچک یا اناطولیہ (ترکی) سے جدا کرتا ہے۔ مغرب میں بحیرۂ آئیونیا اسے اٹلی سے الگ کرتا ہے۔ اس کے جنوب میں بحیرۂ روم واقع ہے۔ یونان کے شمال میں بلغاریہ، مقدونیہ اور البانیہ ہیں جبکہ شمال مشرق میں یورپی ترکی (تھریس یا تراقیہ) واقع ہے۔

لیڈیا، سپارٹا اور حکیم سولن



لیڈیا (ترکی) کے دارالحکومت ساردیس کے کھنڈر

تیسری ہزاری ق م میں یونانی قبیلے جزیرۂ کریٹ، قبرص، بحیرۂ ایجہ کے جزائر، نیز سمرنا (موجودہ ازمیر) یا ایشیائے کوچک کے دوسرے مقامات پر آباد ہوئے۔ 800 تا 600 ق م مصر، سسلی، اٹلی اور شمالی افریقہ وغیرہ میں بہت سی یونانی نوآبادیاں بن گئیں۔ ایشیائے کوچک میں فرجیا (705 ق م) اور لیڈیا (Lydia) کی یونانی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ 546 ق م میں سائرس اعظم (ذوالقرنین) نے لیڈیا کے آخری بادشاہ کروئسس کو شکست دے کر اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

[1] The Oxford English Reference Dictionary, p: 741.

دریں اثنا خاص یونانی ریاستوں میں سے ریاست سپارٹا (سپارٹی)، جو جنوبی یونان کے جزیرہ نما پیلو پونیز (Peloponnese) کے جنوبی حصے میں واقع تھی، اور ایٹیکا (ایتھنز) نے بہت شہرت حاصل کی۔ 593 ق م میں حکیم سولن (639 تا559 ق م) ریاست ایتھنز کے نظم ونسق کا مختار بنا۔ اس نے ضمانت کے طور پر رکھی گئی زمینوں کے قرضے منسوخ کر دیے، غلاموں کو آزاد کر دیا اور قتل کے سوا تمام جرائم کی سزائیں نرم کر دیں۔ حکیم سولن نے 612 ق م میں جس طرز حکومت کو جمہوریت (Democracy) کا نام دیا تھا، اس کے مطابق اس نے عام آدمی (Demos) کو حکومت کے انتظامی امور میں شریک کرنے کا راستہ ہموار کیا۔ وہ نظام آج بدلی ہوئی شکل میں دنیا کے بیشتر ممالک میں نظر آتا ہے۔ [1]

میراتھون کی تاریخی جنگ

498 ق م میں ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کی یونانی ریاستوں نے ایران کے خلاف بغاوت کر دی تو شاہ ایران دارا گشتاسپ (داریوش اول) نے یونان کو فتح کرنے کے لیے ایک بڑی فوج بھیجی۔ 490 ق م میں ایتھنز سے بائیس میل دور میراتھون کے میدان جنگ میں یونانی جرنیل ملٹیاڈیز نے ایرانیوں کو شکست فاش دی۔ ایک روایت کے مطابق فتح میراتھون کی خبر لے کر ایک خبر رساں مسلسل 35 کلومیٹر تک دوڑتا ہوا ایتھنز آیا تھا مگر وہاں پہنچتے ہی اس نے گر کر جان دے دی تھی۔ اس کی یاد میں اولمپک کھیلوں میں میراتھون ریس شامل کی گئی ہے۔ [2] ایک بار پھر دارا کا جانشین خشیارشاہ (Xerxes) 480 ق م میں ایک لاکھ 80 ہزار فوج کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ تھریس اور مقدونیہ میں سے ہو کر ایرانی ایتھنز کی طرف بڑھے مگر درہ تھرما پلی کے اندر



میراتھون کا تاریخی میدان جنگ

لیونی داس کی قیادت میں 300 جوانمرد، جو سب نرینہ اولاد رکھنے والے تھے، مقابلے میں ڈٹ گئے۔ وہ سب موت کے گھاٹ اتر گئے لیکن اس سے ایتھنز والوں کو شہر خالی کر کے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ اس دوران میں سلیمس کی جنگ میں ایرانی بیڑے کو شکست فاش ہوئی اور خشیارشاہ صرف ایک تہائی فوج بچا کر واپس ایران پہنچ سکا۔ اگلے سال ایرانیوں کو پلاٹائیا کی لڑائی میں پھر شکست ہوئی۔ لڑائیوں کا یہ سلسلہ سکندر اعظم کے حملے تک جاری رہا۔ دریں اثنا

[1] ''یونان کا ادبی ورثہ'' از احمد عقیل روبی، ص: 15. [2] آکسفورڈ انگلش ریفرنس ڈکشنری، ص: 880.

460 ق م میں یونانی ریاستوں ایتھنز اور سپارٹا میں پیلو پونیز جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا جو 405 ق م میں ایتھنز کے سقوط پر منتج ہوا۔ سپارٹا والوں نے ایتھنز شہر کی فصیلیں منہدم کر دیں۔

مقدونیہ کا عروج اور سکندر اعظم


سکندر اعظم کا سکہ

مقدونیہ کا حکمران فلپ (فیلقوس) 359 ق م میں تخت نشین ہوا۔ اس نے 337 ق م میں یونانی ریاستوں کی متحدہ فوج کو شکست دے کر انھیں اپنی سلطنت میں ضم کر لیا اور یوں قدیم یونان صفحۂ تاریخ سے غائب ہوگیا۔ پھر فلپ نے ایران کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اگلے سال وہ اچانک مارا گیا اور اس کا بیٹا سکندر سوم (336 تا 323 ق م) تخت نشین ہوا جو تاریخ عالم میں سکندر اعظم (Alexander the Great) کے نام سے مشہور ہے۔ 334 ق م میں وہ 32 ہزار پیادوں اور 5 ہزار سواروں کے ساتھ دنیا کی تسخیر کے لیے نکل پڑا۔ چھوٹے بڑے 160 بحری جہاز ہمراہ تھے۔ اس نے ایشیائے کوچک میں گرینی کس اور اسوس (Issus) کی جنگوں میں ایرانیوں کو شکست دی۔ اس کے بعد سکندر اعظم نے شام و فلسطین اور مصر فتح کیے اور دوبارہ ایران پر چڑھائی کر دی۔ شاہ ایران دارا سوم یکم اکتوبر 331 ق م کو جنگ اربیلا (عراق) میں شکست کھا کر بھاگا اور اپنے درباریوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

اس کے بعد سکندر اعظم نے باختر (افغانستان) اور ترکستان فتح کیے اور وہاں کے ایک بڑے سردار کی بیٹی روشنک (Roxana رخسانہ) سے شادی کی۔ وہ 326 ق م میں برصغیر پر حملہ آور ہوا۔ پنجاب میں دوآبہ چج کے راجہ پورس کو شکست دینے کے بعد اس نے ملتان فتح کیا، پھر دریائے بیاس پر پہنچا تو فوج نے مزید آگے جانے سے انکار کر دیا، چنانچہ سکندر اعظم 323 ق م میں سندھ اور مکران کے راستے لوٹا اور بابل پہنچ کر فوت ہوگیا۔ اس نے مختلف مقامات پر اپنے نام سے 25 شہر آباد کیے جن میں سے اسکندریہ (مصر) اور اسکندرون (ترکی) آج بھی معروف ہیں۔ ہرات بھی الیگزینڈریا کے ابتدائی نام سے اسی نے آباد کیا تھا۔

سکندر اعظم کے جانشین

سکندر اعظم کے جانشینوں میں بطلیموس اور سلیوکس (Seleucus) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بطلیموس نے مصر اور شام کے ایک حصے پر قبضہ مستحکم کیا جبکہ سلیوکس نے 305 ق م میں ایک سلطنت قائم کی جس کا مرکز ابتدا میں سلیوکیہ تھا۔ اسی کا نام بعد میں مدائن مشہور ہوا۔ بعد کے سلیوکی حکمرانوں نے اپنا دارالحکومت انطاکیہ بنا لیا۔ 64 ق م میں روما کے جرنیل پومپی نے سلیوکی خاندان کا خاتمہ کر دیا اور اس کے تمام مقبوضات رومی سلطنت میں شامل کر لیے۔

حکمت یونان کی چھ صدیاں

چھٹی تا پہلی صدی ق م یونانی علم و ادب کا سنہری دور تھا۔ اس زمانے میں ریاضی دان فیثا غورث (560 تا 480 ق م)، مؤرخ ہیروڈوٹس (پ 484 ق م)، جمہوریت پسند سیاستدان پیریکلیز (495 تا 429 ق م)، موحد فلسفی سقراط (469 تا 399 ق م)، افلاطون (428 تا 347 ق م)، نظریۂ ایٹم کا بانی دیموقریطس (460 تا 370 ق م)، مؤرخ زینوفن (435 تا 354 ق م)، بابائے طب بقراط (460 تا 377 ق م)، فلسفی اور مفکر ارسطو (384 تا 322 ق م) اور ریاضی اور طبعیات کے ماہر ارشمیدس (287 تا 212 ق م) کو بہت شہرت ملی۔ فیثا غورث پہلا شخص تھا جس نے کرۂ ارض کو گول کہا اور سورج اور چاند گرہن کی عملی تشریح کی۔ سقراط کے زمانے میں یونانی توحید اور خدا پرستی کے اس قدر مخالف تھے کہ ان لوگوں نے اپنی قوم کے ہادی سقراط کو صرف اس جرم میں زہر کا جام پلا کر مروا ڈالا کہ یہ نامور فلسفی بُت پرستی کا مخالف تھا اور توحید کی تلقین کرتا تھا۔[1]



فیثا غورث کی جیومیٹری کی تختی

افلاطون کی تصنیف ''جمہوریہ'' (Republic) اعلیٰ درجے کے مکالمات کا مجموعہ ہے جس میں اس کے استاد سقراط کا ایک ایک لفظ محفوظ ہے۔ افلاطون کے شاگرد ارسطو نے 335 ق م میں ایتھنز کے باہر لائسیم (سکول و لائبریری) کی بنیاد رکھی۔ اُنیسویں صدی عیسوی میں ڈارون نے ارسطو کے خیالات ہی کی بنا پر نظریہ ارتقا (Evolution Theory) پیش کیا۔ منطق میں ارسطو نے استقرائی طریقہ (Inductive Method) وضع کیا۔ سکندر اعظم ارسطو کا شاگرد تھا۔[2]



افلاطون کی تصنیف ''جمہوریہ'' کا ایک ورق

کثافت کا ''اصول ارشمیدس'' اور قطر اور محیط کی نسبت پائی (π یا $\frac{22}{7}$) یونانی ریاضی دان ارشمیدس کی دریافتیں ہیں۔[3] اس نے سائرا کیوز (سسلی) کے محاصرے میں رومی جہازوں کو آگ لگانے کے لیے آتشی شیشہ استعمال کیا۔ ارشمیدس اس وقت بھی ریت پر ہندسی اشکال بنانے میں منہمک تھا جب ایک رومی سپاہی نے آ کر اسے قتل کر دیا۔

یونانی اصنام پرستی اور اولمپک کھیل

سقراط کی طرف سے نظریۂ توحید کی حمایت اور تلقین کے باوجود اہل یونان دیوی دیوتاؤں کے پجاری رہے۔ ان کا

[1] قدیم مذہبی تاریخ، ص:21 ، روایات تمدنِ قدیم، ص:131۔

[2] Oxford English Reference Dictionary, p:71. [3] Oxford English Reference Dictionary, p:69.

مشرکانہ عقیدہ تھا کہ دیوتا انسانوں کے کرتوتوں پر نگاہ رکھتے اور بروں کو سزائیں دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ سارے فطری مظاہر ان دیوتاؤں ہی کے قبضے میں ہیں۔ بعد میں سقراط کے شاگرد افلاطون کی تعلیمات سے یہ تصور مضبوط ہوتا گیا کہ بعد از موت انسانوں کو جزا اور سزا کے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ یونانی توہمات کے مطابق دیوتا یا تو اولمپس پہاڑ پر رہتے تھے یا اپنے معبدوں میں۔ اولمپس گیارہ بڑے دیوتاؤں کا مسکن تھا جہاں زیوس دیوتا کا دربار تھا۔ جنوبی یونان میں اولیمپیا نامی میدان میں زیوس کی آمد و رفت تھی۔ یہیں 776 ق م سے ہر چار سال بعد کھیلوں کا میلا منعقد ہوتا تھا جس میں مختلف دوڑوں، موسیقی اور ادب کے مقابلے ہوتے تھے۔ مسیحی رومی بادشاہ تھیوڈوسیس اول نے 393ء میں ان کھیلوں پر پابندی لگادی۔ پھر 1896ء میں ایتھنز میں جدید اولمپک کھیلوں کے انعقاد سے یہ سلسلہ از سرِ نو جاری ہوا۔

مستی کا دیوتا اور اپالو

یونان میں ڈائیونیسس شراب اور مستی کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ موسم بہار میں عورتیں پہاڑوں پر نکل جاتیں۔ وہاں دن رات دل کھول کر شراب پیتیں اور نشے میں مدہوش دیوانہ وار جھومتی اور ناچتی ہوئی جلوس نکالتیں۔ اس حالت میں کسی بکرے یا بیل کو ڈائیونیسس دیوتا کا اوتار سمجھ کر پکڑ لیتیں اور اسے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر کچا چبا جاتی تھیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اس طرح دیوتا اُن کے اندر حلول کر جاتا ہے۔ یہی تصور بعد میں کلیسائے روم کے عشائے ربانی کی صورت میں نمودار ہوا جس میں روٹی کو جناب مسیح کا گوشت سمجھ کر کھایا جاتا ہے اور شراب کو ان کا خون سمجھ کر پیا جاتا ہے۔[1]

یونانی رزمیہ نگار ہومر کے ہاں اُلو کی شکل والی ایتھینا دیوی اور گائے کی شکل والی ہیرا دیوی کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ایتھنز شہر ایتھینا دیوی ہی کے نام سے منسوب ہے۔ زیوس کا بیٹا اپالو سورج کا دیوتا شمار ہوتا تھا۔ موسیقی، شعری جذبہ، تیراندازی اور پیش گوئی اس کی عطا سمجھی جاتی تھی۔

ڈیانا اور یوروپا دیوی

یونانی توہمات کے مطابق اپالو کی بہن آرٹیمس شکاری دیوی تھی۔ پیدائش، تولید اور زرخیزی اس کی طرف منسوب تھی۔ افسوس (ترکی) میں آرٹیمس کا مندر دنیا کے سات قدیم عجائبات میں شمار ہوا۔ رومیوں کے ہاں آرٹیمس کو ڈیانا

[1] روایاتِ تمدن قدیم، ص: 127۔

کا نام دیا گیا تھا۔ شاہ اگیمینون نے اپنے وحشی مشرکانہ عقیدے کے تحت اپنی بیٹی آرٹیمس دیوی کے حضور قربان کر دی۔ یونانی مشرکین زیوس کے متعلق یہ بے ہودہ تصور رکھتے تھے کہ اس نے پہلے سانڈ کی شکل اختیار کی، پھر ہنس کی صورت میں یوروپا دیوی کے ساتھ مباشرت کی۔ براعظم یورپ اسی دیوی کے نام سے موسوم ہے۔

یونان میں ہر کہیں انسانی لنگ (عضوتناسل) کی پوجا ہوتی تھی۔ ڈائیونیسس کے تہوار میں عورتیں لنگ کے مجسمے اٹھا کر فحش گیت گاتی ہوئی جلوس نکالتی تھیں۔ یونانی دیومالا میں ایک عالمگیر سیلاب کی روایت موجود تھی۔ اس کے مطابق صرف دیوکیلین اور اس کی بیوی پرہا کشتی میں بیٹھ کر اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ہیلن (Hellen) انھی کا بیٹا تھا جس کے نام پر یونانی ہیلینی (Hellene) کہلاتے تھے اور یونانی تہذیب Hellenistic کہلاتی ہے۔[1]

یونانی اخلاقیات کے گھناؤنے پہلو

یونان ایک طرف حکمت و فلسفہ کا معلم بنا ہوا تھا تو دوسری طرف بد اخلاقی کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق تھا۔ عصمت فروشی یونانی مذہب کا جزو بن گئی تھی۔ محبت کی دیوی ایفروڈائٹ کے مندر کی پجارنیں بدکار عورتیں ہوتی تھیں۔ مشہور نقاش پرکزتیلس نے اپنی آشنا فرائنی کا بت تیار کر کے اپالو کے مندر میں رکھ دیا تھا۔ بڑی بڑی دعوتوں میں خواصیں مادر زاد ننگی ہو کر کھانا کھلانے کو آتی تھیں۔ مردوں میں خلاف وضع فطری بدکاری عام تھی۔ رواقیہ اخلاقی فلسفہ کا بانی زینو اس لت میں مبتلا تھا۔ مشہور نقاش اپیلس نے سکندر اعظم کی معشوقہ لائس کا مجسمہ بناتے ہوئے اس سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ سکندر کو خبر ہوئی تو اس نے بلا تکلف اپنی معشوقہ اپیلس کے حوالے کر دی۔ سپارٹا میں قانون تھا کہ بوڑھے مرد کی جوان عورت علیحدہ کر کے کسی جوان کو دے دی جاتی تا کہ مضبوط نسل پیدا کی جا سکے۔

عظیم فلسفی ارسطو کا قول تھا: ''یونانیوں کے لیے غیر ملکیوں کے ساتھ وہی برتاؤ واجب ہے جو وہ حیوانات کے ساتھ کرتے ہیں۔'' چنانچہ سکندر اعظم نے لبنان کے شہر صور (ٹائر) میں بیس ہزار آدمیوں کو پکڑ کر قتل کرا دیا اور تیس ہزار کو غلام بنا کر بازاروں میں بکوا دیا۔[2]



لبنان کے شہر صور (ٹائر) کا ایک منظر

[1] روایاتِ تمدنِ قدیم، ص: 128. [2] قدیم مذہبی تاریخ، ص: 53-55.

6

سلطنتِ روم

روم یا رومہ (روما) اور رومی جمہوریت

انتہائی قدیم شہر روم موجودہ اٹلی کا دارالحکومت ہے۔ اس کی بنیاد 753 ق م میں رومولس نے رکھی۔ پہلے یہاں رومن بادشاہ حکمران رہے، پھر 510 ق م میں رومن ری پبلک (رومی جمہوریہ) قائم ہوئی جس کا انتظام سینیٹ کے ہاتھ میں تھا۔

روم اور قرطاجنہ (کارتھیج) کی جنگیں

تیسری اور دوسری صدی ق م میں شمالی افریقہ کے اہل قرطاجنہ اور رومیوں میں تین پیونک جنگیں لڑی گئیں۔ دوسری پیونک وار یا فنقی جنگ (218 تا 201 ق م) میں قرطاجنی جرنیل ہنی بال 30 ہزار سپاہیوں اور 40 ہاتھیوں کا لشکر اسپین اور فرانس سے گزار کر اٹلی پر حملہ آور ہُوا لیکن کئی لڑائیوں میں فتح پانے کے باوجود بالآخر اسے پسپا ہونا پڑا اور 202 ق م میں جنگِ زاما (تیونس) میں رُومیوں نے اسے تباہ کن شکست دی۔ ہنی بال فرار ہو کر انطاکیہ چلا آیا اور آخر کار 183 ق م میں بتھینیا (ایشیائے کوچک) میں اس نے زہر کا پیالہ پی کر خودکشی کر لی۔ قرطاجنی اپنے سورج دیوتا بعل ہمّون کے استھان پر زندہ بچوں کو قربان کر دیتے تھے۔ تیسری پیونک جنگ (149-146 ق م) میں رومیوں نے ان کے دارالحکومت قرطاجنہ کو نذرِ آتش کر دیا۔[1] 147-146 ق م میں یونان فتح کر لیا۔



قرطاجنہ کے کھنڈر

ٹائبیریس، سیزر اور آگسٹس

133 ق م میں ٹائبیریس نے غریب کسانوں کے حق میں زرعی اصلاحات کیں تو امراء نے اسے 300 ہمنواؤں کے ساتھ انتخابات میں قتل کر دیا۔ 121 ق م میں اس کے بھائی گیئس کا بھی یہی حشر ہوا۔ پہلی صدی ق م میں روم کو

[1] History of the World, P:71.

پونٹس (ایشیائے کوچک) میں متھری ڈے ٹیز سے لڑائیاں پیش آئیں۔ 88 تا 84 ق م کی جنگ میں اس نے ایک دن میں 30 ہزار رومی موت کے گھاٹ اتار دیے۔ آخرکار تیسری جنگ (74-64 ق م) میں رومیوں نے اسے شکست دے کر ایشیائے کوچک، شام اور فلسطین فتح کر لیے۔



جولیس سیزر کا سکہ

60 ق م میں اربابِ ثلاثہ کی مجلس، یعنی تین جرنیلوں پومپی، کریس اور جولیس سیزر پر مشتمل حکمران کونسل قائم ہوئی۔ جولیس سیزر نے اختیارات ملتے ہی پورا گال (فرانس) فتح کر لیا اور برطانیہ پر بھی حملہ کیا۔ پومپی نے ہسپانیہ فتح کر لیا۔ 53 ق م میں کریس اشکانیوں (ایرانیوں) سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ پھر پومپی اور جولیس سیزر میں کشاکش ہوئی۔ پومپی فرار ہو کر مصر پہنچا جہاں بطلیموس دوازدہم کے وزیر نے اسے قتل کر دیا۔

جولیس سیزر نے شام میں متھری ڈے ٹیز کے بیٹے اور اسپین میں پومپی کے دو بیٹوں کو شکستیں دیں۔ اب سیزر مختارِ کل بن چکا تھا۔ 15 مارچ 44 ق م کو اس کے سر پر تاج رکھا جانے والا تھا کہ ایک سازش کے تحت جس میں جولیس سیزر کا دوست بروٹس شریک تھا، اسے خنجر مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس وقت زخمی سیزر نے قاتل کی طرف مڑ کر تاریخی جملہ کہا تھا: ''بروٹس تم؟''

رومی سلطنت کا آغاز

اب اربابِ ثلاثہ کی دوسری مجلس قائم ہوئی جس میں آکٹیوین، مارک اینٹونی اور لیپی ڈس شامل تھے۔ بروٹس آکٹیوین اور اینٹونی کے ہاتھوں یونان میں شکست کھا کر خودکشی پر مجبور ہوا۔ مارک اینٹونی مصر چلا گیا جہاں ملکہ قلوپطرا کے عشق میں مبتلا ہو کر رہ گیا۔ اس پر آکٹیوین نے مصر پہنچ کر مصری بیڑے کو شکست دی۔ اینٹونی اور قلوپطرا نے یکے بعد دیگرے خودکشی کر لی۔


جنگِ فلپی کے بعد قیصر آگسٹس کا تعمیر کردہ مندر

جنوری 31 ق م میں آکٹیوین نے سینیٹ سے خاص اختیارات حاصل کر لیے جن کی سینیٹ تجدید کرتی رہی اور اسے آگسٹس کا لقب بھی دے دیا۔ جنوری 16 ق م میں اس نے Emperor (شہنشاہ) ہونے کا اعلان کر دیا۔ یوں رومی جمہوریت دوبارہ باقاعدہ بادشاہت میں تبدیل ہوگئی۔ اس سلطنت کا پہلا حکمران آگسٹس سیزر (آکٹیوین) تھا۔[1] آگسٹس کے عہد میں

[1] Oxford English Reference Dictionary, p: 89,90.


قدیم رومی سلطنت
عہد جولیس سیزر (44ق م)
آگسٹس سیزر کے مفتوحہ علاقے (14ء)
ٹراجن کے مفتوحہ علاقے (117ء)
رُوم کے عارضی ملحقہ علاقے
میل 0 200 400 600
کلومیٹر 0 200 400 600 800
روس
پولینڈ
جرمنی
فرانس
سپین
اٹلی
یونان
انگلستان
آئرلینڈ
ڈنمارک
سویڈن
بحیرۂ جرمن (بحیرۂ شمالی)
بحیرۂ بالٹک
بحر اوقیانوس
بحیرۂ روم
بحیرۂ اسود
بحیرۂ کیسپین
کوہ قاف
آرمینیا
پارتھیا (فارس)
عرب
صحرائے اعظم
افریقہ
موریتانیا
سارمتیا
ڈیسیا (رومانیہ)
ایریکم
سولونا
روم
پٹیولی
سسلی
سیراکیوز
کارتھج (قرطاجنہ)
لندن
کولونہ
مینز
لیانز
دریائے لوئر
دریائے ڈینیوب
دریائے ڈینیپر
دریائے وولگا
بیزنطیم
فلپی
مقدونیہ
تھسلونیکا
اتھینز
کورنتھ
پرگامم
افسوس
ایشیا
بتھینیا
فریجیا
گلتیا
کلیکیا
کپے ڈوشیا ترکی
طرسوس
انطاکیہ
ایڈیسا
میسوپوٹیمیا
دریائے دجلہ
دریائے فرات
عراق
خلیج فارس
دمشق
صیداء
صور
قبرص
کریٹ
یروشلم
پیلا
سیناء
اسکندریہ
ممفس
مصر
سائرین (لیبیا)

رومی سلطنت اٹلی، فرانس، اسپین، یونان، بلقان، اناطولیہ، شام، فلسطین، مصر، طرابلس (لیبیا)، تیونس اور الجزائر وغیرہ تک وسیع تھی۔ اگست کا مہینہ آگسٹس سیزر کی یاد دلاتا ہے۔

آگسٹس کے جانشین ٹائبیریس (14ء تا 37ء) کے عہد میں رومی گورنر پیلاطس نے یہودیوں کے اصرار پر مسیح علیہ السلام کو صلیب دیے جانے کا حکم سنایا۔ رومی بادشاہ کلاڈیس (41ء تا 54ء) نے 43ء میں انگلستان فتح کیا۔ کلاڈیس نے اپنی بیوہ بھتیجی سے شادی کی تھی جس سے اس کا بیٹا نیرو اس کا جانشین ہوا۔ نیرو نے اپنی ماں اور بیوی سمیت سینکڑوں افراد مروا دیے۔ 64ء میں روم کا بڑا حصہ آگ کی نذر ہوا۔ کہتے ہیں کہ یہ آگ نیرو نے خود لگوائی تھی۔ مشہور ہے کہ روم جل رہا تھا اور نیرو بنسری بجا رہا تھا۔ اسی سال سینٹ پال کو روم میں مار ڈالا گیا جس نے ابنیتِ مسیح اور کفارہ کے عقیدے عیسائیت میں داخل کیے تھے۔ 68ء میں اپنے خلاف بلوہ ہونے پر نیرو نے خودکشی کر لی۔[1] 70ء میں رومی جرنیل ٹائٹس نے فلسطین میں یہودیوں کی بغاوت کچل دی اور ہیکل سلیمانی مسمار کر دیا۔

قسطنطین اعظم عیسائیت کی آغوش میں

تین صدیوں تک رومی سلطنت میں عیسائیت کے پیروکار دار وگیر اور ظلم کا شکار ہوتے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رومی حکمران دیوی دیوتاؤں کے پجاری تھے۔ پہلا رومی حکمران جس نے مسیحیت قبول کی، وہ قسطنطین اعظم (306ء تا 337ء) تھا۔ اس نے عیسائیت کو رومی سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دیا اور اپنی نگرانی میں بڑے بڑے پادریوں کی کونسلیں منعقد کیں۔ ان کونسلوں نے مسیحی عقائد واعمال کے متعلق وہ سارے فیصلے کیے جن پر موجودہ عیسائیت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ قسطنطین نے 11 مئی 330ء کو بیزنطیم کے مقام پر نئے دارالحکومت کی بنیاد رکھی جو اس کے نام پر قسطنطنیہ (Constantinople) کہلایا۔ آج کل اس کا نام استنبول ہے۔[2]



استنبول کی قدیم فصیل

بازنطینی سلطنت (الروم) کا قیام

رومی حکمران تھیوڈوسیس اول (388ء تا 395ء) کی وفات پر سلطنت اس کے دو بیٹوں میں تقسیم ہوگئی۔[3] مغربی رومی سلطنت کا دارالحکومت روم قرار پایا جبکہ مشرقی رومی سلطنت کا دارالحکومت قسطنطنیہ رہا۔ اس کے سابق نام بیزنطیم

[1] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 2/114-123۔ [2] انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم: 2/125،126۔

[3] History of the World, P:95.

کی نسبت سے مشرقی سلطنت کو بازنطینی سلطنت (Byzantine Empire) بھی کہا گیا۔ عرب اسی مشرقی رومی سلطنت کے ہمسائے تھے اور اسی کو رومی سلطنت کہتے تھے۔ قرآن نے بھی اسی کو الروم کہا ہے۔


بازنطینی گرجے کے کھنڈر، جرش (اردن)

گبن لکھتا ہے: ''بازنطینی سلطنت کے پہلے حکمران آرکیڈیس کے عہد میں سینٹ اینڈریو، سینٹ لیوک (لوقا) اور سینٹ ٹموتھی کی نعشیں تین سو برس بعد قسطنطنیہ لا کر کنیسہ حواریین میں دفن کی گئیں۔ اسی طرح سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی ہڈیاں مبینہ طور پر فلسطین سے برآمد کر کے ایک طلائی برتن میں ریشمی چادر سے ڈھک کر عظیم الشان جلوس کے ہمراہ قسطنطنیہ لے جائی گئیں جن کی زیارت کے لیے فلسطین سے قسطنطنیہ تک زائرین کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ تصور یہ تھا کہ ولیوں اور شہداء کی ہڈیاں سونے چاندی سے زیادہ بیش قیمت ہیں۔''[1]

ملحوظہ: یہ تو غیر مسلموں کی روایت ہے مگر حدیث میں ہے کہ انبیاء کی نعشیں سلامت رہتی ہیں جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''اللہ عزّ وجل نے انبیاء علیہم السلام کے اجساد کو کھانا زمین پر حرام ٹھہرایا ہے۔''[2]

جسٹینین اور نوشیرواں

مغربی رومی سلطنت 476ء میں شمال کے حملہ آوروں کے ہاتھوں کمزور ہوتے ہوتے کلیتاً ختم ہوگئی اور مشرقی رومی سلطنت بتدریج تقریباً ان تمام علاقوں پر محیط ہوگئی جو کبھی قدیم رومی سلطنت میں شامل تھے۔ جسٹینین (527ء تا 565ء) نے شمالی افریقہ، اٹلی اور اسپین کو مسخر کیا۔ 540ء میں روم اور ایران کی لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا جو بارہ سال جاری رہا۔ جسٹینین نے قسطنطنیہ میں ایا صوفیا کا گرجا تعمیر کرایا۔ اس کے جانشینوں کے زمانے میں بھی ایران سے لڑائیاں جاری رہیں۔


ایا صوفیا چرچ جو بعد میں مسجد بنا اور اب میوزیم ہے

575ء میں فرمانروائے فارس نوشیرواں کی فوجوں نے کپاڈوشیا (اناطولیہ) کا رومی علاقہ پامال کیا۔ نوشیرواں کے پوتے خسرو پرویز نے جب باغیوں کے مقابلے میں راہِ فرار اختیار کی تو قسطنطنیہ کے حکمران ماریس نے اسے دوبارہ تاج و تخت حاصل کرنے میں مدد دی۔[3]

[1] قدیم مذہبی تاریخ، ص:32،31۔ [2] سنن النسائي: 1375۔ [3] انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم: 174/2۔

جسٹینین کا رومن لا



قیصر جسٹینین کے رومن لا کا مخطوطہ

جسٹینین کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے رومن لا کی تکمیل، تجدید اور تدوین (Codification) کی۔ اس کا قانون رومن لا کا اہم ترین سنگ میل تصور کیا جاتا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی ولادت اس کے جانشین جَسٹن دوم (یوستینوس ثانی) کے زمانے میں ہوئی۔

جسٹینین لا اور شریعتِ محمدیہ کا موازنہ ایک سلیم الفطرت انسان کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ رومن لا، جس میں یقیناً وحی کے ذریعے سے عطا کردہ کچھ چیزیں شامل ہوں گی، انسانی فطری ارتقا کا نمونہ ہے۔ اس وقت تک کسی انسانی قانون میں عالمگیر مساوات، عورت مرد کے حقوق اور انسان ہونے کے ناتے مفتوحوں اور غلاموں کے حقوق کا کوئی تصور تک موجود نہ تھا۔ عورت کو ملکیت اور خرید و فروخت کی اجازت نہ تھی۔ قانوناً وہ خود قابلِ ملکیت اور قابلِ خرید و فروخت چیز (Commodity) تھی۔ رومن قومیت رکھنے والوں کے سوا کسی انسان کی جان و آبرو کی کوئی قیمت نہ تھی۔ تجارت پر شدید پابندیاں عائد تھیں اور اس کے مقابلے میں محمد رسول اللہ ﷺ نے وحی پر مبنی ایک ایسی شریعت عطا کی جو آج کے معیار کے مطابق بھی انتہائی ترقی یافتہ، مبنی بر عدل و فلاح اور سب انسانوں کے تمام حقوق کا ضامن قانون ہے جس کی دنیا بھر کے قانون دان نقل کرتے چلے آ رہے ہیں جب کہ انسانیت کے لیے اپنے وضعی قوانین کے ذریعے اس کے بلند ترین معیار تک پہنچنا ممکن ہی نہیں۔

قیصر فوکاس کی وحشیانہ سنگدلی



قیصر فوکاس کا سکہ

نبی ﷺ کی نبوت سے آٹھ سال پہلے (602ء میں) فوکاس نامی غاصب جرنیل نے قیصر روم ماریس کے خلاف بغاوت کر دی اور تختِ سلطنت پر قابض ہوگیا۔ ماریس نے اپنے اہل و عیال کے ساتھ گرجے میں پناہ لی تھی۔ اسے پانچ بیٹوں کے ساتھ گھسیٹ کر لایا گیا۔ باپ کے قتل سے پہلے اس کے سامنے بیٹے تہ تیغ کیے گئے۔ ایک انا (دایہ) نے ازرہِ جاں نثاری ماریس کے دودھ پیتے بچے کی جگہ اپنے بچے کی گردن جلاد کی چھری کے نیچے رکھ دی۔ اس دردناک منظر پر خود قیصر ماریس کے قتل نے اپنا خونچکاں پردہ ڈال دیا۔ باپ بیٹوں کے دھڑ باسفورس کی موجوں میں پھینک دیے گئے اور ان کے کٹے ہوئے سر قسطنطنیہ کے دروازوں پر

لٹکا دیے گئے۔ شہزادہ تھیوڈوسیس کو جو اپنے مظلوم باپ کا پیغام لے کر عازم مدائن ہوا تھا، عجمی سرحد میں داخل ہونے سے پہلے پکڑ کر آناً فاناً اس کا کام تمام کر دیا گیا۔ ملکہ کانسٹنشیا اور اس کی تین بیٹیاں پہلے ایک صومعہ میں نظر بند کی گئیں، بعد میں سازش کے شبہ پر ان کے لیے موت کا حکم صادر ہوا اور سزا دہی کا انتہائی ظالمانہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ پہلے ان کی آنکھیں تکلوں سے چھیدی گئیں، پھر زبانیں گدی سے کھینچ کر قاتلوں کے پاؤں میں مسلی گئیں، پھر یکے بعد دیگرے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گئے، پھر ان کے برہنہ جسموں پر تازیانے برسائے گئے، پھر ان کو نیزوں سے چھلنی کیا گیا، پھر انھیں جلتے الاؤ میں جھونک دیا گیا۔[1] رومیوں میں ایسے ظالمانہ اور وحشیانہ طریقے معمول کی بات تھے۔

ابن عساکر رحمہ اللہ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر سلطنت روم کی طرف بھیجا جس میں عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ رومیوں نے انھیں قید کر لیا۔ شاہِ روم نے ان سے کہا کہ عیسائی ہو جاؤ ورنہ میں تمھیں تانبے کی دیگ میں ڈال دوں گا۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ تانبے کی بڑی دیگ منگوائی گئی، اسے تیل سے بھرا گیا اور جب تیل گرم ہو کر جوش مارنے لگا تو بادشاہ نے ایک اور مسلمان قیدی کو بلایا اور اسے عیسائیت قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس نے بھی انکار کر دیا۔ بادشاہ نے اسے کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا۔ اس بیچارے کا گوشت گل گیا اور ہڈیاں نکل آئیں۔ اس کے بعد بادشاہ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے پھر کہا: عیسائی ہو جاؤ ورنہ میں تمھیں بھی اسی دیگ میں ڈال دوں گا۔ انھوں نے کہا: میں ہرگز اپنے دین کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بادشاہ نے حکم دیا: اسے بھی دیگ میں ڈال دو۔ جب سپاہی عبداللہ رضی اللہ عنہ کو دیگ کی طرف لے جانے لگے تو وہ رو دیے۔ لوگوں نے کہا: ڈر گیا ہے، اس لیے رو پڑا ہے۔ قیصر نے کہا کہ اسے واپس لاؤ، پھر پوچھا: روئے کیوں تھے؟ انھوں نے کہا: یہ مت خیال کرنا کہ میں تیرے فیصلے سے ڈرتے ہوئے رویا ہوں، میں تو اس لیے رویا ہوں کہ میری ایک ہی جان ہے جو اللہ کی راہ میں اس طرح قربان ہو رہی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرے جسم پر جتنے بال ہیں، اتنی ہی میری جانیں ہوں اور وہ ایک ایک کر کے اسی طرح اللہ کی راہ میں قربان ہو جائیں۔ شاہِ روم نے بڑا تعجب کیا اور عبداللہ رضی اللہ عنہ کو آزاد کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے ان سے کہا: میرے سر کو بوسہ دو تو میں تمھیں آزاد کر دوں گا۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: میں ایسا نہیں کروں گا۔ قیصر نے کہا: عیسائیت قبول کر لو۔ میں تمھاری شادی اپنی بیٹی سے کر دوں گا اور تمھیں اپنی بادشاہت میں شریک کر لوں گا۔ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس پیش کش کو بھی ٹھکرا دیا۔ اس نے پھر کہا: میرے سر کو بوسہ دو تو میں تمھارے ساتھ 80 مسلمانوں کو رہا کر دوں گا۔ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں! یہ بات ٹھیک ہے، پھر انھوں نے قیصر کے سر کو بوسہ دیا تو اس نے سب مسلمان قیدیوں کو رہا کر دیا۔ یہ خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہ

[1] غلبۂ روم، ص: 68,67۔

تک بھی پہنچی۔ پھر جب عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو امیر المؤمنین اُٹھے اور ان کا سر چوم لیا۔ [1]

پوپ کا قصیدہ اور ظالم بادشاہ کا انجام

مسیحیت کے پیشوا پوپ گریگوری اعظم نے فوکاس کی بدکرداریوں پر پشیمان ہونے کا درس دینے کے بجائے ظالم بادشاہ کے زہد و اتقا اور جود و کرم کی تعریف کرتے ہوئے دعا مانگی کہ ”فوکاس کو ایک طویل، پُرشکوہ اور بامراد عہد حکومت عطا ہو جس کے خاتمے پر وہ اخروی فوز و فلاح سے بھی بہرہ ور ہو۔“ آخر کار فوکاس کا عہدِ ستم اس وقت ختم ہوا جب مصر سے ہرقل کا لشکر قسطنطنیہ آن وارد ہوا۔ فوکاس کو گرفتار کر لیا گیا اور غضبناک عوام نے اسے طرح طرح کی عقوبتیں دے کر اس کا سر تن سے جدا کر دیا، پھر اس سر کو تو اس منظر عام پر لٹکا دیا جہاں کبھی ماریس اور اس کے معصوم بیٹوں کے سروں کی نمائش ہوئی تھی اور اس کا دھڑ ایک دہکتے ہوئے الاؤ کے لپکتے شعلوں کے حوالے کر دیا۔ [2]

ہرقل اور خسرو پرویز

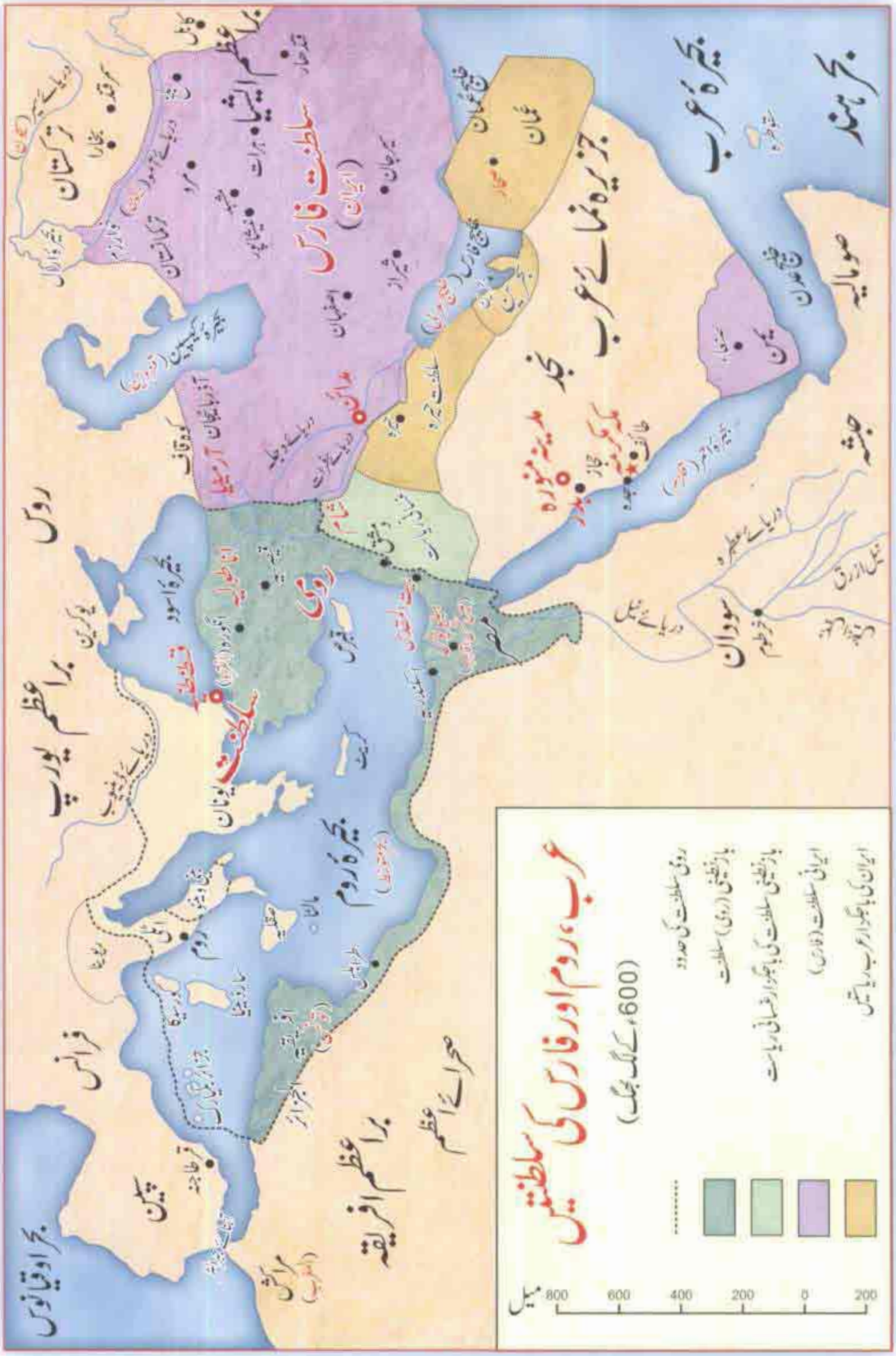


ہرقل کا طلائی سکہ

یونانی نژاد ہرقل اول (610ء تا 641ء) سے قسطنطنیہ میں یونانی نسل کے بادشاہوں کا دور شروع ہوا۔ ہرقل اول نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور شاہِ ایران خسرو پرویز کا ہم عصر تھا۔ 603ء سے خسرو پرویز کی چھیڑی ہوئی جنگ ہرقل کے عہد میں بھی جاری رہی۔ 613ء میں رومی فوج کو ایرانیوں کے ہاتھوں انطاکیہ کے مقام پر بُری طرح شکست ہوئی اور اسی برس ایرانی دمشق پر قابض ہو گئے۔ 614ء میں ایرانیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے عیسائیوں کا مقدس ترین کلیسا، کنیسۃ القیامہ (Holy Sepulchre) یعنی ”قبر مقدس کا گرجا“ برباد کر دیا۔ یہ کنیسہ اس جگہ تعمیر کیا گیا ہے جہاں مسیحی عقیدے کے مطابق مسیح علیہ السلام کو سولی دی گئی تھی۔ [3]

90 ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے۔ ایرانی یروشلم سے مقدس صلیب اٹھا کر اپنے دارالسلطنت مدائن لے آئے۔ اس صلیب کے بارے میں مشہور تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اسی پر سولی چڑھایا گیا تھا۔ اس فتح کے ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اردن، فلسطین اور سیناء کے علاقے پر قابض ہونے کے بعد مصر پہنچ گئیں۔ دوسری طرف ایرانی فوج ایشیائے کوچک میں رومیوں کو دباتی ہوئی 617ء میں قسطنطنیہ کے عین سامنے خلقیدون (موجودہ قاضی کوئی) پر جا قابض ہوئی۔ اس پر ہرقل اتنا ہراساں ہوا کہ قسطنطنیہ چھوڑ کر بھاگ جانے کو تیار ہو گیا۔

[1] تاریخ دمشق الکبیر: 29/245، 246؛ اسد الغابۃ: 2/578


عرب، روم اور فارس کی سلطنتیں
(600ء کے لگ بھگ)
رومی سلطنت کی حدود
بازنطینی (رومی) سلطنت
بازنطینی سلطنت کی باجگزار قبائلی ریاست
ایرانی سلطنت (فارس)
ایران کی باجگزار عرب ریاستیں
میل
800
600
400
200
0
200
بر اعظم یورپ
روس
سلطنت فارس
(ایران)
جزیرہ نمائے عرب
بحیرہ روم
بر اعظم افریقہ
بحیرہ اسود
یونان
فرانس
اسپین
سوڈان
حبشہ
صومالیہ
بحیرہ عرب
بحر ہند
بحر اوقیانوس
مکہ مکرمہ
مدینہ منورہ
نجد
مدائن
عمان
شام
مصر
ترکستان
کوہ قاف

سورۂ روم کی پیش گوئی پوری ہوگئی

دریں اثنا 615ء میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھر بار چھوڑ کر روم کی حلیف عیسائی سلطنت حبشہ میں پناہ لینی پڑی۔ ان دنوں سلطنت روم پر ایران کے غلبے کا بڑا چرچا تھا۔ کفارِ مکہ نے آتش پرست ایرانیوں کے ہاتھوں اہلِ کتاب رومیوں کی شکست پر بہت اظہار مسرت کیا۔ اس وقت یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ رومی جلد اہل فارس کو شکست دیں گے لیکن قرآن نے اعلان کیا کہ رومی بِضْعِ سِنِيْنَ (3 تا 9 سال) کے اندر فتح یاب ہوں گے۔ آخر کار ہرقل نے قوت جمع کی اور بحیرۂ اسود کے راستے آرمینیا پر حملہ آور ہوا۔

622ء میں آرمینیا میں روم و فارس کی پھر ٹکر ہوئی اور ہرقل کے بھائی تھیوڈور نے ایرانیوں کو شکست دی۔ 624ء میں ایرانیوں کو فلسطین میں بدترین شکست ہوئی۔ عین اس موقع پر بدر کے مقام پر کفارِ قریش نے مسلمانوں کے ہاتھوں عبرتناک شکست کھائی اور یوں قرآن مجید کی سورۂ روم میں رومیوں اور مسلمانوں کے حق میں دی گئی دوہری خوشخبری پوری ہوگئی۔ اس کے بعد ہرقل نے عراق پر ہلہ بول دیا اور 627ء میں نینویٰ کے قریب لشکر فارس کو شکست دی۔ خسرو پرویز میدان جنگ سے بھاگا اور ہرقل نے آگے بڑھ کر تبریز پر قبضہ کر لیا۔ اس ذلت آمیز شکست پر ایرانی خسرو پرویز کے خلاف ہوگئے اور خود اس کے بیٹے شیرویہ نے اسے قتل کر کے ہرقل سے صلح کر لی۔ تمام مفتوحہ رومی علاقے واپس کر دیے گئے، نیز مقدس صلیب لوٹا دی گئی۔

روم و یورپ کی تہذیب کے تاریک پہلو

رومیوں میں بدکاری اور درندگی کا چلن

بدچلنی اور زنا کاری میں روم نے یونان کو بھی مات کر دیا تھا۔ لیکی لکھتا ہے: تمام جگہوں سے رومی فاتح لوگوں کو
سیر کر کے اپنے ہاں لانے لگے تو روما کی حالت عصمت فروشی کے بازار کی ہوگئی۔ یونانی اور اسکندریہ کے غلام حسن و
مال میں لا جواب ہوتے تھے۔ زہرہ دیوی کے مندروں میں بدکاری مباح تھی۔ دوسری صدی عیسوی کی بدکار ملکہ
سٹینا نے اپنے متعدد عاشقوں کو سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر ترقی دی۔ رومی سینیٹ کی منظوری سے اسے
یوی کا درجہ دیا گیا حتی کہ روم کے مندروں میں جونو، وینس (زہرہ)، کیرس اور دیگر دیوتاؤں کے ساتھ فوسٹینا کا بت
ھی پوجا کے لیے رکھ دیا گیا۔ یونان کے مانند روم میں بھی اسقاطِ حمل کوئی مجرمانہ فعل نہ تھا۔



کولوسیم ایمفی تھیٹر (روم)

رومی سلطنت میں باپ کو اپنی اولاد مار ڈالنے کا اختیار
ھا۔ اس کی کوئی باز پُرس نہیں تھی اور علانیہ اولاد کُشی کا
کثرت سے رواج تھا۔ اکھاڑوں (ایمفی تھیٹروں) میں دو
متعدد شخص تلواریں وغیرہ لے کر باہم لڑتے تھے یہاں
تک کہ ایک شخص دوسرے کو جان سے مار ڈالتا تھا۔ لڑنے
کے لیے پیشہ ور تلوٗزیوں کو چاندی کی تلواریں مہیا کی جاتی
تھیں۔ ٹائبیریس (14ء تا 37ء) کے عہد میں ایک
نڈوے کی عمارت (ایمفی تھیٹر) گر جانے سے اس کے نیچے بیس ہزار آدمی دب کر مر گئے۔ لوگ اپنے مردہ عزیزوں کی
وحوں کو خوش کرنے کی غرض سے جنازے کے ساتھ تلوٗزیوں کے جوڑ لڑوانا کارِ ثواب سمجھتے تھے۔

غلاموں کے معاملے میں رومی اس قدر ظالم تھے کہ ایک مرتبہ فلامینیس نے اپنے مہمان کی تفریح کے لیے اسے
یک غلام کو ذبح کیے جانے کا تماشا دکھایا جبکہ ویڈیس بولیو نامی شخص اپنی پالتو مچھلیوں کو اپنے غلاموں کا گوشت کھلایا کرتا

تھا۔ بروٹس نے اپنے ایک مقروض کو بھاری سود ادا نہ کرنے کے جرم میں قید کرا دیا اور جیل میں اسے بھوکا مروا ڈالا۔ رومی اس قدر سنگدل تھے کہ گیارہ لاکھ انسانوں کا خون جولیئس سیزر کی ہوسِ فتوحات کی نذر ہو چکا تھا۔ رومیوں نے نیرو کے باغ کی روشنی کا تماشا نہایت دلچسپی سے دیکھا تھا جو عیسائی قیدیوں کے کرتوں پر تیل چھڑک کر آگ لگانے سے پیدا ہوئی تھی جس سے وہ مظلوم جل کر مر گئے۔ شاہ گیلرس اور ہیلیو گیوس کھانا کھاتے وقت قیدیوں کو جنگلی جانوروں سے نچوانے کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔[1]

رومی اکھاڑے میں انسان اور درندے



کولوسیم (روم) کا اندرونی منظر

رومی حکمرانوں نے روم میں ایک بہت بڑا گول اکھاڑہ ''کولوسیم'' (Colosseum) بنایا تھا جس میں نیم دائروی سیڑھیوں پر 50 ہزار تماشائی بیٹھ سکتے تھے۔ اس کی تعمیر کا آغاز بادشاہ ویسپاسین کے دور میں 75ء کے لگ بھگ ہوا اور ٹائٹس اور دومیٹین کے زمانے میں اس کی تکمیل ہوئی۔ اکھاڑے میں مسلح جنگجوؤں اور وحشی درندوں میں مقابلے ہوتے۔[2] نہتے باغیوں اور غلاموں کو اکھاڑے میں دھکیل کر ان پر بھوکے شیر اور چیتے چھوڑ دیے جاتے تھے۔ رومیوں کی یہ تفریح انسانی خونریزی اور ظلم و شقاوت کی بدترین شکل تھی۔

قدیم جرمنوں اور انگریزوں کی اخلاقی حالت

جرمن قوم کی اخلاقی حالت بھی نہایت پست تھی۔ وہ شراب کے نشے میں بدمست ہو کر اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو قتل کر دیتے تھے۔ سکینڈے نیویا کے جرمن اپنے دشمن کو ذبح کر کے اس کی کھوپڑی میں شراب پینا فخر سمجھتے تھے۔ جرمن لوگ جنگی قیدیوں اور جنگی غلاموں کو اپنے بتوں کے استھان پر ذبح کر ڈالتے تھے۔ 105 ق م میں کیمبرین لوگوں نے اوروسیو کے مقام پر فتح پا کر تمام رومی قیدی اپنے دیوتا پر قربان کر دیے۔ اسی طرح اینگلو سیکسن کی ایک فتح کے موقع پر پوری برطانوی فوج کے قیدی دیوتا کی بھینٹ چڑھائے گئے۔ انگلستان میں سوتیلی ماں سے شادی کر لینے کا رواج عام تھا حتی کہ عیسائیت کے حلقہ بگوش ہونے کے باوجود آڈبولڈ نے اپنے باپ ایتھلبرٹ شاہِ انگلستان کے مرنے پر اپنی

[1] قدیم مذہبی تاریخ، ص:56-59.

[2] Oxford English Reference Dictionary,p:286.

سوتیلی ماں کو بیوی بنا لیا۔

فرانس میں بداخلاقی اور ظلم کے مظاہر

گال (فرانس) میں بھی آوارگی اور اوباشی کی گرم بازاری تھی۔ پانچویں صدی عیسوی میں شاہ یورک نے بورڈو شہر میں دربار منعقد کیا تو اس میں ہیرولی قوم کے لوگ مادرزاد ننگے شریک ہوئے جن کے بدن صرف رنگوں سے رنگے ہوئے تھے۔ شاہ برگنڈی جنڈوبالڈ نے اپنے تین بھائی قتل کرا دیے اور اس کے بیٹے سجسمنڈ کو اس کی بیوی اور دو بیٹوں کے ہمراہ آرلین کے ایک کنویں میں زندہ دفن کر دیا گیا۔ خود سجسمنڈ نے اپنے بیٹے کو صرف اس لیے قتل کرا دیا تھا کہ اس کی سوتیلی ماں خوش ہو جائے۔ گال کے نامور فرینک بادشاہ کلوویس نے مارونجین خاندان کے تمام شہزادے قتل کرا دیے تاکہ کوئی اس کا حریف نہ رہے۔ ایک بادشاہ نے اپنے باغی بیٹے، اپنی بہو اور اپنی پوتیوں کو زندہ جلا دیا تھا۔

گال کے مجسٹریٹ شہادت کے باوجود مشتبہ ملزم کو جلتی آگ میں ڈال کر یا گہرے پانی میں غوطہ دے کر جرم سرزد ہونے کا تعین کرتے تھے۔ اس طرح ہزاروں ملزم انصاف کی کچہری کے سامنے مار ڈالے جاتے تھے۔ گال میں مالکوں کو مطلق اختیار تھا کہ اپنے غلاموں کو مار ڈالیں۔ متمول لوگوں کی لڑکیوں کی شادیوں کے موقع پر جہیز میں غلاموں کی ایک لمبی قطار بھی زنجیروں میں باندھ کر ساتھ کر دی جاتی تھی گئے۔

پاپائیت ظلم کی حمایت پر کمربستہ

پاپائے روم گریگوری اعظم نے انگلستان سے آئے ہوئے غلاموں کی خریداری کا حکم دے کر اس وحشیانہ تجارت کی ہمت افزائی کی۔ ظالم شاہ کلوویس کی وفات پر گریگوری نے لکھا: ''کلوویس دل سے تثلیث پر ایمان رکھتا تھا۔ اسی جذبۂ ایمانی سے اس نے کفار پر فتح پائی۔'' ان ''کفار'' میں وہ مسیحی فرقے بھی تھے جن پر اسے فتحیابی ہوئی تھی۔ اور تو اور سجسمنڈ جو کہ اپنے بے قصور بیٹے کا قاتل تھا، خود اس کے قتل کے بعد اسے سینٹ (ولی) کا درجہ دے کر اس سے معجزات منسوب کر دیے گئے۔

پادریوں کے ظلم، عیاشی اور رہبانیت کے مکروہ پہلو

تثلیث کے پیشوا بھی کھلے بندوں بداخلاقیوں کے مرتکب ہوتے تھے۔ ایک پادری نے اپنے ایک ماتحت کی جائداد غصب کرنے کے لیے اسے زندہ دفن کرا دیا مگر وہ قبر سے نکل بھاگا۔ اتنے سنگین جرم پر پادری کو صرف تنبیہ کرنا کافی سمجھا گیا۔ ایک اُسقف نے ایک شخص کو گھر سے نکال کر اس کی بیوی سے منہ کالا کیا۔ ربی ابراہم نامی راہب

نے پچاس برس تک اپنا منہ نہ دھویا۔ ایک دوشیزہ راہبہ نے ساٹھ برس کی عمر تک اپنی انگلیوں کے سوا جسم کے کسی حصے پر پانی نہ لگنے دیا۔ سینٹ سمولس نامی راہب نے اپنے جسم کے گرد ایک رسی کس کر باندھ لی تھی جو گوشت کے اندر گھس گئی اور اس سے گوشت اس قدر سڑ گیا کہ پاس بیٹھنے والے برداشت نہ کر پاتے۔ ایک راہب جو دورانِ عبادت ایک عورت سے ملوث ہو گیا تھا، اس نے بطور کفارہ جلتی آگ میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ مشہور مؤرخ ایڈورڈ گبن چھٹی صدی عیسوی سے پہلے کے مسیحی پیشواؤں کے بارے میں لکھتا ہے: ''ولیوں، دینداروں اور مردہ لاشوں کی پوجا نے سیدھے سادے اور خالص عیسوی مذہب کا خانہ خراب کر دیا تھا۔'' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ رَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ○﴾

''اور رہبانیت تو انھوں نے از خود ہی ایجاد کر لی تھی، ہم نے تو ان پر اسے فرض نہیں کیا تھا مگر یہ کہ رضائے الٰہی تلاش کریں، پھر انھوں نے اس کا خیال نہ رکھا جیسا اس کا خیال رکھنے کا حق تھا، پھر ہم نے ان لوگوں کو جو ان میں سے ایمان لائے ان کا اجر دیا اور ان میں سے بہت سے فاسق ہیں۔''[1]

یورپ کی مجموعی حالتِ زار

چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں یورپی اقوام جہالت و ناخواندگی کے مُہیب سائے میں زندگی گزار رہی تھیں۔ حکومتیں خون ریز جنگوں میں مشغول تھیں۔ وہ تمدن انسانی کے کارواں میں دنیا سے بہت پیچھے اور علوم وفنون سے بہت دور تھیں۔ ان کے جسم گندے اور دماغ اوہام وخُرافات سے بھرے ہوئے تھے،[2] صفائی کے لیے پانی کا استعمال انتہائی کم تھا۔ ان کے پادری اور راہب جسم کو اذیت پہنچاتے اور انسانوں سے فرار میں نہایت درجہ متشدد اور انتہا پسند تھے۔[3] ان کے یہاں ابھی تک یہی بات طے نہیں ہوئی تھی کہ عورت انسان ہے یا حیوان؟ اس کے اندر ابدی و غیر فانی روح ہے یا نہیں؟ عورتوں کو ملکیت اور بیع وشرا کا حق حاصل نہ تھا۔ رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے: ''پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی رہی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی سی تھی جو سڑ گئی ہو۔ اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے اور اس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی۔ وہ ممالک جہاں یہ تمدن برگ و بار لایا اور گزشتہ زمانے میں اپنی انتہائی ترقی کو پہنچ گیا تھا جیسے اٹلی، فرانس، وہاں تباہی، طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا۔''[4]

[1] الحدید 27:57.

[2] Thilly: History of Philosophy, (New York 1945). [3] Lecky, W. E. H. History of European Morals. (New York 1855). [4] The Making of Humanity, P: 1164.

7

سلطنتِ حبشہ اور حبشی کلیسا

آج کا ایتھوپیا ماضی میں حبشہ (Abyssinia) کہلاتا تھا۔ ان دنوں ایتھوپیا ایک خشکی بند ملک ہے جو اریٹیریا، سوڈان، کینیا، صومالیہ اور جبوتی (سابق فرانسیسی صومالی لینڈ) میں گھرا ہوا ہے، تاہم اریٹیریا کی آزادی (1993ء) سے پہلے اس کی حدود بحیرۂ قلزم تک وسیع تھیں۔ ایتھوپیا کا دارالحکومت ان دنوں ادیس ابابا ہے۔ امہارک قومی زبان ہے۔ آبادی کی اکثریت مسلمان ہے مگر صدیوں سے یہاں عیسائی برسرِاقتدار چلے آرہے ہیں۔

حبشہ میں عیسائیت کے پہنچنے کا پہلا ذکر عہد نامہ جدید میں آتا ہے جب حواری فلپس نے حبشیوں کی ملکہ "کندا کے" (Hendeke VII) کے خزانہ دار کو بپتسمہ دیا جو یروشلم کی زیارت کو آیا تھا۔

سلطنتِ اکسوم


شاہ اذینہ کا طلائی سکہ

پہلی صدی عیسوی میں سبا (یمن) سے آنے والوں نے مشرقی افریقہ میں بحیرۂ قلزم کے ساحل پر سلطنت اکسوم کی بنیاد رکھی جو موجودہ اریٹیریا اور ایتھوپیا کے بڑے حصے پر محیط تھی۔ اکسوم کے لوگ شروع میں اپنے ہی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے لیکن 300ء کے لگ بھگ ان کے ایک حکمران شاہ اذینہ (Ezana) نے ابا سلامہ (پدرِامن) فرومنٹیس نامی شامی یونانی کی تبلیغ سے عیسائیت قبول کرلی اور چوتھی صدی کے اختتام تک حبشہ کے بیشتر باشندے اس نئے مذہب کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے۔ یہیں سے عیسائیت اردگرد کے کئی ممالک میں بھی پھیلی اور سلطنت اکسوم ملک سبا تک وسیع ہوگئی۔ ان دنوں اکسوم ایک بڑی تجارتی ریاست تھی اور ان لوگوں کے تجارتی تعلقات مصر، عرب، فارس اور ہندوستان تک وسیع تھے۔ سلطنتِ اکسوم کی زبان گا ئیز (Ge'ez) تھی۔ یہ سلطنت ساتویں صدی عیسوی تک قائم رہی۔ اس کے حکمران نجاشی (Negus) کہلاتے تھے۔ نجاشی اصحمہ نبی ﷺ کا ہم عصر تھا جس نے 6 یا 7 ہجری (628ء) میں آپ کی دعوت پر اسلام قبول کیا۔

مخلوط سبائی عربوں کی اس سلطنت کا پایۂ تخت اکسوم حبشہ کے صوبہ تجرے میں 14.07 درجے عرض بلد شمالی اور

38.31 درجے طول بلد مشرقی پر واقع ہے۔[1] شاہانِ حبش کی تاجپوشی اسی مقدس شہر میں ہوتی تھی۔ حبشی سلطنت کے عہد عروج میں اکسوم میں 100 سے زیادہ پتھر کے تراشے ہوئے چوپہلو مخروطی ستون نصب کیے گئے جن میں سے بعض کی بلندی 30 میٹر تک تھی۔ ان میں سے کئی آج بھی ایستادہ ہیں جبکہ دیو قامت ستونوں میں سے صرف ایک باقی ہے۔ غالباً یہ ستون شاہی مقابر کے ساتھ بطور یادگار تعمیر کیے گئے تھے۔[2]



اکسوم (حبشہ) کا ایک منظر

کلیسائے حبشہ

ایتھوپین آرتھوڈکس چرچ کی بنیاد شاہ اذینہ کے دور میں پڑی جب اسکندریہ کے بطریق نے فرومنٹیس[3] عرف ابا سلامہ کو ''ابونا سلامہ'' (ہمارا باپ سلامہ) کے خطاب سے حبشہ کا بشپ مقرر کیا۔ یوں حبشی آرتھوڈکس عیسائیت سلطنت اکسوم کا مذہب ٹھہری جسے مقامی زبان میں ''ییتیوپیا آرتوداکس توحیدو بیتے کرتیان'' یعنی ''ایتھوپیا کا آرتھوڈکس توحیدی مسیحی کلیسا'' کہا جاتا ہے۔ اسے ''توحیدو'' اس معنی میں کہا گیا ہے کہ یہ مسیح کی ایک وحدانی فطرت پر یقین رکھتا ہے گویا ان کی واحد شخصیت میں مبینہ طور پر الوہی اور انسانی دونوں جبلتوں کا مکمل فطری ملاپ ہوا ہے۔ اس کے برعکس رومن کیتھولک اور مشرقی کلیسا (قسطنطنیہ) والوں کا عقیدہ ہے کہ مسیح کی الوہی اور انسانی فطرتیں الگ الگ ہیں مگر انھیں ایک دوسری سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ایتھوپین آرتھوڈکس چرچ اسکندریہ (مصر) کے قبطی کلیسا (کاپٹک آرتھوڈکس چرچ) کا ذیلی کلیسا شمار ہوتا رہا ہے، چنانچہ ماضی میں ہمیشہ کسی قبطی کو ایتھوپین چرچ کا ابونا یا آرچ بشپ مقرر کیا جاتا تھا حتی کہ 1959ء میں اسکندریہ کے قبطی آرتھوڈکس پوپ سائرل ششم نے حبشی کلیسا کو خود اپنا بطریق (Patriarch) چننے کا اختیار دے دیا۔ اکسومی زبان گائیز آج بھی حبشی کلیسا کی زبان ہے۔[4] حبشی کلیسا کے پیروکار ایتھوپیا کے علاوہ اریٹیریا، جمیکا (ویسٹ انڈیز) اور گائیانا (جنوبی امریکہ) میں بستے ہیں۔[5]



گائیز زبان کی انجیل

[1] تاریخ ارض القرآن (کامل): 240/2.

[2] History of the World, P:102, World Almanac, P:469.

[3] ایتھوپیا میں سینٹ فرومنٹیس کا مقبرہ چٹان کو کھود کر بنایا گیا ہے۔ (Encyclopedia of World Religions.) [4] وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا.

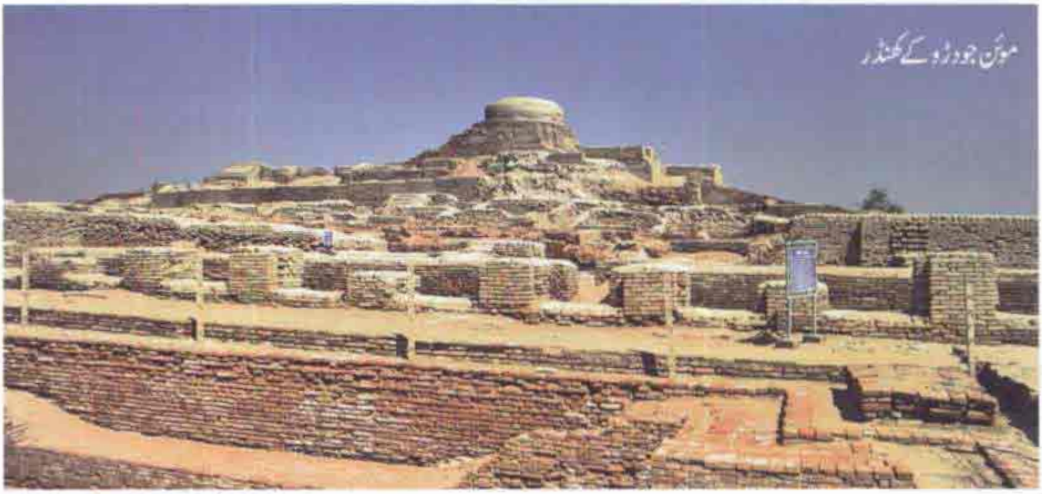
[5] Encyclopedia of World Religions, P:336.

8

ہندوستان

برصغیر پاک و ہند جو اب بھارت (India)، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال اور بھوٹان میں بٹا ہوا ہے، 1947ء سے پہلے صدیوں تک ہندوستان (India) کہلاتا رہا ہے۔

ہندوستان کے قدیم تمدن کے آثار ہڑپہ (پنجاب) اور موئن جو دڑو (سندھ) سے ملے ہیں۔ موئن جو دڑو کے معنی ''مردوں کا ٹیلا'' ہیں۔ یہاں کھدائی سے کئی بار بسایا گیا شہر برآمد ہوا۔ پہلا شہر غالباً 3300 ق م کا ہے، دوسرا



موئن جو دڑو کے کھنڈر

3000 ق م کا اور تیسرا کم و بیش 2900 ق م کا۔ یہاں سے بُت، تانبے کے اوزار اور برتن بھی ملے ہیں۔ ہڑپہ سے 5 ہزار سال پرانے گندم کے دانے بھی برآمد ہوئے۔ جب مصر میں بڑا ہرم (Pyramid) تعمیر کیا گیا، اس وقت ہڑپہ اور موئن جو دڑو کا تمدن عروج پر تھا۔ یہ بُت پرست لوگ تاریخ میں دراوڑ کہلاتے ہیں۔

سندھ اور ہند، سندھو اور ہندو

2000 تا 1500 ق م کے دوران میں آریائی قبائل وسط ایشیا اور ایران سے وادیِ سندھ میں داخل ہونا شروع ہوئے۔ ان کی زبان میں دریا کو ''سندھ'' کہتے تھے، چنانچہ دریائے سندھ کا نام انھی کا دیا ہوا ہے۔ اس کی نسبت سے

وہ ملک (وادیِ سندھ) کو ''سندھو'' یا ''سندھ'' کہنے لگے جسے یونانی مؤرخوں نے ''انڈس'' کہا اور اسی لفظ سے ''انڈ''، ''ہند'' اور ''انڈیا'' ماخوذ ہیں۔ ایرانیوں اور پھر عربوں نے دریائے سندھ کو ''مہران'' کے نام سے موسوم کیا اور اسی وجہ سے سندھ ''وادیِ مہران'' کے نام سے مشہور ہے۔[1]

آریہ تقریباً پانچ سو سال پنجاب میں مقیم رہے،[2] پھر وادئ گنگ و جمن کی طرف بڑھ گئے اور اس کا نام آریہ ورت رکھا۔ ''پُرانوں'' میں اسے بھارت ورش کہا گیا۔ سیام (تھائی لینڈ)، سراندیپ (سری لنکا) اور برما (میانمار) والوں نے ہندوستان کو اندریا کہا لیکن سندھی اپنے ملک کو ''سندھ'' ہی کہتے رہے جبکہ غیر ملکیوں نے اس کے دو حصے کر ڈالے: سندھ اور ہند۔[3] ایرانیوں نے ''سندھ'' کو ''ہند'' کہا اور یونانیوں نے ''ہ'' کو قریب المخرج حرف ہمزہ (الف) سے بدل دیا جو انگریزی میں ''انڈیا'' بن گیا۔[4]

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 329/11. [2] روایاتِ تمدنِ قدیم، ص: 187. [3] آریہ لوگ پنجاب اور سرحد کو ''سپت سندھو'' یعنی سات دریاؤں کی سرزمین کہتے تھے جہاں کابل، سندھ، جہلم، چناب، راوی، بیاس اور ستلج بہتے تھے۔ [4] تاریخ سندھ از اعجاز الحق قدوسی، ص: 2.

1 ہندومت

نو وارد آریائی قبائل ملکی باشندوں (دراوڑوں) کو شکست دے کر وادیِ سندھ اور پنجاب میں آباد ہو گئے۔ یہ ویدوں کا زمانہ (1500 تا 1000 ق م) کہلایا جس میں چار کتابیں رگ وید، یجر وید، سام وید اور اتھر وید لکھی گئیں۔ آریہ پدری نظامِ معاشرت پر کاربند تھے۔ انھوں نے ملکی تمدن میں گھوڑے، رتھ، لوہے اور اگنی پوجا (آتش پرستی) کا اضافہ



رگ وید



یجر وید



سام وید



اتھر وید

کیا۔ اگنی دیوتا کے علاوہ انھوں نے مزید مقامی دیوتا سوریہ (سورج دیوتا)، اندرا (بارش اور جنگ کا دیوتا) اور پرتھوی (زمین کا دیوتا) بھی اپنا لیے۔ اس دوران میں گنگا کے میدان میں آریہ راجاؤں نے اپنی اپنی راجدھانیاں قائم کر لیں۔ ویدوں کے زمانے میں ذات پات کا نظام رائج ہوا جس کے مطابق چار ذاتیں وجود میں آئیں۔[1]

رام چندر اور جنگ مہابھارت

1000 ق م کے لگ بھگ آریہ گنگا و جمنا کی وادی میں آ بسے۔ انھوں نے مقامی باشندوں کو یا تو غلام بنالیا یا انھیں مزید جنوب کی جانب دھکیل دیا۔ اس دور کو عہدِ شجاعت (1000 تا 500 ق م) کہا جاتا ہے جس میں رامائن کی افسانوی داستان نے جنم لیا۔ ایودھیا کے راجہ رام چندر کی بیوی سیتا کو لنکا کا راجہ اغوا کر کے لے گیا، چنانچہ رام اور ہنومان کی بندروں کی فوج نے لنکا پر چڑھائی کر کے سیتا کو رہائی دلائی۔ اسی دور میں مہابھارت کی جنگ لڑی گئی۔ کورو برادران ہار گئے اور پانڈوؤں نے جنگ جیت لی۔ اسی عہد میں اُپنشد اور پُران لکھے گئے۔ وشنو اور شیو کی پوجا شروع ہوئی۔ کائنات کے خالق برہما کے ساتھ وشنو اور شیو کو اکٹھا کر کے ''تری مورتی'' کہا جاتا ہے۔ چھٹی صدی ق م میں

[1] روایات تمدن قدیم، ص: 187، قدیم تہذیبیں اور مذاہب، ص: 79,78.

گوتم بدھ اور مہاویر نے برہمنوں کی اجارہ داری کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ اس زمانے میں شمال مغربی علاقوں اور پنجاب پر ایرانیوں کا تسلط ہوگیا اور وہ اسے گندھارا کہنے لگے۔ [1]

موریا سلطنت اور اشوک اعظم

جب سکندر اعظم فاتحانہ یلغار کرتا ہوا گندھارا پہنچا تو برصغیر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ سکندر کی واپسی پر چندر گپت موریا نے شمالی ہند میں ایک وسیع سلطنت قائم کرلی۔ اس کے جانشین اشوک اعظم نے اسے جنوبی ہند تک وسعت دی۔ کالنگا کی لڑائی (265 ق م) میں ہونے والی خونریزی پر اشوک نے آزردہ خاطر ہوکر ہندومت ترک کردیا اور بدھ مت قبول کرکے اس کی اشاعت کرنے لگا۔ اشوک کا دارالحکومت پاٹلی پتر (موجودہ پٹنہ) تھا اور جنوب کے ایک چھوٹے سے علاقے کے سوا سارا ہندوستان اس کے زیرِ نگیں تھا۔

چانکیہ: مکاری اور فریب کا داعی

چانکیہ (350 تا 283 ق م) چندر گپت موریا کا مشیر اور وزیر اعظم تھا۔ اس کی تصنیف ''ارتھ شاستر'' میں اس کے نام کوٹلیا اور وشنو گپتا دیے گئے ہیں۔ وہ ٹیکشا شلا (ٹیکسلا) کی خانقاہ میں استاد تھا۔ چانکیہ نے ''ارتھ شاستر'' میں حکمرانی کے جو ''اصول'' بتائے ہیں، اُن میں وعدہ خلافی، فریب کاری، ہمسائے سے دشمنی اور ہمسائے کے ہمسائے سے دوستی [2] جیسے ''نادر'' اصول شامل ہیں جن پر ہندو حکمران دل و جان سے عمل کرتے آئے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں۔

پرش پور (پشاور) کی کشان سلطنت

موریا خاندان کے بعد باختری یونانیوں نے اپنی سلطنت مالوہ (وسطی ہند)، گجرات اور کشمیر تک پھیلا لی۔ پہلی صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان میں کشان برسرِ اقتدار آئے۔ ان کا مہاراجہ کنشک علم دوست تھا۔ اس کے عہد میں چرک نے ہندی طب (آیورویدک) کی تدوین کی۔ کنشک نے بھی بدھ مت قبول کیا اور اس کی سرپرستی کی بنا پر دور دراز کے ممالک (وسطی اور جنوب مشرقی ایشیا) تک کے لوگ بُدھ فرقے ''مہایان'' کے حلقہ بگوش ہوگئے۔ کنشک کی سلطنت وسط ایشیا سے لے کر جنوب میں بنارس اور کوہ بندھیاچل تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا دارالحکومت پرش پور (پشاور) تھا۔ اس زمانے میں جنوبی ہند کی آندھرا سلطنت خلیج بنگال سے بحیرۂ عرب تک وسیع تھی۔ کوہستان

[1] روایات تمدن قدیم، ص: 188، دنیا کے بڑے مذاہب، ص: 32. [2] وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا۔

بندھیاچل شمالی ہند اور دکن کے درمیان حائل ہے۔ اس کے جنوب میں تاریخی شہر بھوپال ہے جو مدھیا پردیش کا دارالحکومت ہے۔1947ء سے پہلے بھوپال تقریباً دو سو برس اسلامی ریاست رہا۔

چندر گپت بکر ماجیت اور رامائن اور مہابھارت کی تکمیل

چوتھی صدی عیسوی میں شمالی ہند میں گپت خاندان کو عروج حاصل ہوا۔ سمدر گپت اپنی راجدھانی پاٹلی پتر سے اجودھیا لے آیا۔ مہاراجہ چندر گپت دوم بکر ماجیت (376ء تا415ء) گپت بادشاہت کا سب سے بڑا حکمران تھا۔ گپت عہد میں تمثیل نگار کالی داس اور ماہرِ حساب و فلکیات آریہ بھٹ نے شہرت حاصل کی۔ اسی زمانے میں پُرانوں کی بنیاد پر ہندومت کا احیا ہوا۔ منو نے مذہبی قوانین پر مبنی دھرم شاستر تیار کیا اور طویل رزمیہ نظموں رامائن اور مہابھارت کی تکمیل



ہندو پُران کا ایک نسخہ

ہوئی۔ علاوہ ازیں500ء تک 18 پُران لکھے جا چکے تھے۔ ان میں کم و بیش 4 لاکھ اشعار ہیں۔ آج کل کے ہندوؤں کی اکثریت پُرانوں ہی کو مانتی ہے۔[1] ہندو دنیا میں بار بار کے جنم (آواگون) پر یقین رکھتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اس عہد کو ''گپتا دور میں ہندو سامراج'' کا عنوان دیا ہے کیونکہ اس دور میں ہندوستان میں بدھ مت کا خاتمہ ہوگیا اور ہندو دھرم نے رفتہ رفتہ اسے اپنے اندر جذب کرلیا۔[2]

مہابھارت کا سب سے اہم حصہ بھگوت گیتا ہے جو کرشن جی کا ایک اپدیش یا وعظ ہے۔ بکر ماجیت کے عہد کے حالات چینی سیاح فاہیان نے لکھے ہیں جو بدھ مت کے آثار و علوم کی جستجو میں ہندوستان آیا تھا۔ پانچویں صدی کے اواخر میں شمال مغرب سے سفید ہنوں کے حملے نے گپت خاندان کا خاتمہ کر دیا۔

طلوعِ اسلام کے وقت ہندوستان میں طوائف الملوکی

اسلام کی آمد کے وقت بیشتر ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ حملہ آور ہنوں، سیتھیوں، کشانوں اور باختریوں کی نسل سے جو سردار شمال مغربی ہندوستان کے مختلف حصوں پر حکومت کر رہے تھے، راجپوت کہلانے لگے اور برہمنوں نے ان کا شجرۂ نسب سورج اور چاند سے ملا کر انھیں کھشتریوں کے جانشین تسلیم کرلیا۔ یوں وہ چندر بنسی اور سورج بنسی راجپوت کہلائے۔

[1] روایاتِ تمدنِ قدیم،ص:190۔ [2] تاریخ عالم پر ایک نظر:170/1۔

ہندومت کے 33 کروڑ خدا

چھٹی صدی عیسوی میں ہندوستان کے اندر بت پرستی پورے شباب پر تھی۔ اس صدی میں ہندوؤں کے معبودوں کی تعداد تینتیس (33) کروڑ تک بتائی جاتی ہے۔ غرض ہر عظیم یا ہیبت ناک یا نفع پہنچانے والی شے معبود تھی۔ بت تراشی اور مجسمہ سازی کا فن بھی نقطۂ عروج پر تھا۔ [1]

او میلے نامی یورپی فاضل لکھتا ہے: ''(ہندوؤں میں) خدا سازی کا عمل یہیں پر ختم نہیں ہوگیا بلکہ مختلف زمانوں میں اس خدائی اکادمی یا کونسل میں اتنی بڑی تعداد کا اضافہ ہوگیا کہ اس کا شمار مشکل ہے۔ ان میں بہت سے ہندوستان کے قدیم باشندوں کے معبود تھے جن کو ہندو مذہب کے دیوتاؤں اور خداؤں میں شامل کر لیا گیا تھا، ان کی کل تعداد تیس کروڑ بتائی جاتی ہے۔'' [2]

نبی ﷺ کا ہم عصر مہاراجہ ہرش



مہاراجہ ہرش کا سکہ

ساتویں صدی کے نصف اول میں شمالی ہند میں مہاراجہ ہرش وردھن (وفات 648ء) کی حکومت تھی۔ اس کا دارالحکومت قنوج تھا جو ان دنوں کانپور سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ہرش کی حکومت کوہ ہمالیہ سے وندھیاچل تک محیط تھی۔ وہ بدھ مت کا پکا حامی تھا۔ اس کے دور میں بُدھ مت کا پیروکار چینی سیاح ہیون سانگ 32-630ء میں ہندوستان آیا تھا جس نے اس زمانے کے ہندوستان کے حالات رقم کیے۔ [3]

تاریخ ہند کا بدترین دور

مذہبی، اخلاقی اور اجتماعی طور پر ہندوستان کی تاریخ کا سب سے تاریک اور بدترین دور چھٹی صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ [4] بے حیائی اور عیاشی سے ان کی عبادت گاہیں بھی پاک نہ تھیں۔ مذہب نے ان شرمناک کاموں کو تقدیس اور عبادت کا رنگ دے دیا تھا۔ [5] عورت کی کوئی قدر تھی نہ عزت وعصمت باقی تھی۔ شوہر اپنی بیوی کو جوئے میں ہار جاتا تھا۔ [6] اگر ہندو عورت کا شوہر مرجاتا تھا تو وہ اس کے ساتھ زندہ جلادی جاتی یا زندہ درگور کر دی جاتی کیونکہ وہ شادی کر سکتی تھی نہ اسے کوئی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ شوہر کے انتقال پر عورت کے ستی ہوجانے

---

[1] دیکھیے: آر۔سی دت کی انگریزی کتاب ''قدیم ہندوستان'' (Ancient India): 276/3.

[2] L.S.S. O'malley C.I.E. I.C.S. Popular Hinduism-The Religion of The Masses (Cambridge, 1935), P: 6,7.

[3] تاریخ عالم پر ایک نظر: 197,196/1. [4] قدیم ہندوستان ("Ancient India.")، ج: 3 مؤلفہ آر۔سی۔دت. [5] ستیارتھ پرکاش، ص: 344.

[6] دیکھیے: مہابھارت کا ابتدائی حصہ۔

کی یہ بدترین رسم مسلمانوں نے بند کی اور آخر کار انگریزی اقتدار کی آمد پر ختم سمجھی گئی لیکن خفیہ طور پر جاری رہی۔ [1]

ذات پات کا ظالمانہ نظام

ہندوستان میں ویدک دور میں طبقاتی عدم مساوات کا جو بے رحمانہ نظام رائج ہوا، اس نے یہاں کے باشندوں کو چار طبقوں میں تقسیم کر دیا:

1. مذہب کے اجارہ دار اور پروہت برہمن کہلائے۔
2. فوج میں بھرتی ہونے والے افراد چھتری یا کھشتری کے نام سے موسوم ہوئے۔
3. زراعت پیشہ اور تجارت کرنے والے ویش کہلائے۔
4. نوکر چاکر اور خدمت گار ''اچھوت'' کے ارذل ترین منصب پر پہنچائے گئے۔

یہ آخری طبقہ (جو سب سے بڑی تعداد میں تھا) مظلومیت کی انتہا تک پہنچا دیا گیا۔ اس کے متعلق یہ تصور رائج کیا گیا کہ وہ خالقِ کائنات ''برہما'' کے پاؤں سے پیدا ہوا، اس لیے اس کا کام صرف دیگر تینوں طبقوں کی خدمت کرنا اور ان کو آرام و راحت پہنچانا ہے۔ اس کے برعکس برہمنوں کو اتنے حقوق حاصل تھے کہ کوئی دوسرا ان کی برابری کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ برہمن کے سارے گناہ معاف تھے۔ اس پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ اس کو کسی صورت میں بھی سزائے موت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس کے برعکس اچھوت کچھ کما سکتے تھے نہ جمع کر سکتے تھے۔ کسی برہمن کے قریب بیٹھ سکتے تھے نہ اس کے بدن کو چھو سکتے تھے، نہ مقدس کتابوں کا پڑھنا ان کے لیے جائز تھا۔ [2] دیوتاؤں اور برہمنوں پر شودر کا سایہ پڑنا بھی گناہ تھا۔ کسی اشلوک یا منتر کے الفاظ ان کے کانوں میں پڑ جاتے تو سزا کے طور پر ان کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا تھا۔ [3]

چنڈال اور اچھوت

اہلِ حرفہ اور خدمت کرنے والے طبقے کے لوگ (جو چنڈال کہلاتے تھے) شہر سے باہر رہتے تھے۔ رات کو (خواہ کوئی موسم ہو) ان کا شہر میں رہنا ممکن نہ تھا۔ شہر کی چہار دیواری میں طلوع آفتاب کے بعد وہ کام کرنے کے لیے داخل ہوتے تھے اور غروب سے پہلے ان کو باہر نکل جانا پڑتا تھا۔ سلطان قطب الدین ایبک کے عہد (1206-1210ء) میں یہ جابرانہ نظام ختم ہوا اور شہر کی چہار دیواری طبقاتی تقسیم کی نشانی ہونے کے بجائے ''شہر پناہ'' بن کر رہ گئی اور شہروں میں امراء کے محلات اور فقراء کے جھونپڑے ایک ساتھ لگے۔ [4]

---

[1] دیکھیے: فرانسیسی سیاح برنیر کا سفرنامہ، نیز قرون وسطی کے راجگان کی تاریخ۔ [2] منودھرم شاستر، باب: 1، 2 و 8-11. [3] قدیم تہذیبیں اور مذاہب، ص: 83. [4] نبی رحمت ﷺ، ص: 53.

2 جین مت



جین مت کی علامت

چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندوستان میں جین مت رائج ہوا جس کا بانی وردھمن (599 تا 527 ق م) مہاویر (عظیم ہیرو) کہلایا۔ وہ ریاست بہار میں پٹنہ کے قریب ایک کھشتری سردار کے ہاں پیدا ہوا تھا اور پاواپوری (بہار) میں فوت ہوا۔ مہاویر ہندوؤں کی بعض غیر معتدل رسوم اور ذات پات کے نظام کے خلاف تھا۔ لفظ ''جین'' سنسکرت کے لفظ ''جے'' (فتح) سے مشتق ہے جو نفسانی خواہشات پر قابو پانے کا اشارہ ہے تاکہ روحانی صفائی اور گیان حاصل ہو۔ جیو ہتیا (جانور کُشی) جینیوں کے مذہب میں ناجائز ہے۔ انھوں نے اپنے لیے الگ مندر بنائے۔ ان کے دو فرقے ہیں: سوِتامبرا (سفید پوش) اور ڈگمبرا (آسمان پوش، یعنی ننگے)۔ ڈگمبرا کپڑے پہننے کے قائل نہیں۔ جین مت کے بڑے بڑے مندر چومکھا (رانک پور، راجستھان) اور سَرَون بیلگولا (کرناٹکا) ہیں۔ چومکھا مندر سنگ مرمر کے 1444 ستونوں پر قائم ہے جن پر پیچیدہ کندہ کاری کی گئی ہے۔

جینیوں کے نزدیک ان کا مذہب 24 تیرتھنکروں (مصلحین) کے ذریعے الہام کیا گیا۔ پہلا تیرتھنکر رشبھا تھا جس کا ذکر ویدوں اور پُرانوں میں آیا ہے جبکہ 24 واں تیرتھنکر مہاویر جین مت کا اصل بانی شمار ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اب 12 چکراورتن (فاتحین عالم)، 9 واسودیو (ہندو دیوتا کرشن کے مثیل)، 54 مہاپُرش (عظیم روحیں)، 9 بلدیو (کرشن کے بھائی بلرام کے مثیل) اور 24 کام دیو (محبت کے خدا) بھی جین مت کے ان گنت خداؤں میں شامل ہیں۔ جینی بھی دنیا میں آواگون (بار بار کے جنم) پر یقین رکھتے ہیں۔[1]

[1] Merriam Webster's Encyclopedia of World Religions, pp: 549-553.

3 بُدھ مت



بدھ مت کی علامت

بُدھ مت کا بانی گوتم بُدھ تھا۔ اس کی ولادت 483 ق م میں بتائی جاتی ہے۔ اس کا اصل نام سدھارتھ تھا۔ وہ ہندو ریاست کپل وستو (نیپال) کا راجکمار تھا مگر جوانی ہی میں راج پاٹ اور بیوی بچے چھوڑ کر درویشی اختیار کر لی اور گیا (بہار) میں ایک پیپل کے درخت کے نیچے چلہ کشی کرتے ہوئے اسے نروان (روشنی) ملا۔ اس نے عالمگیر انسانی دکھ درد دور کرنے کے لیے ایک اخلاقی نظام قائم کیا اور گیان دھیان پر زور دیا۔ عبادت کے لیے ''وہارا'' تعمیر کرائے۔ مہاتما بدھ ذات پات اور برہمنوں کی برتری کے خلاف تھے۔[1] آواگون ہندو مت اور جین مت کی طرح بُدھوں کا بھی ایک بنیادی عقیدہ ہے۔

مرورِ ایام سے بدھ مت میں بُت پرستی در آئی اور اس کے پیروکار بھی گوتم بدھ اور دیگر مذہبی ہستیوں کی مورتیوں کو سجانے، ان کے سامنے اظہار بندگی کے لیے ہاتھ جوڑ کر ماتھا ٹیکنے اور ان سے اپنی مرادیں مانگنے لگے۔[2] ویدیا نامی ہندو فاضل ''قرون وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ'' میں راجہ ہرش وردھن کے عہد (606-648ء) کے حوالے سے لکھتا ہے:

''بُدھ مت بت پرستی میں ہندو مذہب سے بھی آگے بڑھ گیا تھا۔ یہ مذہب خدا کے انکار سے شروع ہوا لیکن آخر کار اس نے بدھ ہی کو سب سے بڑا خدا بنا لیا۔ بعد میں دوسرے خداؤں، مثلاً: بودھی ستوا کا اضافہ ہوتا گیا اور خصوصاً مہایان فرقے میں بت پرستی نے مضبوطی سے قدم جما لیے۔ ہندوستان کے بدھ پیروکاروں میں بت پرستی کو اس قدر عروج حاصل ہوا کہ بعض مشرقی زبانوں میں بدھ کا نام ہی بت کا ہم معنی ہو گیا۔''[3]

جب ہندوؤں نے بدھ مت کا صفایا کیا

کشان عہد میں بدھ مت کے دو فرقے بن گئے تھے: مہایان (بڑا حلقہ) اور ہنایان (چھوٹا حلقہ)۔ مہایان کا

[1] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 174/23. [2] دنیا کے بڑے مذاہب، ص: 107

[3] History of Medieval Hindu India, Poona, 1924:1/ 101

زور شمالی ہند میں رہا اور ہنایان کا جنوبی ہند میں، تاہم گپت دور میں، پنڈت نہرو کے بقول ''برہمن مت نے بدھ مت پر بڑی ترکیب سے حملہ کیا، تھوڑا بہت تشدد ہوا'' اور ''آخر کار برہمن مت بدھ مت کو اس کی جنم بھومی سے نکال دینے میں کامیاب ہوگیا۔''[1]

بدھ مت آٹھ نو سو برس تک ہندوستان میں رائج رہا، پھر ہندوؤں نے دہشت گردی اور تشدد سے اسے نیست و نابود کردیا، تاہم برصغیر کے باہر آج بدھ مت کا بڑا حلقہ (مہایان) وسطی ایشیا (منگولیا)، چین، کوریا، جاپان اور جنوب مشرقی ایشیا میں معقول حد تک چھایا ہوا ہے۔[2] جبکہ ہنایان (چھوٹا حلقہ) صرف برما (میانمار)، تھائی لینڈ، کمبوڈیا، ویت نام اور سری لنکا میں پایا جاتا ہے۔

[1] تاریخ عالم پر ایک نظر: 128/1۔ [2] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 174,173/23۔

اعلام، اماکن، قبائل و اقوام اور متفرق مضامین

(بہ اعتبار حروف تہجی)

اعلام

ابن اسحاق (م:150ھ/768ء): امام ابوعبداللہ محمد بن اسحاق بن یَسار مطلبی مدنی رحمہ اللہ سیَر و مغازی کے امام ہیں۔ ان کا دادا یسار، قیس بن مخرمہ مُطّلبی رضی اللہ عنہ کا مولیٰ تھا۔ آپ فارسی الاصل تھے۔ مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ الجزیرہ، عراق، کوفہ، بغداد اور رَے کا سفر کیا، پھر بغداد میں رہنے لگے اور وہیں وفات پائی۔ (الطبقات لابن سعد:322,321/7، وفيات الأعيان:277,276/4، تاريخ بغداد:215/1-234)

ابن القیم (691-751ھ/1291-1350ء): شمس الدین ابوعبداللہ محمد بن ابو بکر بن ایوب بن سعد بن جریر دمشقی زُرعی ابن قیم الجوزیہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے کسب فیض کیا۔ زہد و ورع کا نمونہ تھے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے ساتھ قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ زادالمعاد، إعلام الموقعين، بدائع الفوائد جیسی وقیع علمی کتابیں تحریر کیں۔ (ذيل طبقات الحنابلة:447/4، البدر الطالع:137/2، الدررالكامنة:400/3، التاج المكلّل، ص:425)

ابن جریر طبری (م:310ھ/923ء): ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید طبری رحمہ اللہ طبرستان (ایران) کے دارالحکومت آمُل میں پیدا ہوئے۔ تفسیر اور تاریخ میں مرجع خلائق تھے۔ تحصیل علم کے بعد بغداد کو جائے اقامت بنالیا اور بغداد ہی میں فوت ہوئے۔ تفسير الطبري اور تاريخ الطبري انھی کی بلند پایہ تصانیف ہیں۔ (تاريخ بغداد:166/2، معجم الأدباء:275/5، وفيات الأعيان:191/4)

ابن حجر (773-852ھ/1372-1449ء): ابوالفضل شہاب الدین احمد بن علی بن محمد کنانی عسقلانی مصری رحمہ اللہ ابن حجر کے نام سے معروف ہیں۔ حدیث، تاریخ، علم رجال اور ادب میں امام تھے۔ حصول علم کے لیے یمن اور حجاز کا سفر کیا۔ ان کی کتابوں کی تعداد تقریباً150 ہے۔ ان میں سے فتح الباري، الإصابة، تهذيب التهذيب نے بہت شہرت حاصل کی۔ (تعجيل المنفعة، ص: 19، الدرر الكامنة: 492/4، معجم المؤلفين: 20/2)

ابن حوقل (م:371ھ/981ء): ابوالقاسم محمد بن حوقل رحمہ اللہ دسویں صدی عیسوی کا مشہور مؤرخ، جغرافیہ دان اور سیّاح تھا۔ یہ جنوبی ترکی کے شہر نصیبین میں پیدا ہوا۔ بعد میں بغداد میں رہنے لگا۔ اس کی مشہور کتاب صورة الأرض، اصطخری کی کتاب مسالك الممالك کا خلاصہ ہے۔ (المنجد في الأعلام، ص: 7، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

ابن عبدالبر (368-463ھ/978-1071ء): ابوعمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبر قرطبی رحمہ اللہ قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ آپ ابن حزم رحمہ اللہ کے ساتھی تھے۔ ابن حزم نے ان سے علم حدیث سیکھا۔ آپ کی تصنیفات میں سے الاستیعاب، التمھید اور الاستذکار بہت معروف ہیں۔ (سیر أعلام النبلاء:18/153-163، وفیات الأعیان:7/66)

ابن نجار (578-643ھ/1183-1245ء): ابوعبداللہ محب الدین محمد بن محمود بن حسن بن ہبۃ اللہ بن محاسن بغدادی رحمہ اللہ ابن نجار کے نام سے معروف ہیں۔ بہت بڑے محدث، حافظ اور مؤرخ تھے۔ انھوں نے بہت سی کتابیں تالیف کیں، مثلاً: القمر المنیر في المسند الکبیر، کنز الأنام في السنن والأحکام وغیرہ۔ (شذرات الذھب:5/226،227، الأعلام:7/86)

ابن ہشام (م:213ھ/828ء): مشہور سیرت نگار ابومحمد عبدالملک بن ہشام بن ایوب حمیری معافری رحمہ اللہ ابن ہشام کے نام سے معروف ہیں۔ انھوں نے ابن اسحاق کی کتاب سیر و مغازی کی تہذیب و تلخیص کی جو "سیرت ابن ہشام" کے نام سے معروف ہے، نیز بنو حمیر اور ان کے بادشاہوں کے نسب پر ایک کتاب مرتب کی۔ مصر میں وفات پائی۔ (الروض الأنف:1/22، وفیات الأعیان:3/177)

ابن یعقوب ہمدانی (280-334ھ/893-945ء): حسن بن احمد بن یعقوب رحمہ اللہ یمنی ہیں اور ابن یعقوب، ابن حائک اور ابن ذودمینہ کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ بہت سے فنون کے ماہر تھے۔ انھوں نے جغرافیہ، تاریخ، نسب اور دیگر علوم میں کتابیں لکھیں جن میں صفة جزیرة العرب اور الإکلیل مشہور ہیں۔ (صفة جزیرة العرب، ص:7-33، الأعلام:2/179)

ابو القاسم زجاجی (352-415ھ/963-1024ء): ابوالقاسم یوسف بن عبداللہ زجاجی رحمہ اللہ بہت بڑے محدث، ادیب اور لغوی تھے۔ شیشے کے کام کی وجہ سے ان کی نسبت زجاجی رکھی گئی۔ انھوں نے کئی کتابیں تالیف کیں جن میں عمدة الکتاب وعدة ذوي الألباب، الریاحین اور اشتقاق الأسماء وغیرہ شامل ہیں۔ زجاجی شمال مشرقی ایران کے علاقے استرآباد میں فوت ہوئے۔ (الأعلام:8/239)

ابومجلز: ابومجلز لاحق بن حمید بن سعید (یا شعبہ) بن خالد بن کثیر سدوسی بصری رحمہ اللہ اہل بصرہ میں سے تھے۔ ان کا شمار ثقہ راویوں میں ہوتا ہے۔ ان سے کئی احادیث مروی ہیں۔ وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خلافت میں حسن بصری رحمہ اللہ سے پہلے وفات پا گئے تھے۔ (وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا)

ابومحمد یزیدی (720-817ء): ابومحمد یحییٰ بن مبارک عدوی یزیدی رحمہ اللہ عربی ادب کے عالم اور بصرہ کے بہت بڑے نحوی تھے۔ یہ یزیدی خاندان کے جد امجد ہیں۔ یزید بن منصور کے ساتھ رہنے کی وجہ سے انھیں یزیدی کہا جاتا تھا۔ کتاب النوادر اور المقصور والممدود انھی کی تالیفات ہیں۔ (المنجد في الأعلام، ص:619)

ابوالاعلیٰ مودودی (1322-1399ھ/1903-1979ء): سید ابوالاعلیٰ مودودی بن سید احمد حسن رحمہ اللہ پاکستان کی جماعت اسلامی (بنا کردہ 1941ء) کے بانی، اورنگ آباد (حیدر آباد دکن) میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد اخبارات میں ادارتی فرائض انجام دیتے رہے۔ 1932ء میں مجلّہ ترجمان القرآن شائع کرنا شروع کیا۔ مختلف دینی اور سیاسی موضوعات پر بہت سی کتابیں تحریر کیں۔ ان کی تفسیر "تفہیم القرآن" بہت مشہور ہے۔ (ذیل الأعلام، ص:39،40، وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا)

ابوالفضل علامی (م:1011ھ/1602ء): ابوالفضل بن ملا مبارک مغل بادشاہ اکبراعظم کے 9 رتنوں (وزیروں) میں شامل تھا۔

اشرف قایتبائی (815-901ھ/1412-1496ء): ابونصر سیف الدین قایتبائی محمودی اشرفی ظاہری مصر کے چرکسی سلاطین میں سے تھا۔ یہ غلام تھا۔ اسے سلطان اشرف برسبائی نے مصر میں خریدا۔ پھر سلطان ابوسعید ظاہر چقماق نے اسے خریدا اور آزاد کر کے اپنی فوج میں عہدہ دیا۔ 872ھ میں ممالیک نے سلطان تمر بغا کی حکومت ختم کر کے اشرف قایتبائی کو سلطان بنا دیا۔ (الأعلام:5/188)

اشعث بن قیس (23 قبل ہجرت-40ھ/600-661ء): ابومحمد اشعث بن قیس بن معدیکرب بن معاویہ کندی رضی اللہ عنہ جاہلیت اور اسلام میں کندہ کے امیر رہے۔ دسویں ہجری میں ستر افراد پر مشتمل ایک وفد کی سربراہی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حسن اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے اتفاق کے دن وفات پائی۔ (الإصابة:1/239، الأعلام:1/332)

اَصمعی (122-216ھ/740-831ء): ابوسعید عبدالملک بن قُریب بن علی بن اصمع باہلی اصمعی رحمہ اللہ بصرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ عربی لغت کے مشہور امام ہیں۔ عربی کے شاعر اور چند کتابوں کے مؤلف بھی ہیں۔ ان کتابوں میں الوحوش وصفاتها، النبات والشجر، الخیل وغیرہ معروف ہیں۔ (الأعلام:4/162)

امام ابن قتیبہ (213-276ھ/828-889ء): ابومحمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ دینوری رحمہ اللہ بغداد میں پیدا ہوئے، پھر کوفہ میں رہے۔ کچھ مدت تک دینور کے قاضی رہے۔ المعارف، أدب الكاتب، عیون الأخبار آپ ہی کے علمی کارنامے ہیں۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے ان کی 28 کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ آپ نے بغداد ہی میں وفات پائی۔ (سیر أعلام النبلاء:13/296-302، وفیات الأعیان: 3/42-44)

امام مالک (93-179ھ/712-795ء): امام دارالہجرۃ ابوعبداللہ مالک بن انس بن مالک حمیری اصبحی مدنی رحمہ اللہ اہل سنت کے چار مشہور اماموں میں سے ہیں۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی، معمر، ابوداود رحمہم اللہ ان کے ہم عصر تھے۔ نوجوانی میں علم حاصل کیا اور تدریس وافتاء کے منصب پر فائز رہے۔ آپ درسِ حدیث کے لیے ہمیشہ غسل کر کے اور خوشبو لگا کر تشریف لاتے۔ آپ کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے۔ صحیح بخاری سے پہلے آپ کی کتاب ''المؤطأ'' کو قرآن مجید کے بعد صحیح ترین کتاب کا درجہ حاصل تھا۔ مدینہ میں پیدا ہوئے اور وفات بھی مدینہ میں ہوئی۔ بقیع میں مدفون ہیں۔ (سیر أعلام النبلاء:8/48-135، تهذيب التهذيب:10/5)

امام مسلم (204-261ھ/820-875ء): حافظ محدث امام ابوالحسین مسلم بن حجاج بن مسلم بن ورد قشیری نیشاپوری رحمہ اللہ نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ حجاز، عراق، شام، مصر اور بغداد میں تعلیم پائی۔ امام بخاری اور احمد بن حنبل رحمہما اللہ جیسے جید اساتذہ کے شاگرد ہیں۔ تین لاکھ احادیث میں سے انتخاب کر کے صحیح مسلم مرتب کی جس میں بلا تکرار 3033 احادیث ہیں۔ آپ نیشاپور کے محلے نصر آباد میں مدفون ہیں۔ (تاریخ بغداد:13/100، وفیات الأعیان:5/194،195)

انس بن مالک (10 قبل ہجرت-93ھ/612-712ء): ابوحمزہ انس بن مالک بن نضر بن ضمضم انصاری رضی اللہ عنہ خزرجی قبیلہ بنونجار سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات تک آپ کے خادم رہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کے لیے مال وعمر کی کثرت اور جنت کی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں بہت زیادہ مال اور اولاد سے نوازا۔ آپ نے سو سال سے زیادہ عمر پائی۔ یہ بصرہ میں سب سے آخری صحابی تھے۔ آپ سے بہت سی روایات منقول ہیں۔ کتب حدیث میں ان کی تعداد 2286 ہے۔ (الطبقات لابن سعد:7/17-26، الأعلام:2/24)

ایاد: ایاد بن نزار بن معد بن عدنان بنوایاد کے جد اعلیٰ ہیں۔ بنوایاد میں بہت سے قبائل ہیں۔ بنوحذافہ، بنودُعمی اور بنوطمّاح بھی انھی سے ہیں۔ یہ حرم کے اردگرد اور تہامہ اور حدود نجران کے درمیان رہتے تھے۔ (الأعلام:2/32)

اُمَیم: یہ وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے گھروں پر لکڑی کی چھت ڈالی۔ یہ بادشاہ تھا اور اس کا نام فارسیوں کے ہاں آدم تھا۔ اس کے بیٹے کا نام وبار تھا۔ بنواُمیم ریگستانی طوفانی ہوا سے ہلاک ہوئے اور ان کے آثار ختم ہو گئے۔ (ویب سائٹ: الاسلام)

براء بن عازب: ان کے والد عازب بن حارث رضی اللہ عنہ بھی صحابی تھے۔ براء رضی اللہ عنہ نے اُحد، خندق اور دیگر غزوات میں شرکت کی۔ اُنھوں نے 24ھ میں رَے فتح کیا۔ (أسد الغابة:1/199و2/506)

بیضاوی (م:685ھ/1286ء): ابوسعید ناصر الدین عبداللہ بن عمیر بن محمد بن علی بیضاوی شیرازی رحمہ اللہ شیراز کے قریب علاقہ بیضاء میں پیدا ہوئے۔ یہ ایک مدت تک شیراز کے قاضی رہے۔ انھوں نے قرآن مجید کی تفسیر أنوار التنزيل و أسرار التأويل لکھی جو تفسیر البیضاوی کے نام سے معروف ہے۔ ان کی اہم کتابوں میں منهاج الوصول إلى علم الأصول اور طوالع الأنوار قابل ذکر ہیں۔ (معجم المؤلفین:6/98,97، المنجد في الأعلام، ص:161)

جابر بن عبداللہ (16 قبل ہجرت-78ھ/607-698ء): جابر بن عبداللہ بن عمرو بن حرام خزرجی سلمی رضی اللہ عنہما مدینہ میں پیدا ہوئے۔ دوسری بیعت عقبہ میں اپنے والد کے ساتھ مسلمان ہوئے۔ 19 غزوات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔ آپ سے1540 احادیث مروی ہیں۔ (أسد الغابة:1/294، الإصابة:1/546)

جریر بن عبداللہ بجلی (م:51ھ/671ء): ابوعبداللہ جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کی تاریخ میں اختلاف ہے۔ یہ بہت حسین تھے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ان کے حسن کی وجہ سے انھیں یُوسُفُ هٰذِهِ الْأُمَّة "اس امت کا یوسف" کہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کریم الیمن کہا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یمن کے بعض علاقوں کا گورنر بھی بنایا تھا۔ ذوالخلصہ نامی بُت کو آپ ہی نے گرایا۔ جنگ قادسیہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریک تھے۔ سیدنا علی اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین سفیر رہے۔ فرات کے قریب قرقیساء میں وفات پائی۔ (الإصابة:1/581-583، أسد الغابة:1/319-321، سیر أعلام النبلاء:2/530-537)

حارثہ غطریف: یہ عمرو مزیقیا بن عامر ماء السماء کے دادا تھے۔ عمرو کے پوتے حارثہ بن ثعلبہ اوس وخزرج کے جدّ امجد تھے۔ (سبائك الذهب، ص:281)

حافظ ابن کثیر (701-774ھ/1302-1373ء): ابو الفداء عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر بن ضوء بن درع قرشی بصروی دمشقی رحمہ اللہ معروف مفسر، مؤرخ، حافظ حدیث اور فقیہ ہیں۔ قریہ مجیدل میں پیدا ہوئے جو شام کے شہر بُصریٰ کے مضافات میں ہے، پھر اپنے بھائی کے ساتھ دمشق منتقل ہو گئے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ حصول علم کے لیے مختلف سفر کیے۔ دمشق ہی میں وفات پائی۔ آپ کی بہت سی تصانیف ہیں جن میں سے تفسیر القرآن العظیم، البداية والنهاية، الباعث الحثيث معروف ہیں۔ (الأعلام:1/320، الدرر الكامنة:1/373,374)

حجاج بن یوسف (40-95ھ/660-714ء): ابومحمد حجاج بن یوسف بن حکم بن ابوعقیل بن مسعود ثقفی کُلَیب کے لقب سے معروف تھا۔ اموی خاندان کا وفادار خادم تھا۔ طائف میں پیدا ہوا۔ یہیں پرورش پائی۔ طائف میں بچوں کو پڑھاتا رہا۔ عبدالملک بن مروان

کے عہدِ حکومت میں دمشق جا کر سپاہی بھرتی ہوا۔ 71ھ میں حجاج نے مکہ کا محاصرہ کیا اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اس کے خلاف لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ انتظامی امور میں مستعدی کی بنا پر عبدالملک نے اسے عراق کا گورنر بنا دیا۔ 20 سال تک گورنر رہا۔ سرطان معدہ کے مرض میں مبتلا ہوکر واسط میں فوت ہوا۔ (المعارف لابن قتيبة، ص: 173، العقد الفريد: 13/5، مروج الذهب: 151/3، تاريخ بغداد: 240/8)

حَرب بن اُمَیّہ: ابوعمرو حرب بن امیہ بن عبدشمس بن عبدمناف بن قصی قرشی، ابوسفیان رضی اللہ عنہ کا باپ تھا۔ حرب عبدالمطلب بن ہاشم کا ہم عصر اور جنگ فجار میں قریش کا سپہ سالار تھا۔ حرب آخری معرکۂ فجار کے چند مہینے بعد 586ء میں شام میں فوت ہوا۔ (تاريخ اليعقوبي: 12/2، مروج الذهب: 174/2، الروض الأنف: 319/1)

زکریا بن محمد قزوینی (605-682ھ/1208-1283ء): زکریا بن محمد بن محمود انصاری نجاری قزوینی رحمہ اللہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔ یہ مشہور مؤرخ اور جغرافیہ دان تھے۔ شام اور عراق کا سفر کیا۔ مستعصم باللہ کے زمانے میں واسط اور حلہ کے قاضی رہے۔ آپ کی تصانیف میں سے آثار البلاد و أخبار العباد بہت مشہور ہے۔ (الأعلام: 46/3)

زُہَیر (13 قبل ہجرت/609ء): زہیر بن ابی سلمیٰ بن ربیعہ بن اُبَی رباح مزنی مضری۔ زمانۂ جاہلیت کے مشہور شعراء میں سے ہے۔ بعض علمائے ادب نے اسے تمام شعرائے عرب پر ترجیح دی ہے۔ اس کے والد، خالہ، دونوں بہنیں (سلمیٰ، خنساء) اور دونوں بیٹے (کعب اور بجیر) بھی شاعر تھے۔ زہیر نے حاجر (نجد) میں رہائش اختیار کی۔ اس کے قصائد ''الحولیات'' کے نام سے مشہور ہیں۔ (الأعلام: 52/3)

سعید بن جبیر (45-95ھ/665-714ء): ابوعبداللہ سعید بن جُبیر بن ہشام اسدی رحمہ اللہ، کوفہ کے کبار تابعین میں سے تھے۔ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کے شاگرد تھے۔ دیر جماجم کی لڑائی میں عبدالرحمٰن بن اشعث کندی کا ساتھ دیا اور فرار ہوکر مکہ چلے آئے جہاں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ حجاج بن یوسف نے انھیں شہید کرا دیا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً پچاس برس تھی۔ (الطبقات لابن سعد: 256/6-267، الثقات لابن حبان: 275/4، وفيات الأعيان: 371/2)

سعید بن مُسَیَّب (م 91ھ/710ء): سید التابعین ابومحمد سعید بن مسیب بن حزن قرشی مخزومی رحمہ اللہ مدینہ کے مشہور سات فقہاء میں سے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوسرے سال پیدا ہوئے۔ زہد و ورع کی زندگی بسر کی۔ خواب کی تعبیر خوب بتاتے تھے۔ 75 برس کی عمر پا کر مدینہ میں فوت ہوئے۔ (الطبقات لابن سعد: 119/5-143، وفيات الأعيان: 375/2-378، سير أعلام النبلاء: 245/4)

سلمہ بن اکوع (م 74ھ/693ء): سلمہ بن عمرو بن سنان اکوع اسلمی رضی اللہ عنہ نہایت بہادر، بہترین تیرانداز اور تیز دوڑنے والے صحابی ہیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سات غزوات میں شریک ہوئے۔ ایک عرصہ ربذہ میں رہے۔ مدینہ میں وفات پائی۔ کتب احادیث میں ان سے مروی 77 حدیثیں موجود ہیں۔ (الإصابة: 127/3، أسد الغابة: 353/2، الأعلام: 113/3)

سموأل بن عادیاء (م 65 قبل ہجرت/تقریباً 560ء): سموأل (شموئیل) بن غریض بن عادیاء ازدی کا تعلق بنو دیان سے تھا۔ یہ زمانۂ جاہلیت کا یہودی تھا۔ شاعر اور حکیم تھا۔ چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں زندہ تھا۔ خیبر میں رہائش پذیر تھا۔ اس کا ابلق نامی

ایک محل تھا۔ امرؤالقیس سے اس کی وفاداری کا قصہ مشہور ہے۔ اس کا ایک دیوان بھی موجود ہے۔ (الأعلام: 140/3، المنجد في الأعلام، ص: 309، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

سمہودی (844-911ھ/1440-1506ء): ابوالحسن نورالدین علی بن عبداللہ بن احمد حسنی شافعی سمہودی مصری رحمہ اللہ سمہود (صعید مصر) میں پیدا ہوئے۔ قاہرہ میں پرورش پائی۔ 873ھ میں مدینہ آئے اور یہاں کے مفتی اور مؤرخ کہلائے۔ ان کی وفات مدینہ منورہ ہی میں ہوئی۔ ان کی بہت سی تصانیف تھیں لیکن اکثر جل کر ضائع ہوگئیں۔ ان کی ایک کتاب وفاء الوفا مشہور ہے۔ (شذرات الذهب: 51,50/8، الأعلام: 307/4، المنجد في الأعلام، ص: 309، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

سہل بن سعد (م: 91ھ/710ء): سہل بن سعد بن مالک ساعدی خزرجی رضی اللہ عنہما کے والد بھی صحابی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت سہل رضی اللہ عنہ کی عمر 15 سال تھی۔ انھوں نے تقریباً سو سال کی عمر پائی۔ یہ مدینہ میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی تھے۔ ان سے 188 حدیثیں مروی ہیں۔ (الإصابة: 167/3، أسد الغابة: 390/2، الأعلام: 143/3)

سید طنطاوی (1347-1431ھ/1928-2010ء): ڈاکٹر محمد سید عطیہ طنطاوی رحمہ اللہ مصر کے علاقے سوہاج میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسکندریہ میں حاصل کی۔ شافعی المسلک تھے۔ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تدریسی خدمات سرانجام دیں، پھر جامعہ ازہر مصر کے شیخ بنے اور 1996ء سے وفات تک مصر کے مفتی عام رہے۔ تفسیر الوسیط ان کا اہم علمی کارنامہ ہے۔ 2010ء میں شاہ عبداللہ بن عبدالعزیز نے انھیں ملک فیصل ایوارڈ سے نوازا۔ 24 ربیع الاول 1431ھ کو سعودی عرب میں حرکت قلب بند ہونے سے وفات پائی۔ مسجد نبوی میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور بقیع الغرقد میں دفن کیے گئے۔ (وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

شاہ عباس صفوی (1587ء-1629ء): ایران کے صفوی خاندان کا مشہور ترین حکمران عباس اعظم مغل بادشاہوں اکبر اور جہانگیر کا ہم عصر تھا۔

شاہ عبدالعزیز (1293-1373ھ/1876-1953ء): عبدالعزیز بن عبدالرحمن بن فیصل بن ترکی بن عبداللہ بن محمد بن سعود رحمہ اللہ بنو ذہل بن شیبان کی شاخ ربیعہ سے تھے۔ یہ موجودہ سعودی حکومت کے بانی تھے۔ ریاض میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے ساتھ کویت میں جلاوطن رہے، پھر آل رشید پر حملہ کر کے 1319ھ/1902ء میں الریاض پر قبضہ کر لیا، پھر تقریباً 30 سال میں پورے جزیرہ نمائے عرب پر ان کی حکومت قائم ہوگئی۔ 1351ھ/1932ء میں اس حکومت کا نام المملكة العربية السعودية رکھا گیا۔ سعودی عرب میں تیل انھی کے عہد میں دریافت ہوا۔ (ان کے فرزند سعود، فیصل، خالد، فہد اور عبداللہ (موجودہ خادم الحرمین) یکے بعد دیگرے ان کے جانشین بنے۔) (الأعلام: 20,19/4، الموسوعة العربية الميسرة: 1183/2، المنجد في الأعلام، ص: 366)

شجاع بن وہب اسدی: ابووہب شجاع بن وہب بن ربیعہ بن اسد اسدی غنمی رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ یہ بنو عبدشمس کے حلیف تھے۔ آپ نے ہجرت حبشہ میں دونوں مرتبہ شرکت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کئی بار لشکروں کی قیادت سونپی۔ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ 7ھ میں انھوں نے حارث بن ابی شمر غسانی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خط پہنچایا۔ 12ھ/633ء میں جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔ (الطبقات لابن سعد: 95,94/3، الإصابة: 256/3، أسد الغابة: 414/2، الأعلام: 158/3)

شریف مکہ الحسین (1270-1350ھ/1854-1931ء): حسین بن علی بن محمد بن عبدالمعین بن عون ہاشمی حسنی۔ یہ حجاز کے ہاشمی

اشراف کا آخری حکمران تھا۔ استنبول میں پیدا ہوا۔ 1326ھ/1908ء میں مکہ کا امیر مقرر ہوا۔ جون 1916ء میں ترکوں کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے حجاز کی آزادی کا اعلان کیا۔ اگست 1924ء میں ابن سعود نے طائف پر قبضہ کرلیا تو حسین نے اپنے بیٹے علی کو امیر مقرر کیا اور خود جدہ چلا گیا۔ 1344ھ/1925ء میں قبرص جا پہنچا۔ وہاں سے عمان (اردن) چلا آیا اور یہیں وفات پا گیا۔ اسے بیت المقدس میں دفن کیا گیا۔ (الأعلام: 2/249,250)

شُکامہ بن شبیب: بنوقحطان سے شکامہ بن شبیب بن سکون بن اشرس کندی بنوشکامہ کا جد امجد تھا۔ دومۃ الجندل کا عیسائی بادشاہ اکیدر بنوشکامہ ہی سے تھا۔ (نهاية الأرب، ص: 280,281، الأعلام: 3/171)

طرفہ (86-60 قبل ہجرت/538-564ء): ابوعمرو طرفہ بن عبد بن سفیان بن سعد بکری وائلی کا شمار جاہلی شاعروں کے اولین طبقے میں ہوتا ہے۔ بادیۃ البحرین میں پیدا ہوا۔ نجد کے مختلف علاقوں کا سفر کیا۔ بادشاہ عمرو بن ہند نے اسے اپنے ساتھیوں میں شامل کرلیا، پھر اس کو اپنے ماتحت بحرین کے گورنر مکعبر کی طرف خط دے کر روانہ کیا تو اس نے اسے ہجر میں قتل کردیا کیونکہ اس نے بادشاہ کی ہجو کی تھی۔ اس کا ایک قصیدہ سات مشہور ''معلقات'' میں شامل ہے۔ اس کے شعروں میں ہجو اور حکمت کی باتیں پائی جاتی ہیں۔ (الشعر والشعراء، ص: 59,60، الأعلام: 3/225، الجمهرة لابن حزم، ص: 320)

عبدالرحمٰن بن ناصر سعدی (1307-1376ھ/1889-1956ء): عبدالرحمٰن بن ناصر سعدی رحمہ اللہ عنیزہ میں پیدا ہوئے جو سعودی عرب کا شہر ہے۔ ان کا شمار کبار علماء میں ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے علمی استفادہ کیا۔ ابن سعدی رحمہ اللہ نے بہت سی کتابیں تحریر کیں جن میں تفسیر سعدی بہت مشہور ہے۔ (وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا)

عبداللہ بن سلام (م: 43ھ/663ء): ابویوسف عبداللہ بن سلام بن حارث قینقاعی رضی اللہ عنہ بنوخزرج کے حلیف اور یوسف علیہ السلام کی نسل سے تھے۔ مسلمان ہونے سے پہلے ان کا نام حصین تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل کر نیا نام عبداللہ رکھ دیا۔ بیت المقدس اور جابیہ کی فتح میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریک تھے۔ ان سے 25 احادیث مروی ہیں۔ (الإصابة: 4/102، الاستيعاب، ص: 460، الأعلام: 4/90)

عبد کلیل: شاہ یمن عبد کلیل (یا عبدکلال) بن مثوب (ینوف) حمیری عیسائی تھا۔ عمرو بن تبان بن اسعد کے بعد یمن کا بادشاہ بنا۔ اس کا دور حکومت 64 برس پر محیط ہے۔ یہ امرؤالقیس کے والد کا ہم عصر تھا۔ (الأعلام: 4/57)

عدی بن زید عبادی (م 590ء): عدی بن زید بن حماد بن زید عبادی تمیمی جاہلی شاعر تھا۔ عربی اور فارسی کا ماہر تھا۔ کسریٰ کے دیوان شاہی میں عربی تحریروں کا آغاز سب سے پہلے اسی نے کیا۔ یہ کسریٰ کا عربی ترجمان تھا۔ (الأعلام: 4/220، النجوم الزاهرة: 1/249، الكامل لابن الأثير: 1/71)

عطاء بن ابی رباح (27-114ھ/647-732ء): ابومحمد عطاء بن ابی رباح اسلم بن صفوان قرشی رحمہ اللہ بنوفہر یا بنوجمح کے غلام تھے، نوبی الاصل تھے۔ یمن میں پیدا ہوئے۔ مکہ مکرمہ میں پرورش پائی۔ مکہ اور مدینہ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے علم حاصل کیا۔ مکہ کے مفتی اور محدث تھے۔ ان سے مجاہد، اوزاعی، ابن جریر، ابوحنیفہ اور لیث رحمہم اللہ روایت کرتے ہیں۔ یہ سیاہ فام تھے اور کبار فقہاء میں شمار ہوتے تھے۔ (تهذيب التهذيب: 7/179-183، وفيات الأعيان: 3/261,262، الأعلام: 4/235)

علامہ مقدسی(336-380ھ/947-990ء): ابوعبداللہ شمس الدین محمد بن احمد بن ابوبکر البناء مقدسی بشاری رحمہ اللہ ماہر جغرافیہ دان اور معروف سیاح تھے۔ فلسطین کے شہر القدس میں پیدا ہوئے، اس لیے انھیں ''المقدسی'' کہا جاتا ہے۔ ان کی کتاب أحسن التقاسیم في معرفة الأقالیم بہت مشہور ہے۔ (الأعلام:312/5)

علاء بن حضرمی (م:21ھ/642ء): علاء (عبداللہ) بن حضرمی (عماد) بن اکبر بن ربیعہ حضرمی رضی اللہ عنہ مکہ میں پیدا ہوئے۔ حضرموت میں رہائش اختیار کی۔ 8ھ/629ء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بحرین کا گورنر مقرر کیا۔ سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں بھی گورنر کے عہدے پر فائز رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں بصرہ روانہ کیا تو راستے ہی میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ (الإصابة: 445/4، أسد الغابة:272/3، الأعلام:245/4)

عمارہ بن عقیل(182-239ھ/798-853ء) عمارہ بن عقیل یربوعی تمیمی بڑے فصیح و بلیغ شاعر تھے۔ مشہور شاعر جریر کے نواسے تھے۔ بصرہ کے نحوی علماء ان سے لغت سیکھتے تھے۔ آخری عمر میں نابینا ہوگئے۔ ان کے قصائد کو شاکر العاشور نے کتابی شکل دی ہے۔ (الأعلام:37/5، المنجد في الأعلام، ص:379، تاریخ بغداد:282/12)

عمران بن عمرو: عمران بن عمرو مزیقیا بن عامر ماء السماء کی نسل سے بنو عتیک بہت مشہور ہوئے جو ان کے پوتے عتیک بن اسد کی اولاد ہیں۔ یہ موجودہ عمان میں رہتے تھے۔ عمان کے موجودہ بادشاہ بھی اسی ازدی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ (سبائك الذهب، ص: 285، معجم قبائل العرب:753/2)

عمرو بن لحی: اس کا نسب عمرو بن عامر بن لحی بن عامر بن ربیعہ بن عامر بن قمعہ بن الیاس بن مضر ہے۔ اس کے نسب کے بارے میں علمائے انساب میں اختلاف ہے۔ کچھ اسے قحطانی اور کچھ عدنانی کہتے ہیں لیکن راجح یہی ہے کہ یہ عدنانی ہے۔ اسی نے عرب میں سب سے پہلے دینِ ابراہیمی کو تبدیل کر کے بُت پرستی رائج کی تھی۔ (الجمهرة لابن حزم، ص:233-235، الأعلام: 84/5، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

عمرو مزیقیا: عمرو مزیقیا بن عامر ماء السماء بن حارثہ الغطریف کا شمار تبابعہ میں ہوتا ہے۔ یہ مأرب کا بادشاہ تھا، پھر یہ کہلانی بدوؤں کے حملوں سے تنگ آکر غسان چلا گیا۔ اس کے بعد عک میں رہا اور وہیں وفات پا گیا۔ عمرو مزیقیا کی اولاد میں حارثہ بن ثعلبہ بہلول انصار مدینہ کا جد امجد ہے۔ (تاج العروس، مادة: مزق، الأعلام:80/5)

عنترہ بن عمرو بن شداد (م:22 قبل ہجرت/600ء) عنترہ بن عمرو بن شداد بن عمرو بن معاویہ عبسی۔ یہ بہت سخی، بہادر، جنگجو اور عربوں کا بہت مشہور شہسوار تھا۔ یہ شعراء کے پہلے طبقے کا شاعر تھا۔ اس کا کلام معلقة الذهبية کے نام سے مشہور ہے۔ (الشعر و الشعراء، ص:87، الأعلام:91/5، المنجد في الأعلام، ص:381)

فردوسی: ابوالقاسم فردوسی کا شمار ایران کے پانچ بڑے شعراء میں ہوتا ہے۔ ایرانی اُسے شاعر شاہنامہ کہتے ہیں۔ فردوسی 329 یا 330ھ میں طوس کے مضافاتی قصبے باز میں پیدا ہوا۔ 365ھ میں اُس نے شاہنامہ لکھا جس میں ایرانی اساطیر کی بنیاد پر آفرینش عالم سے اپنے دور تک کی ایرانی تاریخ بیان کی۔ شاہنامہ کا پیرایۂ بیان نہایت دلآویز اور بلیغ ہے اگرچہ اس کی بیان کردہ تفصیلات محض اساطیر پر مبنی، نسلی تعصب سے آلودہ اور انتہائی مبالغہ آمیز ہیں۔ اکثر تاریخی تفصیلات خیالی اور من گھڑت ہیں۔ فردوسی نے 411 یا 416ھ میں

محمود غزنوی کے عہد میں وفات پائی۔

قتادہ (60-117ھ/680-736ء): ابوخطاب قتادہ بن دعامہ بن قتادہ بن عزیز سدوسی بصری رحمہ اللہ مفسر، محدث، ادیب اور لغوی تھے۔ آپ قدری مذہب کی طرف مائل تھے۔ روایت میں تدلیس کرتے تھے۔ لغت، نسب اور تاریخ عرب میں بہت ماہر تھے۔ آخرِ عمر میں نابینا ہوگئے تھے۔ طاعون کی وجہ سے واسط میں وفات پا گئے۔ (سیر أعلام النبلاء:5/269-283، وفیات الأعیان:4/85، میزان الاعتدال:3/385)

قضاعہ: یہ بنوقضاعہ کا جد اعلیٰ ہے۔ بعض مؤرخین اسے عدنانی بتاتے ہیں۔ اکثر نے قحطانی بتایا ہے۔ اس کا نسب یہ ہے: قضاعہ بن مالک بن عمرو بن مرہ بن زید بن مالک بن حمیر۔ یہ لوگ جاہلیت میں اقیصر نامی بُت کی پوجا کرتے تھے۔ (نهاية الأرب، ص:358، معجم قبائل العرب:3/957، الأعلام:5/199)

قیس بن خارجہ بن سنان ذبیانی: بعض علماء نے انھیں صحابہ میں شمار کیا ہے۔ ان سے ایک روایت بھی مروی ہے۔ (الإصابة:5/353، أسد الغابة:3/494، الجمهرة لابن حزم، ص:252)

قیس بن مَخرمہ: ابومحمد قیس بن مخرمہ بن مطلب بن عبدمناف بن قصی قرشی مطلبی رضی اللہ عنہ کی ولادت رسول اللہ ﷺ کی ولادت کے سال عام الفیل میں ہوئی۔ نبی کریم ﷺ نے انھیں خیبر کے مالِ غنیمت سے تالیف قلب کے لیے غلہ بھی مرحمت فرمایا۔ (جامع الترمذي:3619، أسد الغابة:3/510، الإصابة:5/379)

کلبی (م:204ھ/819ء): ابومنذر ہشام بن محمد بن سائب کلبی رحمہ اللہ کوفی ہیں۔ آپ کا نسب آٹھویں پشت میں مشہور جاہلی شاعر امرؤالقیس سے جا ملتا ہے۔ بغداد آئے تو حدیث بیان کرتے رہے۔ آپ علم حدیث اور علم نسب کے ماہر تھے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد تقریباً 150 ہے۔ (تاريخ بغداد:14/45، وفيات الأعيان:4/309-313 و6/82-84)

متنبّی (303-354ھ/915-965ء): ابوطیب احمد بن حسین بن حسن بن عبدالصمد جعفی کندی متنبی عربی ادب اور شاعری میں ممتاز مقام رکھتا تھا۔ کوفہ کے محلے کندہ میں پیدا ہوا اور اسی کی طرف اس کی نسبت ہے۔ شام میں نشوونما پائی۔ بادیۂ شام میں تعلیم حاصل کی۔ اپنی زندگی کے ایک دور میں اُس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا لیکن پھر توبہ کرلی۔ اس کی کتاب دیوان متنبّی معروف ہے۔ علماء نے جہاں متنبّی کی لغزشیں بیان کی ہیں، وہیں اس کی مدح بھی کی ہے۔ (الأعلام:1/115)

محمد بن قاسم (62-98ھ/681-717ء): سندھ کے فاتح اور گورنر محمد بن قاسم بن محمد بن حکم بن ابوعقیل ثقفی رحمہ اللہ عظیم قائد اور بنی مروان کے عہد کے مشاہیر میں سے ہیں۔ حجاج بن یوسف نے 92ھ/711ء میں محمد بن قاسم کو سندھ کی فتح پر مامور کیا تھا۔ انھوں نے مکران کے راستے سندھ پر یلغار کی، دیبل فتح کیا اور راوڑ کی جنگ (93ھ/712ء) میں راجہ داہر کو شکست دی، پھر ان کی فتوحات کا سلسلہ ملتان تک پہنچ گیا۔ اس وقت یہ نوعمر تھے۔ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں واسط کے قید خانے میں وفات پائی۔ (فتوح البلدان للبلاذري، ص:224، الأعلام:6/333، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ:19/347)۔

مسعودی (م:346ھ/957ء): ابوالحسن علی بن حسین بن علی مسعودی بغدادی مصری رحمہ اللہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی نسل میں سے تھے۔ تاریخ اور بحث و تحقیق کے ماہر تھے۔ بغداد میں پیدا ہوئے۔ مصر میں وفات پائی۔ عقیدتاً معتزلی تھے۔ کچھ لوگوں نے انھیں

شیعوں میں شمار کیا ہے۔ اعیان الشیعہ نامی کتاب میں ان کا نام بھی موجود ہے۔ ان کی چند مشہور کتابیں یہ ہیں: مروج الذهب، أخبار الزمان، التنبیه والإشراف۔ (ان کے تیار کردہ دنیا کے نقشے میں افریقہ کے نیچے سمندر پار ارض مجہولہ (انٹارکٹیکا) دکھایا گیا ہے۔) (الفهرست لابن الندیم، ص:171، سیر أعلام النبلاء:569/15، طبقات الشافعیة:456/3)

مغیرہ بن شعبہ (20 قبل ہجرت-50ھ/603-670ء): ابوعبداللہ مغیرہ بن شعبہ بن ابو عامر بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ طائف میں پیدا ہوئے۔ یہ عربوں میں مغیرة الرَّأْی کے لقب سے مشہور تھے۔ 5ھ/626ء میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حدیبیہ اور ما بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ ایران، نہاوند اور ہمدان کی فتوحات میں بھی شریک تھے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انھیں بصرہ، پھر کوفہ کا گورنر مقرر کیا تھا۔ علی اور معاویہ رضی اللہ عنہما کے معاملے میں شریک نہ تھے لیکن فیصلے میں حَکَم تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے انھیں کوفہ کا گورنر بنا دیا۔ اسی منصب پر کام کرتے ہوئے وفات پا گئے۔ ان سے 136 حدیثیں مروی ہیں۔ (الإصابة:6/156-158، أسدالغابة: 4/181، الأعلام:7/277)

مہدی عباسی (127-169ھ/744-785ء): ابوعبداللہ محمد المہدی بن عبداللہ منصور بن محمد بن علی عباسی رحمہ اللہ اہواز میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد 158ھ تا 169ھ-775ء تا 785ء خلیفہ رہے۔ یہ بڑے سخی اور بہادر تھے۔ بغداد کی جامع مسجد الرصافہ انھی نے تعمیر کرائی تھی۔ (مروج الذهب:4/377، الكامل لابن الأثير:5/259، الأعلام:6/221)

نعمان بن منذر (م:15 قبل ہجرت/608ء): ابوقابوس نعمان بن منذر بن امرؤالقیس لخمی حیرہ کے بادشاہوں میں سے تھا۔ دجلہ کے دائیں کنارے پر نعمانیہ شہر اسی نے آباد کیا۔ اس پر کسریٰ پرویز کا عتاب نازل ہوا اور اسے قید کر دیا گیا اور قید ہی میں اس نے وفات پائی۔ (الأعلام:8/43)

وائل بن حجر (م:50ھ/670ء): ابوہنیدہ وائل بن حجر بن ربیعہ بن وائل بن یعمر حضرمی قحطانی رضی اللہ عنہ کے والد یمن کے بادشاہ تھے۔ وائل رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے تو آپ نے ان کے لیے دعا کی اور حضرموت کا گورنر بنایا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور حکومت میں وائل رضی اللہ عنہ ان کی زیارت کے لیے گئے تو امیرالمؤمنین نے انھیں اپنے تخت پر بٹھایا۔ مشہور مؤرخ ابن خلدون اُنھی کی نسل سے ہیں۔ (الإصابة6/466,467، أسدالغابة:4/305,306، الأعلام:8/106)

وج بن عبدالحی: یہ شخص طائف شہر کا بانی اور اَجَأ کا بھائی تھا جس کی طرف اَجَأ و سَلْمٰی (حائل) کے پہاڑ منسوب ہیں۔ (معجم البلدان، مادة: الطائف، الروض الأنف :4/317,318)

وحشی بن حرب (م:25ھ/645ء): ابودسمہ وحشی بن حرب حبشی مولیٰ بنونوفل رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں۔ مکہ کے سوڈانی غلاموں میں سے تھے۔ انھوں نے جنگ احد میں حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔ یہ اہل طائف کے وفد کے ساتھ مسلمان ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنا چہرہ مجھ سے چھپائے رکھنا۔'' انھوں نے یمامہ کے معرکے میں مسیلمہ بن کذاب کو قتل کیا۔ حمص میں عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ (صحيح البخاري:4072، الإصابة:6/470، أسد الغابة: 4/307-309، الأعلام:8/111)

ولید بن عبدالملک (48-96ھ/668-715ء): ابوعباس ولید بن عبدالملک بن مروان بن حکم بن ابی العاص بن امیہ رحمہ اللہ 48ھ

میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے بعد 86 تا96ھ خلیفہ رہے۔ تابعین میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے شام میں جامع مسجد اموی تعمیر کرائی اور مسجد نبوی اور مسجد الحرام میں توسیع کرائی۔ ان کے زمانے میں بہت زیادہ فتوحات ہوئیں۔ آپ نے دیر مران میں وفات پائی اور دمشق میں دفن ہوئے۔ ان کی انگوٹھی کا نقش تھا: یَا وَلِیدُ! إِنَّکَ مَیِّتٌ ''اے ولید! بے شک تو مرنے والا ہے۔'' (البدایة والنهایة:9/168-173، الأعلام:8/121)

ہوذہ بن علی حنفی (م:8ھ/630ء): ہوذہ بن علی بن ثمامہ بن عمرو حنفی کا بکر بن وائل کے قبیلے سے تعلق تھا۔ یمامہ کا بادشاہ مذہباً نصرانی تھا۔ یہ شاعر بھی تھا۔ دعوتِ اسلام سے پہلے بنوحنیفہ کا خطیب تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے ایک مکتوب گرامی کے ذریعے اسلام کی دعوت دی مگر اس نے قبول نہیں کی۔ (الأعلام:8/102، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

یاقوت حموی (574-626ھ/1178-1229ء): ابوعبداللہ شہاب الدین یاقوت بن عبداللہ رومی حموی رحمہ اللہ ثقہ مؤرخ اور جغرافیہ کے ماہر تھے۔ لغت اور ادب میں بھی ماہرانہ دستگاہ رکھتے تھے۔ اصلاً رومی تھے۔ بغداد کے ایک حموی تاجر کے غلام تھے۔ اُس نے انھیں 596ھ میں آزاد کر دیا۔ یاقوت اجرت پر کتابیں لکھتے تھے۔ انھوں نے علمی جستجو میں خراسان، خوارزم، موصل اور حلب کا سفر کیا۔ ان کی تصانیف میں معجم البلدان بہت مشہور ہے۔ (الأعلام:8/131، وفیات الأعیان:6/127-139)

یزید بن زمعہ اسدی (م:8ھ/630ء): ان کا نسب یزید بن زمعہ بن اسود بن مطلب بن اسد بن عبدالعزیٰ اسدی قرشی رضی اللہ عنہ ہے۔ جاہلیت میں یہ قریش کے ممتاز ترین سردار تھے۔ السابقون الاولون میں سے تھے۔ حبشہ کی طرف ہجرت بھی کی تھی۔ یوم حنین یا طائف میں شہید ہوئے۔ (الإصابة:6/515، أسد الغابة:4/339، الأعلام:8/183)

اماکن

ابلا: یہ حلب سے 55 کلومیٹر جنوب مغرب میں آباد تھا۔ آج کل اسے تل مردیخ کہتے ہیں۔ (وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

ابوقبیس: مکہ کے مشرق میں واقع یہ پہاڑ مسجد الحرام کے قریب ترین ہے۔ (المنجد في الأعلام، ص:21)

ارحب: یہ یمن میں ایک زرعی علاقہ ہے جو ایک بڑے قبیلے ہمدان کے نام سے موسوم ہے۔ (معجم البلدان، مادة: أرحب)

اردن: یہ قدیم شام کا حصہ رہا ہے۔ اس کے مغرب میں دریائے اردن، بحیرۂ مردار اور فلسطین، جنوب میں سعودی عرب اور خلیج عقبہ، مشرق میں عراق اور شمال میں سوریہ (شام) ہے۔ دارالحکومت عمّان ہے۔ بہت سے صحابہ کی قبریں اردن میں ہیں۔ الکرک کے قریب جہاں معرکہ مؤتہ برپا ہوا، وہ مقام بھی اسی ملک میں ہے۔ اس کا رقبہ 90740 مربع کلومیٹر ہے۔ اس کے تاریخی شہر الکرک، عجلون، ازرق اور عمان ہیں۔ (موسوعة العالم الإسلامي، ص:54-58، المنجد في الأعلام، ص:36،37)

الاحساء: یہ سعودی عرب کا مشرقی علاقہ ہے جو کویت اور قطر کے درمیان ہے۔ الاحساء ان دنوں منطقہ شرقیہ میں شامل ہے۔ اس کے مشہور شہر القطیف، الخبر، جبیل اور الظہران اور دمام ہیں۔ سعودی عرب میں تیل کا بڑا ذخیرہ اسی علاقے میں ہے۔ (المنجد في الأعلام، ص:28)

الباحہ: یہ صوبہ سعودی عرب کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اس کے شمال مغرب میں صوبہ مکۃ المکرمۃ اور جنوب مشرق میں صوبہ عسیر ہے۔ اس کا رقبہ 10362 مربع کلومیٹر ہے۔ شریف مکہ نے اسے حجاز کے باغ کا لقب دیا تھا۔ (أطلس المملكة العربية السعودية والعالم، ص: 19,18، وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا)

الجوف: دارالسلام کے مینجنگ ڈائریکٹر جناب عبدالمالک مجاہد دومۃ الجندل کی سیاحت کے بعد اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں: ''الجوف منطقہ (صوبہ) کا نام ہے۔ اس کا تاریخی شہر دومۃ الجندل ریاض سے کم و بیش 1200 کلومیٹر کی مسافت پر ہے، اردن کی سرحد سے تقریباً 250 کلومیٹر دور ہے۔ منطقہ الجوف کا دارالحکومت سکاکا ہے۔ سکاکا سے 60 کلومیٹر پر دومۃ الجندل ہے۔'' (ماہنامہ ''ضیائے حدیث''، لاہور مئی 2011ء)

الشُّلیمی: یہ قصبہ سعودی عرب کے صوبہ حائل میں وادی الرمہ کے شمال میں واقع ہے اور حائل شہر سے 170 کلومیٹر دور ہے۔ (وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا)

الشَّرَبَّہ: یہ سعودی صوبہ القصیم کے مغرب میں السلیلہ اور الربذہ کے درمیان نجد کا قدیم علاقہ ہے جہاں درختوں کی بہتات ہے۔ (معجم البلدان، مادة: الشربة)

القطیف: یہ شہر سعودی عرب کے ساحلی شہر الدمام سے 25 کلومیٹر شمال مغرب میں واقع ہے۔ قطیف انھی قرامطہ کا علاقہ ہے جنھوں نے کعبہ سے حجرِ اسود چرا لیا تھا۔ یہ شہر پٹرولیم کی صنعت کا مرکز ہے۔ (معجم البلدان، مادة: القطيف، وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا)

المذنب: یہ سعودی صوبہ القصیم کا ایک قصبہ ہے جو القصیم شہر سے جنوب کی جانب 65 کلومیٹر پر اور دارالحکومت الریاض کے شمال میں تقریباً 300 کلومیٹر دور واقع ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں اس کا نام ''فیحان'' یا ''الذنائب'' تھا۔ یہ ذَنَبٌ سے ہے جس کے معنی دُم ہیں۔ (معجم البلدان، مادة: المذنب، وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا)

المَندَب: یہ یمن کی اہم بندرگاہ ہے۔ باب المندب نامی آبنائے اسی کے نام سے منسوب ہے۔ یہ آبنائے خلیج عدن اور بحر ہند کو بحیرۂ احمر سے ملاتی ہے اور ایشیا کو افریقہ سے اور یمن کو جبوتی سے الگ کرتی ہے۔ (معجم البلدان، مادة: المندب، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

الودیعہ: یہ ربع الخالی کے اندر سعودی حدود میں واقع ہے۔ یہ صحرائی قصبہ نجران شہر کے جنوب مشرق میں تقریباً 350 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور یمنی بندرگاہ المکلا سے تقریباً 460 کلومیٹر شمال میں ہے۔ (وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا)

آرمینیا: یہ ملک جبال قفقاز کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ سوویت یونین میں دسمبر 1991ء تک شامل رہا۔ کل رقبہ 29,800 مربع کلومیٹر ہے۔ اس کا دارالحکومت یریوان ہے۔ (المنجد في الأعلام، ص: 39) آذربائیجان، جارجیا، ترکی اور ایران اس کے ہمسائے ہیں۔

بحیرۂ قلزم: لفظ ''قلزم'' لاطینی زبان کے لفظ کلیزما کی تعریب ہے جو بحیرۂ احمر کا پرانا رومی نام تھا۔ بحیرۂ احمر جو جزیرہ نمائے عرب اور براعظم افریقہ کے درمیان واقع ہے، جنوب میں باب المندب کے ذریعے سے بحیرۂ عرب سے ملتا ہے اور شمال میں یہ خلیج عقبہ اور خلیج

سویس (سویز) میں بٹ جاتا ہے۔ اس کی لمبائی 1900 کلومیٹر اور عرض 200 تا 325 کلومیٹر ہے۔ بحیرۂ قلزم کا رقبہ 450000 مربع کلومیٹر ہے۔ (معجم البلدان، مادة: القلزم، المنجد في الأعلام، ص: 113)

بحیرۂ لوط: اسے عربی میں البحر المیّت (بحیرۂ مردار) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا پانی بے حد نمکین ہے۔ یہ فلسطین اور اردن کے درمیان ہے۔ اس کی زیادہ سے زیادہ گہرائی 393 میٹر ہے۔ (المنجد في الأعلام، ص: 114)

بصرہ: یہ سواد عراق کا ایک شہر ہے جو فرات اور دجلہ کے سنگم سے 90 کلومیٹر جنوب میں شط العرب کے کنارے واقع ہے۔ 636ء میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں اس کی بنیاد رکھی گئی۔ عباسیوں کے دور میں یہ لغت کا گہوارہ اور ثقافت کا مرکز بن گیا۔ الفاو، القرنہ، ام قصر وغیرہ محافظ بصرہ کے اضلاع ہیں۔ (المنجد في الأعلام، ص: 129)

بقیع الغرقد: غرقد کانٹے دار جھاڑی کو کہتے ہیں۔ حدیث میں اس کو شجر الیہود کہا گیا ہے۔ اہل مدینہ کے قبرستان (بقیع) میں یہ درخت بکثرت پایا جاتا تھا۔ یہ مدینہ منورہ کا قبرستان ہے جو مسجد نبوی کے مشرق میں واقع ہے۔ بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسی قبرستان میں مدفون ہیں۔ (صحيح مسلم: 2922، معجم البلدان، مادة: بقيع، المنجد في الأعلام، ص: 132)

بئر معونہ: یہ حرہ بنو عامر اور حرہ بنو سلیم کے درمیان اور حرہ بنو سلیم سے زیادہ قریب ہے۔ مدینہ سے مکہ جاتے ہوئے اُبلیٰ کے پہاڑوں کے درمیان آتا تھا۔ سریہ رجیع اسی کے نزدیک پیش آیا تھا۔ (معجم البلدان، مادة: بئر معونة)

تنعیم: یہ مکہ کے قریب حدود حرم کے باہر شارع مکہ مدینہ پر ایک مقام ہے۔ یہیں مسجد عائشہ واقع ہے۔ اسے تنعیم اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے دائیں جانب پہاڑ ہے جس کا نام نُعَیم ہے۔ ایک اور پہاڑ اس کے شمال میں ہے جسے ناعم کہا جاتا ہے اور وادی کا نام نُعمان ہے۔ (معجم البلدان، مادة: تنعيم، معجم لغة الفقهاء، ص: 148)

خراسان: ماضی میں ایران کے مشرق میں خراسان کا وسیع وعریض صوبہ تھا۔ اس کی سرحدیں ماوراء النہر سے ملتی تھیں۔ بلخ (باختر) خراسان کا سب سے بڑا شہر تھا۔ اس کے علاوہ سرخس، ہرات، مرو، طوس اور نیشاپور مشہور شہر تھے، تاہم آج کا خراسان، جو ایران کا مشرقی صوبہ ہے، محدود علاقے پر مشتمل ہے۔

رومیہ: استنبول یا قسطنطنیہ کو عربی میں سلطنت روم کی نسبت سے رومیہ بھی کہتے ہیں۔ احادیث نبویہ میں قسطنطنیہ اور رومیہ کے علاوہ اس کا نام مدینہ ہرقل بھی آیا ہے۔ (مسند أحمد: 176/2، سنن الدارمي: 503، السلسلة الصحيحة: 4)

سیراف: یہ شہر خلیج فارس کے کنارے پر بندر بوشہر سے 240 کلومیٹر اور بندر عباس سے 380 کلومیٹر دور تھا۔ سیراف اور بصرہ کے درمیان سات دن کا سفر تھا۔ 977ء میں یہ زلزلے کے باعث تباہ ہو گیا۔ (معجم البلدان، مادة: سيراف، المنجد في الأعلام، ص: 320)

سُدیر: اس کا پرانا نام وادی فقی ہے۔ یہ الریاض کے شمال میں 120 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ (معجم البلدان، مادة: السدير، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

صور (Tyre): یہ تاریخی شہر جنوبی لبنان میں بحیرۂ روم کے کنارے پر واقع ہے۔ یہ فنیقیوں کے زمانے میں آباد ہوا۔ بیروت سے

83 کلومیٹر جنوب میں ہے۔ یہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بلا مقابلہ فتح ہوا۔ صور اور صیداء کا تذکرہ بائبل میں جا بجا ملتا ہے۔ (معجم البلدان، مادة: صور، Oxford English Reference Dictionary,p: 1558، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

صیداء (Sidon): فنیقیوں کا آباد کیا ہوا یہ شہر بحیرۂ روم کے ساحل پر صوبہ صیداء کا دارالحکومت ہے۔ بیروت سے 50 کلومیٹر اور صور سے 40 کلومیٹر دور ہے۔ اسے صیدون بھی کہا جاتا ہے۔ عبرانی میں اسے صیدو کہتے ہیں۔ یہ شہر صیدون بن صدقاء بن کنعان کی طرف منسوب ہے۔ 46ھ/667ء میں فتح ہوا۔ (معجم البلدان، مادة: صیداء، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

صَعْدَہ: یہ یمن کے دارالحکومت صنعاء کے شمال میں 243 کلومیٹر دور واقع قدیم شہر اور صوبائی صدر مقام ہے۔ یہاں بارش بہت ہوتی ہے۔ سطح سمندر سے 1800 میٹر بلند ہے اور زیدی رافضیوں کا گڑھ ہے۔ (المنجد في الأعلام، ص: 345، الموسوعة العربية الميسرة: 1123/2)

ضبا: یہ سعودی صوبہ تبوک میں ساحل بحیرۂ احمر پر سمندر کے راستے آنے والے مصری حاجیوں کی بندرگاہ تھی۔ یہاں سے مملوک سلطان اشرف قایتبائی گزرا۔ اس نے ایک بڑی شاندار عمارت تعمیر کرائی جو دارالسلطان کے نام سے مشہور ہوگئی۔ آج کل یہ بہت بڑا تجارتی مرکز ہے۔ (وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

عدن: یہ یمن کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے جو خلیج عدن کے ساحل پر واقع ہے۔ شہر عدن جزیرہ نما عدن پر عُز عدن نامی آتش فشاں پہاڑ (550 میٹر بلند) کے دامن میں آباد ہے۔ اسے عدن ابین بھی کہتے ہیں۔ عدن کی بنا شداد بن عاد سے منسوب ہے۔ 10ھ/631ء میں حضرت علی رضی اللہ عنہ عدن تشریف لائے اور وہاں کے منبر پر لوگوں سے خطاب کیا۔

عسیر: یہ سعودی عرب کے جنوب مغرب میں واقع صوبہ ہے۔ اس کا دارالحکومت ابہا ہے۔ اس کے جنوب میں یمن اور صوبہ جازان، شمال میں صوبہ الریاض اور صوبہ مکة المكرمة، مشرق میں صوبہ نجران اور مغرب میں صوبہ الباحہ اور صوبہ مکة المكرمة کا کچھ حصہ واقع ہے۔ یہ خوبصورت اور زرخیز پہاڑی علاقہ ہے۔ (الموسوعة العربية الميسرة: 1212/2، المنجد في الأعلام، ص: 375، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

غلافقة: یہ یمن کے جنوب مغرب میں زبید کے بالمقابل بحیرۂ احمر کے ساحل پر بارونق بندرگاہ تھی۔ اس کے شکستہ آثار آج بھی نظر آتے ہیں۔ (معجم البلدان، مادة: غلافقة، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: 2-14/551,550)

قطر: یہ جزیرہ نمائے عرب کے مشرق میں واقع چھوٹا سا جزیرہ نما ہے۔ اس ملک کی جنوبی سرحد سعودی عرب سے ملتی ہے۔ باقی تین طرف سمندر (خلیج فارس) ہے۔ اس کا کل رقبہ 11,438 مربع کلومیٹر ہے۔ قطر کا دارالحکومت دوحہ ہے۔ قطر نے 1971ء میں برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ (معجم البلدان، مادة: قطر، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

کاظمہ: یہ ایک تاریخی شہر ہے۔ کویت کے شہر الجہراء سے 40 کلومیٹر دور ساحل جون الکویت (کویت کی کھاڑی) پر واقع ہے۔ یہاں بنو ایاد اور بکر بن وائل رہتے تھے۔ یہیں معرکہ ذات السلاسل (12ھ/633ء) میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فتح پائی۔ حال ہی میں یہاں پرانے کھنڈر دریافت ہوئے ہیں۔ (معجم البلدان، مادة: كاظمة، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

متحدہ عرب امارات: اس کے شمال میں خلیج عربی (خلیج فارس)، مشرق میں خلیج عمان اور سلطنت عمان اور جنوب اور مغرب میں سعودی عرب ہے۔ اس کا رقبہ 92100 مربع کلومیٹر ہے۔ متحدہ عرب امارات میں سات ریاستیں ابوظبی، دبی، رأس الخیمہ، عجمان، ام القیوین، شارقہ (شارجہ) اور الفجیرہ شامل ہیں۔ ان میں تقریباً 3000 مساجد ہیں۔ متحدہ عرب امارات کا دارالحکومت ابوظبی ہے۔ (موسوعة العالم الإسلامي، ص: 62-64)

مدارج العرج: یہ طائف کی ایک نواحی وادی میں بلادِ ہذیل کا ایک بڑا قصبہ ہے۔ آلِ عثمان میں شاعر عبداللہ بن عمر بن عبداللہ بن عمرو بن عثمان بن عفان العرجی اسی سے منسوب ہوئے۔ یہاں سے تہامہ شروع ہوتا ہے۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک بڑی وادی کا نام بھی العرج ہے جو مدینہ سے 113 کلومیٹر جنوب میں ہے۔ (معجم البلدان، مادة: العرج، معجم المعالم الجغرافية في السيرة النبوية، ص: 203)

مدین: یہ سعودی عرب کے صوبہ تبوک سے تقریباً دو سو کلومیٹر مغرب کی جانب خلیج عقبہ اور بحیرۂ قلزم کے ساحل سے متصل علاقہ ہے۔ آج کل مدین مغایر شعیب کے نام سے مشہور ہے۔ یہ شعیب علیہ السلام کی قوم کا علاقہ تھا۔ ''مدین'' ایک قبیلے کا نام بھی ہے۔ (معجم البلدان، مادة: مدين، معجم قبائل العرب: 1062/3، اطلس القرآن (اردو)، ص: 129)

ملک کنعان: ارض کنعان سے مراد فلسطین اور فنیقیہ کی سرزمین ہے جو کنعانیوں، یعنی کنعان بن سام یا کنعان بن حام بن نوح کی نسل سے منسوب ہے۔ کنعانی جنوب مشرقی عرب کے قدیم باشندے تھے جو چوتھی اور تیسری ہزاری ق م کے درمیان ہجرت کر کے فلسطین و شام میں جا بسے تھے۔ شکیم (نابلس)، مجدو، اریحا، بیسان، عکا اور یافا ان کے مشہور شہر تھے۔ (معجم البلدان، مادة: كنعان، سبائك الذهب، ص: 30، کتاب مقدس (پیدائش) 6:10-20، معجم مفردات مقرر مادة التاريخ، ص: 226)

میسو پوٹیمیا: دجلہ اور فرات، دو دریاؤں کے درمیان واقع سرزمین زمانۂ قدیم سے میسو پوٹیمیا یا الجزیرہ یا مابین النہرین کہلاتی ہے۔ میسو پوٹیمیا یونانی نام ہے جو دو لفظوں Mesos (درمیان) اور Potomos (دریا) سے مرکب ہے۔ گویا میسو پوٹیمیا کے معنی ہیں ''دو دریاؤں کے درمیان کی سرزمین۔'' (اطلس القرآن (اردو)، ص: 22)

وادی حنیفہ: اس کا پرانا نام العرض ہے۔ یہ منطقہ العارض (نجد) کی ایک ندی ہے جو بنو حنیفہ کے علاقے الخرج سے گزرتی ہے۔ اس کی لمبائی 120 کلومیٹر ہے۔ سدوس، درعیہ، عیینہ، الحائر، العماریہ اور منفوحہ اسی وادی کے قصبے ہیں۔ (معجم البلدان، مادة: العرض، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

وادی عُرنہ: یہ وادی مکہ کے مشرق میں میدان عرفات کی حدود سے متصل ہے اور عرفات اور مسجد نمرہ کے درمیان واقع ہے۔ یہ وادی حدودِ حرم میں شامل نہیں۔ (معجم البلدان، مادة: عرنة، بحوث في الفقه المعاصر)

وجرہ: مکہ کے شمال مشرق میں عراق کے میقات ''ذات عرق'' (جو مکہ سے 92 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے) کے قریب ایک جگہ کا نام وجرہ ہے۔ یہ بنو سلیم کا علاقہ تھا۔ (معجم البلدان، مادة: وجرة)

یلملم: یہ مکہ مکرمہ سے جنوب کی طرف 92 کلومیٹر دور ایک وادی ہے جو اہل یمن اور جنوب کی طرف سے آنے والوں کا میقات ہے۔ (معجم البلدان، مادة: يلملم، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

ینبع: یہ بحیرۂ احمر کے ساحل پر صوبہ مدینہ منورہ کا ایک بڑا شہر ہے جو مدینہ سے 250 کلومیٹر دور ہے۔ ینبع جدہ سے 350 کلومیٹر شمال میں ہے۔ ینبع کے علاقے میں 370 چشمے ہیں جس کی وجہ سے اس کا نام ینبع پڑ گیا۔ ینبع دراصل ''ینبوع'' ہے جس کا مطلب چشمہ ہے۔ یہاں سے معدنی تیل برآمد کیا جاتا ہے۔ (معجم البلدان، مادة: ینبع، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا)

اقوام و قبائل

المَعافِر: یہ کہلانی یمنی قبیلہ ہے۔ اس کا نسب معافر بن یعفر بن مالک بن حارث بن مرہ ہے۔ معافر نام کا صوبہ انھی لوگوں کی طرف منسوب ہے۔ (معجم البلدان، مادة: المعافر، معجم قبائل العرب: 1115/3)

آل صفوان: یہ بنوجمح ہیں جن میں امیہ بن خلف، ابی بن خلف اور وہب بن خلف وغیرہ شامل ہیں۔ (بنو جمح قریشی قبیلہ جُمح بن عمرو بن ہصیص بن کعب بن لوئی سے منسوب ہے۔) (الجمهرة لابن الكلبي، ص: 95،94)

آل منذر: یہ قبیلہ منذر بن حارث بن جبلہ غسانی کی طرف منسوب ہے۔ منذر بن حارث دعوتِ اسلام کے آغاز سے پہلے بادیۂ شام کا امیر اور رومیوں کا باجگزار تھا۔ اس کے اور شاہانِ حیرہ کے درمیان، جو فارسیوں کے ماتحت تھے، کئی جنگیں ہوئیں۔ بعد ازاں منذر کو رومیوں ہی نے حیلے سے قتل کر دیا۔ (الأعلام: 293،292/7)

بارق: یہ ازدی قحطانی قبیلہ ہے۔ ان کا نسب نامہ بنوبارق بن عدی بن حارثہ بن عمرو مزیقیا ہے۔ انھی میں سے ام الخیر بنت الحریش البارقیہ شاعرہ تھیں جنھوں نے جنگ صفین کے دن معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف فصیح و بلیغ خطبہ دیا تھا۔ (نهاية الأرب، ص: 162، معجم قبائل العرب: 57/1)

باہلہ: یہ بنوعدنان سے قیس بن عیلان کا بہت بڑا قبیلہ ہے۔ باہلہ کا نام منبہ بن سعد بن قیس عیلان ہے۔ یہ یمامہ میں رہائش پذیر تھے۔ (معجم قبائل العرب: 60/1)

بجیلہ: یہ بہت بڑا قبیلہ ہے جو قحطان میں سے ہے۔ ان کا نسب بنوانمار بن اراش بن کہلان ہے۔ یہ اپنی ماں بجیلہ بنت صعب بن سعد کی طرف منسوب ہیں۔ اسلام سے قبل یہ حجاز اور بحرین میں رہائش پذیر تھے۔ ان کے بت کا نام ذوالخلصہ تھا۔ فتوحاتِ اسلامیہ کے زمانے میں ان لوگوں کی اکثریت اپنے علاقوں سے نکل بھاگی اور پسماندگان میں بہت کم لوگ رہ گئے۔ معروف صحابی جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ انھیں لوگوں میں سے تھے۔ (نهاية الأرب، ص: 164، الأعلام: 43/2)

بنواسد: یہ بنوعدنان کا ایک معروف قبیلہ ہے۔ اس کا نسب نامہ بنواسد بن ربیعہ بن نزار بن معد بن عدنان ہے۔ اسد کے تین بیٹے تھے: جدیلہ، عنزہ اور عُمیرہ۔ بنوعمیرہ میں سے طریف بن ابان وفد لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے۔ طریف رضی اللہ عنہ کی نسل میں سے عامر بن مسلم سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ شہید ہوئے۔ (الجمهرة لابن حزم، ص: 293)

بنواسد بن خزیمہ: یہ قبیلہ اسد بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مُضر عدنانی کی طرف منسوب ہے۔ یہ نجد میں کرخ کے علاقے میں بنوطے کے پڑوس میں رہتے تھے، پھر یہ لوگ عراق چلے گئے۔ وہاں 19ھ سے 588ھ تک رہے۔ 9ھ میں ان کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ (نهاية الأرب، ص: 47، معجم قبائل العرب: 1/21-23)

بنو اسلم: یہ خزاعہ کی شاخ ہے۔ ان کا نسب بنو اسلم بن افصیٰ بن حارثہ بن عمرو بن عامر ہے جو قحطانی قبیلے سے تھے۔ ان کی بستیوں میں سے ایک بستی کا نام ''وبرہ'' تھا جو مدینہ کے باہر کھجوروں کے باغات پر مشتمل تھی۔ (معجم قبائل العرب:26/1)

بنو بکر: یہ عدنانیوں کا بہت بڑا قبیلہ ہے جو بکر بن وائل بن قاسط کی طرف منسوب ہے۔ اس کا علاقہ یمامہ سے بحرین اور عراق کی طرف ہے۔ یہ بڑے جنگجو قبیلوں میں سے تھا۔ اس قبیلے نے اسلام سے پہلے اور بعد میں بہت سی تاریخی لڑائیاں لڑی ہیں۔ (معجم قبائل العرب :98-93/1)

بنو تُجیب: یہ بنو سکون کا ذیلی قبیلہ ہے۔ ان کا نسب بنو اشرس بن شبیب بن سکون بن اشرس بن کندہ ہے۔ عدی و سعد ابنائے اشرس کی ماں کا نام تُجیب تھا۔ یہ حضرموت کے درمیان کسر کے علاقے میں رہتے تھے۔ تجیب کے 13 آدمیوں کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور اپنے ساتھ زکاۃ کا مال بھی لایا۔ رسول اللہ ﷺ خوش ہوئے اور ان کا اکرام کیا۔ (معجم قبائل العرب:116/1، معجم البلدان، مادة: تجیب)

بنو عبدالقیس: بنو عبدالقیس بن افصیٰ بن دعمی بن جدیلہ بن اسد عدنانی قبیلے کی شاخ ہے۔ یہ تہامہ میں رہتے تھے، پھر بحرین چلے گئے۔ ان کے بہت سے ذیلی قبائل ہیں۔ یہ لوگ پرامن طریقے سے برضا و رغبت مسلمان ہوئے تھے۔ (نهایة الأرب، ص: 307، الأعلام:49/4)

بنو عدوان: یہ قبیلہ قیس عیلان سے ہے جو عدنانی ہیں۔ عدوان کا نام حارث بن عمرو بن قیس ہے۔ اسے عدوان اس لیے کہا گیا کہ اس نے اپنے بھائی کو ناحق قتل کیا تھا۔ بنو عدوان طائف میں رہتے تھے۔ ثقیف نے ان پر غلبہ حاصل کیا تو یہ تہامہ کی طرف نکل گئے۔ (نهایة الأرب، ص:322)

بنو نضیر: یہ مدینہ کے یہودی قبائل میں سے ایک قبیلہ تھا۔ غزوۂ بدر (رمضان 2ھ) کے بعد انھوں نے نبی ﷺ سے کیا گیا عہد توڑ دیا۔ اس پر نبی ﷺ نے انھیں جلاوطن کر دیا، پھر ان کی املاک پر قبضہ کر لیا گیا۔ (المنجد في الأعلام، ص:574)

بنو امیہ: یہ امیہ بن عبدشمس بن عبدمناف بن قصی کی طرف نسبت ہے جو قریش میں امویوں کے جدِ امجد ہیں۔ امیہ جنگوں میں قریش کی قیادت کرتے تھے۔ نبی ﷺ کی ولادت کے بعد تک زندہ رہے۔ (الأعلام:23/2)

بنو تمیم: یہ عظیم عدنانی قبیلہ تمیم بن مُرّ بن اُدّ بن طابخہ بن الیاس بن مُضر بن نزار بن معد بن عدنان سے منسوب تھا۔ یہ نجد میں بصرہ، بحرین اور یمامہ تک آباد تھا۔ یہ کئی شاخوں میں منقسم تھا، مثلاً حارث، عنبر، زید مناۃ، مالک، عمرو، سعد، حنظلہ، عوف، یربوع، ریاح، امرؤالقیس، حارث الاعرج، ربیعہ۔ بعد میں بنو تمیم نجد سے نکل کر دور دور تک پھیل گئے اور آباد نجد اور جبل شمر کے علاقے میں اس قبیلے کی تین شاخیں رہ گئیں: حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ بن تمیم، سعد بن زید مناۃ بن تمیم، عمرو بن تمیم۔ جنگ قادسیہ (عراق) میں حضرت قعقاع بن عمرو رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بنو تمیم نے بہادری کے جوہر دکھا کر جنگ کا پانسا پلٹ دیا تھا۔ امام محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان (1115-1206ھ/1703-1792ء) بنو تمیم کی شاخ بنو حنظلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ الریاض سے 40 کلومیٹر دور شمال مغرب میں واقع قصبہ عیینہ (نجد) میں پیدا ہوئے۔ حصول علم کے لیے شام، بصرہ اور حجاز کا سفر کیا۔ اپنے والد کے بعد حریملاء کے قاضی رہے۔ 1143ھ میں علانیہ دعوت حق کا آغاز اپنے آبائی قصبے عیینہ سے کیا۔ اس کے نتیجے میں بہت سے مصلح لوگ اکٹھے ہو گئے۔

1157ھ/1744ء میں درعیہ گئے اور محمد بن سعود سے مل کر دعوت کو مزید آگے بڑھایا۔ انگریزوں نے بدنیتی سے انھیں اور ان کے ساتھیوں کو ''وہابی'' کا لقب دیا (حالانکہ یہ لقب صدیوں پہلے شمالی افریقہ کے ایک گمراہ خارجی سردار عبدالوہاب رستمی کی نسبت سے ان کے پیروکاروں کو دیا گیا تھا۔) محمد بن عبدالوہاب نے درعیہ میں وفات پائی۔ ان کی اولاد آل الشیخ کے نام سے معروف ہے۔ انھوں نے بہت مفید دینی اور اصلاحی کتابیں لکھیں۔ کتاب التوحید، کشف الشبهات اور نواقض الإسلام ان کی بڑی معروف کتابیں ہیں۔ (الأعلام: 257/6، وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا) تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ کریں: محمد بن عبدالوہاب ''ایک مظلوم اور بدنام مصلح'' از مسعود عالم ندوی۔

بنوجمح: یہ قریشی قبیلہ بنوہصیص سے ہے جو عدنانی ہیں۔ ان کا نسب نامہ جمح بن عمرو بن ہصیص بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر ہے۔ ردم کے مقام پر بنومحارب بن فہر سے ان کی خون ریز لڑائی معروف ہے۔ (معجم قبائل العرب: 203,202/1)

بنوسعد: اس عدنانی قبیلے کا نسب یہ ہے: سعد بن زید مناۃ بن تمیم۔ ان کے مقامات وسطی عرب میں یمامہ، دہناء اور جرباء تھے۔ ان کی بنوشیبان سے لڑائی ہوئی جس میں یہ غالب آئے۔ معدیکرب بن حارث بن عمرو ان کا بادشاہ رہا۔ (معجم قبائل العرب: 515/2)

بنوسکون: یہ کندہ کا ذیلی قبیلہ ہے جو قحطانیوں میں سے ہیں۔ ان کا نسب بنوسکون بن اشرس بن ثور (کندہ) بن عفیر بن عدی بن حارث بن مرہ ہے۔ بنوسکون دومۃ الجندل کے بادشاہ تھے۔ نبی کریم ﷺ نے دومۃ الجندل کے جس بادشاہ کے پاس خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا، اس کا نام اُکیدر تھا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسے قید کر کے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے آئے تھے، پھر جزیے پر مصالحت ہوگئی اور انھیں آزاد کر دیا گیا۔ (سبائك الذهب في معرفة قبائل العرب، ص: 219، الرحيق المختوم، ص 438)

بنوسہم: یہ قریشی قبیلہ ہے۔ ان کا نسب نامہ سہم بن عمرو بن ہصیص بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر بن مالک ہے۔ بنوسہم کے لوگ فسطاط مصر میں رہائش پذیر ہوئے۔ ان کا ایک گروہ مصر صعید میں مقیم ہوا۔ مصر کے گورنر عمرو بن عاص سہمی رضی اللہ عنہ نے فسطاط مصر میں جو مسجد (جامع عمرو بن عاص) تعمیر کرائی، اس کے آس پاس بنوسہم کی آبادی تھی۔ (معجم قبائل العرب: 560/2)

بنوسُلیم: یہ قبیلہ سُلیم بن منصور بن عکرمہ بن خصفہ بن قیس عیلان کی طرف منسوب ہے۔ یہ عدنانی الاصل ہے۔ اس کی طرف نسبت سُلَمی ہے۔ یہ لوگ نجد عالیہ، حرہ سلیم، حرۃ النار، وادی القریٰ اور تیماء میں رہتے تھے۔ (نهاية الأرب، ص: 271)

بنوشیبان: یہ قحطانی قبیلہ حمیر کی شاخ ہیں اور شیبان بن عوف کی طرف منسوب ہیں جو بنی زہیر بن ایمن بن ہمیسع بن حمیر بن سبا میں سے تھا۔ (نهاية الأرب، ص: 283)

بنوعدی: یہ عدنانی قبیلہ ہے۔ ان کا نسب نامہ بنوعدی بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر ہے۔ عدی کے دو لڑکے تھے: رزاح اور عویج۔ بنو رزاح سے امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے اور بنوعویج سے نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ تھے جو النحام کے لقب سے معروف تھے۔ (نهاية الأرب، ص: 325)

بنوغطفان: غطفان بن سعد بن قیس بن عیلان بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان مشہور عدنانی قبیلے بنوغطفان کا جد امجد تھا۔ اس کی نسل سے بکثرت قبائل وجود میں آئے۔ ان کی تین بڑی شاخیں یہ ہیں: اشجع، عبس اور ذبیان۔ (نهاية الأرب، ص: 348، معجم قبائل العرب: 888/3)

بنوکلب: ان کا نسب کلب بن وبرہ بن تغلب بن حلوان بن عمران بن الحافی بن قضاعہ ہے۔ اس نام کے اور بھی قبائل تھے لیکن یہ زیادہ مشہور ہوا۔ ان کی بستیاں کوفہ اور دمشق کے درمیان السماوہ میں تھیں۔ دومۃ الجندل میں انھوں نے ''ودّ'' بُت نصب کر رکھا تھا۔ یہ بنوامیہ کے ساتھی تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے بنوکلب کی ایک خاتون میسون سے شادی کی تھی۔ (نهاية الأرب، ص:365، معجم قبائل العرب:992,991/3، الجمهرة لابن حزم، ص:455)

بنومخزوم: یہ قریشی قبیلہ بنویقظہ بن مرہ بن کعب سے ہے۔ عمر (عمرو) بن مخزوم، خالد بن ولید بن مغیرہ رضی اللہ عنہ کے جد امجد تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ابوجہل (عمرو بن ہشام بن مغیرہ) بھی اسی قبیلے سے تھا جو بدر میں قتل ہوا۔ (نهاية الأرب، ص:371، الجمهرة لابن الكلبي، ص:85)

بہراء: بہراء قبیلہ قضاعہ کی ایک شاخ ہے۔ ان کا نسب بہراء بن عمرو بن الحاف بن قضاعہ بن مالک بن حمیر ہے۔ یہ قبیلہ خوب پھلا پھولا، اس کے افراد شام، حبشہ، عراق وغیرہ کئی ملکوں میں آباد تھے۔ انھی میں سے قبائل عشیرۂ مقداد، جس سے معروف صحابی مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ تھے، عشیرہ قمزان اور عشیرہ بومہیر ہیں۔ (وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا)

تنوخ: جوہری کا قول ہے کہ تنوخ یمنی قبیلہ ہے جو قحطان سے ہیں۔ مؤید جو تاریخ دان ہیں، وہ کہتے ہیں کہ تنوخ قضاعہ سے ہیں۔ ابوعبید کا قول ہے کہ تنوخ تین قبائل: نزار، أحلاف اور فہمی کا مجموعہ ہیں۔ انھیں تنوخ اس لیے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے شام کے مقام تَنَّخ میں باہم رہنے کا عہد و پیمان کیا تھا جس کی وجہ سے انھیں تنوخ کہا جانے لگا۔ (نهاية الأرب، ص:178، الجمهرة لابن حزم، ص:453)

عاملہ: بنوعاملہ قحطانی قبیلہ ہے۔ یہ حارث (عاملہ) بن مرہ بن ادد بن زید بن یشجب بن زید بن کہلان کی طرف منسوب ہے۔ حارث لخم اور جذام کا بھائی ہے۔ بنوعاملہ شام میں جبل عاملہ میں رہتے تھے۔ ان کے بت کا نام اقیصر تھا۔ یہ لوگ اس کا حج کرتے تھے۔ (نهاية الأرب، ص:303، معجم قبائل العرب:714/2، المفصل في تاريخ العرب قبل الإسلام:275/6)

عباہلہ: یہ یمن کے وہ بادشاہ ہیں جنھیں برقرار رہنے کا حکم ملا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط دے کر وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کو اقیال (ملوک) اور عباہلہ کی طرف بھیجا تھا۔ (تاج العروس، مادة: عبهل)

عبیل: یہ عبیل بن مہلائیل بن عوض بن ارم بن سام بن نوح کی طرف منسوب عرب بائدہ کے ایک قبیلے کا نام ہے۔ یہ لوگ مدینہ منورہ (یثرب) میں رہتے تھے۔ (نهاية الأرب، ص:317، معجم قبائل العرب:748/2، لسان العرب، مادة: عبل)

عذرہ: بنو قضاعہ کی شاخ بنو عذرہ کا جدِ امجد عذرہ بن سعد ہذیم بن زید بن لیث ہے۔ بنوعامر، کاہل، ایاس، عوف اور رفاعہ قبائل بنوعذرہ کی شاخیں ہیں۔ یہ لوگ محبت اور پاکدامنی میں مشہور ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں ان کے بعض افراد شمس نامی بت کی پوجا کرتے تھے۔ (سبائك الذهب، ص:87، نهاية الأرب، ص:326، معجم قبائل العرب:768/2)

عضل (بنوقارہ): عضل بن ہون بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس مضری قبیلہ بنوکنانہ کی شاخ بنوعضل کا جد امجد ہے۔ اس کی اولاد اس کے بھائی الدیش کی اولاد کے ساتھ گھل مل گئی تھی اور وہ اپنی دادی قارہ کے نام کی مناسبت سے بنوقارہ مشہور تھے۔ یہ لوگ تیر اندازی کے ماہر تھے۔ (نهاية الأرب، ص:329، معجم قبائل العرب:787/2، الأعلام:235,234/4)

غامد: اس کے جدِ امجد کا نام عمرو بن عبداللہ بن کعب بن حارث ازدی ہے۔ یہ قحطانی قبیلہ ہوازد کی ایک شاخ تھا۔ ان کا علاقہ کوہستان سراۃ تھا۔ (الجمهرة لابن الكلبي، ص: 277، معجم قبائل العرب: 876/3)

بنو غُطیف: یہ بنوطے کا ایک ذیلی قبیلہ تھا۔ اس کا نسب یہ ہے: غُطیف بن حارثہ بن سعد بن حشرج بن امرؤالقیس بن عدی بن اخزم بن ہزومہ بن ربیعہ بن جرول الطائی۔ (تاج العروس، مادة: غطف)

قیس عیلان: قیس بن عیلان بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان کی طرف منسوب لوگوں کو قیس عیلان کہا جاتا ہے۔ ہوازن، سُلیم، غطفان، مازن، فہم، عدوان، باہلہ اور غنی قیس عیلان سے ہیں۔ جب قیس یمن بولا جاتا ہے تو اس میں سارے عدنانی قبائل شمار ہوتے ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''اللہ تعالیٰ قیس پر رحم فرمائے۔ بے شک وہ ہمارے باپ اسماعیل علیہ السلام کے دین پر تھے۔'' (نهاية الأرب، ص: 362، الجمهرة لابن الكلبي، ص: 311، الأعلام: 207/5، معجم قبائل العرب: 972/3)

مراد: ان کا نسب مراد بن مالک (مذحج) بن اُدد بن زید بن یشجب ہے۔ یہ کہلانی، قحطانی قبیلہ ہے۔ یہ لوگ یمن کے علاقے زبید کے قریب رہتے تھے۔ اسلام سے پہلے ان کے اور ہمدان کے درمیان لڑائی ہوئی تھی جو یوم الرزم کے نام سے مشہور ہے۔ (نهاية الأرب، ص: 373، معجم قبائل العرب: 1066/3)

ہُذیل: یہ ہذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار کی اولاد سے ہیں اور عدنانی الاصل ہیں۔ یہ لوگ جبل غزوان (طائف) تک پھیلے ہوئے تھے۔ نجد اور تہامہ میں بھی موجود تھے، ان کی دو بڑی شاخیں: سعد بن ہذیل اور لحیان بن ہذیل ہیں۔ (نهاية الأرب، ص: 387، معجم قبائل العرب: 1213/3، الأعلام: 80/8)

متفرقات

آطام: یہ أُطُم کی جمع ہے، جس کے معنی قلعہ یا بلند مکان کے ہیں۔ یہ لفظ زیادہ تر مدینہ کے قلعوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ (القاموس الوحيد، مادة: أطم، معجم البلدان، مادة: أطم)

صبح الاعشیٰ: یہ احمد بن علی بن احمد بن عبداللہ قلقشندی کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں املاء کے قواعد وضوابط، ادب وتاریخ اور جغرافیہ کی معلومات ہیں۔ ان کی دیگر کتابیں نهاية الأرب في معرفة أنساب العرب اور حلية الفضل وزين الكرم ہیں۔ (معجم المؤلفين: 317/1، المنجد في الأعلام، ص: 343)

وہیل: علم الحیات کے مطابق وہیل، مچھلی نہیں بلکہ دودھیل (ممالیہ) ہے، تاہم عام زبان میں اسے مچھلی ہی کہا جاتا ہے۔ وہیل انڈے نہیں بلکہ بچے دیتی ہے۔ نیلی وہیل دنیا کا سب سے بڑا حیوان ہے جس کے پیٹ میں ہاتھی کھڑا ہوسکتا ہے۔



سیرت انسائیکلوپیڈیا ﷺ

رہبرِ انسانیت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے ''اسوۂ حسنہ'' ہیں۔ آپ ﷺ کی اتباع کیے بغیر دنیا و آخرت میں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکات اور عظیم کارناموں پر سب سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کتب سیرت کے اس ہجومِ نجوم میں دارالسلام کا زیرِنظر سیرت انسائیکلوپیڈیا ''اللولؤ المکنون'' اپنی نوعیت کا نہایت منور، منفرد اور ممتاز علمی و تحقیقی ارمغانِ عقیدت ہے۔ ان شاء اللہ آپ کو اس کے مطالعے سے رسالت مآب ﷺ کی مقدس زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں علم و بصیرت کی بھرپور روشنی ملے گی۔

یہ سیرت انسائیکلوپیڈیا کی پہلی جلد ہے۔ اس میں آپ عرب بالخصوص مکہ و مدینہ کی مستند تاریخ اور جغرافیہ ملاحظہ کریں گے، اہل عرب کی بودوباش اور ثقافت و تہذیب سے آشنا ہوں گے۔ عاد، ثمود، جرہم، طسم و جدیس جیسی مبغوض قوموں کی تباہی میں ہمارے لیے کیسے کیسے اسباق اور عبرتیں موجود ہیں؟ ان کا کامل مشاہدہ پائیں گے ...... اسی طرح سابقہ انبیاء ہود، صالح، ابراہیم، اسمٰعیل، شعیب اور لوط علیہم السلام کے دل آویز اور ایمان افروز تذکرے آپ کے لیے موعظت و نصیحت کے دریچے کھولیں گے۔ مزید برآں آپ عرب سلطنتوں، عربی زبان و ادب، خطابت و شاعری، اس وقت کی بڑی طاقتوں ایران، روم، حبشہ کا ذکر اور بڑے بڑے مذاہب بت پرستی، عیسائیت، یہودیت اور صابئیت کے احوال پڑھیں گے۔ اس طرح آپ پر یہ حقیقت روشن ہوگی کہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ نے کفر، شرک، اصنام اور اوہام پرستی کے کس قدر تاریک ظلمت زار میں کتنی دانائی اور دلیری سے اسلام کی فطری اور عالم گیر صداقت پیش کی۔

دارالسلام
کتاب و سنت کی اشاعت کا عالمی ادارہ
دارالسلام DARUSSALAM
9786035000826